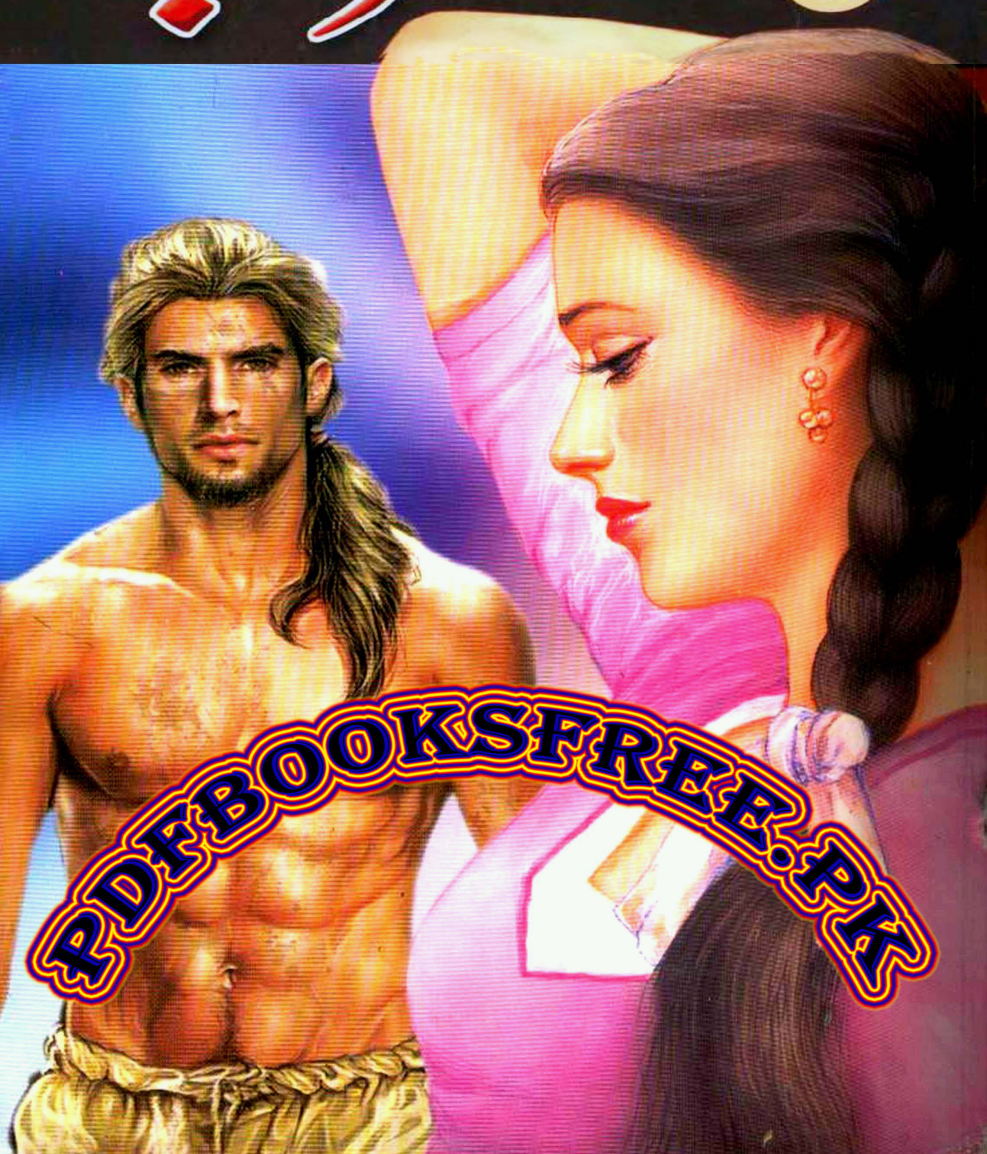


ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی تہلکہ خیز کہانی

سراب

راوی: شہباز ملک
تحریر: کاشف زبیر

13



PDFBOOKSFREE.PK

ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال دلولوں کی ایک تہلکہ خیز کہانی

سراب

تیر ہواں حصہ

کاشف زبیر



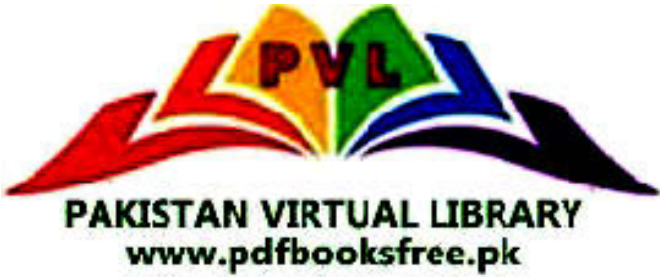
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 37247414

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بارشاعت ————— اول
مطبع ————— یو این ڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ————— عاطف رحمن - لاہور
قیمت ————— 250 روپے
بیرون ملک ————— 10 برطانوی پونڈ
15 امریکی ڈالر



ISBN 978-969-517-320-6

Stokist: (U.K)

Azhar Enterprises

315, Dickenson Road
Longsight, Manchester, M13 0NR
Tel: 0044 (0) 161 224 6331

اسٹاکسٹ
علیٰ ہیکسٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور

وسیم غور سے سن رہا تھا کیونکہ میں نے لیپ ٹاپ کے اسپیکر آن کر دیئے تھے۔ اس نے کہا۔

"مرشد خود کتے کی ڈم ہے یہ اتنی آسانی سے ماننے والا نہیں ہے۔"

"میں نے کل تک وارننگ دے دی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے یاد آیا ایک بار میں نے تم سے کہا تھا کہ

مرشد خاندان کے دوسرے افراد کا پتا چلاؤ جن سے مرشد کی ٹھنی ہوئی ہے۔"

"اس کے چچا کے بیٹے ہیں۔" وسیم نے کہا۔ "میرا خیال ہے تین یا چار بیٹے ہیں۔ مگر ان میں مرشد کا

حریف ارشاد علی ہے۔ وہ اس کے چچا کا سب سے بڑا بیٹا ہے اور مرشد کے خلاف وہی سرگرم ہے۔"

"تب اس سے رابطہ کرنا چاہیے۔"

"میں نے اس کے بارے میں معلوم کر لیا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ مرشد کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اتنا ہی

خبیث اور سفاک انسان ہے۔ اس سے کسی قسم کا تعلق سوچ سمجھ کر کرنا ہو گا۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ بعد میں یہ مرشد کی

جگہ سنبھال لے۔" وسیم نے کہا۔ "مرشد ایک آدمی ہے جب کہ ارشاد کے تین بھائی اور بھی ہیں اس لحاظ سے وہ

مرشد سے زیادہ طاقتور ہو سکتے ہیں۔ فی الحال تو مرشد ان پر حاوی ہے کہ گدی اس کے پاس ہے اور اس کے اندھے

مرید صرف اس کا اشارہ سمجھتے ہیں۔ ارشاد اور اس کے بھائی صرف آمدنی میں حصے دار ہیں۔"

"تب مرشد نے ان کا صفایا کیوں نہیں کر دیا؟"

"اس کی مجبوریاں ہیں۔ ارشاد اور اس کے بھائی اتنے کمزور بھی نہیں ہیں۔ دولت اور کرائے کے

بد معاشوں کی ان کے پاس کمی نہیں ہے۔ درگاہ مرشدیہ سے کچھ ہی دور ان کی جاگیر ہے۔"

"مرشد کی اولاد ہے؟"

"بے شمار..... جائز اولادوں کی تعداد ایک درجن ہے۔ اس کی تین بیویاں ہیں۔ اور فاضلی جیسے تو نہ

جانے کتنے ہوں گے لیکن اس کے بچے ابھی چھوٹے ہیں سب سے بڑا لڑکا شاید اسکول میں ہے۔"

"مرشد غالباً اس وقت کا انتظار کر رہا ہے جب اس کے بیٹے بڑے ہو کر اس کا دست و بازو بن جائیں تب

تک وہ اپنے شریکوں کو چھوٹ دے رہا ہے۔"

"ممکن ہے لیکن اس وقت وہ پھنسا ہوا ہے اور شاید ہمارا کام بن جائے۔"

"کیا اس پر دباؤ بڑھانے کے لئے اور کچھ نہیں کیا جاسکتا۔" میں نے کہا تو وسیم سوچ میں پڑ گیا۔

”کیا تو جاسکتا ہے مرشد اور اس کے چچا زادوں میں دشمنی بھڑکانی جاسکتی ہے۔“
 ”کوئی ڈرامہ کر کے۔“

”بالکل..... مصنوعی حملہ کیا جاسکتا ہے جو لگے کہ مخالف پارٹی کی کارروائی ہے۔“
 ”بس تو اس پر غور کرو۔ ہمیں جلد از جلد کچھ کر گزرنے چاہیے۔ مرشد پر جتنا دباؤ بڑھے گا وہ صلح کی طرف اتنا ہی مائل ہوگا۔“

مجھے مہر اور کرئل کا خیال آیا جنہیں ہم ایبٹ آباد میں چھوڑ آئے تھے وہاں کرئل کو طبی امداد مل گئی ہوگی۔ میں نے آج کے اخبارات منگوائے اور کرئل کے بارے میں ایک جگہ مختصر خبر مل گئی۔ عبدالرحمن نامی شخص کو ایبٹ آباد کے اسپتال میں لایا گیا تھا وہ شدید زخمی تھا اور اسے کئی گولیاں لگی تھیں لیکن آپریشن کے بعد اس کی حالت بہتر تھی۔ فی الحال وہ پولیس کو بیان دینے کے قابل نہیں تھا اس کے ساتھ اس کی بیوی کا کہنا تھا کہ وہ تفریح کرنے یہاں آئے تھے کہ نامعلوم افراد نے ان پر حملہ کر کے اس کے شوہر کو شدید زخمی کر دیا۔ بیوی کا کہنا تھا کہ ان کی کسی سے دشمنی نہیں ہے اور شاید یہ ذہنیاتی کی واردات تھی۔ فائرنگ کے بعد ڈاکو بکھلا کر فرار ہو گئے۔ مہرونے عقل مندی سے بیان دیا تھا اس نے کہیں بھی ہمارا فتح خان کا نام نہیں لیا تھا۔

مگر یہ خبر اخبار میں آگئی تھی۔ مہر اور کرئل کے لیے مشکل ہو سکتی تھی کیونکہ فتح خان ان کا دشمن بنا ہوا تھا۔ وہ ان کے خلاف کارروائی کر سکتا تھا یا پھر پولیس کو کرئل کی اصلیت بتا سکتا تھا۔ پولیس یا کوئی ایجنسی کرئل کو گرفتار کر لیتی۔ وہ ایک غیر ملکی تھا اور بغیر کسی جواز کے پاکستان کی سر زمین پر تھا اور یہاں اس کی ذات سے کئی جرائم بھی وابستہ تھے جن میں سب سے سنگین جرم بھارتیوں کی مدد تھی۔ اس لحاظ سے کرئل اب بھی شدید خطرے میں تھا۔ اگر اس کی اصلیت کھل جاتی تو اس کی ساری عمر جیل میں گزرتی یا وہ کسی نامعلوم قبر میں دفن دیا جاتا۔ اس کے ساتھ مہر بھی پلٹ میں آ جاتی۔ اگرچہ کرئل نے مجھے دو بار بھارتیوں کے حوالے کیا یا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا تھا کہ اس کا جرم اتنا سنگین نہیں تھا۔ وہ اصل میں بریف کیس حاصل کرنے آیا تھا۔

بریف کیس کا باب بند ہو چکا تھا اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کرئل کا باب بھی بند ہو چکا تھا اور ہمیں اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ہماری بلا سے وہ زندہ اور آزاد رہتا یا جہنم رسید ہو جاتا۔ مگر میں چاہتا تھا کہ وہ فتح خان کا شکار نہ ہو۔ بہر حال ابھی کرئل کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنی حفاظت خود کر سکتا۔ میرا خیال تھا کہ ایک ہفتے سے پہلے اسے اسپتال سے چھٹی بھی نہیں ملے گی۔ اس کے زخم بھرنے اور توانائی بحال ہونے میں اتنا وقت تو گلٹا۔ کل کی کارروائی کے بارے میں کسی اخبار میں کوئی خبر نہیں تھی حالانکہ اس میں تین افراد مارے گئے تھے اور دو گرفتار ہوئے تھے لیکن معاملہ ٹاپ سیکرٹ تھا اس لیے کسی اخبار میں خبر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر وسم اور میں نے مل کر ایک سرسبز اور لڑائی کی مشق کی۔ حویلی میں وسم نے اپنے آدمیوں کے لیے باقاعدہ ایک تربیتی پلان ترتیب دے رکھا تھا اور اس کے آدمی اور وہ خود بھی اس پر عمل کرتے تھے۔

عبداللہ سہ پہر میں آیا اور نہادھو کر کھانا کھانے چلا گیا۔ اس سے ملاقات چائے پر ہوئی۔ ”راجا صاحب کی کوٹھی کی فردخت کا کام شروع ہو گیا ہے۔ میں راول چوک والی جگہ بھی دیکھ آیا ہوں۔ لوکیشن اچھی ہے۔ سڑک

سے زیادہ دور نہیں ہے اور آبادی سے ہٹ کر ہے۔ ایک چھوٹا سا فارم ہاؤس ہے شاید ایک ہیکٹر رقبے پر ہوگا۔ اندر تین بیڈ رومز کی کوٹھی ہے۔ چاروں طرف گھنے اور اونچے درخت لگے ہیں جو پردہ پوشی کے لحاظ سے بہترین ہیں۔“

”کیا خیال ہے ہم بھی دیکھ کر آئیں؟“ وسیم نے کہا۔

”کوئی حرج نہیں ہے شام کے بعد جائیے گا۔“ عبداللہ بولا۔ ”میں اسٹیٹ ایجنٹ کو کال کر دوں گا وہ کوٹھی دکھا دے گا۔“

”تم نہیں چلو گے؟“

”مجھے ابھی دوبارہ جانا ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”کل شاید راجا صاحب کے پاس جانا پڑے کیونکہ معاہدے پر سائن ان کے ہوں گے۔“

”بائی ایر جاؤ گے۔“ وسیم نے پوچھا۔

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”سڑک سے آنے جانے میں بہت وقت لگ جائے گا۔ پارٹی جلد از جلد سودا فائل کرنا چاہ رہی ہے۔“

”سودا کتنے میں ہوا ہے؟“ وسیم نے پوچھا۔

”ایک ارب بیس کروڑ روپے میں۔“ عبداللہ نے بتایا تو ہم حیران رہ گئے میرے ذہن میں تھا کہ وہ جگہ قیمتی ہے لیکن اس کی مالیت ارب سے اوپر ہوگی یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔

”سچ منج والا ارب جس میں سو کروڑ ہوتے ہیں۔“ وسیم نے نیم سنجیدگی سے پوچھا تو عبداللہ ہنسا۔

”ہاں وہی والا ارب..... تمہاری آسانی کے لیے ایک سو بیس کروڑ روپے کی کوٹھی ہے یہ۔“

”اتنی قیمت کیوں جب کہ رقبہ بھی کوئی بہت زیادہ نہیں ہے شاید دو کنال کی ہوگی؟“ میں نے کہا۔

”ڈھائی کنال۔“ عبداللہ نے ہنسی کی۔ ”یہ اسلام آباد کے چند مہنگے ترین علاقوں میں سے ایک ہے۔ سمجھ لیں صرف پلاٹ کی مالیت ایک ارب روپے ہوگی۔“

عبداللہ کو دوبارہ جانا تھا اس لیے وہ مجھے اسٹیٹ ایجنٹ کا نمبر دے کر چلا گیا۔ مغرب کے قریب میں نے ایجنٹ کو کال کی اور عبداللہ کا حوالہ دے کر کوٹھی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا کہ وہ آٹھ بجے ہمیں راول چوک پر ملے گا۔ ابھی سات بجی نہیں بجے تھے اور یہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی اس لیے ہم آٹھ بجنے میں پندرہ منٹ پر روانہ ہوئے۔ مری روڈ کا آغاز فیض آباد سے ہی ہوتا ہے۔ یہ اسلام آباد سے ٹلی ایک چھوٹی سی آبادی ہے اور یہاں زیادہ تر کاروباری عمارتیں ہیں لیکن پیچھے عام آبادی بھی ہے۔ عبداللہ کی کوٹھی اسلام آباد کے نزدیک اسی آبادی میں تھی۔ احتیاطاً ہم نے اپنے حلیوں میں معمولی سی تبدیلیاں کی تھیں کہ اب تو یہ ہو گیا تھا کہ باہر نکلتو تو کہیں نہ کہیں دشمن یا غیر متوقع حالات ٹکرا جاتے تھے۔ کچھ ساز و سامان بھی ساتھ لے لیا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم اول چوک پر تھے۔ وسیم کا ہم نام ایجنٹ وہیں ہمارا منتظر تھا۔

ہم نے اس سے رابطہ کیا۔ وہ نئے ماڈل کی لیانا کار میں تھا ظاہر ہے جس پائے کا اسٹیٹ ایجنٹ تھا اسے کسی قسم کی گاڑی میں گھومنا چاہیے تھا۔ اس نے مجھ سے اور وسیم سے ہاتھ ملایا اور تعارف ہوا جو ہماری طرف سے

بالکل غلط تھا۔ میں شبیر نیازی تھا اور وسیم کمال خان۔ البتہ وہ وسیم احمد تھا۔ جوان آدمی تھا اور اس نے بڑا نفیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی ظاہری شخصیت کا بہت خیال رکھتا تھا۔ زبان کا تو تیز تھا ہی ورنہ اسٹیٹ اینجٹ کیوں کہلاتا۔ ”ایسا کریں میرے پیچھے آئیں۔“ وہ اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”زیادہ دور نہیں ہے۔“

لیکن اس کا یہ زیادہ دور نہیں ہے صرف دو ڈھائی کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ راول ڈیم سڑک سے ہم دائیں جانب مڑے اور کوئی ایک کلومیٹر بعد سڑک سے دائیں طرف ایک کپارا سڑک کوئی سو گز دور کھڑی تک گیا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار موجود تھا۔ ہم نے گاڑیاں باہر ہی چھوڑ دیں۔ چوکیدار پٹھان تھا اور اس نے گلابی اردو میں ہم سے سلام دعا کی۔ وہ وسیم احمد کو جانتا تھا اس لیے اس نے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ طرف نام نہاد باغ میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہاں سوائے بڑے درختوں کے اور کچھ نہیں تھا اور زمین پر گزشتہ خزاں کے سوکھے پتوں کا ڈھیر تھا۔ البتہ کٹھی صاف ستھری اور بہترین حالت میں تھی۔ بس کہیں کہیں رنگ و روغن کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کے علاوہ سب ٹھیک تھا۔

اندر داخل ہو کر وسیم احمد نے روشنیاں جلا دیں۔ اس دو منزلہ کٹھی میں نیچے ایک بیڈروم کے ساتھ ڈرائنگ اور ڈائننگ روم تھا۔ کچن اس سے ہٹ کر تھا اور دو بیڈروم کے ساتھ ایک لاونج تھا۔ گھنے درختوں میں گھری ہونے کی وجہ سے کٹھی باہر سے مشکل سے نظر آتی۔ اس لحاظ سے یہ اچھی جگہ تھی۔ وسیم احمد کٹھی دکھا رہا تھا اور خصوصیات بتا رہا تھا۔ سوئٹس ساری تھیں مگر سامان نہیں تھا ہمیں یہاں سب لانا پڑتا۔ اس کا کرایہ چوکیدار سمیت پچاس ہزار ماہانہ تھا۔ بغیر چوکیدار کے کرایہ پینتالیس ہزار ہو جاتا۔ ایک سال کا کرایہ ایڈوانس دینا پڑتا اور معاہدہ بھی ایک سال کا تھا اس لیے پہلے پانچ ماہیں خالی کرنے کو نہ کہتا اور نہ ہم چھوڑ کر جاسکتے تھے دوسری صورت میں ایڈوانس واپس نہیں ملتا۔ مجھے کٹھی پسند آئی تھی لیکن میں نے وسیم احمد سے کہا۔ ”ہم فیصلہ کر کے بتائیں گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ خوشدلی سے بولا۔

ہم واپس ہوئے اور خلاف توقع خیر خیریت سے کسی مداخلت کے بغیر واپس گھر پہنچ گئے۔ وسیم کا خیال تھا کہ کٹھی اچھی ہے لیکن ایک تو آبپاشی کے قریب ہے اور دوسرے تمام سہولیات سے آراستہ تھی۔ مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا سارا سامان لانا پڑتا۔ آس پاس آبادی دور تھی لیکن بہت دور بھی نہیں تھی اور پھر اسلام آباد اور پنڈی دونوں سے قریب تھی۔ جگہ اور کٹھی وسیم اور مجھے پسند آئی تھی لیکن جتنی فیصلے سے پہلے عبد اللہ سے مشاورت کر لینا مناسب سمجھا۔ یہ نواحی پنڈی کی طرف تھا جو اس جگہ سے زیادہ دور بھی نہ تھی اور محفوظ بھی تھی۔ دوسرے یہاں پانی، بجلی، فون اور گیس سمیت تمام سہولتیں تھیں۔ مگر ہمیں اتنی جلدی بھی نہیں تھی ابھی راوی چین لکھ رہا تھا بہت عرصے بعد سکون کی زندگی ملی تھی جس میں کوئی ٹینشن نہیں تھی اور نہ کوئی ٹانگ تھا۔ اس لیے ہم دل کھول کر آرام کر رہے تھے یا کھاتے پیتے اور ایکسر سائز کرتے تھے۔ اگلے دن ندیم کی کال آئی اس نے بتایا کہ مرشد کا وکیل کتے کی ذم کی طرح سیدھا ہو گیا ہے اور اب وہ سب کر رہا ہے جس کے لیے وہ پہلے تیار نہیں تھا۔

”اصل کتے کی دم مرشد ہے جب میں نے اس کی ذم پر پاؤں رکھا تو اس کا وکیل خود بہ خود سیدھا ہو گیا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ بتا کہ کیس کب ری فائل کر رہا ہے؟“

”دودن کا کام ہے۔ کل اتوار ہے اور پیر والے دن عدالت کھلتے ہی کیس ری فائل کی درخواست دے دیں گے۔“

”پولیس بھی ایک فریق ہے؟“ میں نے اسے یاد دلایا۔
 ”ابھی اکرم چشتی کی جگہ دوسرا انویسٹی گیشن آفیسر نہیں آیا ہے۔ اس کے ساتھ بھی براہوا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔“

”ڈی ایس پی صاحب نے اپنی بوئی فصل کاٹی ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”سنا ہے کسی نے ان کی آنکھوں اور کان میں جیکپے والا سلوشن ڈال دیا ہے۔“
 ندیم ہنسا۔ ”ساری خرابی آنکھوں میں تھی بے چارے کان بھی پلیٹ میں آ گئے۔ خیر اب ڈی ایس پی صاحب صبح شام اپنے کتے کے ساتھ ہوا خوری کے علاوہ اور کسی کام کے نہیں رہے ہیں۔“
 ”لیکن یار جب تک دوسرا انویسٹی گیشن آفیسر نہیں آئے گا معاملہ آگے کیسے بڑھے گا؟“ مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔

”اس کی فکر مت کر۔ ابھی تو دو پارٹیوں کے درمیان تصفیے کا کیس ہے پولیس بعد میں نئے شواہد کی بنیاد پر تیرے خلاف ایف آئی آر کی واپسی کی درخواست کرے گی۔“
 ”ندیم اصل اہمیت اسی کی ہے ورنہ فریقوں کے درمیان تصفیے سے مجھے رہائی نہیں ملے گی۔“
 ”یار مجھے معلوم ہے۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ”لیکن ایک کام تو ہو جانے دے اگر بعد میں مرشد مکر بھی گیا تب بھی اس حرکت کی وجہ سے اس کا کیس کمزور ہو جائے گا۔“
 ”ٹھیک ہے یار۔“ میں نے غصہ ڈی سانس لی۔

”میرا مشورہ ہے کہ اب تو منظر عام سے غائب ہو جا۔ کیونکہ یہاں رہے گا تو کہیں نہ کہیں پتکے کرتار ہے گا رار اگر پولیس کے ہاتھ آ گیا تو مجھ لے سارا کیس الٹ جائے گا۔“
 ”میں آرام سے ہی ہوں کوئی پتکا نہیں کر رہا۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔
 ”بھائی یہاں سے دفع ہو جا..... خطرہ کیوں مول لے رہا ہے۔“
 ”اچھا میں سوچوں گا۔“

”سوچوں گا نہیں سوچ اور اس پر عمل کر۔“ ندیم نے خبردار کیا۔ ”اگر مرشد ایک طرف صلح کر رہا ہے تو دوسری طرف وہ کوئی نہ کوئی سازش بھی کر رہا ہوگا۔ اس کی دھمکی رگ تیرے ہاتھ میں ہے اس لیے وہ کیس تو واپس بنے پر مجبور ہے لیکن ساتھ ہی اس کی کوشش ہوگی کہ کسی طرح تو اس کے یا پولیس کے ہاتھ آ جائے تو بازی اس کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ یہ کیس بھی کافی ہیں لیکن پولیس کی تحویل میں تیرے خلاف نئے کیس بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔“

میں نے اسے یاد دلایا۔ ”ہاں میں جان نہیں سکتا۔“
 ”شمال میں کے ٹو سے جنوب میں بحیرہ عرب تک بہت جگہیں ہیں جہاں تو اپنی منخوس شکل چھپا سکتا ہے۔“ ندیم نے کہا۔ ”دیکھ اللہ اللہ کر کے یہ موقع آیا ہے اسے ذرا سی حماقت سے مت گنوا۔“

میں ندیم کی بات سے متفق تھا کہ یہ موقع بڑی مشکل سے آیا ہے لیکن میں یہاں سے جانے والی بات سے متفق نہیں تھا۔ اگر میں یہاں سے چلا جاتا تو میدان مرشد کے لیے خالی رہ جاتا اور صرف میری ذات تو نہیں تھی اس میں دس مسئلے اور بھی تھے۔ میرے ساتھی تھے اور میرے دوسرے دشمن بھی تھے۔ نادر علی ہماری تحویل میں تھا وہ اسی کوششی کے ایک کمرے میں بند تھا جہاں اس کی دیکھ بھال ہو رہی تھی اور ہر دوسرے دن ایک ڈاکٹر اسے دیکھنے آتا تھا اس کا بندوبست عبداللہ نے کیا تھا۔ مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں اور کس کی تحویل میں ہے؟ میں نے وسیم اور عبداللہ سے ندیم کی تجویز کے بارے میں بات کی اور اپنا خیال پیش کیا۔ وسیم نے کہا۔ ”ندیم ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن آپ کا کہیں روپوش ہو جانا مسئلہ کا حل نہیں ہوگا۔ آپ کی موجودگی کی دہشت ہے جو مرشد کو تعصی پر مجبور کر رہی ہے ورنہ وہ پھر کسی شرارت پر اتر آئے گا۔“

”ہاں اس کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔“ عبداللہ نے حمایت کی۔ ”آپ باہر آنے جانے میں احتیاط کریں لیکن یہیں رہیں۔ آپ نے کوششی دیکھ لی ہے اگر پسند آگئی ہے تو آپ وہاں منتقل ہو سکتے ہیں۔“

”فی الحال تو وہاں کچھ نہیں ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”سارا سامان لے جانا پڑے گا۔ یہ بتاؤ کہ اسٹیٹ والا قابل اعتماد ہے؟“

”ہاں راجا صاحب کی جانیداد کا ایجنٹ یہی ہے۔ میرا اس سے پانچ سال سے تعلق ہے۔“

”ویسے ضروری نہیں ہے یہی کوششی لی جائے ہم اشتہار بھی دیکھ سکتے ہیں۔“

”اشتہار سے ڈر لگتا ہے کہ پھر کوئی نہ نگر جائے۔“ عبداللہ نے ہنس کر کہا۔

”ہر بار تو کوئی نہیں نگرے گا۔“ وسیم نے اسے گھورا۔ اتوار کے دن کئی اخبارات آئے تھے۔ میں اور وسیم وہ لے کر بیٹھ گئے۔ عبداللہ ایک دن پہلے پہلی کا پڑ پر جا کر راجا سے فروخت کے کاغذات پر سائن کرا آیا تھا۔ اسے آنے اور جانے میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا جب کہ سڑک کے راستے صرف جانے میں دس بارہ گھنٹے کا سفر بنتا تھا۔ خریدار کا وکیل عبداللہ کے ساتھ گیا تھا اور اس کے سامنے ساری کارروائی ہوئی تھی۔ صابر ترمذی کا اشتہار دیکھنے کے لیے عبداللہ نے تمام اخبارات لگوا لیے تھے۔ مگر ابھی تک اس کی طرف سے اشتہار نہیں آیا تھا حالانکہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ ناواقف ہونے کی وجہ سے اب تک شمالی علاقے میں مہر کی تلاش میں پھر رہا ہوگا۔ میں نے اسے ایک مہینے کی مہلت دی تھی جس میں سے پندرہ دن گزر چکے تھے اور وہ آنے والے پندرہ دنوں میں لازمی رابطہ کرتا اس کے بعد میں شاز یہ کو اس کے حوالے کر سکتا تھا۔ بہ ظاہر تو وہ ہمارے پاس یہ غمال تھی لیکن درحقیقت وہ ایک ذمے داری بن گئی تھی۔ سویرا نے ڈھکے چھپے الفاظ میں بتایا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر نے شاز یہ کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میں اور وسیم شام کے وقت ایکسر سائز سے فارغ ہو کر اخبارات کا کلاسیفائیڈ والا حصہ دیکھ رہے تھے۔ اچانک وسیم نے کہا۔ ”شہباز صاحب..... ذرا دیکھئے گا۔“

میں سمجھا وہ کوئی اشتہار دکھا رہا ہے لیکن یہ خبر تھی جو اندر کے صفحے پر تھی اور یہ صفحہ کلاسیفائیڈ کے صفحے کے ساتھ تھا اس لیے وسیم کی نظر پڑ گئی۔ نوشہرہ پولیس کو جی ٹی روڈ کے ساتھ بوری میں بند لاش ملی تھی جس کی فی الحال شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ شناخت کے لیے پولیس نے لاش کی تصویر شائع کرائی تھی۔ اس اخبار نے خبر کی اہمیت کے پیش نظر اسے اندر کے صفحے پر جگہ دی تھی۔ میں لاش کی تصویر دیکھ کر چونکا۔ اگرچہ چہرے پر زخموں کے نشانات

تھے لیکن پھر بھی صابر کا چہرہ بچپنا جا رہا تھا۔ مجھے دھچکا لگا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھ پر صابر کی ذمہ داری ختم ہوگئی تھی اور وہ آئے تو میں اس کی بیٹی اس کے حوالے کروں اور یہ خبر بتا رہی تھی کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یار یہ صابر لگ رہا ہے۔“

”میں بھی اسی وجہ سے چونکا۔“ وسیم نے کہا۔ ”اگر یہ سچ سچ صابر ہے تو اس کے قتل میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“

”لازمی بات ہے مرشد کا ہاتھ۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اسے صابر کی تلاش ہوگی اور اس کے آدمیوں نے صابر کو تلاش کر لیا ہوگا۔“

”اگر صابر مرشد کے ہاتھ لگا ہوگا تو اسے پتا چل گیا ہوگا کہ آپ نے صابر کو مہر کی تلاش میں روانہ کیا تھا۔“

”ہاں یقیناً اسے پتا چل گیا ہوگا۔“

”تب مہر بھی خطرے میں ہوگی۔“ وسیم نے کہا۔

”مرشد نہیں جانتا کہ مہر کہاں ہے؟“

”دیکھئے اگر صابر پرسوں تک زندہ تھا تو لازمی بات ہے وہ یہاں واپس آتے ہوئے مرشد کے آدمیوں کے ہاتھ لگا ہے۔ اس لحاظ سے وہ مہر کے بارے میں بھی آپ ڈیٹ ہو سکتا ہے۔ اس نے قبیلے والوں کو پکڑا ہوا اور انہوں نے صابر کو بتا دیا ہوگا کہ مہر واپس جا چکی ہے۔ اگر اس نے بھی اخبارات دیکھے ہوں گے تو کرٹل والی خبر اس کی نظروں سے بھی گزرے ہوگی اس کا مطلب ہے اسے مہر کا پتا ہوگا اور وہ مرشد کو بتا سکتا ہے۔ مرشد بریف کیس کے چکر میں اسے اٹھوالے گا۔“

وسیم کا تجربہ قابلِ غور تھا لیکن اس سے بھی زیادہ قابلِ غور بات یہ تھی کہ ہم مہر ویا کرٹل کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے سوائے نیک تمنا رکھنے کے۔ اگر ان کی تقدیر میں مرشد سے بچنا لکھا تھا تو وہ بچ جاتے ورنہ مارے جاتے۔ ویسے مجھے امید تھی کہ ہوش میں آتے ہی کرٹل اپنے اور مہر کے تحفظ کا بندوبست کر لے گا وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اور کبھی بے بس نہیں ہوتے ہیں۔ صابر کے لیے دعائے مغفرت کے بعد ہمیں شازیہ کا خیال آیا۔ میں نے کہا۔ ”سوریا کہہ رہی تھی کہ شازیہ حویلی میں رہ جائے اس کی خواہش اس طرح پوری ہوگی اب اس کا دنیا میں کوئی خونی رشتہ باقی نہیں رہا ہے۔“

”اس تک یہ خبر کیسے پہنچائی جائے؟“

”ابھی تو ضرورت نہیں ہے۔ کچھ عرصے بعد میں ماں جی یا سویرا سے کہہ دوں گا وہ خود اسے بتا دیں گے۔“

”ہاں ابھی اسے ایک صدمہ اور برداشت کرنا پڑا ہے۔“ وسیم کا اشارہ اس کے مسئلے کی طرف تھا اور یہ ہر

عورت کے لیے نہایت حساس اور نفسیاتی قسم کا مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ ابھی ذہنی لحاظ سے بکھری ہوگی اور باپ کی موت کی خبر اسے مزید بکھر سکتی تھی۔ میں نے وسیم سے کہا۔

”پولیس تک صابر ترمذی کی شناخت پہنچا دینی چاہیے۔ ورنہ وہ اسے نامعلوم قرار دے کر قفل کر دیں

گے۔“

”میں عبد اللہ سے کہتا ہوں وہ یہ کام بہتر طور پر کر لے گا۔“ وسیم نے سر ہلایا اور عبد اللہ کو کال کرنے لگا۔ اسے صابر کے بارے میں بتایا اور پھر پولیس کو انعام کرنے کو کہا۔ کچھ دیر بعد وسیم دوبارہ اصل کام کی طرف متوجہ ہوئے تھے کہ میرے موبائل کی تیل بجی۔ ندیم کی کال آ رہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو۔“

”یار میرے پاس ابھی کسی ارشاد علی کی کال آئی ہے وہ خود کو مرشد کا چچا زاد بھائی کہہ رہا ہے۔“

”ہاں مرشد کا اس نام کا ایک چچا زاد ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“

”ایک تو کہہ رہا تھا کہ مرشد ہم سے دھوکا کر رہا ہے۔ کیس ری فائل کرا کے وہ شہباز یعنی تجھے مظہر عام پر نانا چاہتا ہے، تاکہ اچانک تیرا ہوتا صاف کر دے، میں نے کہا بس اللہ خادم کیا کر سکتا ہے اس سلسلے میں.....؟“

”ٹو بیک رہا ہے۔“ میں نے اسے ٹوکا۔

”بس یار تجھ سے چھٹکارے کا سن کر جذباتی ہو گیا تھا۔ پر اپنے ایسے نصیب کہاں..... بہر حال دوسری بات اس نے یہ کہ وہ تجھے بات کرنا چاہتا ہے۔“

”تو نے میرا نمبر دے دیا؟“

”یار میں شوہر ہوں گھماڑ نہیں ہوں۔“ ندیم نے ہنسا کر کہا۔ ”میں نے کہا کہ سرکار شہباز تو عرصے سے مرشد کے سیٹگوں کی طرح غائب ہے پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ آپ اپنا نمبر دے دیں اگر شہباز نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں اسے نمبر دے دوں گا۔“

”اس نے دے دیا؟“

”ہاں نوٹ کر لے مگر فوراً رابطہ مت کرنا ورنہ وہ سمجھ جائے گا کہ میں تجھ سے مستقل رابطے میں ہوں۔“

”تیرا مطلب ہے اس کے پیچھے مرشد بھی ہو سکتا ہے؟“

”بالکل..... وہ اس کا حریف ہے تو کیا ہوا۔ وہ تجھے گدی کا دشمن بھی بنا سکتا ہے اس صورت میں ارشاد اس کی مدد پر راضی ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے دیکھتے ہیں اسے بھی..... ٹوکل کیس ری فائل کر رہا ہے؟“

”ہاں صبح پہلا کام یہی کرتا ہے۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں کیا صورت حال بنتی ہے اور ہاں اگر مچشتی کا جان نشین آ گیا ہے۔ کوئی ڈی ایس پی شیر شاہ ہے۔“

”یہ تو کراچی کی کھاڑی مارکیٹ کا نام ہے۔“ میں ہنسا۔ ”کچھ پتا ہے کس قسم کا آدمی ہے؟“

”یار تیرے کیس کے لیے جو جی آئے گا وہ مرشد کا آدمی ہی ہوگا۔ اس سے خبر کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے مگر میں معلوم کرتا ہوں اب ہر کوئی اکرم چشتی جتنا حرامی تو نہیں ہوتا ہے۔“

”مرشد کا آدمی تو ہوگا لیکن اپنے پیشرو کا حال دیکھ کر عبرت ضرور پکڑے گا۔“

”یار انسانوں کو میرے پیغمبر اور اولیا ٹھیک نہ کر سکے تیری میری اوقات کیا ہے۔“ ندیم نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وسیم غور سے سن رہا تھا اور اس نے میری گفتگو سے اندازہ کر لیا تھا کہ ندیم نے کیا کہا ہے۔ پھر بھی میں نے اسے ندیم کی بات تفصیل سے بتائی۔ وسیم نے کہا۔

”اس کا امکان ہے کہ یہ مرشد کی چال ہو۔ مرشد کا حریف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہمارا حلیف بن سکتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ ارشاد علی سچ سچ مرشد کے خلاف ہماری مدد چاہتا ہو ہمیں اس معاملے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔“

”اگر وہ ہماری مدد بھی چاہتا ہے تو اس کے اپنے مقاصد ہوں گے اور وہ انہیں حاصل کرنے میں ناکام رہا تو پھر وہ بھی ہمارے دشمنوں کی صف میں شامل ہوگا۔“ ویم نے خبردار کیا۔ ”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ مرشد سے کم خبیث اور سفاک نہیں ہے۔“

”ابھی اسے ایک طرف رکھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”پہلے کیس والے کو دیکھتے ہیں کہ مرشد کوئی چکر تو نہیں چلا رہا ہے اس کے بعد ارشاد علی سے بات کر کے بھی دیکھ لیں گے۔“

”یہ دیکھیں۔“ ویم نے ایک اشتہار میری طرف بڑھا دیا۔ ”پنڈی کے نواحی علاقے اسلام آباد ایکسپریس وے کے ساتھ ایک مکان بک رہا ہے۔ مین روڈ کے پاس ہے اور آس پاس کھیت ہیں۔“

اشتہار کے مطابق مایک کنال کے اس ایک منزلہ مکان میں چھ کمرے تھے۔ پانی بجلی اور گیس کی سہولت کے ساتھ تھا اور عین سڑک پر واقع تھا۔ قیمت چالیس لاکھ تھی لیکن کرائے پر بھی مل سکتا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک لگ رہا ہے اسے بھی نوٹ کر لو۔ میرا خیال میں اسی طرف دیکھا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔“

”یہ ایک نئی گالا میں بھی بنگلہ ہے۔“ ویم نے ایک اور اشتہار دکھایا۔

”تم آج ان کے مالکوں سے بات کر لو ہم کل چل کر دیکھ لیتے ہیں۔“

”میں میں خود دیکھ لوں گا۔“ ویم نے انکار کیا۔ ”دن میں آپ کا باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”بھائی میں گھر میں قید ہو کر نہیں بیٹھ سکتا۔“

”میرے خیال میں ندیم کا خدشہ درست ہے مرشد کے آدمی آپ کو شہدہ سے تلاش کر رہے ہوں گے اور آپ ان کے ہاتھ آگئے تو سارا کیس خراب ہو جائے گا اس بار مرشد آپ کو پولیس کی تحویل میں دے دے گا اور جیل کے اندر آپ کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے میری بلکہ ہم سب کی درخواست ہے کہ آپ کم سے کم باہر نکلیں اور دن میں نکلنے سے قطعی گریز کریں۔“

عبداللہ آنے والے دونوں تک کوٹھی کی فروخت کی آخری کارروائی میں مصروف رہا حتیٰ کہ قیمت راجا عمر دراز کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو گئی۔ اس دوران میں ویم نے ان تینوں جگہوں کو دیکھا۔ ویم احمد کی دکھائی کوٹھی پہلے ہی منتخب کر لی تھی۔ اس کے علاوہ ویم نے اسلام آباد ایکسپریس وے والا مکان بھی کرائے پر حاصل کر لیا۔ یہ کوئی دس بارہ کلو میٹر دور تھا اور اس کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی اور نہ ہی کھیت تھے۔ صرف جنگل تھا جس میں مقامی چرواہے اپنے جانور چرانے آتے تھے۔ مکان پرانا اور ایک ٹیلے پر بنا ہوا تھا اور بہت کم کرائے پر مل گیا تھا۔ ویم نے اس سے چھ مہینے کا معاہدہ کیا تھا اور کرایہ پیشگی دے دیا تھا۔ راول ڈیم روڈ والی کوٹھی کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ اس میں نہیں، مانی اور چند دوسرے لوگ رہیں گے۔ جب کہ دہلی مکان میں ویم اپنے آدمیوں کے ساتھ ڈیرہ جمائے گا۔ مکانات کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد اس نے ایاز اور اپنے آدمیوں کو بلوایا تھا اور ان کی

مدد سے دونوں مکانوں کو ضرورت کے مطابق فرنس کرایا اور سامان پہنچایا۔ ایاز بہت دنوں بعد ملا تھا اس لیے پُر جوش تھا۔ اس نے شرماتے ہوئے اطلاع دی۔

”اللہ نے خوش خبری دی ہے جی.....“

”لو بھئی یہ بھی لگ گیا کام سے۔“ وسیم نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ایک ہم ہیں فراق کے دن کاٹ رہے ہیں۔“

”جب ساتھ تھے تب بھی کون سا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔“ ایاز نے سادگی سے کہا تو وسیم کھیا گیا۔ میں اور عبد اللہ ہنس دیئے تھے۔

”تب تمہیں شاہین کے پاس بی رہنا چاہیے تھا۔“ میں نے ایاز سے کہا۔ ”بلکہ ایسا کرو یہاں کے کام نمٹا کرو اب اس چلے جاؤ۔“

”نہیں جناب..... خواتین میں رہ کر میں خود بھی خاتون ہوتا جا رہا تھا۔ ہانڈی چولہا بھی کرنے لگا تھا اس لیے مہربانی کر کے یہیں رہنے دیں۔ میں ہفتہ دس دن میں چکر لگا رہا ہوں گا۔“

”ہاں ایاز کی ضرورت ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”ہم نے گاڑیاں بدلنی ہے۔ یہ کام ایاز کرے گا لیکن پہلے مکانوں کا معاملہ منٹ جائے۔“

”میرے لیے راوی ان دنوں چین لکھ رہا ہے۔“ میں نے سر آہ بھری۔ ”میرا خیال ہے وہی مکان چلا جاتا ہوں۔ وہاں ذرا مصروفیت رہے گی۔ یہاں تو کہنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔“

”وہاں بھی سب ہو گیا ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”لیکن آپ چیخ چاہتے ہیں تو آج شام چلیں۔“

”مانی اور بیٹو کا کیا پروگرام ہے؟“

”فی الحال ان کا خواتین میں دل لگ گیا ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”بلکہ مانی کا کچھ زیادہ ہی لگ گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”سعدیہ کہہ رہی تھی کہ وہ شازیہ کی دل جوئی میں لگا رہتا ہے۔ آج کل اسے کمپیوٹر سکھا رہا ہے۔“

”اس بہانے کچھ اور سکھا رہا ہے۔“ عبد اللہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”اب رہ گئے بیٹو اور عبد اللہ..... تو اللہ ان کا بھی بندوبست کرے گا۔“ وسیم نے کہا۔ ”امید ہے اس کے لیے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ کیونکہ مظلوم خواتین کا ٹھیکا ہمیں ملا ہوا ہے۔“

”مجھے تو معاف رکھیں۔“ عبد اللہ نے کہا۔ ”میرے ماں باپ اللہ رکھے موجود ہیں۔ وہی فیصلہ کریں گے۔“

”دیکھا ایسے ہوتے ہیں سعادت مند بیٹے۔“ وسیم ہنسا۔

”تم نے کبھی اپنے گھر والوں کے بارے میں نہیں بتایا؟“ میں نے عبد اللہ سے پوچھا تو اس نے سادگی سے کہا۔

”آپ لوگوں نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔“

”میں شرمندہ ہو گیا۔“ سوری یا واقعی ہم نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔“

”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ عبداللہ نے جلدی سے کہا۔ ”ہمیں فرصت سے بیٹھنے کا موقع کب ملا اور یہ سب فرصت کی باتیں ہیں۔“

”تو آج فرصت ہی فرصت ہے اس لیے ہم تمہارے گھر والوں کے بارے میں جاننا چاہیں گے۔“ عبداللہ کا تعلق ایک کشمیری خاندان سے تھا۔ آزادی کے وقت وہ جموں سے لٹ پٹ کر یہاں آئے تھے اور آزاد کشمیر میں آباد ہوئے تھے۔ عبداللہ کے چار بھائی اور اتنی ہی بہنیں تھیں۔ وہ سب سے چھوٹا تھا اس لیے سب سے لاڈلاتھا۔ گریجویشن کے بعد وہ ملازمت کے لیے یہاں آگیا اور اتفاق سے اسے پہلی ملازمت ہی راجا عمر دراز کے پاس مل گئی۔ اس وقت وہ نائب منظم تھا پھر اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے سیکرٹری بیک نے اسے یہاں کے تمام امور کا نگران بنادیا۔ تمام بہن بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی اور اب اس کا نمبر تھا لیکن فی الحال وہ شادی سے انکار کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”وجہ؟“

عبداللہ مسکرایا۔ ”والد اور والدہ دونوں کی خواہش تھی کہ میں ان کے خاندان میں شادی کروں لیکن میں ان دونوں لڑکیوں سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ جنہیں انہوں نے پسند کیا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی کی شادی ہو چکی ہے اور دوسری بیٹھی ہے میں انتظار کر رہا ہوں کہ اس کی بھی ہو تو میں شادی کے لیے ہاں کروں۔“

وسیم ہنسا۔ ”یہ تو کوئی نسوانی افسانہ لگ رہا ہے۔“

”ہاں کیونکہ اس میں کئی خواتین ملوث ہیں۔“ عبداللہ نے جواب دیا۔ پھر اس نے موضوع بدل دیا۔ ”سنا ہے مرشد کا کوئی چچا زاد پیدا ہو گیا ہے جو اس کے خلاف ہم سے ملنا چاہتا ہے۔“

”ہاں لیکن اس کا امکان بھی ہے کہ یہ مرشد کی کوئی چال ہو اس لیے فی الحال اس معاملے میں خاموش رہنے کا سوچا ہے۔ ویسے تمہاری کیا رائے ہے؟“

”وہی جو آپ کی ہے۔ مرشد کے خاندان کا کوئی فرد اس سے کم نہیں ہوگا۔ ان میں سے کسی سے تعلق بہت سوچ سمجھ کر رکھنا ہوگا۔“

”ارشاد کے بارے میں وسیم کی رپورٹ ہے کہ وہ کسی طرح مرشد سے کم نہیں ہے فرق صرف اتنا ہے کہ گدی اور سجادہ نشینی کی قوت مرشد کے پاس ہے اس لیے وہ سب پر حادی ہے لیکن ارشاد اور اس کے تین بھائی بڑی قوت ہیں ان کے مقابلے میں مرشد اکیلا ہے۔ نادرنا کارہ ہو چکا ہے اور خود مرشد کے لیے جو بھج بن گیا ہے۔ اس صورت میں اگر مرشد نہیں رہتا تو گدی خود بہ خود اس کے چچا زاد بھائیوں کو منتقل ہو جائے گی۔“

”اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ گدی کی منتقلی کا ہم پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس کا امکان بھی ہے کہ گدی کے ساتھ دشمنی بھی منتقل ہو جائے اور ارشاد برادرز ہمارے خلاف جنگ کا پرچم سنبھال لیں۔“ وسیم نے کہا۔

”بالکل مرشد کی دشمنی ہونے کے باوجود ارشاد برادرز اگر اسے راستے سے ہٹائیں گے تو اسے عوام الناس اور خاص طور سے مریدوں پر ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ مرشد کی موت کو حادثاتی یا جنوں سے جنگ کے دوران شہادت بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد اس کا بھی مزار شریف بنادیا جائے گا۔ اس صورت میں ارشاد برادرز ہم سے جنگ کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ان کے پیچھے مرشد کے اہل خانہ اور مریدوں کا دباؤ آجائے گا۔ زیادہ

امکان اسی بات کا ہے۔“

”اس لیے مرشد کو راستے سے ہٹانے سے بہتر ہے کہ اس سے صلح کی کوشش کی جائے اور موجودہ حالات میں یہ ناممکن نہیں لگ رہا ہے۔“ عبداللہ نے میرے تجویز پر غور کرتے ہوئے کہا۔

”ہم اس کی کوشش ہی کر رہے ہیں ورنہ مرشد ایک آدمی ہے جو ایک گولی سے مر سکتا ہے۔“ وسیم نے کہا۔

”اس کی موت یا زندگی کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا۔“

”نادر کا کیا کرنا ہے۔“ عبداللہ نے پوچھا۔ ”کیا اس پر انجکشن آزما جائے؟“

”ابھی نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ کام اس وقت کیا جائے گا جب ہم اسے مرشد کے حوالے کرنے والے ہوں گے۔ اس سے پہلے عین ممکن ہے ہمیں نادر کی کہیں ضرورت پڑ جائے۔“

”ہم اس سے ممکنہ حد تک معلومات حاصل کر چکے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”اس کی گفتگو ریکارڈ شکل میں موجود ہے۔“

”پھر بھی کبھی مرشد کو تصدیق کرانی پڑے کہ نادر ہمارے پاس ہے اس لیے اس کا ہوش حواس میں رہنا ضروری ہے۔“

میری اس دلیل سے وہ قائل ہو گئے ورنہ عبداللہ اور وسیم دونوں کا خیال تھا کہ نادر پر انجکشن آزما لیا جائے۔ ندیم نے مرشد کے وکیل کے ساتھ مل کر میرے کیسز ری فائل کر دیئے تھے اور پولیس یا سرکاری وکیل نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ندیم کا کہنا تھا کہ معاملہ تسلی بخش جا رہا تھا۔ اس کی شیر شاہ سے ملاقات ہوئی تھی اور شیر شاہ کا کہنا تھا کہ پولیس کی جانب سے نئے شواہد کی روشنی میں مجھے بے گناہ دینے کی درخواست میں کچھ وقت لگے گا کیونکہ اکرم چشتی نے آف دی ریکارڈ میرا نام لیا تھا کہ اس کے ساتھ ہونے والی کارروائی کا ذمے دار میں تھا اگرچہ آن دی ریکارڈ اسے ڈاکوؤں کی کارروائی قرار دیا گیا تھا۔ ندیم کا کہنا تھا کہ اگر مرشد ٹھیک طرح سے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے تو یہ معاملہ ایک ہفتے میں منٹ سکتا تھا۔ میں نے ایک دن پہلے مرشد سے بات کی تھی اور اسے خبردار کیا تھا کہ وہ پولیس کے معاملے میں اپنے اثر و رسوخ کو استعمال نہیں کر رہا ہے تاخیر سے اسے نقصان ہو گا۔ مرشد نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ جلد پولیس حکام کو کیس واپس لینے پر مجبور کر دے گا۔

”شہباز تم نہیں جانتے کہ مجھے کتنی شدت سے نادر درکار ہے۔ میرے مریدوں میں ایسی افواہیں بھی پھیلانی جا رہی ہیں کہ میں نے نادر کو مار کر کہیں دفن دیا ہے۔ اس سے میری ساکھ کو کتنا نقصان ہو رہا ہے۔“

”ویسے تمہاری خواہش تو یہی ہوگی کہ اب اس کے بیکار وجود سے جان چھڑالی جائے۔“ میں نے طنز کیا تو مرشد ناموش ہو گیا تھا۔ شاید میں نے سچ کہہ دیا تھا۔ مرشد نے کچھ دیر بعد التجا کی۔

”شہباز میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ تمہارے کیس ختم ہو جائیں گے اور میں ہر ضمانت دینے کو تیار ہوں کہ تم سے دشمنی بھی ختم کر دوں گا۔“

”یعنی ابھی تم نے دشمنی ختم نہیں کی ہے؟“

اس نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں میرا مطلب ہے کہ میں پھر سے کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے دشمنی کا نئے سرے سے آغاز ہو جائے۔ تم نادر کو میرے حوالے کر دو۔“

”میں بتا چکا ہوں جس دن عدالت نے مجھ پر قائم کیس ختم کر کے مجھے رہا کر دیا اسی دن میں نادر کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

”لیکن اس میں تو بہت دن لگ.....“

”مرشد علی تمہارے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتی ہیں۔ دیر لگتی ہے عام آدمی کے لیے، عام طور سے انصاف ملنے سے پہلے اس کی عمر ختم ہو جاتی ہے۔ تم عام آدمی نہیں ہو اس لیے انصاف تمہارے لیے جلد ہو سکتا ہے بشرطیکہ تم ایسا چاہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ انتظامیہ اور عدلیہ کے کام کرنے کی رفتار میں کیسے تیزی لائی جاتی ہے۔ تم چاہو تو یہ معاملہ مینے سے بھی پہلے منٹ سکتا ہے۔“

”ایسا بہت مشکل ہے۔“

”پھر وہی بات، مشکل عام آدمی کے لیے ہوتی ہے تم جیسے لوگوں کی مشکلات تو خود آسان ہو جاتی ہیں۔ بہر حال اب یہ تم پر ہے کہ تم نادر کو کتنی جلدی حاصل کر لیتے ہو۔ ویسے میں تمہیں بتا دوں اب اس میں کچھ نہیں رہ گیا ہے وہ جسمانی طور پر ٹھیک ہے لیکن اندر سے مر گیا ہے اور جب آدمی اندر سے مر جائے تو باہر سے بھی وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہتا ہے۔ ممکن ہے نادر خود تمہاری مشکل آسان کر دے اور تمہیں برادر کشی کے داغ سے بچالے مگر اس کے لیے تمہیں جو کرنا ہے بہت جلد کرنا ہے۔ اگر وہ ہمارے پاس مر گیا تو یقیناً تمہاری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔“

”میں پوری کوشش کروں گا۔“

میں نے مرشد سے جو کہا تھا اس میں مبالغہ نہیں تھا۔ نادر ہماری قید میں بہت خاموش اور مرجھایا ہوا ہو گیا تھا۔ حالانکہ ہم اس کے علاج اور خوراک کا پورا خیال رکھتے تھے۔ مگر وہ برائے نام کھاتا تھا اور اس کی صحت مستقل گر رہی تھی۔ وسیم نے مجھے خبردار کیا تھا کہ اگر معاملہ جلد نہ منسایا گیا تو اس کا بھی امکان ہے کہ نادر ڈھے جائے۔ وہ یا تو بیمار پڑ جائے یا براہ راست انتقال کر جائے گا۔ دونوں صورتوں میں ہم اس سے متوقع فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ میری ہدایت پر وسیم ڈاکٹر سے اسے ایکسٹرا سٹیلی منٹ دلوانے لگا تھا تا کہ اس کی اندر کی توانائی بحال رہے۔ میں نے ایک دو بار سوتے میں اس کا معائنہ کیا تھا وہ سچ سچ بہت کمزور اور صورت سے مظلوم دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی فرعون صفت آدمی تھا جو تکبر میں نعوذ باللہ خود کو خدا سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اب بستر علالت پر بے بسی و بے چارگی کی تصویر بنالینا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کی تصویر لوں اور اس کیپشن کے ساتھ کسی اخبار میں شائع کراؤں۔ ”یہ شخص جو کبھی فرعون تھا۔“ میں شاید ایسا نہ کرتا لیکن میں نے اس کی کئی تصاویر لے لی تھیں۔

میں احتیاط کر رہا تھا اتنے دن سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ اپنے حلیے میں تبدیلی کے لیے سر کے چھوٹے بالوں کے ساتھ میں نے فرنج کٹ رکھی تھی اور اس سے اوپر شیوا ایک دو دن بڑھا کر رکھتا تھا اس سے میرے رنگ میں سیاہی مائل تاثر آتا تھا۔ نسبتاً گہرے رنگ کے فریم کی عینک لگا کر میرا تاثر خاصا مختلف آ رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ رات کے وقت اس حلیے میں کوئی بالکل پاس سے ہی مجھے شناخت کر سکے تو کر سکے ورنہ دور سے اور سرسری نظروں سے شناخت کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ یعنی اگر کوئی بیڈلک نہ ہو تو میں محفوظ ہی تھا۔ میرے ذہن میں ندیم کی وارننگ

تھی اس کے بعد میں زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ کسی بھی بد احتیاطی کے نتیجے میں میرا کیس بگڑ جاتا اور میرے ساتھیوں کی کوششوں پر پانی پھر جاتا۔ شام کے وقت میں اور وسم نکلے۔

ایاز پہلے ہی جا چکا تھا۔ اب اسے گاڑیوں کا کام کرنا تھا۔ وسم کا خیال تھا کہ وہ حویلی سے جو گاڑیاں لائے تھے اب انہیں ٹھکانے لگا دینا چاہیے اور ان کی جگہ دوسری گاڑیاں لے لینی چاہئیں۔ کیونٹیکیشن دین مل گئی تھی۔ گزشتہ دن ہی وسم نے اسے دیہی مکان میں شفٹ کیا تھا اس کا سارا سامان نکال لیا تھا جواب اس میں دوبارہ فٹ کرنا تھا۔ اب اس پر ہلکا سرمی رنگ کر دیا گیا تھا جودن میں واضح نظر آتا لیکن رات کو یہی رنگ سیاہ ہو جاتا اس سے دیکھنے والوں کو کنفیوز کیا جاسکتا تھا۔ وسم نے اپنے سارے آدمیوں کو بلانے کے بجائے ان دس افراد کو بلایا تھا جو عرصے سے اس کے ساتھ تھے اور جن پر اسے پورا اعتماد ہو گیا تھا۔ ان میں سے چھ سات دیہی مکان میں رہتے اور وہ ایک طرح حویلی کا متبادل بن جاتا۔ تین چار کٹھی میں رہتے۔ اسلحہ اور تمام خاص چیزیں دیہی مکان میں رکھی جاتیں اور کٹھی میں صرف ضرورت کی اشیاء اور مانی کا سیٹ آپ کام کرتا۔ اس کی وجہ سے ہمیں بہت آسانی ہو گئی تھی۔ خاص طور سے الیکٹرانک سیکورٹی اور انٹرنیٹ کے استعمال میں۔

ہم دیہی مکان پہنچے عبداللہ کی کٹھی سے یہ جگہ تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھی اس لحاظ سے یہ حویلی سے بہت بہتر تھی جہاں آنے جانے میں گھنٹے سے کم نہیں لگتا تھا۔ علاقہ ویران تھا اور آس پاس کچھ نہیں تھا۔ زمین کیونکہ شملات کی تھی اس لیے اس پر درخت اور بھاڑیاں تھیں اور کھیت بھی نہیں تھے۔ بلند جگہ ہونے کی وجہ سے مکان سے آس پاس کا منظر خاصی دور تک صاف دکھائی دیتا تھا۔ رات ہونے کی وجہ سے یہ منظر واضح نہیں تھا۔ یہاں بجلی تھی مگر کس نہیں تھی۔ پانی کے لیے صحن میں بورنگ کر کے موثر فٹ کی ہوئی تھی۔ مکان میں چھ بڑے پختہ کمرے تھے۔ جو ایل کی صورت میں بنے ہوئے تھے۔ اس ایل کے سامنے سینٹ کی شیٹوں سے برآمدہ بنا ہوا تھا۔ ایک طرف لائن سے کچن، بڑا سا باتھ روم اور لیٹرین بنے ہوئے تھے۔ تینوں بہت اچھے اور ٹائلز سے آراستہ تھے۔ کچن میں ایل پی جی سلینڈر لگا ہوا تھا۔ مکان تعمیر کے لحاظ سے دیہاتی تھا لیکن صاف ستھرا اور رہائش کے لیے بہترین تھا۔

وسم نے یہاں حویلی والا سیٹ آپ کیا تھا۔ تین کمروں میں فرش پر ڈیزائنڈ رلے کے ساتھ قالین بچھا لیے تھے اور چوتھے کمرے کو اسلحے، سامان اور کنٹرول روم کے طور پر منتخب کیا تھا۔ دو کمرے خالی تھے ان کا مصروف بعد میں تلاش کیا جاسکتا تھا۔ فی الحال ان کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں نگرانی کرنے والے آلات نہیں تھے۔ مانی آتا تو وہی آلات حاصل کرتا اور پھر انہیں لگاتا۔ صحن بہت بڑا تھا اور یہاں جہازی ساز کی تین چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جن پر پوری بارات آرام کر سکتی تھی۔ پینٹل اور نیم کے کئی بڑے درخت تھے جن کے تلے چار پائیوں پڑی تھیں۔ کیونکہ اب دن میں دھوپ قابل برداشت نہیں رہی تھی۔ گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے بہت جگہ تھی۔ وسم کے سارے آدمی ابھی یہیں تھے۔ کٹھی میں کوئی نہیں تھا اسے مانی اور بیٹو کے آنے کے بعد دیکھا جاتا ویسے خاصا سامان وہاں بھی پہنچایا گیا تھا۔ وسم کے آدمیوں میں سے کچھ رات کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہمارے آنے سے ذرا پہلے ایاز دو گاڑیاں لے کر چلا گیا تھا۔ وہ ان کا سودا کر کے اور دوسری دو گاڑیاں لے کر ہی واپس آتا۔ اب وسم کے پاس صرف ایک کار تھی۔ ایاز کی جیب بھی اس نے فروخت کر دی تھی کیونکہ وہ بھی کئی بار نظروں

میں آچکی تھی۔ حالانکہ اسے اپنی جیب بہت پیاری تھی اور اس نے اسے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔
 کھلی جگہ ہونے کی وجہ سے یہاں موسم خوشگوار تھا۔ رات کا کھانا کھا کر ہم چار پائیوں پر آ لیے۔ رات کے لیے وسیم نے دو آدمیوں کی ذیوٹی لگا دی تھی۔ یعنی رات بھر دو افراد جاگ کر پہرہ دیتے۔ مکان کے گرد چار دیواری تھی لیکن یہ سات فٹ بلند تھی۔ وسیم نے باہر سے جائزہ لیا تو کئی جگہوں پر دیوار کے ساتھ پتھر مٹی جمع ہونے سے اس کی اونچائی پانچ فٹ رہ گئی۔ دن میں وسیم نے ان تمام جگہوں کو صاف کرایا تھا اور دیوار سے ملہ ہٹوا دیا تھا مگر دائیں طرف ابھی بھی خاصا ملہ پڑا ہوا تھا۔ دوسرے مرحلے میں دیواروں پر خار دار بازو لگائی جاتی۔ کمروں پر چھت تھی لیکن اوپر جانے کے لیے پختہ سیڑھی نہیں تھی۔ مگر بانس کی ایک سیڑھی تھی جس سے چھت پر چڑھا جاسکتا تھا۔ رات کو کسی قدر ٹھنڈ ہوئی تو ہم اٹھ کر اندر آ گئے۔ میں اور وسیم ایک کمرے میں سوئے تھے۔ اس کے آدی دوسرے کمروں میں تھے۔ کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لیے ہم مستقبل کی پلاننگ کرتے رہے۔ بارہ کے بعد مجھے نیند آ گئی تھی۔ رات کسی وقت مجھے نیند میں لگا جیسے کوئی گڑبڑ ہے۔ میری آنکھ کھل گئی تھی باہر کچھ بھاگ دوڑ ہو رہی تھی اور وسیم اپنی جگہ نہیں تھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ میں اٹھ کر دروازے تک آیا۔ کچھ لوگ مین گیٹ کے ساتھ موجود تھے۔

”کیا ہوا ہے؟“ میں نے برآمدے کی طرف آنے والے کو روکا۔
 ”جناب مکان کے باہر کچھ پراسرار نقل و حرکت ہو رہی ہے۔“ اس نے سلیس زبان میں جواب دیا۔
 ”کمانڈر نے سب کو الارٹ کر دیا ہے۔“

وسیم کے دو آدمی سیڑھی لگا کر چھت پر چلے گئے ان کے پاس ٹائٹ ویڈیو دوربین اور ٹیکنیکس تھیں۔ وسیم خود گیٹ کے پاس موجود تھا۔ میں اس کے پاس آیا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“
 ”باہر سڑک پر دو گاڑیاں ہیں اور ان سے کچھ لوگ اتر کر مکان کے چاروں طرف پھیل رہے ہیں۔“ وسیم نے دھیمی آواز میں بتایا۔ ”ان کی تعداد کم سے کم آٹھ ہے۔“
 ”مسئلہ ہیں؟“

”ابھی کچھ صحیح سے نہیں معلوم، اوپر والے رپورٹ دیں گے تو اس سے پوزیشن واضح ہوگی۔“
 ”تم ایسا کرو کچھ اسلحہ نکال کر اوپر لے آؤ۔ کوئی دور مار ہتھیار ہو تو بہتر ہے۔“ میں نے سیڑھی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ چھت اوپر سے سطح تھی اور کوئی کھڑا ہوتا تو دور سے صاف دکھائی دیتا۔ معمولی سی چار دیواری بھی نہیں تھی۔ وسیم کے دونوں آدمی دو الگ سمتوں میں رخ کیے لیٹے ہوئے تھے۔ میں بھی چھت پر آتے ہی لیٹ گیا جس طرح ہمارے پاس رات کو دیکھنے والے آلات تھے اس طرح آنے والوں کے پاس ان کی موجودگی عین ممکن تھا۔ میں ریٹکتا ہوا ایک آدمی کے پاس پہنچا اور سرگوشی میں پوچھا۔ ”کیا رپورٹ ہے؟“
 ”اس طرف تین آدمی ہیں جناب۔“ اس نے جوابی سرگوشی میں کہا اور اپنی ٹائٹ ویڈیو عینک اتار کر میری طرف بڑھادی۔ ”اسی طرف دیکھیں۔“

میں نے عینک لگا کر اس کی بتائی ہوئی سمت دیکھا تو مکان سے کوئی ڈیڑھ سو فٹ کے فاصلے پر تین افراد تقریباً ساتھ ساتھ دکھائی دیئے وہ دبے قدموں مکان کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان کے ہاتھوں کی پوزیشن سے

اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے اسلحہ اٹھا رکھا تھا یعنی ہاتھوں کا انداز رائفل بدست تھا۔ یہ مکان کا دائیں طرف والا حصہ تھا۔ دوسرے آدمی کے مطابق عقبی سمت بھی دو افراد موجود تھے لیکن وہ فاصلے پر رکے ہوئے تھے اور مکان کی طرف آنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ بائیں طرف دیوار کے ساتھ چھوٹی سے کھائی تھی اور اس طرف سے کسی کا اندازہ نہایت مشکل تھا۔ سب سے آسان دائیں طرف والی دیوار تھی۔ سامنے سے آنا آسان تھا لیکن کوئی بے خبری میں مشکل سے اندر گھس سکتا تھا۔ اس لیے آنے والوں نے آسان ترین راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ کمروں کے پیچھے موجود دیوار تھی اس پر چڑھ کر وہ آسانی سے اندر کود سکتے تھے۔ وسم نے آہستہ سے کہا۔

”کیا خیال ہے یہ دشمن ہیں؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتے۔“ میں نے جوابی سرگوشی کی۔ ”ویسے یہ جس طرح آرہے ہیں ایسا لگ رہا ہے جیسے ان کو معلوم ہے کہ مکان کے اندر آنے کا آسان راستہ کس طرف سے ہے۔“

وسم نے غور کیا اور بولا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ اور کسی طرف سے پیش قدمی نہیں کر رہے ہیں صرف اسی طرف سے آرہے ہیں۔“

وسم ریڈیو لے آیا تھا اور اب اپنے آدمیوں سے رابطے میں تھا۔ وہ اسے آنے والوں کی پوزیشن سے آگاہ کر رہے تھے۔ ”سوال یہ ہے کہ اگر یہ دشمن نہیں ہیں تو اس طرح خاموشی سے آکر گھیرا ڈالنے اور ان تین افراد کو مکان کی طرف پیش قدمی کا کیا مقصد ہے؟“

”یہ تینوں آنے والے بتائیں گے۔“ وسم نے کہا اور اپنے آدمیوں کو ہدایت دینے لگا کہ آنے والوں استقبال کیسے کرنا ہے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ شور مٹا کر بغیر یہ کام کرے تاکہ باہر والوں کو خبر نہ ہو۔ اگر دوران میں آنے والے دیوار تک پہنچ گئے تھے اس لیے ہم کنارے سے پیچھے سرک گئے ورنہ ہمارے سروں سے ہول دیکھ سکتے تھے۔ صحن میں روشنی تھی اور اس کا انعکاس یہاں تک آرہا تھا۔ وسم کے آدمیوں نے اندر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ آنے والوں میں سے ایک دیوار پر چڑھا اور اندر جھانکا جب اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا وہ اندر اتر آیا۔ اس معاملے میں اس کی مہارت قابل تعریف تھی کہ اس کے آنے کی ذرا بھی آہٹ نہیں ہوئی تھی اگر پہلے سے ہوشیار نہ ہوتے تو پتا بھی نہیں چلتا کہ دشمن ہمارے درمیان آگیا ہے۔ وہ کمروں کی عقبی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا صحن کی طرف آیا اور ہمیں وسم کا ایک آدمی اس کا منتظر تھا۔ اس نے صفائی سے اس آدمی کے سر پر کوئی بھاری اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ وہ اسے کھینچ کر صحن میں لے گیا۔ اس دوران میں دوسرا دیوار پر چڑھ رہا تھا۔ وہ یہ اتر کر دوسری طرف گیا اور وسم کے دوسرے آدمی کے ہتھے چڑھ گیا۔ اب تیسرا باہر موجود تھا اور اس کے اندازہ لگ رہا تھا کہ اس کا اندر آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ شاید صرف مدد کے لیے موجود تھا۔

آٹھ میں سے تین افراد اس طرف تھے اور دو عقب میں تھے جب کہ تین سامنے تھے۔ پکڑے جا۔ والے دونوں افراد مسلح نکلے تھے۔ پستول دونوں کے پاس تھا جب کہ ایک پاس چھوٹی لیکن جدید ترین رائفل تھی۔ وسم نے پیچھے ہٹ کر اپنے آدمیوں کو تیسرے کے لیے ہدایت دیں اور اس کے نتیجے میں وسم کے دو آدمی دیوار تک گئے اور ایک نے اوپر چڑھ کر باہر موجود تیسرے فرد کو ہاتھ خفیف سی ”شش“ کر کے متوجہ کیا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔ وہ دہلی آواز میں بولا۔ ”اجمق میں اندر نہیں آسکتا، سردار نے منع کیا۔“

مگر وسم کا آدمی سردار کا نافرمان بنا اسے اشارہ کرتا رہا۔ مجبور ہو کر وہ دیوار کے پاس آیا اور جیسے ہی ذرا اوپر چڑھا وسم کے آدمی نے اس کے سر پر کچھ مارا اور اس سے پہلے کہ وہ واپس نیچے جاتا، اسے پکڑ لیا اور پھر دوسرے کی مدد سے اسے بھی اندر کھینچ لیا۔ اب تین آدمی ہمارے قابو میں آچکے تھے۔ میں نے وسم سے کہا۔ ”اب پیچھے موجود دونوں افراد کو بھی قابو کرنا ہے۔“

”اس کا طریقہ میں نے سوچ لیا ہے۔ ہمارے آدمی پیچھے گئے تو یہ ہوشیار ہو جائیں گے اور پیچھے کا حصہ بہت ناہموار ہے۔“

”طریقہ کیا ہے؟“

”ڈارٹ گن۔“ وسم نے سرگوشی کی۔ ”بے ہوشی کے بلیٹ مارتی ہے اور آدمی صرف دس سینکڈ میں اٹھا غنیل ہو جاتا ہے۔“

میں نے ٹائٹ ویژن سے پیچھے موجود افراد کا جائزہ لیا وہ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تھے لیکن یہ فاصلہ اتنا نہیں تھا کہ ایک کو بے ہوشی کا بلیٹ لگتا تو دوسرے کو خبر نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ شکار بے ہوش ہونے سے پہلے گلا بھاڑ کر چلاتا تو مکان کے سامنے والوں تک بھی اطلاع پہنچ جاتی اور میں چاہتا تھا کہ وہ سب قابو میں آئیں کوئی فرار نہ ہو۔ اگر کوئی فرار ہو جاتا تو دوسروں کو لاسکتا تھا۔ اس لیے میں نے وسم کی ڈارٹ گن والی تجویز مسترد کر دی۔ ”تب کیا کیا جائے؟“

”ہم خود باہر جا کر ان کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بہت دن ہو گئے ہیں ہاتھ پاؤں ہلائے ہوئے۔“

وسم کو تجویز اچھی لگی۔ ”لیکن جانیں گے کس طرف سے؟“

”دائیں طرف سے جہاں سے یہ آئے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ اپنے کچھ آدمی سامنے والوں کے لیے بھی بھیج دو اگر وہ ان کو قابو نہ کر سکیں تو کم سے کم فرار بھی نہ ہونے دیں۔“

ہم نیچے آئے وسم نے اپنے تین آدمی بلائے اور انہیں سامنے والوں کے بارے میں ہدایت دینے لگا۔ ہم پانچوں اسی دیوار سے کود کر باہر اترے اور سب نے ٹائٹ ویژن لگا رکھی تھیں اس لیے ہمیں تاریکی میں بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ وسم کے آدمی سامنے والے حصے کی طرف چلے گئے اور ہم دونوں عقب کی طرف بڑھے۔ محنت پر موجود دونوں آدمی ریڈیو کی مدد سے ہمیں گائیڈ کر رہے تھے کہ دشمن کہاں تھا اور ہمیں کس طرف سے جانا چاہیے تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ دونوں ہمارے سامنے تھے۔ وہ ایک بڑے پتھر کے دائیں بائیں دبک کر بیٹھے تھے۔ وسم نے اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ ایک کو قابو کرے گا۔ میں نے سر ہلایا۔ وسم نے ایک پتھر اٹھا کر ان کے عقب میں اچھال دیا۔ وہ چونک کر پیچھے دیکھنے لگے۔ کچھ دیر دیکھتے رہے اور جب مزید کوئی آواز نہیں آئی تو وہ دوبارہ مکان کی نگرانی کرنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا انہیں اس لیے یہاں بھیجا گیا تھا کہ مکان سے کوئی پیچھے کی طرف سے فرار کی کوشش کرے تو وہ اسے روکیں۔ انہیں پتا نہیں تھا کہ ان کی ایک ٹیم ہمارے قبضے میں آچکی تھی اور اب ان کی باری تھی۔ وسم نے کچھ دیر بعد دوسرا پتھر اچھالا تو وہ واضح مشکوک ہو گئے ان میں سے ایک دبی آواز میں بولا۔ ”اس طرف کوئی ہے۔“

”میں دیکھتا ہوں۔“ دوسرے نے کہا اور اٹھ کر جھکا جھکا اس طرف بڑھ گیا۔ پہلا بھی اسی سمت میں دیکھ رہا تھا اس لیے میں دبے قدموں اس تک پہنچا تو اسے کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس کی کپٹی پر کھڑی ہتھیلی ماری۔ وہ جمبول کر گر اور ساکت ہو گیا۔ میں نے احتیاطاً ایک ہاتھ اور مارا تا کہ کوئی سر رہ گئی ہو تو وہ پوری ہو جائے۔ جیسے ہی میں اسے اٹھا کر پیچھے آیا وہ سیم نے اس کی جگہ لے لی۔ اتنی دیر میں اس کا ساتھی واپس آنے لگا تھا اور جب تک اسے احساس ہوتا کہ اس کے ساتھی کی جگہ کوئی اور ہے وہ سیم نے اسے قابو کر لیا تھا اس نے اس کا پستول چھین لیا اور اسے نیچے گرا کر اس کا منہ دبایا۔ میں نے اس کی تلاش لی اور اس کے پاس سے ایک خنجر اور پستول کے دو اضافی کلپ برآمد ہوئے تھے۔ وہ وہ سیم کے نیچے چل رہا تھا لیکن خود کو چھڑا نہیں پارہا تھا۔ اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی جو اصل میں کیو فلاج کے لیے تھی کیونکہ اس نے آف وائٹ رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور اسے چھپانے کے لیے اوپر سیاہ چادر اوڑھ لی تھی۔

ہم نے اس کی چادر اسی کے خنجر سے کاٹ کر اسے باندھا اور پھر منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر اوپر سے کپڑا باندھ دیا۔ آخر میں اس کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی گئی۔ اب وہ پارسل کے لیے تیار تھا۔ ہم ان دونوں کو اٹھا کر لائے اور دیوار پر سے اندر کر دیا۔ دوسری طرف وہ سیم کے آدمیوں نے انہیں سنبھال لیا تھا۔ ہم اندر نہیں آئے بلکہ سڑک کی طرف بڑھے۔ کیونکہ اس طرف بھیجے جانے والے تین افراد کی رپورٹ یہ تھی کہ دونوں گاڑیوں میں دودو افراد تھے اور وہ اندر تھے۔ قریب جائے بغیر ان پر قابو نہیں پایا جاسکتا تھا، اتفاق سے گاڑیاں اس طرح کھڑی تھیں کہ وہ زمین سے لگ کر جاتے تب بھی ان میں موجود افراد کی نظروں سے نہیں بچ سکتے تھے۔ میں نے وہ سیم سے کہا۔ ”انہیں باہر لانے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔“

”کیا کیا جائے؟“

”تمہارے پاس بے آواز پستول ہے۔“

”ہاں لیکن وہ اندر ہے۔“

”منگوا لو۔“ میں نے مشورہ دیا تو وہ سیم واپس کیا اور پستول لے کر آگیا۔ اس کا نشانہ مجھ سے بہتر تھا اس لیے اس نے اتنے فاصلے سے ایک گاڑی کا پچھلا ٹائر برسٹ کر دیا کہ گولی چلنے کی خفیف سی آواز بھی گاڑیوں میں بیٹھے افراد تک نہ پہنچے۔ گولی چلنے کی آواز تو ہمیں بھی مشکل سے سنائی دی لیکن ٹائر برسٹ ہونے کا دھماکہ اتنا بلند تھا کہ گاڑیوں میں بیٹھے افراد کے ساتھ ہم بھی اچھل پڑے تھے۔ چاروں فوراً گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ ان میں سے ایک بولا ”یہ کیا تھا؟“

”تیری ماں کا.....“ دوسرے کی باقی بات ناقابل اشاعت تھی۔ ”دیکھ نہیں رہا..... ٹائر برسٹ ہوا ہے۔“

وہ آپس میں بک بک کرنے لگے۔ زبان اور گفتگو سے وہ نچلے طبقے کے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک خاموش تھا جو بعد میں ان کا سردار ثابت ہوا اس نے وہی آواز میں غرا کر کہا۔ ”بکواس بند کرو.....“ تینوں کہاں مر گئے ہیں اب تک گیٹ کیوں نہیں کھولا؟“

اس کا اشارہ یقیناً دائیں طرف سے آنے والوں کی طرف تھا۔ ان کا کام اندر اتر کر گیٹ کھولنا اور مکمل طور پر کھن یا کردوں میں موجود افراد کو قابو کرنا تھا۔ وہ سیم نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ تو مجھے معمولی قسم کے ڈاکو لگ رہے۔“

”ہیں۔“

”ہو سکتا ہے ویسے مرشد کے گرگے بھی اسی سلع کے ہوتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے مگر اس صورت میں وہ اتنی خاموشی سے نہ آتے۔ سلطان راہی اسٹائل میں بڑکیں مارتے ہوئے آتے۔ انہیں پولیس یا کسی کا خوف نہ ہوتا۔ دوسرے وہ آٹھ نو بندے نہیں بھیجتا۔ وہ ہمیں اچھی طرح جانتا ہے کم سے کم ڈھائی تین درجن چھٹے ہوئے بد معاش روانہ کرتا۔“

میں دسم کی بات۔ سر قائل ہوا۔ ”اگر یہ ڈاکو ہیں تو اس غریبانہ سے مکان میں کیا توقع لے کر آئے ہوں گے۔“

”ممکن ہے گاڑیوں سے سمجھے ہوں کہ اندر اچھا خاصا مال مل جائے گا۔“

اس دوران میں سردار کی فکر مندی تشویش میں بدل کر وقفے وقفے سے اس کے منہ سے مغفلات کی صورت میں خارج ہو رہی تھی۔ وہ بے تکلفی سے اندر جانے والوں کے خاندان سے ناجائز رشتے قائم کر رہا تھا۔ بالآخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے دو آدمیوں کو اندر جانے اور ان تینوں کی اطلاع لانے کا حکم دیا۔ وہ دائیں طرف سے روانہ ہوئے۔ دسم نے اپنے آدمیوں کو ان کے بارے میں خبردار کیا۔ ”انہیں بھی خاموشی سے قابو میں کرنا۔“

مگر وہ انہیں خاموشی سے قابو میں نہ کر سکے تھے۔ ان میں سے ایک نے قابو کیے جانے کے دوران فریاد کی۔ ”ہائے ماں.....“

الفاظ کی صورت میں یہ فریاد ہم نے مائیک سے سنی تھی لیکن ویسے یہ آواز سردار اور اس کے دوسرے ساتھی تک بھی پہنچ گئی اور وہ فوری طور پر چوکنہ ہو گئے۔ سردار نے کہا۔ ”یہ آواز کیسی ہے مجھے گڑ بڑ لگ رہی ہے۔ جو..... کا جاتا ہے..... اندر..... ہی بیٹھ جاتا ہے۔“ اس نے خالی جگہوں میں مرصع گالیاں فٹ کی تھیں اور لگ رہا تھا کہ اسے خاصی مشتق ہے۔ معمولی کوشش کے بعد یہ دو بھی قابو میں آ گئے تھے۔ مگر اب باقی دو کو مار دھاڑ کے بغیر قابو میں کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی فارغ نہ ہو۔ اگرچہ یہاں دور تک آبادی نہیں تھی لیکن اگر آس پاس کہیں پولیس گشت پر ہوتی اور فارغ کی آواز سن کر آجاتی تو ہم بلاوجہ مشکل میں پڑ جاتے اس لیے میری خواہش تھی کہ معاملہ خاموشی سے نمٹا لیا جائے۔ اس موقع پر دسم کی سابق تجویز کام آئی اور ڈارٹ گن کے دو بلٹ نے انہیں چونکایا ضرور تھا لیکن اس سے پہلے وہ سوچتے اور کوئی رد عمل ظاہر کرتے۔ خواب آور دوائے ان کے حواسوں پر قبضہ کر لیا اور یوں تمام کے تمام نو افراد ہمارے قابو میں آ گئے۔ خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے اب تک ہم میں سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ ہم انہیں اور ان کی گاڑیوں کو اندر لے آئے۔

ہم طے کر چکے تھے کہ ان میں سے کوئی ہم میں سے کسی کی صورت نہ دیکھنے پائے۔ اس لیے تمام نو افراد کو رسیوں سے باندھ کر ان کی آنکھوں پر کپڑا باندھ دیا تھا اور انہیں ایک کمرے میں ڈال دیا گیا۔ میں نے غور کیا ان میں سے چھ نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور صرف تین کے جسموں پر پتلون قمیص تھی۔ ان کے چہرے اور چلیے بتا رہے تھے کہ وہ اجڈ قسم کے جرائم پیشہ تھے اور شاید ان کا تعلق دیہات سے تھا۔ ان کے پاس اور گاڑیوں سے اچھا خاصا اسلحہ نکلا تھا۔ اس میں چار عدد غائفلین، دو مشین گنز اور ایک درجن پستول اور ریوولور تھے۔ اسی حساب سے

ایمونیشن بھی تھا۔ مگر ان کے پاس سے کسی قسم کے ہم نہیں ملے تھے۔ ان کے پاس رقم بھی تھی لیکن کسی کے پاس کوئی شناختی چیز نہیں تھی۔ سردار کے پاس سے موبائل ملا تھا مگر اس میں نہ تو کوئی نمبر فیڈ تھا اور نہ ہی آنے جانے والی کالز کا کوئی ریکارڈ تھا۔ اس لحاظ سے وہ چالاک لگ رہے تھے۔

گویا ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا تھا تو ان ہی سے ہو سکتا تھا۔ آٹھ بے ہوش تھے اور صرف ایک ہوش میں تھا اس لیے نقیشت کا آغاز اس سے کیا گیا۔ پہلے وسیم کے ایک آدمی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور دوسرے نے اسے منچک بیک کی جگہ استعمال کیا۔ وہ اچھا خاصا باکسر تھا۔ ایک درجن کے کھا کر ہوش والے کا حال برا ہو گیا تھا منہ میں ٹھنڈے پڑے کی وجہ سے وہ فریاد بھی نہیں کر سکتا۔ اسے چھوڑا تو وہ آٹے کی پوری کی طرح نیچے لڑھک گیا۔ وسیم نے آگے آکر اس کے بالوں کو پکڑ کر اسے دوبارہ کھڑا کیا اور بدلے لہجے اور آواز میں بولا۔ ”تم سمجھ گئے ہو کہ کن لوگوں کے قبضے میں ہو۔ جس طرح ہم تمہیں آسانی سے قابو میں کر سکتے ہیں اسی آسانی سے تمہیں مار کر یہاں آس پاس دفن کر سکتے ہیں۔“

اس نے سر ہلایا اور ناک سے آوازیں نکالیں وہ کچھ بولنا چاہتا تھا۔ وسیم نے اس کے منہ پر بندھا کپڑا اتار دیا اور پھر منہ میں ٹھنڈا کپڑا بھی باہر کھینچ لیا۔ وہ ہانپنے لگا۔ اس نے ٹھکھیا کر کہا۔ ”رب کے لیے مجھے نہ مارو۔“

”شکر ادا کرو کہ تمہیں بالکل ہی نہیں مار دیا۔“ وسیم نے اسے تھپڑ رسید کیا اور یہ ایسا تھپڑ تھا کہ اس ک نکسیر پھوٹ گئی ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ ”کوشش کرنا مجھے غصہ نہ آئے ورنہ سب کو گولی مار کر ایک ہی جگہ دفن کر دوں گا۔ تم لوگوں کی جرأت کیسے ہوئی میرے گھر میں گھسنے کی۔“ وسیم کا لہجہ ڈرانے والا تھا میں نے محسوس کیا کہ وہ لرز گیا تھا۔

”ہمیں معاف کر دیں جی۔“

”تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟“

”ہم جی جیدا کے آدمی ہیں۔“

وسیم نے غلطی کی اور اسے باتوں سے بتا دیا کہ وہ سب پکڑے گئے ہیں اگر اسے یہ تاثر نہ دیا جاتا تو وہ زیادہ ڈرتا۔ بہر حال اب بھی وہ تعاون پر آمادہ دکھائی دے رہا تھا۔ وسیم نے اس بار چالاک سے کام لیا۔ ”تمہارا سردار ہے جیدا؟“

”جی وہ باہر موجود تھا۔“

”اب وہ بھی اندر ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”جیدا کیا کرتا ہے؟“

اس نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ ”آپ نہیں جانتے جیدا تو اس سارے علاقے میں مشہور ہے۔ لوگ اس

کے نام سے کانپتے ہیں۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”شاہنواز جی۔“ اس نے کہا۔

”جیدا اور تم لوگ کیا کرتے ہو؟“

”ہم ڈاکو ہیں جی۔“

”یہاں کیا کرنے آئے تھے؟“

وہ ہچکچایا پھر اس نے جواب دیا۔ ”ہمیں سردار لایا تھا اسے معلوم تھا کہ یہاں کیا کرنا ہے۔“
میرا خیال تھا کہ وہ زیادہ ہی انجان بن رہا تھا یہ بات وسم نے بھی محسوس کی اور اسے کچھ دیر کے لیے باکسر کے حوالے کیا۔ مزید ایک ورجن کے کھا کر شاہنواز چلانے اور بلبلانے لگا تھا۔ ”ہائے..... ہائے..... اوئے مینوں نہ مار..... ہائے اوئے رہا..... بس کر ظالما۔“

مگر ظالما اس وقت رکا جب وسم نے اسے اشارہ کیا۔ شاہنواز کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ کئی منٹ تک وہ بولنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ وسم نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب تم سمجھ گئے ہو کہ کسی سوال کا جواب نہ دینے یا جھوٹ بولنے کی کیا سزا ہو سکتی ہے۔“

میں نے مداخلت کی۔ ”انتا کھڑاگ پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ گولی مارو اور پیچھے کہیں دفنا دو کون پوچھنے آئے گا۔ یہ معمولی درجے کے اچکے ہیں ان سے کیا پوچھنا؟“

”نہیں جی میں بتاتا ہوں۔“ اس نے بوکھلا کر کہا۔ ”ہم..... ڈاکا مارنے آئے تھے۔“

”ڈاکا مارنے آئے تھے اور اس غریب سے مکان میں؟“

”مخبر نے بتایا تھا کہ یہاں پیسے والے لوگ آئے ہیں۔“

”اور تم لوگ دوڑے چلے آئے۔“ وسم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”یہ نہیں سوچا کہ واپسی کیسے ہوگی؟“

میں نے وسم کو اشارہ کیا اور ہم باہر آئے۔ ”مجھے لگ رہا ہے یہ اب بھی پورا راج نہیں بول رہا ہے۔ ان سے الگ الگ پوچھ گچھ کرنی ہوگی اور یہ کام صبح سے پہلے کرنا ہے۔“

”آپ کے ذہن میں کوئی بات ہے؟“

”ہاں، اگر انہیں کسی نے بھیجا ہے تو ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ہوگا۔“

وسم سمجھ گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ان سب کو ہوش میں لانے کو کہا۔ ان کے پاس ایوینو تھی۔ انہوں نے اسے استعمال کیا تو چند منٹ میں سب ہوش میں آ گئے تھے۔ سردار اور اس کا ساتھی کسی قدر مشکل سے ہوش میں آئے تھے کیونکہ وہ دوا کی مدد سے بے ہوش کیے گئے تھے۔ ان کو باری باری لے کر دوسرے کمرے میں سوالات کیے گئے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ ان میں سے کوئی بھی پوری بات نہیں بتا رہا تھا۔ ایک بات کا اقرار سب کر رہے تھے کہ وہ ڈاکو تھے اور یہاں ڈاکا مارنے آئے تھے لیکن اس کے علاوہ سب نے کوئی نہ کوئی جھوٹ بولا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سب کوئی نہ کوئی ایسی بات چمپا رہے تھے جو ان کا مشترکہ مقصد تھا۔ میں نے وسم سے کہا۔ ”وقت نہیں ہے ان سے اگھوانے کے لیے ڈرامہ کرنا پڑے گا۔“

”آپ کے پاس کوئی پلاٹ ہے؟“

”ہاں ایک پلاٹ ہے۔“ میں نے کہا پھر وسم کو اپنے پلاٹ سے آگاہ کیا۔ اسے پلاٹ پسند آیا تھا اور اس نے چند تراشیم تجویز کیں جو میں نے منظور کر لیں۔ میں اور وسم کمرے میں آئے وسم بولا۔ ”تم لوگ پورا راج نہیں بول رہے ہو اس لیے تمہارے لیے سزائے موت کا فیصلہ ہوا ہے۔ صرف ایک موقع ہے جان بچانے کا اور وہ ہے پورا راج۔“

”تم ہمیں نہیں ڈرا سکتے۔“ جید اسردار نے جیداری سے کہا۔

”اچھا پہل تم سے کرتے ہیں۔“ وسم نے کہا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے جیداکو بازوؤں سے پکڑا اٹھالیا وہ چل رہا تھا اور شور شرابا کرتے ہوئے دھمکیاں دے رہا تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ مگر اس کی دھمکیاں مضحکہ خیز تھیں۔ ان سب کی آنکھیں بند تھیں اس لیے وہ صرف سن سکتے تھے۔ وسم کے اشارے پر اس کی آدی جیداکو مکان کے عقبی حصے میں لے آئے اور وسم نے بلند آواز سے کہا۔ ”کلمہ شریف پڑھ لو یا چاہو تو اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو۔“

سردار اب گالیاں بھی دے رہا تھا۔ وسم نے اس کے سر کے پاس پستول سے فائر کیا تو اس نے ایسی چیخ ماری جیسے چیخ گولی لگی ہو اس سے زیادہ اسے مہلت نہیں ملی کیونکہ وسم نے ساتھ ہی پستول کی نال اس کے سر پر ماری اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے وہیں چھوڑ کر ہم واپس آئے تو جیداکے باقی ساتھیوں کی حالت خراب تھی۔ ایک تو فارغ بھی ہو گیا تھا اور اس نے قالین گندہ کر دیا تھا۔ وسم نے غصے سے کہا۔ ”یہ کیا قالین بچانے کے لیے اسے باہر لے جا کر مارا تو انہوں نے اس طرح گندہ کر دیا۔ باہر نکالو ان حرامیوں کو۔“

وسم کے آدی انہیں کھینچ کر باہر لے آئے۔ اس نے پوچھا۔ ”کوئی بچنا چاہتا ہے یا دوسرے بندے کا کام تمام کروں۔“

”میں بتاتا ہوں۔“ وہ تڑپ کر بولا جس نے قالین گندہ کیا تھا۔

”چپ کر سوز دے غم۔“ جیداکا نائب پھنکار کر بولا۔ ”مرنے سے ایسا ڈر لگتا ہے تو ماں.....“

وسم نے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری تو اس کا جملہ ادھر وارہ گیا تھا۔ وسم نے دھاڑ کر اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”اب اس سورا کو لے چلو۔“

”ہاں لے چلو۔“ نائب بولا وہ چیخ جیدار آدی تھا وہ خود کھڑا ہو گیا اور اسے مکان کے عقبی حصے میں لا کر وہی ڈرامہ کیا گیا۔ ہم واپس آئے تو باقی پارٹی چیخ بولنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ مگر ہم ان پر اعتبار نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہیں پھر باری باری الگ لے جا کر پوچھ گچھ کی اور اگلے ایک گھنٹے میں صورت سال واضح ہو گئی۔ اس بار انہوں نے چیخ ہی بولا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ جیداکو اس کا گروہ لوٹ مار کرتے تھے۔ ان کا علاقہ یہاں سے آگے تھا مگر کبھی کبھی وہ پنڈی بھی آ جاتے تھے۔ یہ مکان انہوں نے خاصے عرصے سے تاڑ رکھا تھا اور ایک دو بار یہاں کرائے دار آئے تو انہوں نے انہیں بھگا دیا۔ دراصل یہ مکان ان کا اڈہ تھا۔ وہ عقبی سمت سے یہاں آمد و رفت کرتے تھے۔ اصل وجہ جس کے لیے سردار اور اس کے نائب نے ”جان دینا“ کو اراکی۔ وہ یہ تھی کہ انہوں نے یہاں لوٹ کا مال چھپا رکھا تھا۔ یہ سن کر ہم حیران رہ گئے تھے۔

محن میں جہاں نیم کے درخت لگے تھے وہاں زمین کچی تھی اور انہوں نے زمین میں ایک مضبوط قسم کا دھاتی ٹرک دبا رکھا تھا۔ تقریباً نصف سینٹی میٹر موٹی فولادی چادر کا یہ ٹرک ایک لکڑی کی پٹی میں رکھا تھا تاکہ اسے رنگ نہ لگے۔ پہلے آدی کے بیان سے ہم سمجھے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے جان بچانے کے لیے لیکن جب دوسرے اور تیسرے نے بھی اس کے بیان کی تصدیق کی تو ہمیں یقین آ گیا۔ ہماری قسمت دیکھیں کہ خفیہ ٹھکانہ تلاش کیا تو وہ ڈاکوؤں کا ڈیرہ نکلا۔ وسم اور میں نے الگ جا کر میٹنگ کی۔ ”یہ تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔“

”اس کے باوجود ہمیں یہ جگہ چھوڑنی پڑے گی۔“ وسیم نے کہا۔

میں نے سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو کیونکہ ان لوگوں کو چھوڑنا پڑے گا آٹھ افراد کا قتل بہت مشکل کام ہے ایک دو ہوتے تو سوچا جاسکتا تھا اور انہیں چھوڑ دیا تو ہم غیر محفوظ ہو جائیں گے۔“

وسیم جھنجھلا گیا۔ ”اپنی بھی کیا قسمت ہے ابھی آکر بیٹھے بھی نہیں تھے کہ یہ نازل ہو گئے۔ اب یہاں سے بھی جانا پڑے گا۔“

”مجبوری ہے دوست۔“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے کہ ہم بے خبری میں شکار نہیں ہوئے ورنہ یہ ہمیں کہاں چھوڑتے۔“

”جب کیا خیال ہے ہم بھی ان کے ساتھ وہی سلوک نہ کریں؟“

میں نے نئی تیر سر ہلایا۔ ”ہم جرائم پیشہ نہیں ہیں اس لیے ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتے۔“

”جب کیا کریں انہیں ایسے ہی چھوڑ دیں؟“

”ایسے ہی نہیں چھوڑیں گے ان کی وجہ سے ہمیں یہ جگہ چھوڑ کر جانی پڑے گی اس لیے انہیں اس کا خمیازہ

بھگتنا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”انہوں نے جو مال دبا رکھا ہے وہ ہم لے جائیں گے۔“

وسیم خوش ہو گیا۔ ”یہ ٹھیک ہے ہمارے لیے تو یہ حلال بھی ہوگا۔“

وقت کم تھا اس لیے ہم تیزی سے حرکت میں آئے۔ سب نے اپنے چہرے نقابوں سے چھپائے اور پھر ان کی آنکھوں سے پٹیاں اتاریں۔ یہ دیکھ کر ان کا مددے سے برا حال ہو گیا کہ سردار اور اس کا نائب زندہ تھے۔ بلکہ وہ خوفزدہ بھی تھے کہ اب وہ دونوں انہیں نہیں چھوڑیں گے۔ جس کا پیشاب خطا ہوا تھا اس نے ہم سے کہا۔ ”تم نے دھوکا دیا۔“

”تو کیا شرافت سے پیش آتے تم جیسے ڈاکوؤں سے۔“ وسیم نے استہزاء سے انداز میں کہا۔

”سردار مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ اس نے کہا۔ ”بلکہ ہم میں سے کسی کو نہیں چھوڑے گا۔“

”یہ تم لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے۔“ وسیم نے لا پرواہی سے کہا۔ ”اب اٹھو اور زمین کھودو۔“

زمین کھودنے کے آلات بھی وہی لائے تھے ورنہ ہمارے پاس کہاں تھے۔ لکڑی کا بکس زمین میں دوفٹ کی گہرائی میں تھا۔ مٹی بہت سخت نہیں تو بہت نرم بھی نہیں تھی۔ بہر حال تین آدمیوں نے مل کر آدھے گھنٹے میں زمین کھود ڈالی۔ لکڑی کا بکس دو بائی تین فٹ کا تھا۔ اس پر پلاسٹک کور بچھا تھا تاکہ یہ اوپر سے آنے والی نمی سے محفوظ رہے اور تالے پر باقاعدہ پلاسٹک چڑھا کر اسے دھاگے سے سیل کیا گیا اس لیے بکس اور تالا دونوں صاف ستھری حالت میں تھے۔ اس کی چابی سردار کے پاس ملی بلکہ اندر موجود لا کر کی چابی بھی اس کے اور نائب کے پاس تھی۔ یہ دو چابیوں سے کھلنے والا لا کر تھا۔ بکس کا ڈھکن کھولا تو لا کر سامنے آ گیا۔ یہ بالکل صاف ستھری حالت میں تھا کیونکہ اندر بھی پلاسٹک شیٹ بچھائی گئی تھی جو لا کر کوفی اور مٹی سے محفوظ کر رہی تھی۔ چابیاں لگا کر اسے کھولا تو جب ہم نے اندر جھانکا تو ہماری اپنی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔

لا کر ڈھائی فٹ چوڑا، پونے دوفٹ لمبا اور کوئی دوفٹ ہی گہرا تھا۔ یہ پورا لا کر تقریباً آبی فیصد سونے کے زیورات اور کرنسی کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کرنسی نیچے تھے اس پر گتے کی ایک شیٹ تھی اور پھر اوپر سونے کے

زپورات بھرے ہوئے تھے۔ ان کا وزن کسی طرح دس بارہ کلو گرام سے کم نہیں تھا۔ یہ میں خالص سونے کا وزن بتا رہا ہوں۔ در نہ کھوٹ، پتھر پگینے اور ڈوریاں وغیرہ ملا کر وزن میں کلو گرام سے بھی زیادہ لگ رہا تھا۔ دسیم نے کہا۔

”میرے خدا ان لوگوں نے تو بہت لوٹ مار کی ہے۔“

”پتا نہیں کتنے غریبوں کو ان کی ساری عمر کی جمع پونجی سے محروم کر دیا ہو گا اور نہ جانے کتنی عورتوں سے ان کا زپور لوٹا ہو گا۔“

ایک کھدائی کرنے والے نے حسرت سے کہا۔ ”پانچ سال سے جمع کر رہے تھے۔ سردار نے کہا تھا کہ دس سال میں سب کر ڈپٹی ہو جائیں گے۔“ اس نے غضبناک نظروں سے سردار کی طرف دیکھا۔ ”بس ضرورت کا لیتے تھے۔“

میرا خیال تھا کہ سردار انہیں بیوقوف بنا رہا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں کوئی ٹارگٹ بنا رکھا تھا جب وہ پورا ہو جاتا تو وہ باقی سب کو مار دیتا یا دھوکہ دے کر ایسا غائب ہوتا کہ وہ اسے تلاش ہی کرتے رہ جاتے۔ میں نے بھی بھر زپور نکال کر دیکھا۔ اس میں بہت اچھا دالا زپور بھی تھا یعنی ہماری اور کئی تولے کا بنا ہوا اور ایسی معمولی چیزیں بھی تھیں جو شاید ایک گرام کی بھی نہ ہوں۔ اتنی ہلکی چیز کوئی غریب عورت ہی پہن سکتی تھی۔ سویرا، ماں جی، بھابی، آپا اور شمی کے پاس کوئی زپور چاہے ہو انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو تولے سے کم کا نہیں تھا۔ میرا سینہ بوجھل ہو گیا۔ ان ڈاکوؤں نے نہ جانے کتنے گھروں کے خواب اجاڑے ہوں گے۔ وہ اتنے سفاک اور بد کردار تھے کہ انہوں نے معمولی سی چیز بھی نہیں چھوڑی تھی۔ پھر مجھے اور دسیم کو غصہ آنے لگا۔ ہمارا رد عمل دیکھ کر کھدائی کرنے والے تینوں ڈاکوؤں کی حالت خراب ہونے لگی۔ ان میں سے ایک بولا۔ ”ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ ہم سردار کے کہنے پر چلتے تھے۔“

”بکواس کرتے ہو۔“ دسیم نے اسے لات ماری۔ ”اگر سردار کہتا اپنی ماں کو لوٹ لو تو کیا تم ایسا ہی کرتے۔ تم سب برابر کے شریک ہو اور اس قابل ہو کہ تمہیں قتل کر کے اسی گڑھے میں دفن کر دیا۔“

وہ سمجھے کہ دسیم کا ارادہ جیج ایسا ہی کرنے کا ہے وہ چلانے اور معافی مانگنے لگے۔ دسیم کے آدمیوں نے انہیں دوبارہ باندھ دیا۔ ان سب کو ایک خالی کمرے میں ڈال دیا۔ ان سب کاموں میں صبح ہو گئی تھی۔ دسیم کے آدمیوں نے روانگی کی تیاری شروع کر دی اور طے ہوا کہ ابھی ہم کوٹھی پر جائیں گے۔ گاڑیاں نہیں تھیں۔ پیننگ کے بعد دو آدمی کوئی چھوٹا ٹرک لینے گئے۔ دسیم نے انہیں ناشتہ لانے کو بھی کہا تھا کیونکہ کچن کا سامان بھی پیک ہو گیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد وہ ایک شہر و ٹرک کے ساتھ ناشتے میں حلوہ پوری اور چھو لے لے آئے۔ باری باری سب نے ناشتہ کیا اور اس دوران میں ٹرک پر سامان بھی لوڈ کرتے رہے۔ ایک گھنٹے بعد جب سورج کسی قدر بلند ہو گیا تھا ٹرک اور دوسری گاڑیاں روانہ ہو گئیں۔ سب سے پہلے لاکر نکال لیا تھا اور گڑھے کو مٹی سے پُر کر دیا تھا۔ اس پر اس طرح سے سوکھے پتے بکھیر دیے کہ کسی کو کھدائی کا شک نہ ہو۔ آخر میں وہاں صرف میں اور دسیم رہ گئے تھے۔ میں نے دسیم کو روک لیا تھا۔ اس نے وجہ نہیں پوچھی لیکن عبد اللہ کو کال کر کے رہائی کا بتا دیا اور پھر اس سے کہا کہ وہ کوٹھی پر آکر لاکر لے جائے۔ اس کی چابیاں دسیم کے پاس تھیں۔ جب سب چلے گئے تو اس نے پوچھا۔

”ہم کیوں رکے ہیں؟“

”مجھے اب بھی شک ہے کہ انہوں نے پوری بات نہیں بتائی ہے۔ اس قسم کے ڈاکو کسی قسم کی مدد کے بغیر ہوں آزادانہ نہیں پھر سکتے ہیں۔“

”یہ تو لازمی بات ہے ان کو کسی نہ کسی با اثر آدمی کی مدد حاصل ہوگی۔“

”میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کے پیچھے کون ہے۔“

”کیا اس سے کوئی فائدہ ہوگا؟“ وسیم نے کہا۔ ”میرا تو ارادہ ہے ان کو یہیں بندھا چھوڑ کر چلا جاؤں

بھوکے پیاسے مر جائیں۔“

”نہیں یا رہم ایسی سفاکی نہیں دکھا سکتے۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہو سکتا ہے کوئی فائدہ ہو ہی جائے۔“

”کرنا کیا ہے؟“

ڈاکوؤں کی دونوں گاڑیاں یہاں موجود تھیں۔ ان کا سارا اسلحہ ہمارے قبضے میں آ گیا تھا۔ ”ہم انہیں آزاد ہونے کا موقع دیں گے اور پھر پیچھا کر کے دیکھیں گے کہ وہ کہاں جاتے ہیں۔“

وسیم نے کسی قدر غور کے بعد سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے یہ کر کے دیکھتے ہیں۔ ویسے مجھے بے چارے مالک

مکان کا خیال آ رہا ہے ہم تو چلے جائیں گے بعد میں وہ مشکل میں نہ پڑ جائے۔“

”اس کا کیا قصور ہوگا۔ اس نے مکان کرائے پر دیا اب اسے کیا معلوم کہ ہم کیسے لوگ تھے۔ وہ بچ بول کر

اپنی جان بچا لے گا۔“

ہم ڈاکوؤں والے کمرے میں آئے اور وسیم نے ان سے کہا۔ ”تمہاری خوش قسمتی کہ ہم نے تمہارے قتل کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں تمہارا مال لے کر، ہمیں تلاش کرنا بے کار ہے کیونکہ ہم نے سامنے آئے بغیر یہ مکان کرائے پر لیا تھا۔ اس کے باوجود تمہارا دل چاہے تو شوق سے تلاش کرنا۔“

وسیم نے ان میں سے ایک کے ہاتھوں کی بندش کسی قدر نرم کر دی۔ وہ کوشش کرتا تو پانچ دس منٹ میں خود کو آزاد کر سکتا تھا۔ یہ کام کرتے ہی ہم وہاں سے نکل گئے۔ سڑک پر آ کر ہم نے گاڑی کچھ آگے لے جا کر جھگ میں کھڑی کر دی یہ سڑک سے نظر نہیں آ رہی تھی اور خود ایسی جگہ آگے جہاں سے مکان پر نظر رکھ سکتے تھے۔ ان کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے ایک خیال یہ بھی تھا کہ انہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے لیکن اس میں یہ قباح تھی کہ پولیس مالک مکان کو پکڑتی اور وہ وسیم کا صورت آشنا تھا۔ اگرچہ وسیم نے اسے جو شناختی کارڈ دکھایا تھا اور کاپی دی تھی وہ جعلی تھا۔ وسیم کو اس کا دکھ تھا کیونکہ بقول اس کے مالک مکان نہ صرف صورت سے شریف نظر آتا تھا بلکہ درحقیقت بھی بہت شریف تھا۔ اگر پولیس اس سے پوچھ گچھ کرتی تو خطرہ تھا کہ پولیس کا خیال ہماری طرف جاسکتا تھا۔ دوسرا خطرہ خود یہ ڈاکو تھے۔ ہم نے ان کا سارا مال چھین لیا تھا اور ان کی پشت پر کوئی با اثر شخص ہوتا تو وہ یقیناً ہمیں تلاش کرنے کے لیے اس کا سہارا لیتے۔ ہمارے لیے بوجہ کہ ایک مشکل کھڑی ہو جاتی۔ وسیم نے کہا۔ ”فرض کریں ایسا ہی ہو کہ ان کے پیچھے کوئی با اثر آدمی ہو اور وہ اس کی مدد سے ہماری تلاش شروع کریں تو ہمیں کیا کرنا ہوگا۔“

”تب ہم اس شخص کو وارننگ دیں گے کہ وہ اپنے آدمیوں کو بازار کے دروازے نقصان ہوگا۔ بہر حال

اب یہ ہمارے لیے اندھا تیر نہیں رہیں گے۔ ہم جب چاہیں گے ان کی گردن تاپ سکتے ہیں۔“

بندھے ہووں کو آزاد ہو کر نکلنے میں ہمارے اندازے سے زیادہ وقت لگا تھا وہ آدمے کھٹنے بعد گاڑیوں میں باہر نکلے اور مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ میں اور وسیم گاڑی کی طرف لپکے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور وسیم نے اوپری خانہ کھول کر دور بین سنبھال لی۔ اس طرح ہم خاصے فاصلے پر پہنچے ہوئے بھی ان کا تعاقب کر سکتے تھے۔ ہم سڑک پر آئے تو وسیم نے کہا۔ ”وہ آگے جا رہے ہیں۔“

گاڑیاں مجھے نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن وسیم کوئی چارٹ اوپر تھا اور اس کے پاس دور بین تھی اس لیے اس نے گاڑیاں دیکھ لیں۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ وہ دائیں بائیں مڑ نہیں گئی تھیں یہ اسلام آباد ایکسپریس وے تھی اور دائیں بائیں متعدد سڑکیں اس سے نکل رہی تھیں۔ دونوں طرف نئی نئی کالونیاں آباد ہو رہی تھیں اور اب پنڈی شہر اس طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ پنڈی جلد فیصل آباد کو پیچھے چھوڑے ہوئے ملک کا تیسرا بڑا شہر بن جائے گا۔ پہلے اور دوسرے نمبر پر ظاہر ہے کراچی اور لاہور ہیں۔ وسیم کے پاس موجود دور بین چھوٹی لیکن خاصی طاقتور تھی۔ اس سے میل بھر کے فاصلے سے آدمی کو شناخت کیا جاسکتا تھا۔ گاڑیاں خاصی تیز رفتاری سے جا رہی تھیں۔ اچانک وسیم نے اطلاع دی۔

”وہ بائیں طرف مڑ رہی ہیں۔“ مجھے اس سڑک تک پہنچنے میں تین چار منٹ لگے اس وقت بھی وہ گاڑیاں میری نظر میں نہیں تھیں لیکن وسیم دور بین سے انہیں نظروں میں رکھے ہوئے تھا۔ اس نے کسی قدر تشویش سے کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ مرشد کے علاقے کی طرف جا رہے ہیں۔“

اس علاقے میں وہی چوروں ڈاکوؤں کا سب سے بڑا سر پرست ہے ممکن ہے ان کا اس سے یا اس کے کسی چیلے چچے کا گیر دار سے تعلق ہو۔ مگر کوئی مزید آدمے کھٹنے بعد دونوں گاڑیاں درگاہ مرشدیہ میں داخل ہوتی دیکھی گئیں تو میں اور وسیم دنگ رہ گئے تھے۔ ان لوگوں کا تعلق مرشد سے لکھ گاہیہ ہم نے سوچا نہیں تھا اور شکر ہے وہ اپنا مال لینے آئے تھے اگر ہمیں پہچان کرتے تو اس طرح نہ آتے اور ہم مارے نہ جاتے تب بھی مشکل میں پڑ جاتے۔ بہر حال اب وہ جا کر مرشد کو یہ کہانی سناتے اور عین ممکن ہے اس کا شاطر ذہن ہماری طرف جاتا اور وہ ہماری تلاش شروع کر دیتا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ”اب مجھے وہ کوشی بھی محفوظ نہیں لگ رہی ہے۔ وہ اس جگہ سے کتنی دور ہے ممکن ہے اب مرشد کے آدمی اسٹیٹ ایجنٹوں کو ٹھونکنا شروع کر دیں۔“

وسیم بھی فکر مند ہو گیا تھا۔ اس کا خطرہ تھا۔ یہ بات سامنے آتی کہ کوشی ہم نے لی ہے تو مرشد کے گرگے وہاں دھواؤں لے کر زیادہ دیر نہیں لگتے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”وسیم اپنے آدمی لگا دو ان لوگوں کی مزید نگرانی کی جانی چاہیے۔“

وسیم نے سر ہلایا۔ ”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“

یہاں موہا بکسنگل نہیں تھے ہم پیچھے آئے جہاں موہا بکسنگل دستیاب تھے وسیم نے کال کر کے اپنے دو بانیک سوار بلوا لیے۔ وہ آدمے کھٹنے میں آگئے تھے۔ وسیم نے انہیں ڈاکوؤں کی گاڑیوں کے نمبر اور دوسری تفصیلات بتائیں۔ ”ان کا ہوشیاری سے تعاقب کرنا ہے اور دیکھنا ہے کہ وہ کہاں جاتے ہیں خاص طور سے ان کے ٹھکانے کا پتا چلانا ہے۔“

ان کو ڈیوٹی پر لگا کر ہم لوٹ آئے تھے۔ جب کوشی پہنچے تو وسیم کے آدمی سارا سامان وہاں سیٹ کر چکے

تھے۔ عبداللہ آکر لاکر لے گیا تھا۔ وسیم نے اپنے آدمیوں کو پوری طرح ہوشیار رہنے کا حکم دیا اور ہم عبداللہ کی کوشی پر آ گئے۔ ان ساروں چکروں میں دو پہر ہو چکی تھی اور ہمیں بھوک لگ رہی تھی اتفاق سے کھانا تیار تھا اور فرمائش پر فوراً ہی لگا بھی دیا گیا۔ کھانے کے دوران عبداللہ ہم سے پوچھتا رہا۔ وہ بھی حیران تھا۔ ”کیا قسمت ہے؟ جہاں جاتے ہیں دشمن پہلے سے موجود ہوتا ہے۔“

”مگر روشن پہلو بھی تو دیکھو کہ ہمیشہ بچ کر آ جاتے ہیں اور اللہ دشمن کو نقصان ہوتا ہے یا اس کے منصوبے ہمارے علم میں آ جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ یہاں سے تو بہت بڑا فائدہ ہو گیا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ عبداللہ نے سر ہلایا۔

”کاش کہ پہلے پتا چل جاتا کہ وہ مرشد کے آدمی ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”ان کو جانے نہ دیتے مار کر دو ہیں“

”مرشد کے آدمی اس قابل بھی ہیں۔“ عبداللہ نے اس کی تائید کی حالانکہ وہ مار دھاڑ سے ذرا کترانے والا آدمی تھا۔ مگر مرشد اور اس کے کرگروں کے معاملے میں وسیم کا ہموار بن جانا تھا۔ ایاز ابھی تک گاڑیوں کے چکر میں تھا۔ وہ ٹیکسلا چلا گیا تھا وسیم نے اسے بھی کال کر کے انعام کر دیا تھا کہ کہیں وہ غلطی سے مکان کی طرف نہ چلا جائے۔ اب وہ کوشی کی طرف جاتا اس نے دونوں گاڑیاں فروخت کر دی تھیں اور دو گاڑیاں لے لی تھیں۔ اس کے ساتھ وسیم کا آدمی بھی تھا۔ وہ شام تک سارے معاملات نمٹا کر واپس آتا۔ وسیم ابھی تک جھنجھلایا ہوا تھا۔

”شہر میں رہنے میں یہ مسئلہ ہے حویلی اور اس سے پہلے فارم ہاؤس میں ہم نے کتنا عرصہ سکون سے گزارا۔ بلکہ فارم ہاؤس کو تو خود چھوڑ کر آئے تھے۔ کیونکہ وہ آبادی سے دور تھا۔“

”دور تو یہ بھی تھے بس قسمت کی بات ہے۔“ عبداللہ بولا۔

”یاریع نباشکرے ہو۔ دولت سے بھرا لاکر لے گیا ہے اب مزے سے جو جگہ چاہے خرید لو۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”مری کے بارے میں کیا خیال ہے وہاں آدمی آرام سے سب کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا ہے اور جب ضرورت تو آسانی سے یہاں آ سکتا ہے۔“

”چلو اس طرف بھی دیکھتے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”لیکن پہلے لاکر دیکھتے ہیں۔“

لاکر اوپر میرے کمرے میں رکھا تھا۔ رات زیادہ دیر سونے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس وقت پیٹ بھر کر کھا لیا تھا اس لیے کچھ سستی آرہی تھی میں بستر پر دراز ہو گیا اور وسیم عبداللہ کے ساتھ مل کر لاکر کھول کر بیٹھ گیا۔ لاکر خود بھی خاصا وزن فی تھا۔ بقول عبداللہ کے ایک من سے کم نہیں تھا اور اتنا ہی اس کے اندر وزن تھا بڑی مشکل سے تین افراد اسے اوپر لے کر آئے تھے۔ عبداللہ ایک سفید پلاسٹک شیٹ لے آیا اور انہوں نے پہلے سونے کے زیورات نکال کر اس پر ڈھیر کیے۔ پھر نیچے سے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں۔ یہ ساری پانچ سو ہزار اور پانچ ہزار کی رقم تھی۔ اور گڈیوں کی تعداد ڈھائی تین سو سے کم نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈاکوؤں میں اتنا اتفاق کیسے ہو گیا کہ انہوں نے اپنی ساری دولت ایک جگہ رکھی تھی اور جگہ بھی سب کے علم میں تھی۔ یہ جتنی بڑی مالیت کا سونا اور رقم تھی ایسا لگ رہا تھا انہوں نے سب اسی لاکر میں چھپا دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس ڈاکو نے سچ کہا تھا کہ انہوں نے جتنا کمایا تھا وہ سب اسی جگہ چھپا دیا تھا۔ یقیناً ڈاکوؤں میں ایسا تھا اور آپس میں اعتماد بھی تھا کہ کوئی دھوکا نہیں

دے گا۔

عبداللہ کے پاس حساس الیکٹرانک ترازو تھا۔ وہ ترازو اور کچھ نوک دار اوزار لے آیا۔ اس دوران میں کوٹھی کا منتظم شاہ جی کافی لے آیا تھا۔ عبداللہ نے اسے بھی کام پر لگا لیا۔ وہ زیورات کی ڈوریاں لگ کر رہا تھا۔ وسیم اور عبداللہ ٹکینے نکال خالی زیور ترازو پر رکھتے جا رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا رفتہ رفتہ وزن بڑھ رہا تھا ایک کلو گرام پھر دو کلو گرام، پانچ کلو گرام، دس کلو گرام اور جب آخری زیور بھی اس پر رکھا تو کل وزن سترہ کلو گرام سے اوپر جا چکا تھا۔ شاہ جی بیزار تھا اس لیے کام ختم ہوتے ہی وہ رخصت ہو گیا۔ اس نے اتنے ڈھیر سارے سونے اور دولت میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ عبداللہ نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ ایک حادثے میں اپنے بیوی بچوں کو گنوانے کے بعد دنیا سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ معمولی کھانا اور پہنتا تھا اور اپنی تقریباً ساری تنخواہ راہِ خدا میں بانٹ دیتا تھا۔ وسیم نے کہا۔ ”لیس جناب سترہ کلو گرام گولڈ ہے۔“

”اس میں سے کھوٹ نکال دو تو شاید مشکل سے دس کلو گرام بچے گا۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے ہاں عام طور سے جو سونا بانٹیں کیرٹ کہہ کر بیچا جاتا ہے اس میں اصل دنا اٹھارہ کیرٹ ہوتا ہے۔ اگر اسے خالص کر لیا جائے تو یہ پچیس تیس فیصد کھوٹ ہو گا۔“

”کھوٹ کا پتا کیسے چلے گا؟“

”بہت آسانی سے۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”ہم سونا پگھلا کر خالص حالت میں لے آئیں گے اور اس کے ڈلے بنا کر فروخت کر سکتے۔“

اس وقت سونا کوئی پینتالیس ہزار روپے کا دس گرام تھا یعنی پینتالیس لاکھ روپے کا ایک کلو گرام۔ وسیم نے حساب لگایا۔ ”اگر دس کلو گرام خالص نکل آیا تو صرف سونا ہی ساڑھے چار کروڑ روپے کا ہے۔“

”یہ رقم بھی میرے حساب سے تین کروڑ سے زیادہ کی ہے۔“ عبداللہ نے گڈیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”مرشد کا ایک اور تھنہ، ابھی تو اس کا پہلا مال بھی خرچ نہیں ہوا۔“ میں ہنسا۔ وسیم نے سر ہلایا۔

”نہیں اس میں سے بڑی تیزی سے خرچ ہو رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس کے بعد کیا کریں گے۔“

”آپ غیریت کی باتیں نہ کریں۔“ عبداللہ نے کسی قدر نفطی سے کہا۔ ”کیا میں نہیں ہوں۔“

”کیوں نہیں ہو یا.....“ میں نے اس کی دل جوئی کی۔ ”رقم کی تو بات ہی نہیں ہے اصل چیز تمہارا اور

دوسرے لوگوں کا خلوص ہے۔“

وسیم نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا۔ ”ناراض کیوں ہوتا ہے بھائی..... بس یہ دولت چیز ہی ایسی ہے کہ

آدمی پا کر تھوڑا بہک جاتا ہے۔“

عبداللہ یاروں کا یا ر تھا وہ ناراض ہونے والا آدمی ہی نہیں تھا۔ اس لیے فوراً مان گیا۔ اس نے وسیم کے

ساتھ مل کر گڈیاں گنی اور مالیت نکالی تو جواب تین کروڑ بارہ لاکھ آیا تھا۔ رقم والا سوٹ کیس بھی یہیں تھا۔ طے ہوا

کہ اس کی رقم بھی لاکر میں منتقل کر دی جائے۔ کیونکہ سوٹ کیس ایسے ہی پڑا رہتا تھا۔ اگرچہ عبداللہ اور وسیم کے

تمام آدمی قابل بھروسہ تھے لیکن کسی کے ایمان کی آزمائش کیوں کی جائے؟ اس لیے سوٹ کیس کی رقم بھی اسی میں

منتقل کر دی گئی اور لاکر کو کمرے کے کونے میں دیوار کے ساتھ سیٹ کر دیا گیا۔ کافی پی کر نیند اڑ گئی تھی۔ اس لیے

میں نیچے آگیا۔ عبداللہ نے بھی آدمیوں کی چھاننی کی تھی۔ اس لیے اب صرف تین ملازم تھے اور اس کے علاوہ خاص آدمیوں کی تعداد چھ تھی۔ ڈنر کے دوران ایاز آگیا تھا وہ کھانے میں شامل ہو گیا اور کھانے کے دوران اس نے رپورٹ دی۔

”ایک تقریباً نئے ماڈل کی ہیکلس ہے۔ مارکیٹ سے پچاس ہزار کم میں مل رہی تھی۔ دوسری پجارو ہے تین سال پرانی اور سیاہ شیشوں والی۔ اس کی بھی کنڈیشن بہت اچھی ہے۔ اس قسم کی گاڑیوں میں نقل و حرکت آسان ہوتی ہے کیونکہ پولیس یا چیکنگ کرنے والے کم روکتے ہیں۔“

ایاز پانچ لاکھ روپے لے کر گیا تھا اس نے اس میں سے بھی ڈیڑھ لاکھ بچا لیے تھے۔ ڈنر کے بعد وہ دسیم کے ساتھ چلا گیا کیونکہ دسیم نے اس سے مزید گاڑیوں کی بات کی تھی اور اگلے دن ان کو دوبارہ مارکیٹ جانا تھا۔ حوبلی میں موجود ہیکلس وہیں رہ گئی تھیں۔ نکلنے سے پہلے ان کی نمبر پلیٹس اتار لی تھیں اور انجن اور چیمپی نمبر پتی سے گھس دیئے تھے ان کی مدد سے پولیس ہمارا سراغ نہیں لگا سکتی تھی۔ دسیم نے عارضی طور پر دو بایک حاصل کی تھیں لیکن اسے اپنے رائڈر دے دے کے لیے اچھی بایکوں کی ضرورت تھی۔ وہ بہت کارآمد ثابت ہوتے تھے۔ خاص طور سے مگرانی اور خاص مشن کے لیے۔ ان کے لیے طاقتور اور بہترین ہیکلس کی ضرورت تھی۔ پہلے بھی ہیکلس ایاز نے لی تھیں۔



اگلے دن دسیم کے آدمیوں نے ڈاکوؤں کا ٹھکانہ کھوج لیا تھا۔ وہ درگاہ مرشدیہ کے پاس ہی ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے مگر ان کا ڈیرہ گاؤں میں نہیں تھا بلکہ گاؤں سے کسی قدر ہٹ کر تھا اور گاؤں والے ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ ان میں سے پانچ چھ تو آس پاس کے رہنے والے تھے اور دوا سی گاؤں کے تھے۔ سب جانتے تھے کہ وہ مرشد کے خاص آدمی ہیں اس لیے سب ان سے ڈرتے تھے پولیس والے بھی انہیں جھک کر سلام کرتے تھے۔ انہوں نے بیٹھا روادا تمیں کی تھیں اور اس دوران میں انہوں نے کئی افراد کو قتل بھی کیا تھا۔ مگر ان کے خلاف کبھی ایف آئی آر نہیں کئی۔ اگر کسی نے کوشش کی تو نہ صرف اسے منہ کی کھانی پڑی تھی بلکہ پولیس نے الٹا اسے اندر کر دیا تھا۔ اب لوگ ڈرتے تھے اور ان کے سامنے آنے سے گریز کرتے تھے۔ ظاہر ہے مرشد کی اندھیر نگری میں سارا راج ہی چو پٹ تھا۔

یہ معلومات تشویش ناک تھیں۔ وہ مرشد کے بہت قریبی لوگ تھے اور پولیس بھی ان کی ہمنوا تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ مالک مکان رگڑے میں آیا ہوگا اور اس سے ہمارے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی ہوگی۔ دسیم اور اس کے آدمی ہوشیار تھے۔ عبداللہ نے اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کر لی تھی کہ اگر کوئی اس کے پاس ہمارے بارے میں پوچھتا ہوا آئے تو اسے صاف انکار کر دینا ہوگا۔ اس نے عبداللہ کو یقین دلایا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ دسیم اس کے باوجود مطمئن نہیں تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شہری آبادی سے دور ہی کہیں ٹھکانہ بنائے گا اور اس مقصد کے لیے اس نے تلاش شروع کر دی تھی۔ جب سے جیدا اینڈ کوکا مرشد سے تعلق سامنے آیا تھا تب سے دسیم زیادہ فکر مند تھا۔ اس لیے بھی کہ جیدا اور اس کے ساتھی اپنی دولت کی خاطر سر دھڑکی بازی لگا کر ہمیں تلاش کر سکتے تھے اور ان سے دور رہنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ ہم خاصی حد تک محفوظ تھے لیکن دسیم کو مالک مکان کے بارے میں فکر تھی۔

حویلی میں مانی اور بیٹو سے بات ہوئی۔ وہ اب اداس تھے اور واپس آنا چاہتے تھے۔ جب کہ سویرا کہہ رہی ہے کہ ان لوگوں کا یہاں بہت دل لگا ہے اور سادی کا کہنا تھا کہ مانی کا کچھ زیادہ ہی لگ گیا ہے۔ بیٹو نے کہا۔ ”شوہنی ہم کو یہاں بہت مزہ آیا ہے..... آپ کا بابا صاحب بہت اچھا ہے۔ انہوں نے ہم کو بیٹا بنالیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب میں حویلی میں رہوں گا۔“

”صرف بابا اچھے لگے، ماں جی، آپا، شی اور سویرا بھی تو ہیں۔“

”سب بہت اچھا ہے۔ ماں جی اور سویرا آپ کے بارے میں بہت پوچھتا ہے۔“

”تو رہو وہاں اور مزے کرو، اتنا دیدی لوگ مل گیا ہے اور سب پکانے کا ماہر ہے۔“ دیم نے اسے چھیڑا۔

”یہاں سارے بے دید ہیں اور کھانا جانتا ہیں پکانا نہیں..... اب تو سفیر بھی حویلی میں رہے گا۔“

”نہیں اب ہم واپس آئے گا بہت دن سے آپ لوگوں سے دور ہے۔“ بیٹو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”اچھا دیکھتے ہیں۔“ میں نے اسے ٹالا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ ابھی وہ اور مانی حویلی میں رہیں۔ پھر مانی سے بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ اس دوران میں اس نے نہ صرف حویلی کی پوری طرح الیکٹرانک سیکورٹی کر دی ہے بلکہ بابا اور وہاں موجود افراد کو آلات کے استعمال کی تربیت بھی دی ہے۔

”شوہنی بھائی اب ہم واپس آجائیں؟“ مانی نے بھی کہا تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ کیونکہ سعدیہ کے مطابق اس کا دل لگ گیا تھا۔

”کیوں برخوردار اطلاعات تو کچھ اور ہیں کہ تمہارا واپسی کا ارادہ نہیں ہے۔“

”وہ سادی باجی ہیں نا۔“ مانی جھینپ گیا۔ ”قسم سے سفیر بھائی کا دوسرا ایڈیشن ہیں۔ وہاں انہوں نے جینا حرام کیا ہوا تھا اور یہاں یہ بھی ہیں اس لیے تو میں واپس آنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ابھی حالات مناسب نہیں ہیں۔ ٹھکانے کم ہیں جیسے ہی کوئی مناسب جگہ ملی اور وہاں سیٹ آپ کیا تمہیں بلا لیں گے۔“

”کوئی بات نہیں جہاں آپ ہیں وہاں ہم بھی رہ لیں گے۔“

”اتنی عجلت نہیں کرو۔ ابھی آرام سے وہاں رہو۔“ میں نے کہا۔ میں سمجھ رہا تھا شازیہ میں دلچسپی اپنی جگہ لیکن مانی شہر کا رہنے والا تھا اور شہر میں رہنے والوں کے لیے ایک حد سے زیادہ گاؤں میں رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چاہے وہاں ان کو کتنا ہی آرام کیوں نہ مل رہا۔ ان سے بات کرنے کا مقصد بھی ان کو روکنا تھا۔ ابھی یہاں ان کی ضرورت نہیں تھی اور وہ چین سے بیٹھنے والے بھی نہیں تھے۔ ان دونوں کو باہر کے کھانوں کا چرکا تھا زیادہ باہر گھومنا یا غیر متعلقہ افراد کی آمد و رفت خطرے سے خالی نہیں تھی۔ فارم ہاؤس میں صبح شام کھانے کی چیزیں ڈیلیور کرنے والے آ رہے ہوتے تھے۔ وہ جی ٹی روڈ پر ایک ایسی جگہ تھا جہاں آس پاس کوئی گھر بھی نہیں تھا لیکن یہ عین شہر تھا اور یہاں اس قسم کی آمد و رفت ٹھیک نہیں تھی۔

دوسرے مجھے یقین تھا کہ مرشد کے آدمی حویلی کے آس پاس ہوں گے۔ بے شک وہ حویلی میں ٹھس نہیں سکتے تھے لیکن دور سے نگرانی تو کی جاسکتی تھی۔ مرشد کے لیے مقامی طور پر آدمیوں کا حصول مشکل نہیں تھا کیونکہ وہ جس پارٹی میں ہماری طرف سے اسی کا ایم این اے منتخب ہوا تھا اور اس سے ایک بار میرا ٹاکرا بھی ہو چکا تھا۔ مگر

اس نے بعد میں عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے بات کو بڑھانے سے گریز کیا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میرا تعلق کس خاندان سے ہے اور علاقے میں ہماری ایک حیثیت تھی۔ وہ مجھے چھینڑ کر اپنے ووٹ بنک میں کی نہیں کرانا چاہتا تھا اس لیے وہ معاملے کو پی گیا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بھول گیا تھا۔ اب بھی وہ اگر ہمارے خلاف کچھ اس طرح کر سکتا کہ اس کا نام نہ آئے تو وہ ضرور کرتا۔ مرشد اس سے مدد لے سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مانی اور بیٹو یا کوئی بھی فرد حویلی سے بغیر حفاظت کے نکلے۔ جب مانی اور بیٹو کو بلوانا ہوتا تو یہاں سے وسم اپنے آدمیوں کو بھیج کر ان کی حفاظت کا بندوبست کر سکتا تھا۔ ان کا اکیلے آنا درست نہیں تھا اس لیے میں نے ان کو وسم کر دیا۔ وسم اپنے کام نمٹا لیتا تو ان کو لینے کے لیے آدمی بھیج سکتا تھا۔

فی الحال اس کے آدمی جید اگروپ اور درگاہ مرشدیہ کی نگرانی کر رہے تھے۔ وسم نے بانکس حاصل کرنے کے بعد چار آدمی لگا دیئے تھے اور وہ بارہ بارہ گھنٹے کی شفٹ میں ڈیوٹی دے رہے تھے۔ ہمارے مکان چھوڑنے کے تیسرے دن رپورٹ آئی کہ جید اگروپ کسی شخص کو انوا کر کے اپنے گاؤں والے ڈیرے پر لائے ہیں۔ میرے ذہن میں فوراً خیال آیا تھا کہ کہیں وہ بے چارہ مالک مکان نہ ہو۔ اب وہ اس سے اپنے طریقے سے پوچھ کچھ کرنا چاہتے ہوں گے۔ ظاہر ہے وہ کسی کے کہے پر اعتبار کرنے والے لوگ نہیں تھے۔ اگر وہ مالک مکان تھا تو اس کی عافیت خطرے میں تھی اور ہم اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ صرف دعا کر سکتے تھے کہ وہ خیر خیریت سے رہے اگرچہ یہ ذرا مشکل ہی لگ رہا تھا۔ وسم نے یقین سے بتایا تھا کہ مکان کا مالک اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور صرف دو بار اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا شناختی کارڈ جعلی تھا اور وسم کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ پھر اس نے سادہ شیشوں والی مینک لگا لی تھی۔ وہ وسم کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا کہ مکان کس کو دیا تھا۔ شام کو وسم آیا تو پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا فکر مند لگ رہے ہو؟“

”شہباز میں نے تصدیق کر لی ہے جبراً کے آدمیوں نے مالک مکان کو اٹھا لیا ہے۔ مجھے خطرہ ہے وہ تشدد

کر کے اسے مار نہ دیں۔“

”ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

”ہم کر سکتے ہیں لیکن کیونکہ اس سے ہمارا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے کرنا نہیں چاہتے ہیں۔“ وسم نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”شہباز صاحب میرا ضمیر مطمئن نہیں ہے وہ عام آدمی ہے اور بیوی بچوں والا ہے اس کی تمن بیٹیاں ہیں جو اپنے باپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ جب میں اس سے مکان کی بات کر رہا تھا تو مستقل ان کے فون آرہے تھے۔“

وسم بہت مضطرب لگ رہا تھا میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر تم چاہتے ہو تو ہم اسے بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن کیا یہ اس کے ساتھ مزید دشمنی نہیں ہوگی۔ فرض کرو ہم اسے ابھی چھڑا لیتے ہیں لیکن بعد میں اسے کون بچائے گا۔ یہ تو یک طرح تصدیق کرنے والی بات ہوگی کہ اس کا ہم سے تعلق ہے۔“

”یہ سب بعد کی بات ہے شہباز صاحب میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ وہ بہت سفاک لوگ ہیں اور پھر ان کی اتنی بڑی دولت چھن گئی ہے اس کی واپسی کے لیے انہیں دس لوگوں کو قتل کرنا پڑے تو وہ یہ بھی کر سکتے

ہیں۔“

”یعنی ہمیں ایکشن کر کے اسے وہاں سے نکالنا ہوگا؟“

”بالکل اور یہ مرشد کے لیے ایک دھچکا بھی ہوگا اسے اپنے اہم بندوں سے محروم ہونا پڑے۔“

”میں نے سوچا۔“ اگر یہ مرشد کے خاص آدمی ہوئے تو یقیناً اس کے لیے دھچکا ہوگا ورنہ اسے آدمیوں کی پروا نہیں ہوتی ہے۔“

”اگر یہ اس کے خاص آدمی نہ ہوئے تو اور اچھی بات ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”اس طرح اس کا شک ہماری طرف نہیں جائے گا۔ ہمیں اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

”ٹھیک ہے اب یہ بتاؤ کہ اس کی مدد کیسے کرنی ہے؟“

”اسے وہاں سے نکالنا ہے اور ان لوگوں کو ٹھکانا لگانا ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”یہ کام آج رات کرنا ہے ورنہ شاید کل تک وہ زندہ نہ رہے۔“

”میں بھی چلوں گا۔“

”نہیں میرا خیال ہے میں اور ایاز چار بندوں کے ہمراہ آرام سے یہ کام کر لیں گے۔“

”مجھے پانچواں شمار کرلو۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وسیم کو مجبوراً رضی ہونا پڑا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ ہم نصف رات کو وہاں پہنچیں گے اور پھر موقع دیکھ کر کارروائی کریں گے۔ وسیم نے مکان دیکھا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ پر خاکہ بنا کر دکھایا۔ ”یہ احاطہ ہے..... سمجھ لیں کہ کوئی سوٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے۔ تین طرف کھیت ہیں اور چوتھی طرف ایک جو ہڑ ہے جس میں بھینسیں نہاتی ہیں اور گاؤں کا گندہ پانی اسی میں آکر گرتا ہے۔ جو ہڑ کے ساتھ سفیدے اور بیری کے درختوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا جھنڈ ہے۔ یہ جھنڈ ہمارے کام آ سکتا ہے کیونکہ بعض درختوں کی شاخیں احاطے کی دیوار تک چلی گئی ہیں۔“

”اندر کی کیا صورت حال ہے؟“ میں نے خاکے پر غور کیا۔

وسیم نے درختوں والی دیوار کے ساتھ کمرے بناتے ہوئے کہا۔ ”اس طرف کمروں کی قطار ہے، پھر اس سے مخالف سمت میں دوسری قطار ہے۔ لمبائی بتاتی ہے کہ کمرے اچھے خاصے ہیں۔ پھر اس سمت میں لائن سے شاید لیٹرین، غسل خانہ اور کچن کا چھپر ہے۔ اس میں تندور بھی لگا ہے۔“

”ملازم بھی ہیں وہاں؟“

”ہاں دن میں دو افراد آتے ہیں اسی گاؤں کے ہیں۔ وہ شاید کھانے پکانے اور صفائی ستھرائی کا کام کرتے ہیں۔ وہ صبح سویرے آتے ہیں اور سات بجے تک چلے جاتے ہیں۔“

”ان کے علاوہ کوئی مستقل آتا جاتا ہو؟“

”دو دن پہلے دو عورتیں آئی تھیں اور ان کا تعلق یقیناً اُس بازار سے تھا۔ وہ رات بھر وہاں رہیں اور صبح گئی تھیں۔“

”عبداللہ کو پتا چلا تو اس نے مخالفت کی۔“ ”یہ تو آئیل مجھے مار کہنے والی بات، دگی۔“

”نہیں ہوگی یار اور پھر امید ہے کہ کام صفائی سے ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے بھی ان کا تعلق مرشد

سے ہے اس لیے ہم تیل کو مارنے جا رہے ہیں۔“

عبداللہ چپ ہو گیا۔ ”آپ کی مرضی مگر صرف ایک بندے کی خاطر.....“

”یار وہ ایک بندہ نہیں ہے۔“ وسیم نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اس نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے مکان میرے حوالے کیا اور اب وہ مصیبت میں ہے تو میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ ہم نے اسے نہیں بتایا کہ ہم کون ہیں اور ہماری دھمی کیسے لوگوں سے ہے اب اس پر ہماری وجہ سے آفت آئی ہے تو ہم اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔“

عبداللہ راضی نہیں تھا مگر اس نے محسوس کیا کہ وسیم فیصلہ کر چکا ہے اس لیے وہ چپ ہو گیا۔ ایاز کوشی پر تھا۔ ام شام کو ڈنر کے بعد نکلے تھے۔ عبداللہ نے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کیا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ ”تمہارا یہاں ہونا ضروری ہے۔ یہاں نادر بھی ہے اور بہت بڑی رقم بھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”لیکن مجھ سے رابطہ رکھیے گا۔ کوئی بھی مشکل ہوئی تو میں آدھے گھنٹے میں آ جاؤں گا۔“

”یہ ٹھیک ہے تم بیک آپ تیار رکھنا ہم روانہ ہونے سے پہلے تمہیں اطلاع کر دیں گے۔“ وسیم نے اس سے کہا لیکن اس وقت ہمیں خیال نہیں آیا کہ جیدا کے ٹھکانے کے آس پاس موبائل سنگنل نہیں تھے۔

کوشی پر خاصی گہما گہمی تھی۔ کیونٹیکیشن وین اور ایاز کی لائی نئی گاڑیاں آچکی تھیں اور ان کے ساتھ چند لوگوں میں خاصا سامان بھی کوشی میں لایا گیا تھا۔ ایک کمرے کو تفریحی لاؤنج میں بدل دیا گیا تھا وہاں ٹی وی اور افسر ریسیور تھا۔ کئی طرح کے انڈور کھیلوں کا سامان تھا۔ ڈرائنگ روم سونے کا کمرہ تھا جہاں وال نوال کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ ٹیکے اور گاؤٹیکے تھے۔ وسیم کا بیڈ روم اوپر تھا اس میں بھی قالین تھا۔ دوسرا بیڈ روم ایاز کے حصے میں آیا تھا۔ وسیم نے پہلے ہی اپنے آدمیوں کو تیار ہونے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ تیار تھے اور اب اپنے اسلے اور دوسرے آلات کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے۔ سب نے چست سیاہ لباس پہن رکھے تھے اور سروں پر ایسی سیاہ لومیاں تھیں جنہیں کھینچا جاتا تو وہ چہرے پر نقاب بن جاتیں۔ میں نے اور وسیم نے بھی ایسا ہی لباس پہنا۔ میں نے رات کی ہم کے لحاظ سے ہلکا ڈنر کیا تھا۔ پھر گرین ٹی لی تھی۔ اس سے ذہن چاک و چو بند رہتا۔ وسیم سوچ رہا تھا میں نے پوچھا۔ ”لائن آف ایکشن کیا ہوگا؟“

”احاطہ بہت بڑا ہے اور کمرے بھی زیادہ ہیں اس لیے گیس کا استعمال بے کار ہوگا۔ خاموشی سے اندر داخل ہونا ہوگا اور جو پہرے پر ہوا اسے ٹھکانے لگانا ہوگا۔“

وسیم کا مطلب واضح تھا۔ میں نے ہچکچا کر کہا۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا؟“

”بالکل جناب ان لوگوں کا تعلق مرشد سے ہے اور خود ان کا کردار سامنے ہے۔ یہ ڈاکو ہیں اور انہوں نے صرف دولت مندوں کو نہیں غریبوں کو لوٹا ہے۔ کتنے افراد کو قتل کیا ہے۔“

ایاز بھی آگیا تھا اس نے وسیم کی تائید کی۔ ”میں اس قسم کے مجرموں کو اچھی طرح جانتا ہوں جناب..... وہ درندوں سے بدتر ہوتے ہیں۔ صرف مال نہیں لوٹتے اور جان ہی نہیں لیتے ہیں بلکہ جہاں جاتے ہیں وہاں عزتیں بھی لوٹ کر آتے ہیں۔ مال کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ جان پر بھی مبرا آ جاتا ہے پر عزت کا کوئی بدل نہیں ہوتا۔ پورا گھر برباد کر دیتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اس صورت میں ہم سب کے پاس بے آواز پستول ہونے چاہئیں۔ تاکہ شور نہ ہو۔“
 ”صرف پستول ہی نہیں رائفلوں پر بھی سائنکسر ہوگا۔“ وسیم نے سر ہلایا۔ ”اس مشن کے لیے خاص طور سے چیک ساختہ ایوزی مشین گن نکلوائی ہیں۔ بہت شاندار ہتھیار ہے۔“

کچھ دیر بعد وسیم کا ایک آدمی ہمارا اسلحہ لے آیا۔ اس میں تین عدد سائنکسر لگے پستول اور تین عدد چھوٹی ایوزی گنیں تھیں۔ اسرائیل نے ان کی نقل تیار کی ہے جو مارکیٹ میں یوزی کے نام سے دستیاب ہے۔ ہر ہتھیار کے ساتھ دو عدد فاضل میگزین بھی تھے۔ آپس میں رابطے کے لیے مختصر سے ریڈیو تھے جو صرف کان پر فٹ آ جاتے تھے۔ یہ وسیم نے حال ہی میں حاصل کیے تھے اس سے پہلے جو ہیڈ سیٹ تھے ان کا ریسپیونگ سیٹ الگ سے جیب میں رکھنا پڑتا تھا۔ کیونکہ وہاں پر لائٹ تھی اس لیے نائٹ ویژن کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر احتیاطاً تیار کی کے گلاسز جیسے نائٹ ویژن عینکیں سب کے پاس تھیں کہ کہیں تاریکی سے واسطہ پڑے تو ان سے کام چلا سکیں۔ مشن کے لیے دین کے بجائے ہیلکس اور موٹر سائیکلوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ دو بائیک سوار پہلے سے وہاں موجود تھے اور دو ہمارے ساتھ جاتے۔ ہیلکس میں ہمیں وسیم اور ایاز ہوتے۔ ڈرائیونگ ایاز کے سپرد تھی۔

بارہ بجے ہم کھجی سے نکلے۔ موسم کسی قدر سرد مگر خوشگوار تھا۔ امید تھی کہ اس موسم میں کوئی باہر سونے کی کوشش نہیں کرے گا لیکن ہم ہر صورت حال کے لیے تیار تھے۔ وسیم کا اندازہ تھا کہ وہاں آٹھ سے دس افراد سے سامنا ہو سکتا ہے۔ بارہ بجے کے بعد اگر پہرہ ہوا تو دو سے زیادہ افراد نہیں ہوں گے اور کیونکہ بہ ظاہر ان کو کسی سے خطرہ نہیں ہے اس لیے وہ بھی اتنے جوکس نہیں ہوں گے۔ ہم آسانی سے ان پر قابو پا سکتے تھے۔ ایک بار ہم اندر داخل ہو جاتے تو پھر ہمیں کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ بیس منٹ بعد ہم اس جگہ کے قریب تھے ایاز نے خاصی تیز ڈرائیونگ کی تھی۔ درنہ کوئی اور ہوتا تو آدھے گھنٹہ لگتا۔ قریب آتے ہی وسیم نے اپنے آدمیوں سے رابطہ کیا۔ جو درگاہ مرشدیہ کی نگرانی کر رہا تھا وہ بھی اب جیدا گروپ کے ٹھکانے کے پاس آ گیا تھا۔ ایک سامنے والی طرف تھا اور دوسرا عقب میں کھیتوں کے ساتھ ایک جھنڈ میں رُو پوش تھا اور وہیں سے نگرانی کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ ہیڈ سیٹ کی ریخ میں نہیں تھے اس لیے وسیم ایک بڑا ریڈیو ساتھ لایا تھا۔ اس کی مدد سے دور موجود افراد سے بھی رابطہ کیا جاسکتا تھا۔ ہیڈ سیٹ آپس میں سوگزر کی ریخ میں کام کرتے تھے۔ اس سے زیادہ ریخ پر یہ کام نہیں کرتے تھے۔ تازہ ترین رپورٹ لے کر وسیم نے ہمیں بتایا۔ ”دو گھنٹے پہلے دو عورتیں آئی ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے اندر سب جاگ رہے ہوں گے؟“ میں نے تشویش سے کہا۔

”امکان یہی ہے۔“ وسیم معنی خیز انداز میں بولا۔ ”لیکن ان میں سے دو تین مصروف بھی ہوں گے۔“

ایاز ہنسا۔ ”باقی کو ہم مصروف کر دیں، جہنم کی طرف مارچ میں۔“

نگرانی کرنے والے اپنی جگہ رہتے۔ کام ہم پانچ افراد کو ہی کرنا تھا۔ ہیلکس اور بائیکس ایسی جگہ چھوڑیں جہاں ہم آسانی سے واپس آ سکتے تھے۔ عین ممکن تھا ہمیں جلّت میں فرار ہونا پڑتا۔ ایاز کے لیے فیصلہ ہوا کہ وہ باہر رہے گا اس نے احتجاج کیا۔ ”باہر کیوں؟“

”تاکہ ہماری طرف سے گنل ملتے ہی ہیلکس احاطے کے پاس لاسکو ہمیں ایک بندے کو بھی لے کر جانا ہے اور امکان ہے وہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں ہوگا۔“ وسیم نے سمجھایا۔

”او کے پاس۔“ ایاز نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں سوچ رہا تھا بہت دنوں بعد کچھ شغل رہے گا۔“
 ”ممکن ہے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔“ وسیم نے کہا۔ ”مگر تمہارا اصل کام ڈرائیونگ ہے کسی بھی
 ہنگامی صورت حال میں ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکالنا ہوگا۔“

”کوئی اور یہ کام اتنی اچھی طرح نہیں کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا اور ہم سب نیچے اتر آئے۔ طے ہو گیا تھا
 کہ میں، وسیم اور اس کے دو آدمی درختوں کی مدد سے اندر اتریں گے اور پھر موقع محل دیکھ کر کارروائی کریں گے۔
 جو ہڑ کے پاس سے گزرتے۔ آئے درختوں تک آئے۔ بیری اور سفیدے کے درخت آپس میں اس طرح مل
 گئے تھے جیسے ایک دوسرے کو سہارا دے رہے ہوں۔ بیری پر چڑھنا ممکن نہیں تھا ورنہ ہم سب خراشوں کے ساتھ
 دوسری طرف اترتے۔ اس کے لیے سفیدے کا درخت ہی مناسب تھا۔ ایک سفیدہ دیوار سے کوئی پانچ فٹ کے
 فاصلے پر لگا تھا لیکن اس کا ایک دو شاخہ دیوار کے نزدیک گیا تھا۔ یہ کچی مٹی کی مدد سے بنائی کوئی نو فٹ اونچی
 اور شاید فٹ بھر موٹی دیوار تھی۔ وسیم نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور وہ اوپر چڑھ گیا اس نے دیوار کے نزدیک
 جا کر ایک رسی باندھ کر نیچے لٹکائی اور دوسرا آدمی رسی کی مدد سے اوپر گیا۔ اس نے اندر جھانکا اور آہستہ سے بولا۔
 ”اس طرف کوئی نہیں ہے یہ کروں کے پیچھے خالی جگہ ہے۔“

”نیچے اتر جاؤ۔“ وسیم نے اسے حکم دیا۔ وہ نیچے اتر گیا۔ درخت پر موجود ساتھی نے رسی واپس کھینچ کر
 ہماری طرف بھیگی اس بار میں گیا میرے بعد وسیم بھی نیچے آ گیا۔ البتہ درخت پر موجود ساتھی کو وہیں چھوڑ دیا۔ جو
 ہمارے ساتھ اندر آیا تھا اس کا نام حبیب تھا۔ یہاں اندھیرا تھا مگر سامنے والی طرف سے اتنی روشنی آ رہی تھی کہ
 کام چل رہا تھا۔ کھڑکیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس طرف چار کمرے تھے۔ یہ ساری پرانی طرز کی گول سلاخوں
 اور لکڑی کے پنوں والی کھڑکیاں تھیں اور خوش قسمتی سے تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ ورنہ کوئی جھانک کر دیکھتا تو ہم
 صاف دکھائی دیتے اور فوراً ہی وہ ہمارے استقبال کو دوڑتے۔ وسیم نے اشارے سے مجھے پیچھے کی طرف جانے کو
 کہا اور خود اپنے ساتھی کے ہمراہ اگلے حصے کی طرف بڑھا۔ میں پیچھے جانے لگا اور جب کسی کھڑکی کے پاس سے
 گزرتا تو نیچے بیٹھ جاتا کوئی اتفاقاً بھی کھڑکی کھول سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ میں ایک کھڑکی کے نیچے سے گزر رہا تھا
 کہ اچانک وہ کھلی اور کسی نے کھنکار کر غلغلی مچا دی۔ میں دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ شکر ہے کہ غلغلی مجھ پر نہیں گرا۔

”او..... جلدی آتا..... ابھی دوسروں کو بھی بھگتنا ہے۔“ ایک بو جھل نسوانی آواز نے بتایا کہ اس کمرے
 میں کیا ہو رہا تھا۔ آدمی نے کھڑکی بند کی اور واپس چلا گیا۔ میں آگے سرکا اور عقبی حصے کی طرف جا نکلا۔ دیوار کے
 کونے سے جھانک کر دیکھا۔ اس طرف کچھ آگے لیٹرین، غسل خانہ اور اس سے آگے باورچی خانے کا چھپرہ تھا۔
 کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔
 ”وسیم اس طرف کوئی نہیں ہے۔“

”سامنے گیٹ کے ساتھ دو بندے بیٹھے ہیں۔“ وسیم نے آگاہ کیا۔ ”ہی رہے ہیں مگر یہاں سے فاصلہ
 زیادہ ہے گولی درست جگہ نہیں لگی تو دوسرے ہوشیار ہو سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں ان کو اس طرف بلاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں لیٹرین کی چھت پر نکل کر پھینکوں گا۔“
 میں نے زمین سے ایک چھوٹا سا کنکر لیا۔ میرا مقصد آواز ان دونوں تک پہنچانا تھا اگر بڑا کنکر لیتا تو آواز

اندر کمروں میں بھی جاسکتی تھی۔ لیٹرین اور غسل خانے کی چھت ٹین کی تھی اور جب کنکر اس پر گرے تو آواز میرے توقع سے بلند آئی تھی۔ وسیم نے اطلاع دی۔ ”انہوں نے سن لی ہے اور اب ایک اس طرف جا رہا ہے۔ جیسے وہ لیٹرین والے حصے میں آئے آپ اس کا کام تمام کر دیں۔ یہ کام ایک ساتھ کرنا ہے۔“

”اوکے۔“ میں نے جواب دیا اور سالنکسر لگا پستول نکال لیا اور اس طرف آنے والے کا انتظار کرنا لگا۔ وہ کچھ دیر بعد نمودار ہوا۔ اس کے شانے پر سیون ایم ایم رائفل لٹک رہی تھی اور وہ مجھے نظروں سے لیٹرین اور غسل خانے کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے پوچھا۔

”اؤئے اندر کون ہے؟“

میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا اور وسیم سے کہا۔ ”ریڈی ٹوشوٹ۔“

”میں بھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تین ٹنک گولوں گا۔۔۔ ایک۔۔۔ دو تین۔“

اس کے تین کہتے ہی میں نے گولی چلا دی۔ تقریباً تیس فٹ کے فاصلے سے یہ ذرا مشکل نشانہ تھا مگر گولی ٹھیک جگہ لگی اور وہ بغیر آواز لگائے گر گیا۔ آواز اس کی رائفل کے گرنے سے آئی تھی لیکن یہ اتنی نہیں تھی کہ اندر موجود افراد سن کر چوہک جاتے۔ اگر کسی نے سنا بھی تھا تو توجہ نہیں دی۔ میں دوڑا اور اپنے شکار کو سمجھ کر عقبی آگ میں لے آیا تقریباً اسی وقت وسیم نے بھی یہی کام کیا۔ اس کا شکار بھی خاموشی سے مر گیا تھا۔ وسیم نے کہا۔ ”آہ۔ صحن تک آئیں جب تک ہم کمروں کو کلیئر کرتے ہیں۔“

میں دیوار کے ساتھ لگا ہوا صحن تک آیا وسیم اور اس کے ساتھی پہلے کمرے کے دروازے کے سامنے تھے وسیم نے آہستہ سے اسے کھولنے کی کوشش کی اور وہ کھل گیا۔ وہ ایک دم اندر گیا تو میرا دل ایک لمحے کورک گیا۔ اندر کوئی ہوتا تو وہ وسیم پر گولی چلا سکتا تھا مگر پھر اس نے کہا۔ ”کلیئر۔“

”تیسرے کمرے میں ایک مرد اور ایک عورت ہیں۔“ میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”تب اس کمرے کو نہیں دیکھنا ہے۔“ وسیم نے جواب دیا اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ ”اے کدوسرے کمرے میں رکھا گیا ہوگا۔“

دوسرا کمرہ بھی خالی تھا اور اس کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اب آخری کمرہ رہ گیا تھا۔ وسیم اس کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک طرف سے میں اور دوسری طرف سے وسیم کا آدمی اسے تحفظ دے رہے تھے۔ ابھی وہ اس کے دروازے تک پہنچا تھا کہ اچانک سامنے والی لائن سے ایک کھڑکی سے رائفل کی نال باہر نکلی اور اس سے پہلے میں وسیم کو خبردار کرتا نال شیلے اگلنے لگی تھی۔ میں نے رائفل اتاری اور کھڑکی کی طرف برست مارا فوراً ہی رائفل غائب ہو گئی تھی لیکن اس سے پہلے وہ دس بارہ گولیاں چلا چکی تھی۔ میں نے وسیم کو پکارا۔ کیونکہ اب میں دیوار اوٹ میں تھا۔ اس نے ہنسنی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“

مگر وہ ٹھیک نہیں تھا میں نے جہاں تک کر دیکھا تو وہ کمرے کے دروازے کے عین سامنے ڈھیر دکھائی تھا۔ میری رائفل بے آواز تھی لیکن دوسری رائفل کے شور نے سب کو ہوشیار کر دیا تھا۔ اب سب اندر ہی اندر رہے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے لیکن کوئی کمرے سے باہر آنے کو تیار نہیں تھا۔ سب گھاگ جرائم پیشہ تھے۔ ہنگامی حالات میں بھی اپنے اعصاب قابو میں رکھتے تھے۔ میں نے حفظِ مالٹا

کروں کی طرف ایک برست چلایا اور وسم کی طرف دوڑا۔ وہ دیوار سے ٹکا بیٹھا تھا اور اس کی دائیں ران سے خون بہہ رہا تھا۔ اس دوران میں اندر موجود افراد نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ کسی نے شاٹ گن سے فائر کیا تو گولی اس کمرے کے دروازے پر لگی جس کے ساتھ وسم بیٹھا ہوا تھا۔ گولی نے دروازہ میں سوراخ کر دیا اور مجھے فوری خیال آیا۔ دروازہ کے باہر تالا پڑا تھا میں نے پستول سے کنڈی کے آس پاس کئی فائر کیے اور بالآخر وہ لوٹ گئی۔ میں نے دروازہ اندر دھکیلا اور وسم کی جیکٹ کا کارہام کر اسے گھسیٹ کر اندر لے آیا۔ دیوار کی آڑ میں آکر ہم کسی قدر محفوظ ہو گئے تھے۔ اس دوران میں حبیب دیوار کی آڑ سے سامنے والے کروں کی طرف لائٹنگ کر رہا تھا۔ اس سے بھی ہماری بچت ہوئی ورنہ ہم سامنے تھے اور ہمیں آرام سے شوٹ کیا جاسکتا تھا۔

ایاز بار بار پوچھ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے میں نے اندر آکر اسے بتایا۔ ”ہم ٹریپ ہو گئے ہیں۔ میں اور وسم ایک کمرے میں ہیں۔ وسم زخمی ہے۔“

اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ ہم کمرے میں اکیلے نہیں تھے وہاں ایک کونے میں کوئی شخص بیٹھا تھا کیونکہ اندر روشنی نہیں تھی اس لیے اندر آتے ہی احساس نہیں ہوا تھا۔ میں نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”مجھے مت مارو میں ان کا ساتھی نہیں قیدی ہوں۔“

”یہ مالک مکان ہے۔“ وسم نے آہستہ سے کہا۔

اس کی طرف سے اطمینان کے بعد میں نے ایاز سے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا لیکن کوئی اندھا قدم مت اٹھانا۔ ابھی دشمن کی طاقت کا درست اندازہ نہیں ہے۔“

وسم نے حبیب سے پوچھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں گیٹ والی سمت ہوں۔“

”ٹھیک ہے وہیں رہو اور اگر کوئی خطرہ محسوس ہو تو واپس چلے جانا۔“

”نہیں۔“ ایاز کی آواز آئی۔ ”ہم آپ کو چھوڑ کر واپس نہیں جائیں گے۔“

میں نے وسم کے زخم کا معائنہ کیا۔ گولی ران کے اندر تھی لیکن اس نے ہڈی کو نقصان نہیں کیا تھا۔ میں نے خون روکنے کے لیے اپنا رومال کس کر زخم پر باندھ دیا۔ اس سے خون بہنے کی رفتار میں کمی آئی تھی لیکن وسم کو طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہم محبت میں جس مہم کو آسان سمجھ کر آئے تھے وہ اتنی آسان بھی نہیں تھی۔ یہ یقیناً جلد بازی اور ناقص پلاننگ تھی جس کی وجہ سے ہم یہاں ٹریپ ہو گئے تھے اور باہر دشمن مورچہ بند تھا۔ اب وہ اتنی آسانی سے ہمیں یہاں سے نکلنے کی اجازت نہ دیتا۔ کروں کی طرف سے روہرہ کر پستول، شاٹ گن اور رائفل کا سنگل فائر ہو رہا تھا اور گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی گزر رہی تھیں۔ دروازے کے عین سامنے کھڑکی تھی۔ میں پہلے فرش سے لگ کر دائیں طرف گیا کیونکہ یہ کمرہ آخر میں تھا اس لیے دروازے سے گزرنے والی گولیاں زیادہ تر بائیں طرف آرہی تھیں۔ مالک مکان بھی اسی طرف بیٹھا ہوا تھا۔ قریب آنے پر مجھے پتا چلا کہ اس کی حالت خراب تھی۔ وہ پھنے ہوئے کپڑوں میں تھا اور یہ کپڑے جا بے جا خون سے آلودہ تھے۔ نیم تاریکی میں اس کے چہرے کے زخموں کے نشانات دکھائی دے رہے تھے باقی جسم کا نہ جانے کیا حال تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”ہم تمہیں چھڑانے آئے ہیں۔“

وہ چونکا۔ ”تم کون ہو؟“

”جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔“ میں نے کہا اور خطرہ مول لے کر کھڑکی کے پاس گیا۔ اس کے پٹ کھولے جو مستقل بند رہنے سے جام ہو گئے تھے اور خاصی مشکل سے کھلے۔ اس پر بھی خاصی موٹی سلاخی تھیں اور انہیں توڑنا تقریباً ناممکن تھا۔ اسٹیل بلیڈ کی آری مل جاتی تب بھی ایک سلاخ کاٹنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ جاتا۔ جب کہ وہ بھی نہیں تھی۔ حبیب نے کہا۔ ”یہ لوگ کمروں کے پیچھے آگئے ہیں اب دیوار کی اوٹ سے مجھ پر فائرنگ کر رہے ہیں۔“

”تم پیچھے گلی میں آ جاؤ۔“ وسیم نے اسے حکم دیا اور پھر ایاز سے پوچھا۔ ”تم کیا کر رہے ہو؟“

”میں اور اسماعیل دیوار کے ساتھ ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہم سامنے سے نہیں نکل سکتے ہیں اس کمرے کے پیچھے کھڑکی ہے۔ اگر کسی طریقے سے اس کی سلاخیں نکال دی جائیں تو ہم باہر نکل سکتے ہیں۔ ہم جس شخص کے لیے آئے تھے وہ بھی یہاں موجود ہے۔“

”میں کچھ کرتا ہوں۔“ ایاز نے کہا۔ ”آپ ان لوگوں کو روکیں اور صحن میں نہ آنے دیں۔“

میں نے کہا۔ ”اسماعیل سے کہو کہ وہ گلی کا دوسرا سرا سنبھال لے ورنہ وہ لیٹرین والی سمت سے گھوم کر اس طرف بھی آ سکتے ہیں۔“

اسماعیل اندر آ گیا تھا۔ میں واپس دروازے تک آیا۔ اس دوران میں ان لوگوں نے صحن میں جملنے والی تمام روشنیاں فائرنگ کر کے گل کر دی تھیں۔ اپنے کمروں کی روشنیاں وہ پہلے ہی بجھا چکے تھے۔ یہ ان کی احتیاطی تدبیر تھی لیکن ایک لحاظ سے انہوں نے ہمارا کام آسان کیا تھا۔ میں نے ٹائٹ ویڈن نکال کر پہن لی۔ یقیناً ہمارے باقی ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔ فوراً ہی مجھے سامنے والے کمروں کے دروازوں اور کھڑکیوں کے ساتھ روشن ہونے لگے۔ وہ چھپے ہوئے تھے لیکن کچھ نظر بھی آرہے تھے اور یہ سامنے کے چاروں کمروں میں تھے۔ تشویشناک طور پر ان کی تعداد ہمارے اندازے سے زیادہ تھی۔ ان چار کمروں میں کم سے کم دس افراد تھے۔ جب کہ دو مارے گئے تھے اور دو ہمارے برابر والے کمرے میں محصور تھے۔ ان کی طرف سے ابھی تک کوئی ردِ عمل سامنے نہیں آیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ غیر مسلح تھے۔ وہ خاموش بیٹھ کر موقع کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے حبیب اور اسماعیل کو ان کے خطرے سے خبردار کیا۔ ”گیٹ سے تیسرے کمرے میں کم سے کم ایک جوڑا ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں اگر انہوں نے کوئی حرکت کی تو میں کمرے میں گرنیڈ ماروں گا۔“ حبیب نے کہا اس کے پاس گرنیڈ تھے۔

”ٹائٹ ویڈن سے یہ دکھائی دے رہے ہیں۔ انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کرو۔“ میں نے کہا

”شوٹ ٹوکل؟“ حبیب نے تصدیق چاہی۔

”احتمالاً باتیں مت کرو۔“ وسیم غرایا۔ ”کیا اس وقت ہم کوئی بیچ کھیل رہے ہیں۔“

”سوری کمائنڈر۔“ حبیب نے جلدی سے معذرت کی۔ اس دوران میں ہمیں نے سامنے والے کمرے

میں موجود کھڑکی کے پٹ کے ساتھ لگے ہولے کا نشانہ لیا اور ایوزی کا مختصر برسٹ مارا۔ یہ کارگر رہا کیونکہ دوسری

طرف سے ایک چیخ سنائی دی اور ہیولہ غائب ہو گیا۔ وہ مرا نہیں تھا تب بھی زخمی ضرور ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا کہ اگر دو عورتیں تھیں تو باقی ایک درجن مرد تھے اور ان میں سے دو مارے گئے تھے ایک زخمی تھا اور ایک برابر والے کمرے میں تھا گویا سامنے والے کمروں میں آٹھ مسلح افراد تھے اور یہ تعداد کم نہیں تھی۔ کیونکہ وہ سب چھپے ہوئے جرائم پیشہ اور اسلحے کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔ فائرنگ سے پتا چل رہا تھا کہ ان کے پاس اسلحے اور ایمونیشن کی کمی بھی نہیں تھی۔ حبیب اور اسماعیل بھی ٹائٹ ویشن کی مدد سے انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ہماری طرف سے ایک کارگر فائر کے بعد وہ سب مختاپ ہو گئے تھے اور اب محفوظ آڑ میں تھے۔

”جناب میں اندر آنا چاہتا ہوں۔“ ایاز کی آواز آئی۔ ”میں کچھ چیزیں لایا ہوں کھڑکی میں راستہ بنانے کے لیے۔“

میں نے پوچھا۔ ”باہر کون دیکھ رہا ہے۔“

”میں نے سیر اور کریم کو بلا لیا ہے۔ ایک سامنے ہے اور دوسرا ہماری والی پوزیشن پر ہے۔“

”ٹھیک ہے آ جاؤ لیکن محتاط رہنا..... گولیاں دروازے سے گزر کر کھڑکی تک آرہی ہیں۔“

”میں خیال رکھوں گا۔“ ایاز نے کہا اور ایک منٹ بعد کھڑکی کے سامنے نمودار ہوا۔ میں نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ تاکہ گولی اس طرف آئے تو پٹ سے گزر کر آئے۔ ایاز نے ایک بھاری تھوڑا اور چھینی اٹھا رکھی تھی۔ اس نے کونے والی سلاح پر چھینی رکھ کر تھوڑے سے ضربیں لگا کر شروع کیں۔ سلاخیں سینٹ کی چوکت میں پوسٹ تھیں۔ اگر یہ لکڑی ہوتی تو کام آسان ہو جاتا۔ مگر سینٹ اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹی۔ یہ پرانی دیوار تھی لیکن نہایت مضبوط تھی۔ میں ایاز کی جدوجہد دیکھنے کے بجائے سامنے نظر رکھنے کے لیے آ گیا۔ اسماعیل اور حبیب کو بھی محتاط رہنے کو کہا۔ وسم فی الحال کچھ نہیں کر سکتا تھا اس کا خون بہنا بند ہو گیا تھا اس لیے وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ یہاں موبائل سگنل نہیں تھے بلکہ ان کے لیے درگاہ مرشدیہ کے پاس جانا پڑتا تھا۔ حبیب اور اسماعیل کی موجودگی ضروری تھی۔ جب کہ کریم اور سیر کا بھی اپنی جگہ رہنا ضروری تھا۔ لازمی بات تھی جس طرح ہم کسی سے رابطہ نہیں کر سکتے تھے اسی طرح جیڈ ایڈز کمپنی کسی سے رابطہ کر کے مدد طلب نہیں کر سکتی اس کے لیے یہاں سے نکلنا ضروری تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے کریم سے کہا۔

”عقب کا خیال رکھنا کوئی دیوار پھلانگ کر فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔“

”میں دیکھتا ہوں۔“ کریم نے کہا اور اس طرف گیا اور فوراً ہی فائرنگ کی آواز آئی کریم نے بتایا۔ ”دو

دیوار سے کودے تھے میں نے دونوں کو اڑا دیا ہے۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ درگاہ مرشدیہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی شاید دو یا ڈھائی کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور اگر وہ وہاں تک پہنچ جاتے تو مدد لانے میں چند منٹ بھی نہیں لگتے اور ہم گھیرے میں آ جاتے۔ وسم نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ کے ذہن میں بروقت خیال آیا۔“

”بس اچانک آ گیا۔ تین اطراف ہم نے کور کر رکھی ہیں لیکن وہ عقب سے آسانی سے فرار ہو سکتے ہیں۔

بدوقت خیال آ گیا ورنہ وہ نکل جاتے تو دس منٹ کے اندر مدد لا سکتے تھے۔“

دو افراد کے مارے جانے سے ان لوگوں کا حوصلہ پست ہوا تھا اور انہوں نے پھر کوشش نہیں کی بلکہ اس طرف بھی فائرنگ روک دی تھی اب سناٹے میں صرف ہتھوڑا چلنے کی آواز آرہی تھی۔ ایاز پوری قوت صرف کر رہا تھا۔ اس کے باوجود دیوار ٹوٹنے کی رفتار سست تھی۔ دس منٹ بعد میں جائزہ لیا تو مشکل سے چند انچ گہرا سوراخ ہوا تھا اس رفتار سے کم سے کم دوسلاخیں نکالنے میں کئی گھنٹے لگ جاتے۔ وسم نے کہا۔ ”ہمیں ہینڈ گرنیڈ استعمال کرنا پڑے گا۔“

”نہیں اس میں خطرہ ہے اس کمرے میں کوئی آدمی نہیں ہے۔“ میں نے تجویز رد کر دی۔ ”ہم انتظار کر سکتے ہیں۔ ایاز اب تم حبیب کو دے دو۔“

ایاز پسینے میں ہڑبڑا رہا تھا اور اس کے ہاتھ سے ہتھوڑا پھسل رہا تھا۔ حبیب نے اس کی جگہ سنبھالی اور دیوار کاٹنے لگا۔ ایاز اس کی جگہ چلا گیا تھا۔ وسم اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بھول رہا تھا کبھی کبھی اس کا سر آگے ڈھلک جاتا تھا۔ مسلسل خون بہنے سے وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ یہاں کہیں پانی بھی نہیں تھا لیکن ایاز باہر سے آتے ہوئے پانی کی بوتل لے آیا اور میں نے وسم کو پانی پلایا تھا۔ اس کے باوجود ہر گزرتے لمحوے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ میں نے زخم کا معائنہ کیا خون برس رہا تھا۔ رد مال مکمل طور پر خون سے بھیگ گیا تھا۔ ایاز نے اپنا رد مال دیا تھا میں نے وہ بھی زخم کے اوپر باندھ دیا۔ وسم کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی اور اس کے لیے یہاں سے نکالنا لازمی تھا۔ حبیب زیادہ بہتر انداز میں کام کر رہا تھا۔ ایاز اس کو کرتا تھا اس لیے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ حبیب کا انتہیانا اس سے بہتر تھا اس لیے وہ ر کے اور تھکے بغیر مسلسل ہتھوڑا چلا رہا تھا اور اس نے پانچ منٹ میں ایک سلاخ نکال لی۔ اسے زور لگا کر الگ کیا اور پھر نیچے کھینچ کر الگ کر دیا۔ ہر سلاخ کے درمیان پانچ انچ کا فاصلہ تھا اور نصف انچ موٹی سلاخ تھی گویا اب گیارہ انچ کا خلا بن گیا تھا لیکن ہم اس سے نہیں گزر سکتے تھے۔ دوسری سلاخ نکالنا لازمی تھا۔ حبیب اب دوسری سلاخ کے نچلے حصے میں سینٹ کاٹ رہا تھا۔ اپنا کام نصف کر کے اس نے ہتھوڑا اور چھینی اسماعیل کو دے دیا اور خود اس کی جگہ سنبھال لی تھی۔ میں نے سمیر اور کریم سے گاؤں والوں کا رد عمل پوچھا۔ کریم نے کہا۔

”اس طرف مکمل خاموشی ہے بلکہ جن گھروں میں روشنیاں تھیں اب وہاں اندھیرا ہے۔“

اس کا مطلب تھا کہ گاؤں والے مداخلت نہیں کرتے۔ اس دوران میں مالک مکان بالکل خاموش بیٹھا تھا نیم تاریکی میں اس کے خدو خال واضح نہیں تھے۔ جب ہم اندر آئے تو وہ خوفزدہ ہوا تھا لیکن اب پُرسکون تھا۔ اب تک مجھے اس کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔ حالانکہ وسم نے متعدد بار اس کا ذکر کیا تھا لیکن ہر بار اسے مالک مکان ہی کہا تھا۔ اسماعیل نے زیادہ تیزی سے کام کیا اور دوسری سلاخ کی سینٹ چند منٹ بعد کاٹ دی تھی۔ یہ سلاخ زیادہ مضبوط تھی اس لیے میں نے بھی اسماعیل کی مدد کی اور بالآخر اسے موڑ کر نکالنے میں کامیاب رہے تھے۔ اب خلا تقریباً پورے دو فٹ کا تھا اور ہم کسی قدر کوشش کے بعد اس سے نکل سکتے تھے۔ ایاز نے کہا۔

”میں گاڑی لینے جا رہا ہوں۔ جب تک میں نہ آؤں آپ لوگ کمرے سے مت نکلے گا۔“

میرا بھی یہی خیال تھا کیونکہ کمرے سے نکل جانے کی صورت میں دشمن کو موقع ملتا اور وہ محن میں آسکتا تھا۔ یہاں سے نکلنے کے لیے اسے کمرہ میں رکھنا ضروری تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر نکل کر تجربہ کیا۔ میں اور

مالک مکان اس سے آسانی سے نکل سکتے تھے جب کہ تقریباً بے ہوش و سیم کو مشکل پیش آتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ نو دس فٹ اونچی دیوار پر کیسے چڑھے گا عام حالات ہوتے تو شاید چڑھ بھی جاتا لیکن پیچھے دشمن تھے اور یہ بات یقینی تھی کہ وہ ہمارے پیچھے آتے۔ اس پر مجھے خیال آیا اور میں نے حبیب سے کہا۔ ”احاطے میں موجود گاڑیوں کے بائراڑا دو۔“

اس نے احاطے میں کھڑی ایک جیب اور ایک پک اپ کے بائراڑا دیئے اور اب وہ آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ جو خیال مجھے آیا تھا وہی ایاز کو بھی آیا وہ چند منٹ میں ہیکلس لے آیا تھا اور اس نے مجھ سے کہا۔ ”وسیم کیسے آئے گا۔ ہم کسی نہ کسی طرح دیوار پار تو کرائیں گے لیکن اس میں پیچھے سے حملے کا خطرہ ہے۔“

”یہی بات میرے ذہن میں آئی تھی۔ اس کا کیا حل ہو سکتا ہے۔“

حبیب کے پاس گرینڈ ہے وہ دیوار اڑا دے۔“ ایاز نے قابل عمل حل پیش کیا۔

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ میں خوش ہو گیا۔ ”امید ہے اتنا بڑا سوراخ ہو جائے گا کہ ہم اس سے با آسانی گزر سکیں گے لیکن تم لوگ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ۔“

حبیب اور اسماعیل کمرے میں آگئے اور حبیب نے گرینڈ کی پن کھینچ کر اسے کچھ آگے دیوار کے پاس پھینکا۔ ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور دیوار کا یہ حصہ ہی زمین بوس ہو گیا۔ جب غبار اور دھواں چھٹا تو مجھے دیوار میں سوراخ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پہلے میں اور مالک مکان باہر نکلے۔ پھر اسماعیل اور حبیب نے وسیم کو سہارا دے کر کھڑکی سے باہر نکالا اور پھر خود بھی نکل آئے۔ میں نے وسیم کو شانے پر اٹھا لیا اور ان دونوں سے کہا۔ ”مجھے کور دو..... کوئی راستے میں آئے تو اسے بے دریغ اڑا دیتا۔“

مگر اپنے چار ساتھیوں کے مارے جانے کے بعد ان کی بہتیں پست ہو گئی تھیں اور کوئی ہمارے راستے میں نہیں آیا تھا حد یہ کہ تیسرے کمرے میں موجود جوڑے نے بھی دم سادھ لیا تھا۔ ہم بحفاظت سوراخ سے گزر کر باہر آگئے۔ ایاز ہیکلس پاس ہی لے آیا تھا اس نے عقبی دروازہ کھولا ہوا تھا۔ میں وسیم کے ساتھ اندر گھس گیا۔ اسماعیل اور حبیب پیچھے کھلی جگہ چڑھ گئے۔ تاکہ کسی طرف سے مزاحمت ہو تو وہ فوری جواب دے سکیں۔ ہمارے بیٹھے ہی ایاز نے گاڑی چلا دی۔ میں نے کریم اور میر سے کہا۔ ”تم بھی پیچھے آؤ..... اگر کوئی تعاقب کرنے کی کوشش کرے تو اس کی گاڑی کو تارہ کر دیتا۔“

ہم سڑک تک آئے تھے کہ درگاہ مرشدیہ والی سمت سے تیز روشنیاں نمودار ہوئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کئی بڑی گاڑیاں آرہی ہوں۔ میں نے ایاز سے کہا۔ ”جلدی نکلو میرا خیال ہے دشمنوں کو مدد آگئی ہے۔“

مگر جب ایاز نے گاڑی کا رخ ہنڈی کی طرف کیا تو سامنے سے بھی دو گاڑیاں نمودار ہوئی تھیں۔ ہم دونوں طرف سے گھر گئے تھے۔



سامنے سے نمودار ہونے والی دونوں گاڑیاں بڑی تھیں اور شروع میں مجھے لگا کہ انہوں نے راستہ روک کر سڑک بلاک کر دی ہے۔ مگر جب وہ نزدیک آئیں تو ان کے درمیان میں راستہ تھا۔ انہوں نے ہیکلس کو روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے دائیں بائیں سے گزرتی آگے چلی گئیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کچھ آگے نکلتے

ہی وہ ذرا گھوم کر رکیں اور پھر ایک گاڑی کی چھت سے پر ایک شخص ایل ایم جی سمیت نمودار ہوا۔ اس نے اس کا ٹرائی پوڈ چھت پر بھاتے ہوئے اس کی نال کارخ درگاہ مرشدیہ کی طرف سے آنے والی گاڑیوں کی طرف کیا اور پھر فائرنگ شروع کر دی۔ ان گاڑیوں کی روشنی میں وہ شخص صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آنے والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ان کا استقبال اس طرح کیا جائے گا۔ ایل ایم جی والا گاڑیوں کے ٹائروں اور سامنے والے حصوں کو نشانہ بنا رہا تھا چند سیکنڈ میں سامنے والی بڑی جیب کے اگلے دونوں ٹائرز برست ہو چکے تھے اور وہ گھوم کر مرکز سے اتر گئی۔ اس کے پیچھے والی گاڑی تقریباً رک چکی تھی مگر وہ بھی ایل ایم جی کی خوفناک مار کے اندر تھی۔ اس کا حشر نفر ہو گیا اور اس میں موجود افراد اتر واپس بھاگے تھے۔ مشین گنر جان بوجھ کر صرف گاڑیوں کو نشانہ بنا رہا تھا اس نے کسی کو مارنے کی کوشش نہیں کی ورنہ ان میں سے کسی کا بچنا مشکل ہو جاتا۔ ایل ایم جی کی گولی ایک فٹ موٹی کنکریٹ سے گزر جاتی گاڑیوں کی پتلی شیٹ کی تو اس کے سامنے کوئی اوقات ہی نہیں تھی۔

تیسری گاڑی جو سب سے پیچھے تھی وہ پہلے ہی واپسی کے مڑ چکی تھی۔ کھیتوں میں اتر جانے والی گاڑی سے بھی لوگ نکل کر بھاگ رہے تھے کسی نے جوابی کارروائی کی کوشش نہیں کی کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ ایک فائر کریں گے تو جواب میں گولیوں کی بارش ہوگی اور گولی بھی ایل ایم جی جو فولادی چادر سے بے تکلف گزر جاتی تھی انسانی جسم کی تو اس کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ دوسری گاڑی کی چھت پر بھی ایک اور ایل ایم جی بردار موجود تھا مگر اس نے کارروائی میں حصہ نہیں لیا تھا ایک ہی کافی ثابت ہوا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ آنے والی گاڑیوں کا کوئی فرد زخمی نہیں ہوا تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی سے زیادہ ایل ایم جی استعمال کرنے والے کی مہارت تھی کہ اس نے صرف گاڑیوں کو نشانہ کیا اور انہیں دہشت زدہ کیا تھا۔ ایاز نے اس دوران میں ہیکلس کو آگے بڑھا دیا تھا اور ہم ان دونوں گاڑیوں سے کوئی پانچ سو گز آگے نکل گئے تھے۔

اگرچہ یہ ایل ایم جی کی مار کے لحاظ سے دوری نہیں تھی مگر آنے والوں کا اندازہ دوستانہ تھا اگر وہ ہمارے دشمن ہوتے تو ہمارے پاس سے یوں نہ گزر جاتے اور ہمارے پیچھے آنے والے دشمنوں کے خلاف کارروائی نہ کرتے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میدان صاف ہو گیا اور دونوں گاڑیاں پلٹ کر واپس آئیں۔ ایک ہم سے آگے نکل گئی اور دوسری ہیکلس کے پاس رکی اور اس سے ایک عورت نکلی۔ حالات نے مجھے ہر حال میں پرسکون رہنا سکھا دیا تھا اور مجھ پر سر پرانز ذرا کم اثر کرتے تھے لیکن اس وقت میں حیران ہوا تھا۔ وہ مہرہ تھی۔ وہ بلا تکلف ایاز کے ساتھ والی سیٹ پر آگئی اور بولی۔ ”اب نگو، پیچھے کوئی نہیں آئے گا لیکن امکان ہے آگے پولیس نہ آجائے۔“

”تم کہاں سے آن چکیں؟“

”بس آگئی۔“ اس نے کہا۔ ”اگلی گاڑی میں کرنل ہے۔“

میں ایک بار پھر حیران ہوا تھا۔ چند دن پہلے تک کرنل شدید زخمی حالت میں ایبٹ آباد کے ایک اسپتال میں پڑا ہوا تھا اور یہ ظاہر خود اپنی مدد کرنے کے قابل نہیں تھا مگر اس وقت جب ہمیں مدد کی ضرورت تھی وہ اچانک نمودار ہوا تھا۔ ”کرنل کی حالت کیسی ہے؟ اور تم لوگوں کو ہمارے بارے میں کیسے پتا چلا؟“

”بتاتی ہوں۔“ مہرونے کہا اور اپنی ہلکی سی ہاف جیکٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا داکی ٹاکی نکالا۔ ”سب

ٹھیک ہے نا؟“

”آل کٹر میڈم۔“ دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ اس دوران میں مہرہ کے ساتھ آنے والی دونوں گاڑیاں خاصی آگے نکل گئی تھیں۔ واک ٹاکی رکھ کر اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر چوگی۔
 ”وسیم کو کیا ہوا؟“

”اس کی ران میں گولی لگی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”ہم پندرہ منٹ میں اپنے ٹھکانے پہنچ جائیں گے وہاں وسیم کو طبی مدد مل سکتی ہے۔“
 ”اس کی ضرورت نہیں ہے ہمارا ٹھکانہ ہے اور زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“ میں نے انکار تو نہیں کیا لیکن اس پر واضح کر دیا کہ ہم اس کے ساتھ اس کے کسی ٹھکانے پر نہیں جائیں گے۔ اس نے شانے اچکائے۔
 ”مرضی تمہاری لیکن ہم تمہارے اس ٹھکانے سے بے خبر نہیں ہیں درحقیقت اسی وجہ سے ہمیں تمہارے بارے میں پتا چلا اور جب تمہارے ساتھیوں سے پتا چلا کہ تم لوگ اس طرف آئے ہوئے ہو اور تم سے رابطہ بھی نہیں ہو رہا تو ہم وہاں سے چل پڑے تھے۔“

”ہمارے ٹھکانے کے بارے میں کیسے پتا چلا؟“

”کیونکہ اتفاق سے ہم اس جگہ کے پاس ہی رکے ہوئے ہیں۔“ مہرہ بولی۔

”یہ لاؤشکر کہاں سے آیا؟“

”یہ کرنل کے خاص آدمی ہیں مگر یہیں موجود تھے۔ اگر یہ ساتھ ہوتے تو شاید کرنل زخمی نہ ہوتا۔“

”مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ کرنل اور تمہاری آپس میں کوئی سیٹنگ ہو گئی ہے؟“

”ہاں اس نے مجھے اپنی بیوی تسلیم کر لیا۔“ مہرہ نے بہم سے انداز میں کہا۔ اس کی بات سے واضح نہیں تھا کہ کرنل نے صرف اسے بیوی تسلیم کیا ہے اور اس نے جو تبدیلی مذہب اور نکاح کا ٹانگ کیا تھا اس کا کیا ہوا۔ اگر اس کی نیت میں دھوکا تھا تو یہ شادی سرے سے ہوئی نہیں تھی۔ انہیں دوبارہ شادی کرنی تھی۔ مگر یہ اس کا خاصی حد تک ذاتی معاملہ تھا اور میں اس میں ایک حد سے زیادہ دخل نہیں دے سکتا تھا اور یہ موقع بھی ایسا نہیں تھا کہ میں اس کی شادی اور کی مذہبی اور معاشرتی حیثیت لے کر بیٹھ جاتا۔ وسیم بے ہوش ہو گیا تھا میں نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس کی ٹانگ کا زخم چیک نہیں کیا تھا۔ مگر اس سے خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ جیسے ہی موبائل پر سگنل نمودار ہوئے میں نے کوٹھی کال کی اور وہاں وسیم کی حالت کے بارے میں بتایا۔

”کسی ڈاکٹر کا بندوبست کرو۔۔۔۔۔ ایمر جنسی میں۔“

فون بند کر کے میں نے مہرہ کی طرف دیکھا۔ ”کتنے آدمی ہیں تمہارے ساتھ؟“

”چار آدمی ہیں ایک کرنل اور ایک میں ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے حیرت سے کہا۔ ”بس تم لوگ چار آدمیوں کے ساتھ نکل آئے؟“

”ہاں یہ چار آدمی چالیس پر بھاری ہیں۔“ وہ بولی۔ ”تم نے دیکھا نہیں صرف ایک آدمی نے آنے والوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا، ویسے یہ تھے کون؟“

”مرشد کا نولہ تھا، ان لوگوں نے ہمارے ایک آدمی کو پکڑ لیا تھا اسے چھڑانے آئے تھے مگر خود بچس گئے۔

باہر نکلے تو مرشد کے اور آدمی آ گئے۔ میں تو تمہیں بھی ان کا آدمی سمجھا تھا۔“

ہم کونھی کے پاس پہنچ گئے تھے۔ مہرو نے پھر واک کی ٹاکی پر رابطہ کیا اور کرنل کو بتایا۔ ”یہ ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

کرنل کی طرف سے ”شہباز کسی پر اعتماد کرنے والا آدمی نہیں ہے۔“

”ہاں میں یا تو سو فیصد اعتماد کرتا ہوں یا بالکل نہیں کرتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”درمیان کی کوئی صورت نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو، ویسے میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہنا، ہم تم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔“

کونھی آگئی تھی۔ کرنل کی دونوں گاڑیاں وہیں رکی ہوئی تھیں۔ ایاز نے ہیلکس روکی تو مہرو نیچے اتر گئی۔ ”بائے پھر ملیں گے۔“

”ہائے۔“ میں نے کہا تو وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے جاتے ہی ایاز نے گاڑی کونھی کی طرف بڑھا دی۔ گیٹ کھل گیا اور اندر وسیم کے آدمی موجود تھے اسے اتار کر فوری طور پر اندر لے جایا گیا۔ ان میں سے جو طبی مدد کا ماہر تھا وہ وسیم کو دیکھنے لگا۔ میری ہدایت پر بالک مکان کو اندر پہنچا دیا تھا۔ ابھی تک اس پر غور نہیں کیا تھا کیونکہ مجھے وسیم کی فکر لگی تھی۔ اس کے پاؤں سے پنی اور پھر پتلون کا پانچھ کاٹ کر اتارا گیا۔ گولی اندر ہی تھی۔ اسے نکالنے کے لیے ایک ڈاکٹر اور اوزاروں کی ضرورت تھی۔ وسیم کے دو آدمی ڈاکٹر لینے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ اب دودھ گرم کر کے لے آیا اور چیچ سے وسیم کے منہ میں ڈکانے لگا۔ اس کا اچھا اثر ہوا اور وہ ہوش میں آنے لگا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وسیم کے آدمی ایک ڈاکٹر کو لے آئے وہ اسے اس کے کلینک سے لائے تھے اور راستے میں اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اس لیے وہ سخت ہراساں دکھائی دے رہا تھا کمرے میں لا کر اس کی پٹی کھولی تو اس نے کہا۔

”اوہ بھائی تم لوگ مجھے کہاں لے آئے ہو۔“

”فکر مت کریں ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”آپ کو کوئی مشکل نہیں ہوگی پنی باندھنا بھی مجبوری تھی آپ زخمی کو دیکھیں اور اسے ٹریٹ کریں۔“

اس نے وسیم کا زخم دیکھا اور مستعد ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے جراثیم کش سے زخم کی صفائی کی۔ خون صاف کیا تا کہ اندر کی پوزیشن بہتر سامنے آئے۔ اس نے کہا۔ ”گولی نکالنی ہے گرم پانی چاہیے۔“

باقی ڈاکٹر کے پاس سب کچھ تھا۔ اسے فوری گرم پانی مہیا کر دیا گیا۔ اس نے پہلے وسیم کو سن کرنے والا انجکشن دیا اور پھر آلات جراحی کی مدد سے باآسانی گولی نکال لی۔ اس دوران میں خون دوبارہ بہنے لگا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”بڈی کو نقصان تو نہیں ہوا ہے؟“

”نہیں بڈی بچ گئی ہے لیکن خون بہت بہا ہے بلڈ پریشر کم ہے۔ انہیں طاقت کا انجکشن دے رہا ہوں لیکن تین چار دن احتیاط کریں بیڈ ریست کریں اور قوت والی لیکن زود ہضم خوراک لیں۔ دوائیاں لکھ کر دے رہا ہوں وہ منگوا لیں۔“

”ڈریسنگ کا کیا ہوگا۔“

”کوئی دیکھ لے کہ میں کیسے ڈرینگ کر رہا ہوں بعد میں اسی طرح ڈرینگ کرنی ہے تین دن بعد ضرورت نہیں پڑے گی صرف دغم کو رگڑ سے بچانے کے لیے اوپر سے پٹی لپیٹ دیں۔ ایک ہفتے میں ٹھیک ہو جائے گا مگر چند روز تک احتیاط کرنی ہوگی بھاگ دوڑ نہیں کرنی ہے اور نہ ہی اس ٹانگ پر زور دینا ہے۔“

وسیم ہوش میں تھا اور سن رہا تھا اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب کو پورے احترام کے ساتھ چھوڑاؤ اور ان کے فیس بھی دینی ہے۔“

جو ڈاکٹر کو لائے تھے وہی اسے چھوڑنے اور دوائی لینے چلے گئے۔ دوائی چنڈی سے ملتی کیونکہ اس وقت آس پاس کے سارے میڈیکل اسٹور بند ہو چکے ہوتے ڈاکٹر بھی انہیں فیض آباد سے ملا تھا۔ ٹریٹ منٹ کے بعد وسیم کی حالت بہتر ہو گئی تھی اس نے مجھ سے کہا۔ ”وہاں سے نکلنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“

”نہیں کیونکہ غیر متوقع طور پر مہر واد کرٹل اپنے آدمیوں سمیت مدد کو آگئے تھے باہر نکلنے پر مرشد کے آدمیوں نے گھیرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔“

وسیم چونکا۔ ”مہر واد کرٹل وہ کہاں سے آگئے؟“

”یہ تو تمہارے آدی بتائیں گے کیونکہ وہ ان سے ملے تھے اور انہوں نے ہی انہیں بتایا تھا کہ ہم کہاں ہیں وہ مدد کے لیے چل پڑے۔“

کنگ سائز گلاس میں گرم دودھ نے وسیم کی توانائیاں بحال کر دی تھیں۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اس نے اپنے آدمیوں سے پوچھا اور پھر پتا چلا کہ شجاعت باہر تھا کہ اس کی ملاقات مہر واد سے ہو گئی اس نے مہر واد کو سب بتا دیا یہ بھی کہ ہم کہاں ہیں۔ وہ مجھ سے ملنے چلی آئی اور جب اسے پتا چلا کہ ہم ہم پر نکلے ہوئے ہیں اور خاصی دیر ہو گئی ہے تو وہ ہماری مدد کے لیے نکل کھڑی ہو گئی تھی۔ وسیم نے شجاع کو جھڑا اور وہ بے چارہ کان دبائے سن رہا پھر میں نے مداخلت کی۔ ”چل یار جانے دے، نادانستگی میں ہو گیا اور پھر ہمارے حق میں اچھا ہی ہوا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ڈسپلن بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس طرح سب اپنی مرضی سے فیصلے کر کے رہے تو ہمارا بیڑا غرق ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔“

وسیم کو ٹھنڈا کر کے میں باہر آیا تب مجھے بے چارے مالک مکان کا خیال آیا وہ بھی زخمی تھا اور اسے طبی امداد کی ضرورت تھی میں نے اس کے بارے میں پوچھا۔ اس کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی اور دوسرا لباس دے دیا تھا۔ میں کمرے میں آیا تو وہ کھن گئے سلاکس چائے کے ساتھ کھا رہا تھا۔ میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا اور مجھے اس کے نقوش جانے پہچانے لگے تھے۔ چہرے پر ہلکی سی بڑھی ہوئی داڑھی تھی اور پھر مار پیٹ کے نشانات بھی تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں کہ ان لوگوں کی قید سے نکالا لیکن اب مجھے گھر جانے دیں میرے بیوی بچے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

میں نے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”آپ فکر نہ کریں آپ آج ہی اپنے گھر میں ہوں گے۔“

”میرا نام فرخ شاہ ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ میں چونکا اب میں نے اسے پہچان لیا تھا یہ ان دنوں کی بات تھی جب میں بنانا اس مصیبت میں پڑا تھا اور مرشد سے چھپتا پھر رہا تھا۔ راجا عمر دراز نے مجھے اسلام آباد

میں ایک شخص کے پاس بھیجا تھا جو میری اور میرے ساتھیوں کی مدد کرتا۔ اگرچہ اس سے میری ایک ہی ملاقات ہوئی تھی اور دوبارہ ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے نقوش میرے ذہن میں تھے لیکن نام اور موقع بھول گیا تھا۔ اس نے نام بتایا تو مجھے یاد آ گیا۔

”آپ کو شہباز ملک یاد ہے؟“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک آئی اس نے گرم جوشی سے کہا۔ ”میرے خدا..... میں بھی سوچ رہا تھا کہ آپ کیوں جانے پہچانے لگ رہے ہیں۔“

”میں نے بھی آپ کو نام سے پہچانا..... اس ایک ملاقات کے بعد دوبارہ موقع نہیں ملا تھا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”راجا صاحب نے دوبارہ خدمت کا موقع نہیں دیا۔ آپ کے بارے میں اخبارات میں پڑھتا رہا ہوں۔“

”ان لوگوں نے آپ کو کہاں سے اٹھایا؟“

”آپ نے ہمارے کہو میں میرا غریب خانہ دیکھا ہے، بس اس سے نکلا تھا کہ ان لوگوں نے راستہ روک لیا اور زبردستی ساتھ لے آئے۔ میرے خدا بعض اوقات یہ لوگ بالکل وحشی ہو جاتے تھے۔ وہ آپ لوگوں کے بارے میں جاننے کے لیے پاگل ہو رہے تھے اور میرے پاس انہیں بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ آخری بار مجھے وارننگ دی تھی کہ اگر میں نے آپ لوگوں کے بارے میں نہیں بتایا تو میرے ہاتھوں کی انگلیاں ایک ایک کر کے کاٹ دی جائیں گی۔ میرے پاس بس چند گھنٹے کی مہلت تھی پھر خدا نے مدد کی اور ان کے پاس کہیں باہر سے عورتیں آگئیں اور وہ مجھے بھول کر ان میں لگ گئے تھے۔ پھر آپ لوگ فرشتے بن کر آ گئے۔“

میں فکر مند ہو گیا تھا اگر یہ لوگ فرخ شاہ کو اس کے گھر کے پاس سے اٹھا لائے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ اس کے گھر سے واقف تھے۔ وہ دوبارہ وہاں جا سکتے تھے اور فرخ شاہ نہیں ملتا تو اس کی بیوی اور بچوں کو لے جاتے۔ میں نے فرخ شاہ کو اس خدشے سے خبردار کیا تو اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا اس نے گھبرا کر کہا۔ ”تب مجھے فوری جانا ہو گا۔“

”صرف جانا نہیں ہو گا بلکہ آپ کو وہ جگہ چھوڑنی ہو گی۔ کیا کوئی اور جگہ ہے بلکہ ہو سکے تو فی الحال اسلام آباد سے چلے جائیں۔“

”میرا سارا خاندان لاہور میں ہے۔“

”نہیں کسی ایسی جگہ جائیں جہاں یہ نہ پہنچ سکیں۔ لاہور اور رشتے داروں تک جانا تو بہت آسان ہو گا۔“

فرخ شاہ اب سوچ میں تھا اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں کر لوں گا لیکن اب مجھے فوری گھر پہنچنا ہو گا اس سے پہلے کہ.....“

”میں اپنے آدمی آپ کے ساتھ کر رہا ہوں وہ اس وقت تک آپ کی اور گھر والوں کی حفاظت کریں گے جب تک آپ خطرے سے نہیں نکل جاتے۔“

میں نے حبیب اور شجاع کو بلایا اور انہیں فرخ شاہ کے ساتھ جانے اور اس کی حفاظت کرنے کو کہا۔ فرخ

شاہ اب بے چین تھا اس لیے وہ دسیم سے ملے بغیر روانہ ہو گیا۔ رات کا آخری پہر قریب تھا اور میری آنکھیں جل رہی تھیں لیکن سونے سے پہلے میں نے غسل کیا اور پھر دسیم کے آدمیوں کو چوکس رہنے کا کہہ کر دسیم والے بیڈ روم میں چلا آیا۔ یہاں فرش پر قالین اور نیچے وغیرہ تھے۔ سردی تھی لیکن کبل کی ضرورت نہیں تھی کہیں سے بھی کام چل سکتا تھا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو دسیم نیچے کے سہارے بیٹھا چائے نوشی کر رہا تھا اس نے مسکرا کر کہا۔ ”صبح بہ خیر جناب کیا چائے کا کہوں؟“

”نہیں یار پہلے منہ ہاتھ دھو لوں۔“ میں نے انگڑائی لی۔ ”تکلیف کیسی ہے؟“

”بہت کم رہ گئی ہے میں نے رات میں دوا لی تھی اب دوبارہ لینی ہے۔ مگر ناشتے کے بعد، آپ واش روم سے ہوا آئیں ناشتہ آنے والا ہے۔“

میں واش روم سے آیا تو دسترخوان بچہ رہا تھا اور کچن سے گرما گرم پراٹھے، تلے ہوئے انڈے، سوچی کا طلوہ اور تہہ والی ملائی آگئی۔ رات ہلکا کھانا کھایا تھا اس لیے زبردست بھوک لگ رہی تھی۔ ناشتے کے دوران دسیم نے فرخ شاہ کی رپورٹ دی۔ حبیب اور شجاع اسے موٹر وے تک چھوڑ آئے تھے وہ اپنے بیوی بچوں سمیت کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہوا تھا اس کے بارے میں اس نے ان دونوں کو بھی بتایا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہ اچھی بات ہے کہ وہ دشمن کے توجہ دینے سے پہلے نکل گیا ورنہ اس کا بھی صابر کے گھر والوں جیسا حشر ہو سکتا تھا۔“

”میں جان کر حیران ہوا کہ وہ آپ کا واقف کار نکلا ہے۔“

”میری تو صرف ایک بار ملاقات ہوئی تھی وہ اصل میں راجا صاحب کا جاننے والا ہے۔ انہوں نے مجھے اس کے پاس بھیجا تھا۔“

”یہ اچھا ہوا کہ ہم نے اسے پچالیا۔“ دسیم خوش نظر آنے لگا۔ ”اب مجھے اپنے زخم کا افسوس بھی نہیں ہے۔“

”یہ تو تقدیر میں تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا ایک ہفتہ لگے گا ٹھیک ہونے میں اس دوران میں تم آرام کرو گے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کام بہت زیادہ ہیں۔ اب یہ جگہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں کہیں اور شفٹ کرنا ہوگا۔ یہاں سے دشمن زیادہ دور نہیں ہے اور خاص بات یہ ہے کہ یہی سڑک زرگاہ ہے۔ اس سے خطرہ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔“

دسیم نے اچھا نکتہ اٹھایا تھا۔ مرشد کی درگاہ کی طرف یہی سڑک جاتی تھی اس کا مطلب تھا کہ اس کی اور اس لے آدمیوں کی آمد و رفت یہیں سے ہوتی تھی۔ اتفاقاً آنا سامنا ہونے کا خطرہ بہت زیادہ تھا۔ میں نے ناشتے کا تمام کرتے ہوئے کہا۔ ”جب بہتر ہے ہم یہاں سے کوچ کر جائیں، میرا مطلب ہے میں اور تم۔ اپنے کچھ قہمی بھی ساتھ لے لو اور باقی کو یہیں چھوڑ دو یہ کم سے کم باہر نکلیں اس سے خطرہ کم ہو جائے گا جب تک ہم کوئی سری جگہ نہیں تلاش کر لیتے یہ یہیں رہیں۔“

ناشتے کے بعد چائے آئی تھی اور ساتھ ہی عبداللہ بھی آگیا۔ اسے رات کو ہی پتا چل گیا تھا کہ دسیم زخمی ہوا، لیکن ہمارا مشن کامیاب رہا تھا۔ فرخ شاہ کا سن کر وہ حیران ہوا تھا۔ ”میں اسے جانتا ہوں..... کسی زمانے میں باصاحب کی لپے کام کرتا تھا۔ وہ بھی اصل میں اسٹیٹ ایجنٹ ہے۔ مگر اب یہ کام چھوڑ چکا ہے۔“

”بس اتفاق کیسے کیسے لوگوں کو سامنے لے آتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب وہ کسی محفوظ مقام پر جا چکا ہو

گا۔

”جناب میں ایک تجویز لایا ہوں؟“

”کیسی تجویز؟“

”ہمارے پاس تقریباً نو کروڑ روپے کی کرنسی اور سونا ہے اور اتنی دولت گھر میں رکھنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ یہ رقم بینک میں جمع کرادی جائے۔“

”جب ہمیں ضرورت ہوگی تو کیا کریں گے؟“ وسیم نے پوچھا۔

”میری تجویز ہے کہ یہ رقم چار یا پانچ اکاؤنٹس میں ڈال دی جائے اور سب کے اے ٹی ایم کارڈز بنوالیے جائیں اس کے علاوہ کریڈٹ کارڈز بھی بنوائے جاسکتے ہیں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ بہت رسکی ہے۔ ہم آئے دن دشمن کے ہاتھ لگتے رہتے ہیں۔ اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈز ان کے ہاتھ آئیں گے تو ہمارے بارے میں سراغ مل جائے گا۔ پھر بار بار اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈ بنوانا بھی مسئلہ ہے۔ نقد رقم سب سے بہتر ہوتی ہے۔ تم ایک کام کرو کہ تمام رقم کو ہزار اور پانچ ہزار کی بینک گڈیوں میں تبدیل کرالو۔ زیادہ رقم پانچ ہزار کی گڈیوں کی صورت میں ہو۔ اسی طرح سونا بھی کیش کر لو۔“

”یہ ساری رقم کہاں رکھی جائے؟“ وسیم نے پوچھا۔

”کسی تجوری میں۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی چھوٹی لیکن مضبوط اور جدید قسم کی تجوری لے لو۔ یہ لاکر بھی مضبوط ہے لیکن اتنی بڑی رقم کے لیے زیادہ حفاظت کی ضرورت ہوگی۔“

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے ایسا کرتے ہیں۔“

”بنکوں میں خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہاں کیمرے اور پولیس والے بھی ہوتے ہیں۔ میٹ ورک کا حصہ ہونے کی وجہ سے مرشد جیسے طاقتور اور بارسوخ سیاست دان کے لیے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کرلیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ میں نے ذرا تفصیل سے اپنا نکتہ نظر واضح کیا تو عبداللہ مطمئن نظر آنے لگا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کیش ہی سب سے بہتر ہے۔“

وسیم ہنسا۔ ”اور یہ کیونسی ہماری حق حلال کی کمائی ہے جس کے لیے فکر مند ہوں۔“

عبداللہ گاڑی لے آیا تھا ناشتے کے بعد میں اور وسیم اس کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ایاز اب کوشی کا انچارج تھا اور وسیم نے اس کے ذمے نئے ٹھکانے کی تلاش کا کام لگا دیا تھا۔ ”جیسے ہی ٹھکانہ ملے یہاں سے شفٹ کر ہے۔“

”میں آج ہی تلاش شروع کر دیتا ہوں۔“ ایاز نے کہا۔ ”بھگوال میں میرے کچھ جاننے والے رہتے ہیں وہاں فارم ہاؤس ہیں۔ شہر سے زیادہ دور نہیں ہے اور سہولتیں بھی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں وہاں تلاش کروں۔“ میں نے بھگوال دیکھا تھا۔ یہ مری روڈ پر بھارہ کھوسے لنگنے والی سمگلنگ ڈیم روڈ پر کوئی تین چار کلومیٹر کے بعد تھا۔ یہ مری کے ذیلی پہاڑیوں کا علاقہ تھا۔ مگر زمین بہت زیادہ اونچی نیچی نہیں تھی اور لوگوں نے اسے جاہل آباد کر رکھا تھا۔ شہر سے زیادہ دور نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے عافیت اور سکون پسند لوگوں نے یہاں زمین

کرفارم ہاؤس بنالیے تھے جہاں وہ اہل خانہ اور دوست احباب کے ہمراہ پکنک منانے یا چھٹیاں گزارنے جاتے تھے۔ مجھے ایاز کی تجویز اچھی لگی۔ یہ شہر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ البتہ آنے جانے کے لیے واحد قابلِ بھروسہ راستہ مری ہائی وے ہی تھا باقی سڑکیں ناقابلِ بھروسہ اور بہت گھوم پھر کر پنڈی تک آتی تھیں۔ ہم عبد اللہ کے ہمراہ اس کی کوٹھی پر آئے۔ دیم کو بہت احتیاط سے اور زبردستی اٹھا کر گاڑی میں بٹھایا۔ زبردستی اس لیے کہ وہ خود چل کر جانے پر مصر تھا۔ اسی طرح اسے اٹھا کر کوٹھی کے اندر بھی لے گئے تھے۔ عبد اللہ نے اس کے لیے ایک واکر منگوا لیا تھا اس کی مدد سے وہ پاؤں پر زور ڈالے بغیر چل پھر سکتا تھا اور واش روم جاسکتا تھا۔ میں نے یہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے انٹرنیٹ کی مدد سے ندیم کو کال کی۔ وہ راستے میں تھا۔ میری آواز سنتے ہی اس نے حسبِ معمول گالیاں دیں۔ پھر بولا۔ ”شکر ہے تیرا کس ری فائل ہو گیا ہے۔“

”شکر ہے۔“

”زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے کس دوسرے بھی بن سکتے ہیں۔“ اس نے خبردار کیا۔ ”میں نے تجھ سے کہا تھا یہاں سے دفع ہو جائیں تو اب تک یہیں ہے۔“

”میں فائنل سے بات کر رہا ہوں۔“

”بکو اس نہ کر..... تیرے اس نہ ہونے والے سالے کا فون آیا تھا صبح صبح..... موڈ اور ناشتہ دونوں خراب کر دیئے۔“

”مرشد کی بات کر رہا ہے؟“

”ہاں گرج برس رہا تھا کہ گزشتہ رات ٹو نے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ بیوی بچے سامنے تھے اس لیے میں کھل کر نہیں پوچھ سکا بس یہی کہا کہ شہباز نے ایسا کیا اور کہاں کیا ہے۔“

”مرشد ہم کی طرح پھنسا ہوگا؟“ میں ہنسا۔

”اس سے بھی کچھ آگے..... تجھے بھول گیا اور مجھے دھمکیاں دینے لگا۔ میں خاموشی سے سنتا رہا جب وہ بک بک کر کے چپ ہو گیا تو میں نے کہا کہ سرکار کال ریکارڈ ہو رہی تھی اب یہ سندر ہے گی اور بوقتِ ضرورت کام آئے گی۔“

”اس کے طیش کا غبارہ پھٹ گیا ہوگا۔“

ندیم نے ناقابلِ بیان الفاظ میں بتایا کہ یہ سن کر مرشد کا کیا پھنسا تھا۔ ”وہ بالکل الف سیدھا ہو گیا اور بہت پیٹھے لہجے میں بولا۔ وکیل صاحب ناراض کیوں ہوتے ہو الفاظ ہی ہیں نا..... میں واپس لے لیتا ہوں جیسے تم عدالت میں اپنے الفاظ واپس لیتے ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے شہباز کا کچھ پتا نہیں ہے میں صرف عدالت میں اس کے معاملات کا ذمہ دار ہوں۔“

”اس نے اور کچھ نہیں کہا؟“

”اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں دھمکی دی ہے کہ اگر تیری طرف سے اس سے چھیڑ چھاڑ جاری رہی تو کس ری فائل خطرے میں پڑ جائے گی۔“

”تو کیا کہتا ہے سچ سچ خطرے میں پڑ جائے گی۔ کیا ایک بار وہ کس واپس لے کر دوبارہ عدالت میں جا

”کتنا ہے؟“

”یاریہ پاکستان ہے یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آج کل عدالتیں مضبوط ہو رہی ہیں لیکن نیچے تو سارے وہی لوگ بیٹھے ہیں۔ نئے کیس پیدا کرنا کیا مسئلہ ہے۔ اس لیے اگر ٹوکھ کچھ کر رہا ہے تو مہربانی کر کے ایک مہینہ صبر سے بیٹھ جا اسی لیے تجھ سے کہہ رہا ہوں کہیں اور چلا جا۔ نہ یہاں ہوگا اور نہ دشمنوں سے پنگا ہوگا۔ باقی لواحقین کو ٹوکھ دیے ہی حویلی بھیج چکا ہے۔“

”یاریہ میں نے کچھ نہیں کیا۔“ میں نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ ”مرشد کے اور دشمن بھی ہوں گے ان میں سے کسی نے کچھ کیا ہوگا وہ میرے سر ڈال رہا ہے۔“

”بیٹے ٹو اتنا شریف نہیں ہے جتنا بن رہا ہے کوئی نہ کوئی حرامی پن تجھ سے سرزد ہوتا رہتا ہے۔ بہر حال اپنے خرچ پر خوش رہ۔..... پکڑا گیا تو ہم موجود ہیں عدالت میں بھگتنے کے لیے۔“

میرا اندازہ تھا کہ مرشد کو جاننے میں دشواری نہیں ہوگی کہ یہ کارروائی ہماری ہے اور اس کے پاس رابطے کا ایک ہی ذریعہ تھا اس نے اسی سے رابطہ کیا۔ میں نے سوچا کہ مرشد سے بات کروں لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں اس بارے میں غور کرنا چاہتا تھا نادر کا معاملہ طول کھینچ رہا تھا۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ مر جاتا تو ہمارے ہاتھ سے ایک مہرہ کھسک جاتا اور مرشد کے مزے ہو جاتے وہ نادر کی موت کا ذمے دار ہمیں قرار دیتا اور اس کے رشتے داروں اور مریدوں کے غیض و غضب کا نشانہ بن جتے۔ جب سے نادر ہماری تحویل میں آیا تھا میں نے اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں خود اس کی حالت دیکھوں۔ میرا کام ہونے تک اس کا زندہ رہنا ضروری تھا۔ میں نے عبداللہ کو تلاش کیا۔ وہ نیچے ایک کمرے میں تھا۔ میں نے نادر کے بارے میں پوچھا۔ ”اس کی حالت کیسی ہے؟“

”اچھی نہیں ہے دو دن سے کچھ نہیں کھا رہا ہے مجبوراً ڈرپ کی مدد سے اسے طاقتور دوائیں دینا پڑ رہی ہیں۔“

”اس وقت سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟“

”میرا خیال ہے جاگ رہا ہوگا۔ ایک گھنٹہ پہلے ڈاکٹر اسے دیکھ کر گیا ہے۔“

نادر نچلے حصے کے ایک کمرے میں تھا عبداللہ کے آدمی اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے مگر طویل قید، تنہائی اور معذوری نے اسے زندگی سے مایوس کر دیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اب نادر سے ایک ملاقات کر لینی چاہیے۔ ممکن ہے وہ کچھ عرصے بعد ہمارے پاس نہ رہے یا اس دنیا میں نہ رہے۔ میں اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آیا تو وہ مریضوں کے لیے مخصوص بیڈ پر لیٹا ہوا چھت کو کھو رہا تھا۔ اس کی کھلی آنکھیں ساکت تھیں اور ایک لمبے کو مجھے شبہ ہوا کہ وہ مر چکا ہے لیکن فوراً ہی اس نے سر گھما کر دیکھا اور مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کوئی حیرت کا تاثر نہیں آیا تھا۔ گویا اسے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ میری قید میں ہے۔

”شہباز ملک۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ وہ بہت کمزور لگ رہا تھا۔ چہرہ ست گیا تھا اور آنکھیں جیسے گڑھوں میں بدل گئی تھیں۔ شیوہ بڑھنے سے اس کی بے چارگی کے تاثر میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے دنیا میں جن چند لوگوں سے شدید نفرت تھی وہ ان میں سے ایک تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس کی وجہ سے مجھ پر کرب و بلا کا ایک دروازہ

کھلا۔ میرے پیاروں اور میری زندگی مسلسل آزمائش بن گئی۔ اس نے مونا کے لیے غلیظ عزائم کا اظہار کیا۔ اس نے میرا ہاتھ ناکارہ کرنے کی کوشش کی۔ دونوں بار اللہ نے ہمیں اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ پھر اس نے دشمنی کا رخ میرے خاندان کی طرف موڑ دیا۔ شاہد بھائی کا قتل نادر نے کر لیا تھا۔ میرے دفتر کے چوکیدار گل خان سے لے کر بے شمار بے گناہ لوگوں کے مارے جانے کا ذمہ دار یہی شخص تھا۔ اس کے ساتھ میں نے برا نہیں کیا تھا جو کیا قدرت نے کیا۔ اس کے باوجود اس کے جرائم اتنے تھے کہ میں اسے قتل کر دیتا تو یہ عین انصاف ہوتا۔ اس کمرے میں آنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ اسے سامنے پا کر میری نفرت بھڑک نہ جائے مگر جب میں نے اسے دیکھا تو میرے اندر اس کے خلاف جلنے والی آگ مدہم پڑنے لگی تھی۔ یہ جان کر مجھے تعجب ہوا کہ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ میں ایک کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”تم جانتے تھے کہ میری قید میں ہو؟“

اس نے سر ہلایا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ ”تمہارے ساتھیوں نے ایجنسی والے بن کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر کچھ عرصے بعد میں نے جان لیا تھا کہ میں تمہارے قبضے میں ہوں۔“

”تمہیں خوف نہیں آیا کہ تم میرے قبضے میں ہو اور مجھے تم سے بہت سے حساب بے باقی کرنے ہیں۔“ وہ ایک نکل مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”اس لحاظ سے خوف نہیں آیا کہ تم مجھ پر تشدد کر دو گے یا زندگی کو میرے لیے مشکل کر دو گے مجھے معلوم ہے اگر تم نے میری موت کا فیصلہ کیا تو کم سے کم تکلیف کے ساتھ مجھے موت کے گھاٹ اتار دو گے۔“

”یعنی تم مجھے شریف دشمن قرار دے رہے ہو۔“ میں نے غمی سے کہا۔ ”کیا تم نے کبھی سوچا کہ تمہیں بھی دشمنی کے آداب بھانے چاہئیں؟“

”نہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”بات سوچ کی نہیں فطرت اور تربیت کی ہوتی ہے۔ تم نے وہ کیا جس کی تم نے تربیت حاصل کی اور میں نے وہ کیا جس کی تربیت مجھے ملی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو میں نے کس ماحول میں پرورش پائی ہے۔ جہاں انسان کو انسان نہیں صرف غلام سمجھا جاتا ہے۔ جہاں عورت رشتے کا نہیں جسم کا نام ہو۔ جہاں دوسروں کو ذلیل کر کے اپنے تکبر کی تسکین کی جاتی ہو۔ بے حساب دولت اور حرام کی دولت اور اسے حرام میں خرچ کرنے کے بے شمار طریقے تھے۔“

”میں نے جہاں پرورش پائی وہاں انسان کو انسان سمجھا جاتا ہے۔ وہاں ہر شخص عزت اور احترام کا مستحق ہو یا نہ ہو لیکن اسے بے عزت نہیں سمجھا جاتا ہے۔ مجھے بچپن سے حرام حلال کا فرق اتنی شدت سے بتایا گیا کہ میں سب بھول جاؤں تب بھی یہ چیز نہیں بھول سکتا۔ عورت ہمارے ہاں صرف رشتے کا نہیں بلکہ عزت کا نام ہے۔ اس سے وابستہ ہر رشتہ عزت کا دوسرا نام ہے۔ انسانیت، رحم، مروت اور صبر میری تعلیم میں شامل ہے۔“

”تب ہی تم ایسے ہو۔“ نادر نے سرد آہ بھری۔ ”تمہاری اس قید میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میرا اتنا ہی خیال رکھا گیا ہے جتنا کہ میرے اپنے گھر میں رکھا جاسکتا تھا۔ کسی نے مجھے ذلیل نہیں کیا۔ کسی نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا، حتیٰ کہ گالی تک نہیں دی۔ تمہارے ساتھی اپنا آرام چھوڑ کر میری دیکھ بھال کرتے رہے۔ میرے لیے مستقل ڈاکر آتا ہے لیکن شہباز ملک میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتا۔“ وہ بولتے بولتے رکا تو مجھے اس کی آنکھوں

کے گڑھوں میں نمی کی جھلک نظر آئی تھی۔

”کیوں؟“

”اگر تم مجھے ذلیل کرتے..... مجھ پر تشدد کرتے..... اپنا بدلہ لیتے تو میں اندر سے مضبوط رہتا..... کبھی تمہارے سامنے ہتھیار نہ ڈالتا..... لیکن شہباز..... تمہاری شرافت نے مجھے مار دیا ہے۔ میں تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں مجبور ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اب موت مجھے ساتھ لے جائے۔“

”اتنی مایوسی کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”تم نے ٹھیک کہا ہے اگر تمہارے بارے میں موت کا فیصلہ ہوا تو تمہیں بنا کسی تکلیف کے موت دی جائے گی مگر اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ میری مرشد سے بات چل رہی ہے۔ امید ہے جلد ہمارے درمیان تصفیہ ہو جائے گا اور تمہیں اس قید سے رہائی مل جائے گی۔“

مرشد کا نام سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ ”وہ میری رہائی کے لیے تم سے بات کر رہا ہے؟“

”تو اور کون کرے گا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”اس دنیا میں وہی تمہارا والی وارث ہے۔“

”وہ میرا دشمن ہے۔“ نادر نے تنگی سے کہا۔ ”اس کا بس چلے تو مجھے مار کر میرا بھی حزار بنادے..... اگر وہ تم سے کوئی معاہدہ کرنا چاہ رہا ہے تو میں تمہیں بتا دوں اس میں سو فیصد دھوکا ہوگا۔ وہ تمہارا ایسا دشمن ہے جو کبھی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔“

”میری اصل دشمنی تو تم سے تھی۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھ سے نہیں تھی..... اس دشمنی کو یہاں تک پہنچانے کا سہرا بھی مرشد کے سر ہے۔ اس نے مجھے اکسایا کہ تم لوگوں سے بدلہ لوں۔ وہ چالاکی سے خود گدی نشین اور قابلِ احترام شخصیت بنا ہوا تھا اور مجھے اس نے بد معاشی کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے لیے لڑوں اور اس کے دشمنوں کا خاتمہ کروں۔“

”یعنی وہ تمہیں اپنی فورس کے سربراہ کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔“

”ہاں جب تک میں ٹھیک تھا اس کے لیے کارآمد تھا لیکن اب میں اس کے لیے ناکارہ ہو چکا ہوں اگر تم نے مجھے اس کے حوالے کیا تو وہ مجھے مار دے گا۔“

”میرا نہیں خیال کہ وہ ایسا کرے گا اور اگر اس نے ایسا کیا تو تمہاری ہی خواہش پوری کرے گا۔“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”تم بھی تو مرنا چاہتے ہو؟“

”ہاں لیکن ایسے نہیں۔“ اس نے التجا آمیز انداز میں کہا۔ ”اس سے بہتر ہے تم مجھے مار کر کسی گم نام جگہ دفن دو۔ وہ مجھے مارے گا اور پھر میرا حزار بنادے گا۔ اس سے بھی کمائی کرے گا۔“

”لیکن وہ تمہیں آزاد کرانے کے لیے بے چین ہے اس کا کہنا ہے خاندان اور مریدوں کا اس پر دباؤ ہے۔“

”خاندان والے اپنے چکر میں ہیں لیکن وہ مرشد پر دباؤ نہیں ڈال سکتے اور جہاں تک مریدوں کا تعلق

ہے وہ عقل کے اندھے اس کے غلام ہیں ان کے پاس دماغ ہی کہاں ہے کہ سوچ سکیں۔“ نادر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”وہ مجھے جلد از جلد زندگی کی قید سے آزاد کرنے کے لیے بے چین ہے تاکہ گدی کا ایک ممکنہ امیدوار کم ہو۔ ویسے بھی اس کی اپنی اولاد جوان ہو رہی ہے۔ کچھ عرصے بعد اسے ویسے ہی میری ضرورت نہ رہتی۔“

مجھے خیال آیا۔ ”مرشد کے پاس فاضلی بھی تو ہے۔“

”اس کی حرامی اولاد۔“ نادر نے حقارت سے کہا۔ ”وہ سمجھتا ہے کہ یہ بات دوسرے نہیں جانتے ہیں لیکن مجھے معلوم ہے۔ فاضلی کی ماں ایک زمانے میں مرشد کی ذاتی خادمہ تھی۔“

”تمہاری شادی نہیں ہوئی۔ لیکن تم کوئی پارسا آدمی نہیں ہو تم نے کبھی سوچا کہ تمہاری بھی ایسی کتنی ہی اولادیں نہ جانے کہاں کہاں ہوں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر میں ایسا سوچنے والا ہوتا تو یہ سب کیوں کرتا۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں جانے لگا تو اس نے التجائی۔ ”شہباز خدا کے لیے مجھے مرشد کے حوالے مت کرنا۔ اس سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا صرف مرشد کا فائدہ ہوگا۔“

”میں اس پر غور کروں گا لیکن تم اپنا خیال رکھو، زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور کوئی بھی نقصان اسے کھونے کا ہوا نہیں رکھتا ہے۔ ہاں جب آدمی عزت سے زندہ رہنے کا ہر راستہ کھودے تب اسے مرجانا چاہیے۔“

”میں اس لفظ کا مفہوم ہی نہیں سمجھتا۔“ اس نے پیچھے سے کہا۔

”جب تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔“ میں نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔ نادر سے اس ملاقات سے میرے دل پر بوجھ سا آیا تھا۔ انسان بعض اوقات کیسے بدل جاتا ہے اس کے احساسات اور جذبات بدل جاتے ہیں۔ اگرچہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ نادر میں یہ تبدیلی سچ آئی تھی یا صرف ماحول کا اثر تھا۔ وہ واپس اپنے ماحول میں جاتا تو دوبارہ ویسا ہی ہو جاتا۔ مگر اس وقت مجھے اس کے لہجے میں سچائی محسوس ہوئی تھی۔ میں دسم کے کمرے میں آیا۔ وہ ڈی وی دیکھ رہا تھا۔ شاہ جی اس کے لیے دیسی چوزے کی بجائی بنا کر لایا تھا۔ اس کا خاصا خون بہا تھا اور اسے قوت بخش غذاؤں کی ضرورت تھی۔ شاہ جی نے یہ ضرورت پوری کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی اس نے کہا۔ ”ایک ہفتے میں یہ پہلے سے اچھے نہ ہو جائیں تو بے شک میرا نام بدل دیجئے گا۔“

”تمہارا نام بدل کر کیا رکھیں گے؟“ دسم نے شرارت سے کہا۔ ”شاہ جی ویسے بھی تم پر سوٹ نہیں کرتا ہے۔“

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”درست کہا جی، ہم جیسے غریبوں پر یہ نام کہاں اچھا لگے گا۔ اپنا نام تو اللہ رکھایا

فردین ہونا چاہیے تھا۔“

”شاہ جی نام میں کیا رکھا ہے اصل چیز تو بندے کا کام ہوتا ہے اور وہ تم لا جواب کرتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”خاص طور سے کافی واقعی لا جواب بتاتے ہو۔“

”اتنی لمبی تمہید کیوں باندھ رہے ہیں جی۔“ وہ مسکرایا۔ ”کافی ابھی حاضر کرتا ہوں۔“

وہ چلا گیا تو دسم نے کہا۔ ”بہت اچھا آدمی ہے۔“

”آدمی سارے اچھے ہوتے ہیں بس نفس بہکاتا ہے۔“ میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا اور پھر دسم کو نادر

کے بارے میں بتایا۔ ”ابھی اس کے پاس سے آ رہا ہوں خاصا بندے کا پتر بنا ہوا ہے۔“
 ”اس جیسے لوگ کبھی بندے کے پتر نہیں بننے ہیں۔“ دسیم نے نفی میں سر ہلایا۔ ”قید میں رہ کر اس کا دماغ ٹھکانے پر نہیں رہا ہے اور اس کے سر میں موجود فرعونیت کے کیڑے بے دم ہو گئے ہیں لیکن جیسے ہی یہ آزاد ہوگا اس کا دماغ ٹھکانے پر آ جائے گا اور یہ پہلے کی طرح فرعون بن جائے گا۔ سارے کیڑے پھر سے تندرست و توانا ہو جائیں گے۔“

”پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے وہ اب پہلے والا نادر نہیں رہا ہے۔“
 ”شہباز صاحب، اس کی حالت سے دھوکا مت کھائیں، میں تو کہہ رہا ہوں یہ سانپ ہمارے قابو میں ہے اس کا سر کچل دیں۔ اگر مارنا نہیں چاہتے تو اسے بچہ بنانے والا انجکشن دے دیں۔ ذرا غور کریں یہ اتنے عرصے سے ہماری قید میں ہے لیکن اس نے ایک بار بھی مرشد کے خلاف کوئی کام کی بات نہیں بتائی۔ صرف وہی کچھ بتایا جو ہم پہلے سے جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔ اصل میں یہ ہمیں بے وقوف سمجھ رہا ہے اس لیے خود پر مظلومیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ کھانا پینا چھوڑ دیا ہے مرنے کی باتیں کر رہا ہے۔ ابھی اسے آزاد کر دیں تو پھر اس کا اصل روپ سامنے آئے گا۔“

دسیم کی باتوں میں یہ بات قابل غور تھی کہ نادر نے اب تک ہمیں کوئی ایسی بات نہیں بتائی تھی جو مرشد کے خلاف سچ بچ ہماری مدد کرتی۔ اس کے باوجود میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس میں کوئی نہ کوئی تبدیلی آئی ہے۔ دسیم مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔ ”شہباز صاحب کیا آپ نادر کو کوئی رعایت دینا چاہتے ہیں؟“
 ”نہیں..... اگر اس میں کوئی تبدیلی آئی ہے تو یہ اس کے لیے ہے ہم تو اس کا فیصلہ اس کے جرائم کو مد نظر رکھ کر کریں گے۔ ویسے اس کا کہنا ہے کہ مرشد ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔ وہ اسے اس لیے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ اس سے چھٹکارا پالے۔“

”اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔ اگر مرشد کا بس چلے تو وہ ہمیں ذرا بھی رعایت نہ دے۔“ دسیم نے کہا۔
 ”لیکن اس وقت وہ مجبور ہے اس لیے ہم اس سے جو فائدہ اٹھا سکتے ہیں ضرور اٹھائیں گے۔“
 ”بالکل ٹھیک۔“ میں نے کہا۔ عبداللہ آگیا اور ہم گپ شپ کرنے لگے۔ پھر دسیم کی دوا کا وقت ہو گیا تھا اس میں جو چین کلر تھی اسے کھانے سے غنودگی آتی تھی اس لیے ہم اسے سونے کا کہہ کر نیچے آ گئے۔ میں نے عبداللہ کو نادر سے ہونے والی اور پھر اپنی دسیم سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ بھی دسیم سے متفق نظر آنے لگا۔ ”وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اس نے تائید کی۔ ”اس نے منع کیا ہے کہ سعد یہ کو اس کی حالت کے بارے میں نہ بتایا جائے ورنہ وہ پریشان ہوگی۔“

”اچھا کیا اس نے بتا دیا ورنہ شاید میں بتا دیتا۔“

”وہ یہاں آنے پر اصرار کرے گی اور دسیم اسے بلانا نہیں چاہتا ہے۔“
 ”میں سوچ رہا ہوں کہ تین چار دن بعد جب دسیم لمبے سفر کے قابل ہو جائے تو اسے حویلی بھیج دوں اور سفیر کو بلوالوں۔“

”ہاں اسے آرام کی ضرورت ہے اور سفیر نے بہت آرام کر لیا ہے۔ بیٹو اور مانی کو بھی بلوالیں۔ میں سوچ

رہا ہوں اس کوٹھی کی الیکٹرک سیکورٹی مضبوط ہونی چاہیے ابھی تو ہم عام طریقے سے کام چلا رہے ہیں۔ مانی یہ کام بہتر طور پر کر سکے گا۔“

”ٹھیک ہے دسم سے بات کر لو اور تین دن بعد اسے بھیج دینا۔ سفیر، مانی اور بیٹو ساتھ آجائیں گے۔“

”آپ کا مطلب ہے جو دسم کو چھوڑنے جائیں گے وہی انہیں لے آئیں گے۔“

”بالکل اس معاملے میں سیکورٹی پوری رکھنی ہے۔ یہاں ہم دشمن کی نظروں میں نہیں ہیں لیکن حویلی پر ان کی نگرانی ضرور ہوگی بے شک آس پاس نہیں ہوں گے لیکن آنے جانے کے راستوں پر ضرور نظر رکھے ہوں گے۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”کیوں نہ ہیلی کاپٹر استعمال کیا جائے۔“

مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب سفیر، مونا اور سعد یہ ہیلی کاپٹر میں تھے اور اسے گن سے نشانہ بنایا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے سب محفوظ رہے تھے سوائے مونا اور سفیر کے ہونے والے بچے کے کسی کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے فنی میں سر بلایا۔ ”نہیں ہیلی کاپٹر والا آئیڈیا ٹھیک نہیں ہے۔ روڈ کا سفر محفوظ رہے گا۔“

”ٹھیک ہے میں پلان کرتا ہوں کہ کیسے جائیں گے۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”آپ دسم سے بات کر لیں کیونکہ وہ اتنی آسانی سے نہیں مانے گا۔“

”آسانی سے نہیں مانے گا تو زبردستی بھیج دیں گے۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔

”آپ بھیج سکتے ہیں۔“ عبداللہ مسکرایا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ دسم آپ کی بہت عزت کرتا ہے۔“

”ایسا نہیں ہے دسم دوستوں کا دوست ہے تم بھی کہہ کر دیکھو وہ تمہاری بات کو بھی اتنی ہی اہمیت دے گا۔“ میں نے یقین سے کہا۔

”نادر کے بارے میں سوچا آپ نے؟“

”ہاں اسے اس وقت تک آزاد نہیں کرنا ہے جب تک مرشد میرے کیس ختم نہیں کر دیتا۔ ندیم بتا رہا تھا کیس ری فائل ہو گئے ہیں اور اگر پولیس نے تعاون کیا تو ایک سے ڈیڑھ مہینے میں سارے کیس ختم ہو سکتے ہیں۔“

”پولیس اس وقت حرکت میں آئے گی جب اس پر مرشد کا دباؤ ہوگا۔ آپ بتا رہے ہیں کہ اس نے ندیم کو بھی دھمکیاں دی ہیں۔“

”ہاں مگر وہ وکیل ہے۔ مرشد اس سے الجھنے سے گریز کرے گا۔ اس نے اس کو مناسب جواب دیا ہے۔“

”آپ مرشد سے بات کریں گے۔ کیونکہ وہ کل رات کے واقعات پر جھنجھلایا ہوا ہوگا۔“

”مجھے اس بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس جگہ کا بہ ظاہر مرشد سے کوئی تعلق نہیں ہے اگر اس نے کہا تو میں انجان بن جاؤں گا۔ ہاں اس سے بات ضرور کرنا چاہوں گا۔ اس کا رول جاننا ضروری ہے اور دھمکانا بھی۔ ورنہ ممکن ہے وہ کوئی حرکت کرنے کا سوچ رہا ہو۔“

میں اوپر آیا۔ انٹرنیٹ سے کال ملاتے ہوئے میں نے مانی کو دعادی اس کی وجہ سے یہ بڑی سہولت حاصل ہوگئی تھی اب دشمن سے بغیر کسی نمبر کے بھی بات کی جاسکتی بغیر اس خوف کے کہ وہ میرا سراغ لگا لے گا۔

مرشد کا پرانا موبائل نمبر میرے ذہن میں تھا میں نے وہی ملایا لیکن وہ بند جا رہا تھا مجھے مرشد ہاؤس کے نمبر پر کال کرنا پڑی۔ اس بار نستعلیق سیکرٹری کے بجائے کسی ملازم نے کال ریسیو کی۔ ”کون ہے جی؟“ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مرشد نے دنیا کے ہر کام کے لیے ملازم رکھے ہوئے تھے تو اس نے مرشد ہاؤس میں ایک کال آپریٹر رکھنے کی زحمت کیوں نہیں کی تھی۔ وہ سیاست دان اور معروف گدی نشین تھا اور یقیناً اسے کال کرنے والوں کی کمی نہیں ہوگی لیکن مرشد ہاؤس میں کال سیکرٹری یا کوئی ملازم ہی ریسیو کرتا تھا۔ میں نے شرافت سے کہا۔ ”مجھے مرشد سے بات کرنی ہے۔“

”سرکار سے۔“ ملازم نے میری بے ادبی پر جڑ جڑتے ہوئے کہا۔

”سرکار ہو گا وہ تمہاری ماں کا۔“ اس بار میں نے شرافت بالائے طاق رکھتے ہوئے غرا کر کہا۔ ”اسے بولو اس کے باپ کی کال ہے۔“

ملازم غالباً دل ہی دل میں مجھے گالیاں دیتا ہوا مرشد کو بتانے گیا اور خود گیا تھا کیونکہ اس جاہل کو فون کال ٹرانسفر کرنا بھی نہیں آتی تھی۔ کچھ دیر بعد مرشد کی آواز آئی۔ ”ہیلو.....“ اس نے میرا نام نہیں لیا تھا لیکن سمجھ گیا ہو گا کہ اس طرح کال کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ ”تم ایک ڈھنگ کی فون آپریٹر نہیں رکھ سکتے ہو؟“

”شہباز تم حد سے بڑھ رہے ہو؟“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

میں سمجھا کہ اس کا اشارہ کل والے واقعے کی طرف ہو گا اس لیے میں پہلے سے طے شدہ پالیسی کے تحت انجان بن گیا۔ ”میں سمجھا نہیں؟“

”تمہیں ایک معمولی ملازم سے میرے بارے میں اس طرح کہنے کی کیا ضرورت تھی اس آلو کے پٹھے نے بھی چار لوگوں کے سامنے تمہاری بات دھرا دی۔“

مرشد کی حالت کا سوچ کر مجھے دلی مسرت ہوئی تھی۔ ”اس میں بھی تمہارا قصور ہے میں نے پہلے بھی کہا ہے کوئی فون آپریٹر رکھ لو اس طرح روز روز کی بے عزتی سے بچ جاؤ گے۔“

”پہلی بار میرے کسی ملازم نے ایسی بے وقوفی کی ہے۔“

”اب اس بے چارے کا کیا ہو گا تم نے اسے یقیناً اپنے جلا دوں کے حوالے کر دیا ہو گا۔“

مرشد ایک لمحے کے لیے چپ ہوا پھر رکھائی سے بولا۔ ”تم اس کی نہیں اپنی فکر کرو۔ تم نے کل رات میرے ایک ٹھکانے پر حملہ کر کے اچھا نہیں کیا ہے۔ میرے چار آدمی مارے گئے اور ایک درجن زخمی ہوئے ہیں۔“

”کل رات.....“ میں نے تعجب سے کہا۔ ”مرشد کل تم نے یقیناً اپنی درگاہ کے لشکر کا کھانا کھایا ہو گا اور تمہارا پیٹ خراب ہو گا تبھی تمہیں ایسا خواب آیا۔ کل رات میں اپنے بستر میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔“

”مجھے احمق مت سمجھو، میرے ساتھی احمق تھے جو تمہیں پہچان نہیں سکے لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ یہ تمہاری کارروائی ہو سکتی ہے۔ فرخ شاہ کے بارے میں بھی مجھے بعد میں بتا چلا وہ اس کی لاش بھی نہ ملتی۔“

”کون فرخ شاہ؟“ میں نے ایک بار پھر کمال سادگی کا مظاہرہ کیا۔

”میں اس فرخ شاہ کی بات کر رہا ہوں جو ایک زمانے میں راجا عمر دراز کا ایجنٹ تھا۔“

”اگر ایسا کوئی فرخ شاہ تھا تب بھی ضروری نہیں ہے میں اس سے واقف ہوں اور بائی دی وے... فرخ شاہ سے تمہارا کیا تعلق؟“

”وہ میرے آدمیوں کے قبضے میں تھا لیکن تم لوگوں نے اسے چھڑا لیا اور اس کے بیوی بچوں سمیت اسے کہیں اور منتقل کر دیا۔ میرے آدمی اسے تلاش کر رہے ہیں اور وہ زیادہ دن چھپا نہیں رہے گا۔“

”ممکن ہے مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”شہباز تم جھوٹ بول رہے ہو۔ فرخ شاہ نے خود قبول کیا تھا کہ اس نے کن لوگوں کو اپنا مکان کرائے پر دیا تھا۔ وہ تمہارے ساتھی تھے۔“

”تم ایک ایسے شخص کی بات پر یقین کرتے ہوئے مجھے الزام دے رہے ہو جسے میں جانتا بھی نہیں ہوں۔“ میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے تمہاری نیت میں کوئی فور آ گیا ہے اور تم اپنے ہی معاملے سے پیچھے ہٹنا چاہ رہے ہو۔“

”ایسا نہیں ہے۔“ مرشد مجھ بھلا گیا۔ ”تم میرے ساتھ چالاکی سے کام لے رہے ہو ایک طرف میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے ہیں اور دوسری طرف تم میرے خلاف کسی کارروائی کے لیے آزاد ہو۔“

”مرشد میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں اگر اس بہانے تم نے میرے یا میرے کسی ساتھی کے خلاف کوئی کارروائی کی تو اس کے نتائج تمہارے حق میں نہایت سنگین ہوں گے۔ اس لیے کچھ کرنے سے پہلے خوب سوچ لہا۔“

”میرا کچھ کرنے کا ارادہ نہیں ہے لیکن میں تمہیں بھی خبردار کر رہا ہوں اگر تمہاری طرف سے پھر ایسی کوئی کارروائی ہوئی تو کیس ری فائل کا کام رک جائے گا۔“

”تب تم اس بہانے کی کرنا چاہتے ہو۔“ میں نے اپنا انداز برقرار رکھا۔ ”مرشد تمہارے پچازاد بھائی کا ام کیا ہے۔ شاید ارشاد علی ہے۔“

”ہاں۔“ اس کے لہجے میں تشویش آگئی۔ ”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”ایسے ہی..... جس طرح تم میرے بارے میں ساری خبریں رکھتے ہو اسی طرح میرا حق بھی ہے کہ تمہارے بارے میں مکمل معلومات رکھوں۔“

”شہباز تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“ اس کے لہجے کی تشویش بڑھ گئی تھی۔ ”تم جانتے ہو کہ میرے اپنے لازاد بھائیوں سے تعلقات اچھے نہیں ہیں اس لیے تم ان سے ملنے کی بات کر رہے ہو؟“

”یہ بھی ایک آپشن ہے۔“ میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ”مجھے امید ہے تم مجھے مجبور نہیں کرو گے کہ ان کی طرف جاؤں۔ ویسے مجھے کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے میں خود تم سے اور تمہارے سارے خاندان سے ٹھٹھکتا ہوں۔“

”اب تم دعوے کر رہے ہو؟“

”نہیں دعویٰ نہیں ہے۔“ میں نے تردید کی۔ ”یہ حقیقت ہے۔“

”نادر کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے، اس نے جینے کی امید چھوڑ دی ہے لیکن تم جاننے ہو آج کل آدمی اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتا ہے اسے زندہ رکھنے کے کئی طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔ تم فکر مت کرو اسے زندہ ہی تمہارے حوالے کیا جا گا۔ ہاں تم اس کی جان لے لو تو الگ بات ہے۔“

”میں اس کی جان کیوں لوں گا وہ میرا ایک ہی تو بھائی ہے۔“ وہ چالاکی سے بولا۔

”تمہارے بھائی نے تمہیں اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دیا ہے۔“ میں نے طنز کیا۔ ”اس نے مجھ۔“

درخواست کی ہے کہ تمہارے حوالے کرنے کے بجائے میں اسے اپنے ہاتھ سے مار دوں۔“

”وہ دشمنوں کی باتوں میں آگیا ہے۔“

”اگر تمہارا اشارہ ہماری طرف ہے تو میں یقین دلاتا ہوں ہم نے نادر کا ذرا بھی برین واش نہیں ہے۔“

”میں اپنے چچا زادوں کی بات کر رہا ہوں میں نے بے وقوفی کی تھی جب نادر کو مرشد ہاؤس سے درجہ

اور ان لوگوں کو موقع مل گیا۔“

”تم ان سے خوفزدہ ہو؟“

”نہیں۔“ وہ جھنجھلا گیا۔ ”مجھے صرف رشتے داری کا خیال ہے ورنہ میں ان کو ایک دن میں مٹا دوں۔“

مرشد یقیناً غصے میں تھا ورنہ وہ میرے سامنے اور فون پر اس طرح کی بات نہ کرتا۔ اسے اپنی غلطی

احساس بھی ہو گیا تھا اس لیے اس نے جلدی سے بات بدل دی۔ ”شہباز..... اب میں اس معاملے کو جلد از م نمٹا دیتا چاہتا ہوں۔“

”اپنا پورا زور لگاؤ اور کیسوں کی واپسی کا عمل تیز کرو۔ جیسے ہی مجھے ان سے چھٹکارا ملے گا میں نادر

تمہارے حوالے کر دوں گا۔“ میں نے کہا پھر مجھے صابر کا خیال آیا۔ ”مرشد تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو لیکن خود تم

کر رہے ہو۔ صابر کو کس نے مارا ہے؟“

”صابر.....؟“ وہ بوکھلایا پھر سنبھل کر ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں نہیں جانتا میں نے بھی اخبار میں اس

بارے میں پڑھا ہے۔“

”مرشد وہ تم سے چچتا پھر رہا تھا اور تمہارے آدمی اس کے پیچھے تھے۔ اس کے دو غدار ساتھی تو ہمارے

ہاتھ لگ گئے تھے اور انہوں نے خود تم سے گٹھ جوڑ کا اعتراف کیا تھا۔ صابر کے گھر میں جو ہوا وہ تمہارے کہنے پر،

اور اس میں تمہارے ساتھی بھی شامل تھے۔“

”تم جو چاہے کہتے رہو۔“ اس نے اس بار سکون سے کہا۔ ”تمہارے کہنے سے کوئی جرم میرے کھانے

میں شامل نہیں ہوگا۔“

”کیونکہ تم اب۔“ بارسوخ سیاست دان اور جاگیردار گدی نشین ہو۔“ میں نے چپیتے ہوئے لہجے میں کہا

”لیکن تم نے یہ سوچا کہ باقی ہر لحاظ سے ایک عام آدمی ہو۔ تمہیں بالکل کسی ایسی وجہ سے موت آسکتی ہے جو کم

عام آدمی کی موت کی وجہ ہو سکتی ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے تکبر سے کہا۔ ”ایک عام آدمی اور مجھ میں بہت فرق ہے۔“

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ”ایک عام آدمی کتنا بھی برا ہو جائے وہ تمہارے مقام تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔“

”میرا خیال ہے تمہارے پاس کرنے کے لیے کوئی بات نہیں رہی ہے۔“ اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔

”نہیں ایک بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آئندہ میرے وکیل کو غیر متعلقہ باتوں کے لیے کال مت کرنا۔“

اس نے مجھ سے کہا کہ میرے مقدمات بھی بھاڑ جائیں، مگر تمہاری آئندہ ایسی کسی حرکت کے جواب میں وہ تمہیں عدالت میں کھینچ لے گا۔ تم سوچ سکتے ہو اس قسم کی مقدمے بازی تمہاری سیاسی ساکھ کے لیے کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔“

”وہ بلاوجہ بھڑک رہا ہے میں نے اسے ایسا کیا کہہ دیا؟“ مرشد نے ناگواری سے کہا۔

”مرشد میں نے تمہاری ریکارڈنگ سنی ہے۔ تم اپنے کسی ایمان فروش مرید سے نہیں ایک معزز وکیل سے

بات کر رہے تھے اگر بات عدالت تک گئی تو جج بھی اس فرق کو نوٹ کرے گا۔ سب منظر عام پر آئے گا۔“

”ٹھیک ہے اب میں اسے کال نہیں کروں گا۔“ مرشد نے جلدی سے کہا۔ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی

تھی۔

”دوسرے اپنے وکیل سے کہو کہ اپنے سپریم کورٹ کا وکیل ہونے کا خناس ذہن سے نکال دے اور اس

معاملے میں وہی کرے جو ندیم اسے کہے، بلاوجہ اپنی قابلیت نہ بھاڑے۔“

”تم فکر مت کرو اسے پہلے ہی ہدایت دے چکا ہوں اور وہ تمہارے وکیل سے مکمل تعاون کر رہا ہے۔“

”ندیم نے بھی یہی بتایا ہے مگر تم ایک بار پھر اسے کہہ دو۔ دوسرے نیا تفتیشی افسر شیر شاہ تمہارے آدمیوں

میں شامل ہے؟“

”وہ میرے آدمیوں میں نہیں ہے لیکن اس سے جو اوپر بیٹھے ہیں ان سے تعلق ہے۔“

”دوسرے لفظوں میں تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ نیا تفتیشی افسر کیسوں کی ری فائٹنگ میں روڑے اٹکائے گا تو

پہ تمہارا قصور نہیں ہوگا۔“

”تم بلاوجہ بدگمان ہو رہے ہو۔ میں نے کب کہا کہ وہ روڑے اٹکائے گا۔ وہ اپنے اوپر دالوں کے حکم

سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔ ویسے تم نے اکرم چشتی کے ساتھ اچھا نہیں کیا وہ بہت کام کا آدمی تھا یوں مجھ لو میں اسے

براہ راست حکم دے سکتا تھا لیکن ہر پولیس افسر اس طرح آنکھ بند کر کے میری بات نہیں مانے گا۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا ہے لیکن سنا ہے دشمنوں نے ڈی ایس پی صاحب کو کسی قابل نہیں چھوڑا ہے سوائے

ہدی کے.....“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”وہ کیا کہتے ہیں مکافات عمل..... شاید ان کی رسی کھینچنے کا وقت آ

گیا تھا۔ مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور تمہیں بھی افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے پولیس کا محکمہ ایسی کالی

بھیلروں سے بھرا ہوا ہے مجھے تو حیرت ہے کہ اب تک کسی نے اکرم چشتی کی جگہ لینے کی درخواست نہیں کی تم

سے؟“

وہ ہنسا۔ ”کئی آئے تھے مگر فی الحال میں نے سب کو ٹال دیا ہے۔ ایک بار ان کو منہ لگا تو یہ آئے دن دھرتا دیے بیٹھے ہوتے ہیں حرام کھانے کے چکر میں۔“

”اور تمہارے پاس حرام ہی حرام ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”گدھ بھی تو وہ ہیں آتے ہیں جہاں مردار ہوتا ہے۔ خیر چھوڑو اپنے فاضلی صاحب کا حال احوال سناؤ۔ میرا خیال ہے خبر سے صحت مند ہو گئے ہوں گے۔“

”فاضلی کو میں باہر بھیج رہا ہوں۔“ اس نے گویا مجھے آگاہ کیا۔ ”صحت یاب ہوتے ہی وہ یہاں سے چلا جائے گا۔“

”افسوس کہ تم نے ابھی اسے پہچانا نہیں ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مرشد تم میرے دشمن ہو لیکن میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں تم اپنی آستین میں سانپ نہیں اڑو حوالہ پا رہے ہو۔“

”تم مجھے فاضلی کے بارے میں نہیں بہکا سکتے میں اسے تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”اس کی قید میں، میں رہا ہوں تم نہیں اس لیے تم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”بہر حال تمہاری مرضی۔“

میں نے کال کاٹ دی۔ اگر مرشد نے سچ کہا تھا تو اسے یقیناً فاضلی سے کوئی انیسیت تھی ورنہ وہ اسے ہم سے بچانے کے لیے یوں کہیں دور نہ بھیجتا اور اس کا امکان بھی تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہو۔ ویسے فاضلی بھی مجھے کہیں جانے والا نہیں لگتا تھا اس کے عزائم بہت اونچے تھے اور مرشد کو ان کی بھنک پڑ جاتی تو اس کے ہاتھوں کے طوطے میناڑ جاتے اور وہ فاضلی سے اپنی انیسیت بھول کر اسے ملک سے باہر بھیجنے کے بجائے دنیا سے بھیجنے پر تل جاتا۔ وہ میرے کہنے پر کبھی یقین نہ کرتا لیکن مجھے یقین تھا کہ جلد وقت خود اسے فاضلی کی اصلیت بتا دے گا۔

مرشد کی پر یقین کرنے والا آدمی نہیں تھا جو اپنے سگے بھائی کے درپے ہو جائے وہ اپنی ناجائز اولاد کو کیوں بخشے گا صرف اتنا یقین ہونے کی دیر تھی کہ فاضلی اس کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے بعد مرشد اپنے ہاتھ سے اسے قتل کرے گا۔ معاف کرنا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ میں نے اس معاملے کو مرشد اور فاضلی کی قسمت پر چھوڑ دیا تھا۔

اس سے بات کر کے یہ تصدیق ہو گئی تھی کہ اگر مرشد چستی چج بچے کا رہ گیا تھا۔ اگر اسے نوکری سے نہ نکالا گیا تو کسی ایسی ڈیوٹی پر لگا دیا جائے گا جہاں وہ بیٹھ کر کھیاں مار سکے ویسے اس کے لیے سب سے موزوں جاب شکایات سننے کی ہو سکتی تھی۔ ایک بار مجھے خیال آیا کہ اگر مرشد چستی کا بچہ چشم خود معائنہ کیا جائے لیکن فوراً ہی میں نے خیالی جھٹک دیا۔ اگر مرشد چستی اندھا اور بہرا ہوا تھا باقی پولیس فورس کی آنکھیں بالکل سلامت تھیں۔ ایک بار میں اگر مرشد چستی کو دیکھنے جاتا تو واپسی کیسے ہوتی۔ مرشد کے لہجے میں گزشتہ رات کی کارروائی کی جھنجھلاہٹ تھی لیکن وہ اس معاملے میں اتنا برا فروختہ بھی نہیں تھا کہ مجھ سے کیا معاہدہ توڑ دیتا۔ ظاہر ہے یہ اس کا براہ راست نقصان نہیں تھا بلکہ اس کے پالتو ڈاکوؤں کا ذاتی نقصان تھا اور ظاہر ہے مرشد کو اس کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ اس سے گفتگو کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جلد از جلد تدارک کو حاصل کرنے کے لیے میرے خلاف کیسوں کو جلدی میں ختم کرنے میں سنجیدہ ہے۔

وسیم سورا تھا اور عبداللہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ میں نے اکیلے ہی لٹچ کیا اور پھر حویلی کال کی۔ سب سے

بات ہوئی۔ سفیر کو میں نے اشارے کنائے میں سمجھا دیا تھا کہ وسیم آنے والا ہے اور وہ اس کی جگہ یہاں آئے گا۔ وہ تاڑ گیا کہ کوئی چکر ہے جب میں نے فون بند کیا تو سفیر کے نمبر سے کال آگئی۔ وہ اب کہیں اور تھا۔ ”شہباز کیا ہوا ہے؟“

”یار ایک مہم پر گئے تھے مہم تو کامیاب رہی اور اس سے پہلے ایک بڑا خزانہ بھی ہاتھ لگا لیکن اس مہم کے دوران وسیم کی ران میں گولی لگی ہے۔ ویسے ٹھیک ہے مگر مکمل ٹھیک ہونے میں پندرہ دن لگ سکتے ہیں۔“

”اچھا صبح تو سعدیہ کی اس سے بات ہوئی ہے۔“ سفیر نے حیرت سے کہا۔ ”اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا۔“

”وسیم مجھ اوشو شہر ہے یار۔ بہر حال ٹو بھاپ بھی مت نکالنا، میرا اشارہ مونا کی طرف ہے تیرے پیٹ میں کوئی بات نہیں نکلتی ہے۔“

سفیر کھسیا گیا۔ ”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ وسیم کب تک آئے گا؟“

”چند دنوں میں۔“ میں نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ ”لیکن تم لوگ ایک گھنٹے کے نوٹس پر روانگی کے لیے تیار رہنا۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں مانی اور بیٹو سے نہیں کہوں گا وہ اپنی دیدیوں کو پھوٹ دیں گے۔“

”بیٹو کی دیدی تو سادی ہے یہ مانی کی دیدی کون ہے؟“

”مونا..... آج کل حویلی میدان جنگ بنی ہوئی ہے۔ سعدیہ اور مانی کی ٹھنی رہتی ہے۔ مونا اپنے بھائی کی حمایت کرتی ہے اور بیٹو اپنی دیدی کی۔“

میں ہنسا۔ ”دبی تیری ہوئی ہوگی۔“

”کم بختی ہے بھائی اگر غلطی سے بھی کسی دوسرے کی حمایت کر دو تو کوئی نہ کوئی بچے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتا ہے۔“

”یہ کوئی مونا ہی ہوتی ہوگی۔“

”ہاں یار فارم میں آگئی ہے۔“

”یہ اچھا ہے سفیر، وہ باہمت لڑکی ہے ورنہ اس کا دکھ معمولی نہیں تھا۔ اولاد کا دکھ ہر دکھ سے بڑھ کر ہوتا ہے۔“

سفیر چپ ہو گیا پھر اس نے سر داہ بھری۔ ”ٹھیک کہہ رہا ہے میں نے اس بچے کے لیے نہ جانے کیا کیا سوچ لیا تھا جو ابھی ماں کے پیٹ میں شاید میٹھے کا بھی نہیں ہوا تھا۔ اگر مجھے اس کا خیال آتا ہے تو یقین کر دل میں جیسے سوئی سی چھ جاتی ہے۔“ سفیر کا لہجہ بدل گیا۔ ”مونا کی خاطر میں معمول کے مطابق رہتا ہوں۔“

”حوصلہ کریار۔“ میں نے اسے پیار سے سمجھایا۔ ”اسی سے مونا کے دکھ کا اندازہ کر لے۔ ماں کا دکھ باپ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے اولاد کے لیے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے کبھی میری آنکھ کھلتی ہے تو مونا سوئی بن جاتی ہے پر یار اس کے چہرے پر آنسو ہوتے ہیں۔“

”سفیر وہ بچہ اللہ کی امانت تھا اور جو آئندہ دے گا وہ بھی اسی کی امانت ہوں گے جب چاہے دے اور جب چاہے واپس لے لے۔ مجھے یقین ہے اس بچے کے بدلے تم دونوں کو اولاد کی بہت ساری خوشیاں دے گا۔“

”ان شاء اللہ۔“ اس نے کہا۔

”اگر مونا سیٹ ہے تب آ جا ورنہ ابھی وہیں رہ، یہاں کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ ہم ہاتھ پاؤں سمیٹ کر بیٹھے ہیں۔“

”یار میں سوچ رہا ہوں کہ تیرے پاس آنے کے بہانے ایک چکر دینی کا لگا لوں۔ وہاں میں نے کپنی بنائی تھی کچھ اس کے معاملات بھی دیکھوں گا اور وہاں موجود رقم کی ٹرانسفر کا بندوبست بھی کروں گا۔ ویسے وہ رقم میں یہاں سے بھی نکال سکتا ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے اس رقم کو وہیں رہنے دے بلکہ ہو سکے تو کسی نفع بخش کام میں لگا دے۔ ایسے ہی پڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

”میں سوچ رہا ہوں اسے گولڈ میں تبدیل کر لوں۔ سنا ہے آنے والے چند سالوں میں سونے کی قیمت دو گنی ہو جائے گی۔“

”سنا تو میں نے بھی یہی ہے اور پھر سونے میں تبدیل کرانے سے نقصان بھی نہیں ہوگا یہ بہت آسانی سے کیش ہو جانے والی چیز ہے۔“

سفیر کو یاد آیا۔ ”تو کسی خزانے کا ذکر کر رہا تھا۔“

میں نے اسے ڈاکوؤں سے ملنے والی رقم اور سونے کے بارے میں بتایا۔ ”تقریباً ساڑھے سات کروڑ روپے مالیت کی چیزیں ہیں۔“

”عبداللہ سے کہو کہ سونا فروخت کرنے کے بجائے اسے چھوٹی بارز میں تبدیل کرا لے۔ کسی لاکر میں رکھوا دینا۔ بعد میں کام آئیں گی۔“

”بعد میں کب؟“

”جب ان چکروں سے جان چھوٹ جائے گی تو اپنا گھر اور بزنس بھی تو اسٹیمپلش کرنا ہوگا۔“

”یار یہ دولت حلال کی نہیں ہے۔ اسے عام استعمال میں نہیں لانا ہے۔ اس سے فی الحال ہمارے اخراجات پورے ہو رہے ہیں اور اگر باقی بچی تو لوگوں میں بانٹ دیں گے۔“

”چل کوئی بات نہیں، ہیروں والی رقم تو ہے۔“

”نہیں وہ تیری اور مونا کی ہے۔“

”تب تو کیا کرے گا؟“ سفیر ٹھکی سے بولا۔ ”محنت مزدوری کرے گا۔“

”وہ بھی کر لوں گا۔“ میں ہنسا۔ ”ویسے میری خاصی رقم ندیم کے پاس پڑی ہے اگر اس کی فیس سے بچ گئی تو اپنا کام دوبارہ شروع کروں گا تو جانتا ہے یہ صرف کام نہیں ہے بلکہ میرا شوق بھی ہے۔ اگر رقم نہیں ہوئی تو تجھ سے ادھار لے لوں گا۔“

”بکواس نہ کر اس میں تیرا اور دسم کا حصہ بھی ہے۔“

”اس طرح تو بیٹو بھی ہوا۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”وہ بھی اس سفر میں ہمارے ساتھ تھا جس میں ہیرے ملے تھے۔“

”ہاں وہ بھی ہے۔ چار حصے دار ہیں اس رقم کے۔“

”بس تو آجا اور دینی جا کر یہ کام کر لے۔“ میں نے کہا۔ ”مونا کو نہیں بتائے گا۔“

”اسے بتایا تو وہ حویلی سے نہیں نکلنے دے گی۔“

سفیر سے گفتگو کے دوران عبداللہ آگیا تھا اس نے ایک بڑا سا بیگ اٹھا رکھا تھا۔ بیگ میرے سامنے میز پر رکھ کر وہ اندر چلا گیا۔ شاید اس نے کھانا نہیں کھایا تھا جب تک میں نے سفیر سے بات کی وہ واپس آگیا۔

”مونا بک بند کر کے میں نے اس سے پوچھا۔“ کہاں گئے تھے؟“

”گیا تو ایک اور کام سے تھا لیکن میں نے سوچا کہ آپ کی تجویز پر عمل درآمد شروع کر دیا جائے۔ میں دس لاکھ لے گیا تھا انہیں پانچ ہزار کے نوٹوں میں تبدیل کرالایا ہوں۔“ اس نے بیگ سے پانچ ہزار کے نوٹوں والی دو گڈیاں نکالیں۔ ”ایک جاننے والا بنک منیجر ہے میں نے اس سے بات کی ہے۔ تھوڑی تھوڑی کر کے ساری رقم اسی طرح کرالوں گا۔“

”یہ اچھا کام شروع کیا ہے تم نے۔“ میں نے کہا اور اسے سفیر کی تجویز کے بارے میں بتایا۔ اس نے سر ہلایا۔

”اتفاق سے میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا اس لیے سامان لینے گیا تھا۔“ اس نے بیگ سے وہ مخصوص برتن نکالا جس میں سونا پگھلایا جاتا تھا اور اس کام کے باقی اوزار بھی تھے۔ وہ سو گرام کے پارکی ڈائی بھی لایا تھا۔ یہ سامان عام نہیں ملتا ہے لیکن مل جاتا ہے۔ عبداللہ نے شاہ جی کو بلالیا اور زپورات کو پگھلا کر بار میں تبدیل کرنے کا عمل شروع کر دیا۔ یہ کام اوپر میرے کمرے میں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر تو میں دلچسپی لیتا رہا لیکن پھر بوریت ہونے لگی تو دسم کے کمرے میں آیا۔ وہ جاگ گیا تھا اس نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیے تھے۔ کپڑوں میں وہ آرام دہ ٹی شرٹ اور کھلا شارٹ پہن رہا تھا کیونکہ زخم کی وجہ سے وہ چٹلون نہیں پہن سکتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ عبداللہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے دلچسپی سے کہا۔ ”اچھا میں بھی دیکھ کر آتا ہوں۔“

وہ داکر کے سہارے چلا گیا اور حسب توقع دس منٹ بعد بور ہو کر واپس آگیا۔ ”بڑا مشکل کام ہے ابھی تک صرف ایک درجن بار زینی ہیں۔“

”کم سے کم سو بار زینیں گی۔“ میں نے کہا۔ ”اتنا سونا تو ہے۔“

”میری سعدیہ سے بات ہوئی تھی۔“

”میری بھی سب سے بات ہوئی ہے۔ میں نے سفیر کو بتا دیا ہے۔ تم ایک دو دن میں جیسے ہی سفر کے قابل ہوئے حویلی روانہ ہو جانا۔ وہاں سے سفیر، مانی اور بیٹو آجائیں گے۔“

”میرا کیا کام ہے وہاں؟“

”تم آرام کرو گے اور سعدیہ کے ساتھ رہو گے۔ جب تک مکمل فٹ نہیں ہو جاتے۔“

”کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وسیم اور ایاز کی طرف سے ابھی تک اطلاع نہیں آئی ہے۔“

”آپ کال کر کے معلوم کر لیں۔ ممکن ہے کہیں راستہ خراب ہو تو انہیں دیر ہوئی ہو۔“

چند سال پہلے تک یہاں ہائی ویز کا نظام بہت اچھا نہیں تھا اور خاص طور پر میانوالی کی سڑکیں خستہ حالی کا شکار رہتی تھیں۔ مگر شی گورنمنٹس کے قیام سے سڑکوں کے نظام میں خاصی بہتری آئی تھی۔ پھر مرمت کے کام چلتے رہتے تھے اور اس وجہ سے ٹریفک میں خلل لازمی آتا تھا۔ عبد اللہ سے بات کر کے میں نے وسیم کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”جی شہباز صاحب..... ابھی راستے میں ہیں۔ سڑک کئی جگہ بہت خراب ملی اور ٹریفک جام تھا۔ ایاز کا کہنا ہے کہ اب ایک گھنٹے کا سفر باقی ہے۔“

”دوسرا کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“

”نہیں ابھی تک دشمنوں کی منحوس صورت یا ان کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔

”لیکن ہم ہوشیار ہیں۔“

”ہوشیار ہی رہنا اور حوصلے پہنچتے ہی اطلاع کرنا۔“ میں نے کہا۔

”آپ بے فکر رہیں۔“

وسیم سے بات کر کے مجھے اطمینان ہوا تھا۔ حالات بہت عرصے بعد بہتری کی طرف آئے تھے۔ بریف کیس کا مسئلہ حل ہوا تھا اگرچہ یہ میرا ذاتی مسئلہ نہیں تھا لیکن پھر بھی یہ میرے نام کے ساتھ جڑا ہوا تھا اور آنے والے وقت میں یہ مسئلہ بن بھی سکتا تھا۔ اب اس کا امکان نہیں رہا تھا۔ مرشد باؤ کے آگے مجبور ہوا تھا اور اس نے میرے کیس ری فائل کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی اور کیس ری فائل کی درخواست بھی دے دی گئی تھی۔ ندیم کا کہنا تھا کہ اگر کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی تو ایک سے ڈیڑھ مہینے میں میرے خلاف تمام کیسز خارج کر دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد مجھ پر قانون کی گرفت نہ رہتی میں حرکت کرنے اور ملک سے باہر جانے کے لیے آزاد ہو جاتا۔ میرا در کو تار کارہ بنا کر مرشد کے حوالے کر دیتا اور اگر مستقبل میں مرشد کوئی شرارت کرتا تو اس سے منشا جاسکتا تھا۔

فتح خان ہیردوں کے ساتھ بریف کیس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور فی الحال نہ گھر کا نہ گھاٹ کا تھا۔ اس کے کچھ ساتھی آرمی انٹیلی جنس کی گرفت میں تھے اور ممکن ہے اب اس کی بھی تلاش کی جا رہی ہو۔ ڈپوڈ شاواڈو نے ناکام واپسی کے بعد خاموش بیٹھا ہوا۔ حکیم قادس کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اس کا معجزاتی دواؤں کے فارمولوں کا خواب بھی ادھورا رہ گیا تھا۔ ویسے بھی اس دوا کا بنیادی جز اصل میں ہمالیائی واوی میں ملتا تھا۔ گم میرے تقریباً تمام دشمن بے دست و پا تھے یا پھر خاموش بیٹھے رہنے پر مجبور تھے۔

مگر میں ایک دشمن کو بھول رہا تھا جسے ہمارے ہاتھوں دو مرتبہ شدید زک لگی تھی ایک مرتبہ مالی اور ایک مرتبہ جانی زک پہنچی تھی۔ جان کا تو اتنا مسئلہ نہیں تھا مگر ان کی تمام زندگی کی جمع پونجی ہم تھمپا چکے تھے اور وہ دولت کے پیچھے جان لینے اور دینے والے لوگوں میں سے تھے۔ یعنی جیدا اینڈ کو اور وہ اس دولت کی واپسی کے لیے مرتے دم ہمارا پیچھا کرتا۔ اس وقت ہم نے ایک بات اور نظر انداز کی تھی کہ جیدا بے شک ہمارے بارے میں نہیں جانتا تھا لیکن مرشد ہمارے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا اور جیدا اگر وہ اس سے تعلق تھا تو اسے ہمارے

تیر ہواں حصہ

بارے میں جتا سکتا تھا۔ نہ صرف جتا سکتا تھا بلکہ انہیں اکسا کر اپنے سہارے کا یقین دلا کر انہیں ہمارے پیچھے لگا سکتا تھا۔ مرشد نے جذباتی ہو کر ندیم کو کال کر دی تھی اور اس طرح اس نے خود جیدا گروپ سے تعلق کا اعتراف کر لیا تھا اب اگر وہ ہمارے خلاف کرروائی کرتے تو مرشد ان سے لاطلفی ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ جذباتی نہ ہوتا تو جیدا گروپ کو ہمارے خلاف کھل کر استعمال کر سکتا تھا اور ہم اسے الزام بھی نہ دے پاتے۔ مگر اب بھی اس کا امکان تھا۔ میں اس بارے میں غور کر رہا تھا اور مجھے احساس ہوا کہ کوٹھی میں مجھ سمیت صرف چار افراد تھے اور صرف میں ہتھیار استعمال کرتا تھا اور کسی مشکل موقع پر کوٹھی کا دفاع کرنا پڑتا اور اگر دشمن زیادہ قوت کے ساتھ حملہ کرتا تو میں اکیلا کیسے مقابلہ کرتا۔ جب کہ یہاں نہ صرف نادور تھا بلکہ وہ دولت بھی تھی جس کے لیے جیدا گروپ پاگل ہو رہا تھا۔

یہ خیالات آتے ہی میرے اندر بے چینی سے ابھرنے لگی تھی میں نے اٹھ کر کوٹھی کا چکر لگایا۔ دونوں گئیں پر ایک ہی آدمی تھا وہ بڑی گلی والے گیٹ پر تھا لیکن یہاں سے پھیل گلی والے گیٹ پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ دوسرا آدمی اندر کے کمروں پر نگران تھا اور شاہ جی ظاہر ہے کہ دن دیکھنے میں لگا ہوا تھا۔ ساڑھے چھ بجے سورج فروب ہونے کے قریب تھا اور کچھ دیر میں اندھیرا چھا جاتا۔ میں نے شاہ جی سے چائے کا کہا اور کوٹھی کی چھت پر آیا۔ یہاں سے چاروں طرف دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ بڑی کوٹھیوں کا علاقہ تھا اور پیشتر کوٹھیاں ایک منزلہ تھیں اور دور تک دیکھنے میں رکاوٹ نہیں تھیں سرشام ہی روشنیاں جل اٹھی تھیں اور گلیاں روشن تھیں۔ بچے کھیل رہے تھے لوگ آ جا رہے تھے۔ پھل بیزی اور دوسری چیزیں فروخت کرنے والے بھی رواں دواں تھے لیکن ان میں مجھے کوئی مھلک فرد نظر نہیں آیا۔ سب معمول کے مطابق لگ رہا تھا۔

شاہ جی مجھے تلاش کرتا چائے اوپر ہی لے آیا تھا اس نے چائے کے ساتھ ٹرے میں گھر میں بنائے پھونے چائے سموسے بھی چھنی کے ساتھ رکھے تھے۔ ”یہ تم نے نیکی کا کام کیا ہے شاہ جی۔“ میں نے اس سے (رے لی۔) ”نیچے موجود دونوں آدمیوں کو کہو کہ پوری طرح ہوشیار رہیں۔“

”میں کہہ دوں گا صاحب۔“

میں اوپر ہی رہا، مجھے عبداللہ کا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد وسیم کی کال آئی۔ ”ہم پہنچ گئے ہیں۔“ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”یہ اچھا ہوا..... لیکن یہاں کوٹھی میں صرف میں ہوں اور تین نوکر ہیں۔ ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ ہم جیدا پارٹی کی طرف سے کچھ زیادہ ہی مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہیں کیونکہ ان کے لیے یہ زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔ وہ اپنی دولت واپس حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر سکتے ہیں۔“

”لیکن وہ ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں اور فرخ شاہ ان کی گرفت سے دور جا چکا ہے۔“

”تم بھول رہے ہو مرشد ہمارے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے اور جیدا اصل میں اس کا آدمی ہی

“۴

وسیم سوچ میں پڑ گیا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر مرشد ہمارے اس ٹھکانے سے بے خبر ہے۔“

”ہاں یہ اطمینان کی بات ہے ورنہ اب تک وہ یہاں چڑھائی کر چکا ہوتا۔“

”دراصل اسے فاضلی کے غیر فعال ہونے سے نقصان ہوا ہے۔ وہ اس قسم کے کاموں کا ماہر تھا ورنہ باقی

مرشد کے پاس میرا خیال ہے جیسا جیسے زے بد معاش ہی ہیں۔“

”میں نے اس سے پہلے بھی مرشد کے پاس کوئی کام کا آدمی نہیں دیکھا۔ یہ تو اس کی قسمت کہ ڈیوڈ شاکی وجہ سے فتح خان جیسا آدمی مل گیا۔“

”فتح خان اب اس کا دشمن ہے۔ ویسے آپ کا کیا اندازہ ہے فتح خان کہاں ہوگا۔“

”فی الحال وہ روپوش ہوگا کیونکہ اس کے آدمی آرمی انٹیلی جنس کے ہاتھ لگے ہیں اور بریف کیس والے معاملے میں اس کا نام آیا ہوگا۔ مگر اس کے بارے میں کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا ہے وہ اکثر مجھے حیران کر دیتا ہے۔“

”مہر دیا کرئل کی طرف سے دوبارہ رابطہ نہیں ہوا؟“

”نہیں اور اگر ان کی طرف سے رابطہ کیا بھی گیا تو میری طرف سے ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہوگی۔ میں

ان دونوں میاں بیوی سے دور رہنا چاہتا ہوں۔“

وسیم نے گویا سکون کا سانس لیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں ان لوگوں سے دور ہا جائے۔“

”مجھے کرئل پسند ہی نہیں ہے۔ جو شخص مذہب کے معاملے میں اس طرح سے دھوکا کرے وہ میرے نزدیک کسی صورت قابل اعتبار نہیں ہو سکتا ہے۔ مہر دیا وجہ سے مجبور ہو کر میں نے اس کی مدد کر دی تھی۔ اگر وہ پوچھ کر ہماری مدد کرنا چاہتا تو میں یقیناً انکار کر دیتا۔“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے اس حالت میں بھی کسی کا باپ ہمیں نہیں روک سکتا تھا۔“

”بہر حال تمہارے آدمیوں نے وہ کوٹھی چھوڑ دی ہے۔ عبد اللہ ان کے ساتھ ہے وہ بھوت بنگلے میں شفٹ

ہو چکے ہیں۔“

”بھوت بنگلہ۔“ وسیم ہنسا۔ ”اچھا نام ہے۔“

”سادی خوش ہے؟“

”ہاں مگر زخم دیکھ کر اس نے بہت سنائی ہیں۔“

”زخمی ہونے پر؟“

”نہیں اسے نہ ہٹانے پر۔“

ابھی بات کر رہا تھا کہ نیچے دو گاڑیاں آ کر رکیں۔ عبد اللہ اپنے آدمیوں سمیت واپس آ گیا تھا۔ میں بات ختم کر کے نیچے آیا۔ عبد اللہ اندر آ گیا تھا اور اس کے آدمیوں نے اپنی اپنی جگہوں پر ڈیوٹیاں سنبھال لی تھیں۔ عبد اللہ نے آتے ہی معذرت کی۔ ”سوری شہباز صاحب میں سارے آدمی لے گیا تھا لیکن اسی صورت منتقلی تیزی سے اور محفوظ طریقے سے ہو سکتی تھی۔“

”کوئی بات نہیں یار..... ویسے میں ہوشیار تھا۔“

”میں نے تعاقب کا خاص خیال رکھا تھا کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ مرشد نہ سہی مگر کرئل کے آدمی ہماری نگرانی کر سکتے ہیں مگر اب مجھے یقین ہے ہمارے اس نئے ٹھکانے سے کوئی واقف نہیں ہے۔ حویلی اچھی ہے صاف ستھری اور تمام سہولیات کے ساتھ ہے۔ آس پاس کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔ شہر آنے کے دو تین راستے ہیں۔ میں دوسرے راستے سے ہو کر آیا ہوں یہ اسلام آباد ایکسپریس دے پر لکھتا ہے۔“

”یہ اچھا ہوا سفیر اور بیٹو وہیں جائیں گے۔ تم سفیر کے لیے دیی کا ایریکٹ لے لو۔ میں چاہتا ہوں وہ جلد از جلد دیی چلا جائے۔“

”صرف سفیر جائے گا۔“

”ہاں اسے وہاں اپنے معاملات نمٹانے ہیں۔“ میں نے کہا پھر اسے دسیم کے بارے میں بتایا۔ گفتگو کا رخ دسیم کی طرف مڑا تو عبداللہ نے کہا۔

”میرا خیال ہے دسیم کی ایک بہن بھی ہے۔“

”سونیا۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”لیکن بہت عرصے سے اس سے رابطہ نہیں ہے۔ صرف دسیم جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے؟“

”اس لحاظ سے یہ اچھا ہی ہے ورنہ ہمارے دشمن اس تک پہنچ جاتے۔ وہ سکون سے اپنے گھر میں ہے ویسے اس بے چاری نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔“ میں نے عبداللہ کو سونیا کے بارے میں بتایا۔

”یہ ناصر اگر اتنا ہی اچھا صحافی ہے تو ہمارے کام آسکتا ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر اسے ہمارے کام آنا ہوتا تو وہ بہت پہلے خود ساتھ دیتا۔ میں نے کبھی کسی سے نہیں کہا کہ وہ میری جنگ میں میرا ساتھ دے۔ تم اور دوسرے سب اپنے خلوص اور اپنی رضا مندی سے میرے ساتھ آئے۔ میں اسے الزام نہیں دے رہا لیکن وہ لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں تھا۔“

”اس طرح تو ندیم بھی ہے لیکن اس نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔“

”ندیم درمیان میں شامل نہیں ہوا ہے وہ شروع سے میرا دوست اور وکیل رہا ہے۔“

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہر کوئی اس طرح سے ساتھ نہیں دے سکتا۔“ عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”لیکن

لاہور میں تو اس نے آپ کا بہت ساتھ دیا تھا۔“

”وہ ایک فوری اور ہنگامی ضرورت تھی۔ جب میں وہاں سے نکل گیا تو وہ وہیں رہ گیا تھا۔“

”آپ کے غائب ہونے اور بھارت میں دریافت ہونے تک ہم میں سے کسی کو صورت حال کا درست معلوم نہیں تھا۔ ان دنوں میں ناصر سے مسلسل رابطے میں تھا لیکن جب راجا صاحب یہاں سے چلے گئے اور پھر مجھے بھی اسلام آباد جانا پڑا تو پھر اس سے رابطہ نہیں رہا۔ بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ سونیا اور ناصر نے شادی کر لی ہے۔“

”ہمارے حالات بھی ایسے رہے کہ دسیم سے پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا کہ اس کا سونیا سے رابطہ ہے یا نہیں؟“

”میرا خیال ہے رابطہ ہے۔ خود دسیم نے بھی اپنی بہن کو الگ کر دیا ہے۔ اس لیے وہ اس کا ذکر بھی نہیں کرتا ہے۔“

”لیکن وہ اس سے ملنے بھی نہیں جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں ہمیں تو پتا چلا۔“

”دشمنوں کو اس سے دور رکھنے کے لیے وہ خود اس سے ملنے سے گریز کرتا ہوگا۔“ عبداللہ نے کہا۔

”پھر بھی یار مجھے شرمندگی ہو رہی ہے سونیا کا خیال میرے ذہن سے بالکل نکل گیا اور میں نے کبھی دسیم

سے اس کے بارے میں پوچھا بھی نہیں۔ وہ بھی کیا سوچتا ہوگا کہ مجھے اب اس کی بہن اور بہنوئی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟“

”حالات جناب۔“ عبداللہ نے مجھے تسلی دی۔ ”ہم میں سب سے زیادہ مشکلات کا شکار آپ ہی ہوتے ہیں آئے دن آپ دشمنوں کی قید میں ہوتے ہیں اور وہاں سے چھوٹ کر چند دن سکون کا سانس لیتے ہیں تو کچھ دن بعد کوئی دوسرا دشمن آپ کو لے جاتا ہے۔ ویسے میرا ایک مشورہ ہے؟“

”وہ کیا؟“

”آپ لاہور چلے جائیں کچھ دن کے لیے۔“

”لاہور..... وہاں جا کر کیا کروں گا؟“

”کچھ نہیں آرام کیجئے گا۔ وہاں دشمن نہیں ہوگا اس لیے خطرات بھی کم ہوں گے۔“

”لیکن وہاں تم لوگ بھی تو نہیں ہو گے۔“

”آپ بیٹو اور سفیر کو لے جائیے گا۔“

اچانک مجھے خیال آیا۔ ”یار تم کسی خاص وجہ سے یہ سب کہہ رہے ہو؟“

عبداللہ مسکرایا۔ ”ارے نہیں..... بس ایسے ہی خیال آ گیا۔ آپ جانتے ہیں لاہور میں بھی راجا صاحب کا سیٹ آپ ہے وہاں آپ کو کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“

”نہیں یار مجھے چیزوں کے ساتھ مزہ نہیں آتا ہے مجھے انہوں کے ساتھ مزہ آتا ہے۔“

”جیسے آپ کی مرضی، ویسے جی بات ہے ہمیں بھی آپ کے ساتھ مزہ آتا ہے جب آپ غائب ہوتے ہیں تو ہم بھی بور ہو رہے ہوتے ہیں۔“



اگلے دن ایاز سفیر، مانی اور بیٹو کو لے آیا تھا۔ سفیر اور بیٹو نے بھونٹے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ میرے پاس آنا چاہتے تھے۔ بیٹوں اور خاص طور سے بیٹو آکر مجھ سے ایسا چٹا کہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔ ”بھائی میں کہیں بھاگتا توڑی جا رہا ہوں۔“

”بس اب ہم آپ کو نہیں چھوڑے گا۔“ بیٹو نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”آپ اچانک غائب ہو جاتا ہے اس بار آپ غائب ہوا تو ہم بھی آپ کے ساتھ غائب ہوگا۔“

”لے بھائی۔“ سفیر نے قہقہہ لگایا۔ ”تیرا ازواجی مستقبل ابھی سے تاریک نظر آ رہا ہے۔ جب یہ ایسے چمنار ہے گا تو بیوی کے لیے جگہ ہی کہاں بچے گی۔“

میں اور بیٹو دونوں ہی جھینپ گئے۔ بیٹو جلدی سے الگ ہو گیا اور شکایتی لہجے میں بولا۔ ”یہ سفیر بھائی بہت تنگ کرتا ہے وہاں بھی ایسا ہی کرتا تھا۔“

”ایسے لوگوں کے لیے اس موسم میں کپڑوں سمیت غسل موزوں ہوتا ہے۔“ میں نے کھڑے ہونے ہوئے کہا۔ سفیر نے بھانپ کر فرار ہونا چاہا تھا لیکن اس میں نے اسے پکڑا بیٹو اور مانی رضا کار بن کر آئے اور ہم نے سفیر کو زبردستی لے کر شاد کے نیچے کھڑا کر دیا۔ وہ اندر سے باہر آنے کی کوشش کرتا تو ہم اسے واپس دھکیل

دیتے۔ سفیر برا بھلا کہہ رہا تھا اور ساتھ ساتھ فتنیں بھی کر رہا تھا۔ مگر جب تک وہ بھیگ نہیں گیا ہم نے اسے شاد کے بچے سے نکلنے نہیں دیا۔ ہم باہر آئے تو وہ بھی بکتا بھکتا اور چھینکتا ہوا باہر آیا۔ عبداللہ کو ذرا دیر سے اطلاع ملی تھی اس لیے وہ محفوظ ہونے سے رہ گیا لیکن کچھ دیر بعد جب سفیر کپڑے بدل کر آ گیا تھا تو اسے مزید تپانے کے لیے بیٹو اور مانی نے سارا واقعہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا۔ بالآخر یہ طوفان بدتمیزی ختم ہوا۔ مانی کو عبداللہ لے گیا اور بیٹو اور گھنٹے لگا تھا۔ وہ سہ پہر کے وقت یہاں پہنچے تھے اس لیے کھانا راستے میں کھا لیا تھا۔ یہاں چائے کے ساتھ ریفریجیٹر لی تھی۔

”اب بتا حیرا کیا ارادہ ہے؟“ میں نے سفیر سے پوچھا۔

وہ چائے کا سپ لے کر بولا۔ ”میں دعویٰ جا کر اپنا سیٹ آپ دیکھوں گا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں مونا کے ساتھ دعویٰ میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ دوسری صورت میں مجھے اس کو حویلی میں رکھنا پڑے گا اور حویلی کا ماحول اس جیسی شہری خاتون کے لیے موزوں نہیں ہے۔ وہ اس ماحول میں نہیں رہ سکے گی۔ یا مجھے تو تیری حویلی کے ماحول پر شک آتا ہے۔ بے شک وہاں بھی روایات اور دیہی تہذیب کا پورا خیال رکھا جاتا ہے پر ذرا بھی ٹھٹھن اور جبر کا احساس نہیں ہوتا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ میں وہاں جا کر یور ہوں گا پر میرا دل اس آئے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔“

”یہ بابا کا بنایا ہوا ماحول ہے۔ بعض معاملات میں وہ بہت سخت ہیں لیکن مجموعی طور پر انہوں نے ہمیں پوری آزادی دی۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں ہے لیکن صفران آپا کو بابا نے خود اصرار کر کے گریجویشن کرایا۔ اب ٹی گریجویشن کر رہی ہے۔“

”یہ دونوں بہت بد معاش ہیں۔“ سفیر نے مانی اور بیٹو کی طرف اشارہ کیا۔ ”جب تک چا چا جی حویلی میں ہوتے یہ شرافت سے مردانے میں رہتے تھے اور ان کے جاتے ہی خواتین کے پاس پہنچ جاتے۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ چا چا جی کو بھی پتا تھا لیکن وہ نظر انداز کرتے تھے۔“

”خواتین سے مجھے یاد آیا شاز یہ کیسی ہے اب؟“

”ٹھیک ہے، اس نے خود کو سنبھال لیا ہے۔ وہ سادی سے بہت اونچ ہو گئی ہے۔“

”مانی اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔“

”ہاں کچھ محسوس تو کیا تھا لیکن جب میں نے پوچھا تو صاف مکر گیا۔“

”تمہارے سامنے اقرار کر کے اس نے اپنی جان عذاب میں ڈالنی تھی۔“

”یار میں ایسا بھی جلاؤ نہیں ہوں۔“ سفیر بھنا گیا تھا۔ ”ان دونوں نے مجھے بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔“

”خیر چھوڑ ان کو، یہ بتا کہ جائے گا کیسے؟“

”ظاہر ہے بائی ایئر۔“

”بیٹے تمہارے خیال میں ایئر پورٹ پر مرشد کی نگرانی نہیں ہوگی۔ وہ حکومت میں شامل رہا ہے اور اب

بھی اس کا اثر و رسوخ ہے۔“

”تب کیا پیدل چلا جاؤں؟“

”نہیں میں نے سوچا ہے تم یہاں سے نہیں بلکہ لاہور سے جاؤ گے۔“

”یاد رہاں سے ٹکٹ کرانے کا مسئلہ ہوگا۔“

”نہیں ہوگا یہ بتا پاسپورٹ اور دوسری چیزیں ساتھ لایا ہے؟“
”بالکل۔“

”بس تو ہم یہاں سے نکلیں گے اور لاہور میں کسی ٹریول ایجنٹ سے کام کرائیں گے۔“

”ہم۔“ سفیر چونکا۔ ”تم بھی چلو گے۔“

”لاہور تک۔“ میں نے قہج کی۔ ”ہمارے ساتھ بیٹو بھی ہوگا۔“

”یہ مصیبت ساتھ جائے گی۔“

”آپ خود مصیبت ہے۔“ بیٹو نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔ ”ہم نے مونادیدی کو کہتے سنا تھا۔“

سفیر مزید بھنا گیا تھا۔ ”دیکھی تم نے اس شخص کی اخلاقی حالت.....؟ میاں بیوی کی باتیں چپ چپ کر سنتا ہے۔“

”ہم نے اپنے کمرے میں سنا تھا۔“ بیٹو اسی طرح بولا۔ ”مونادیدی چلا کر کہہ رہا تھا۔“

میں ہنس رہا تھا اور بڑی مشکل سے ان کا جھگڑا ختم کرایا۔ طے ہوا کہ ہم کل صبح سویرے لاہور کے لیے نکل

جائیں گے۔ مانی کو پتا چلا کہ بیٹو ہمارے ساتھ جا رہا ہے تو وہ دوڑ آیا۔ ”شوہی میں بھی چلوں گا۔“

”سفیر دعی جا رہا ہے حج کرنے نہیں جو پورا خاندان اسے ایئر پورٹ چھوڑنے جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا یہاں کام ہے اس لیے تم یہیں روکو گے۔“

مانی نے منہ بسورا۔ ”پوریست.....“

”بیٹے جب راستے میں گولیاں طلیں گی اور دشمن ہم وغیرہ پھینکیں گے تب تمہیں مزہ آئے گا۔“

”گولیاں، ہم۔“ مانی نے ہدک کر کہا۔ ”یہ کہاں سے آئیں گی۔“

”جب برسیں گی تب پتا چل جائے گا کہ کہاں سے آ رہی ہیں۔“ سفیر نے اس کی حالت سے لطف اندوز

ہوتے ہوئے کہا۔

”تب میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ مانی نے فوراً فیصلہ واپس لے لیا۔

عبداللہ کو ہمارے اس فیصلے سے اختلاف تھا اس نے کہا۔ ”صرف تین افراد کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ آپ

تین چار محافظ لے کر جائیں۔“

”نہیں یا ربھیڑ بھاڑ سے ہم نظر میں آسکتے ہیں اور ایک بار دشمن کی نظر میں آجائیں تو پھر زیادہ آدمیوں

سے بھی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ وہ اسی لحاظ سے اپنا پلان بنا لے گا۔ ہم جتنی خاموشی سے نکلیں گے اتنا ہی کم

امکان ہوگا دشمن کی نظر میں آنے کا۔“

سفیر حامی تھا اس نے کہا۔ ”شوہی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں اپنی کسی گاڑی کے

بجائے پرائیویٹ گاڑی لے لینی چاہیے۔“

”بالکل ڈرائیور سمیت کارل جاتی ہے۔ ہم دو دن کے لیے ہائر کر لیں گے اور امید ہے کہ دو دن میں سفیر

روانہ ہو جائے گا۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”لیکن آپ مجھ سے مستقل رابطے میں رہیے گا۔“

”مستقل تو مشکل ہے لیکن دن میں چار پانچ بار تم سے رابطہ کریں گے۔“

کیونکہ صبح سویرے نکلتا تھا اس لیے رات سے تیاری شروع کر دی۔ بیٹو بہت خوش تھا کہ اسے میرے ساتھ پھر سفر کا موقع مل رہا ہے۔ اسے لاہور دیکھنے کا شوق تھا اور اس نے بڑے عجب سے پوچھا۔ ”شوبی کیا جگہ ہے؟“

”یہ محاورہ ہے منے۔“ سفر نے کہا اور پھر بیٹو کو سمجھانے لگا کہ محاورہ کسے کہتے ہیں۔ سفر نے ایک اچھا کام یہ کیا تھا کہ ایک اخباری اشتہار دیکھ کر ایک ریٹ اے کار والے سے بات کر لی تھی۔ اب وہ صبح آٹھ بجے فیض آباد کے ایک معروف کیفے کے سامنے ہمارا انتظار کرتا۔ اگر ہم صبح ہی کار تلاش کرتے تو بہت مشکل ہوتی کیونکہ اس قسم کی دکانیں کھلتی ہی گیارہ بجے کے آس پاس تھیں۔ عبداللہ وقت ضائع کیے بغیر کوٹھی کی الیکٹرانک سیکورٹی کرانے میں لگ گیا تھا اور وہ مانی کے ساتھ رات گئے تک گھومتا رہا تھا اور آلات خریدتا رہا تھا۔ جب وہ آیا تو ہم کچھ دیر بیٹھے اور پھر سونے کے لیے اٹھ گئے تھے۔ عبداللہ نے پھر کہا کہ ہم راجا صاحب کی کوٹھی میں رکیں مگر میں نے انکار کیا۔

”یہ بلاوجہ نظروں میں آنے والی بات ہوگی۔ راجا صاحب کی کوٹھی سے دشمن اچھی طرح واقف ہیں لیکن تم وہاں موجود دے دار کا نمبر دے دینا اگر مجھے ضرورت پڑی تو میں اس سے رابطہ کر لوں گا۔“

عبداللہ نے مجھے نمبر دیا۔ ”خالد رفیق نام ہے۔ کام کا آدمی ہے لڑنے والا نہیں ہے لیکن ضرورت پڑنے پر سامان اور بندے مہیا کر سکتا ہے۔ اس کا ایک بھائی اندرون لاہور میں اکھاڑا چلاتا ہے۔“

”یعنی بد معاشی کا اڈہ؟“ میں نے عبداللہ کی بات پر غور کیا۔

”ظاہر ہے شرافت سے اکھاڑا کون چلاتا ہے آج کل۔“

”ٹھیک ہے ضرورت پڑے گی تو میں اس سے رابطہ کر لوں گا۔“

صبح بیٹو نے مجھے بیدار کیا۔ ”شوبی اٹھ جائیں اور تیار ہو جائیں ناشتہ بھی تیار ہو رہا ہے۔“

میں مختصر غسل کر کے اور لباس بدل کر نیچے آیا۔ سفر اور بیٹو پہلے ہی ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ سفر نے کہا۔ ”گاڑی والے کی کال آئی تھی وہ وقت پر پہنچ جائے گا۔“

سازھے سات بج چکے تھے اس لیے غلٹ میں ناشتہ نہ بنایا گیا۔ عبداللہ رقم نکال لایا۔ اس نے دس لاکھ روپے سفر کو دیئے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ رقم یہیں سے لے کر جائے اور وہی میں موجود سرمائے کو نہ چھیڑے۔ یہ پانچ ہزار کی دو گڈیوں کی صورت میں تھے۔ مجھے عبداللہ نے پانچ ہزار، ہزار اور پانچ سو کے الگ الگ نوٹوں کی صورت میں کوئی لاکھ روپے دیئے۔ میرے خیال میں اتنی رقم کافی تھی۔ بیٹو کے پاس کچھ رقم موجود تھی اس لیے اس نے مزید لینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ہم کسی اور کے ساتھ جا رہے تھے اس لیے ہم نے چھوٹے ہتھیار رکھے۔ پھر بھی بیٹو نے حفظہ قائم ایک چھوٹی مشین گن اپنے بیک میں کپڑوں کے نیچے رکھ لی یہ اس میں آرام سے آگئی تھی۔ عبداللہ نے ہمیں مین روڈ تک چھوڑا۔ ہمیں گرم جوشی سے رخصت کر کے وہ واپس کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ ہم پیدل ہی کیفے کی طرف چل پڑے جہاں کار والا ہمارا منتظر تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے ہم اس کے

سامنے تھے۔ وہ سانولے رنگ کا دبلا اور ذرا شوقین نظر آنے والا نوجوان تھا۔ اس کا ہنر اسٹائل کچھ عجیب سا تھا۔ سائڈوں سے لیئرٹ جیسے خواتین کرواتی ہیں اور پیچھے کے لمبے بال ایک ڈبیل پونی کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ نام اس کا شاید تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا۔ ”بس آپ تینوں نے جانا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا اور فرنٹ سیٹ پر آ گیا۔ بیٹو اور سفیر پیچھے بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی تین سال پرانے ماڈل کی سیوک تھی اور بہت اچھی حالت میں تھی۔ شاید ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور کسی قدر کچکا ہٹ کے ساتھ بولا۔

”جناب میں ایک دن کا کرایہ پیشگی لیتا ہوں۔“

”کیوں نہیں۔“ میں نے اسے چار ہزار دیئے۔ ”لیکن ہمیں لاہور میں دو دن کا کام ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ رہو۔“

”کیوں نہیں جی۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”ریت آپ کو بتا چکا ہوں ایک دن کے چار ہزار ہوں گے اور اس میں ہمیں آپ کو سو میل تک کہیں بھی لے جاسکتا ہوں۔“

”اور اگر سو میل پورے ہو جائیں تو؟“

”اس کے بعد ہر میل کے پچاس روپے الگ چارج ہوں گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میٹر نوٹ کر لیں۔“

یہ کام بیٹو نے کیا اور مالکویٹر کی ریڈنگ اپنے پاس لکھ لی۔ شاید نے کار اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ میں بے چین ہو رہا تھا۔ زیادہ دیر کھلی جگہ اور رکے رہتا میرے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ مرشد کے آدمی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ اس لیے سفر کے آغاز سے مجھے سکون ملا تھا۔ جو گزشتہ کچھ عرصے میں میری زندگی میں غما ہوتا جا رہا تھا۔ لوگوں کے لیے حرکت وسیلہ ظفر ہوتی ہے میری حرکت بالآخر مجھے کسی نہ کسی مشکل میں لے جا کر پھنسا دیتی تھی۔ جس میں کسی نہ کسی طرح نکل بھی آتا تھا لیکن یہ ایک نام ایڈجیری ٹائپ کی ریس تھی۔ جس نے اب مجھے بیزار کرنا شروع کر دیا تھا اس لیے میری عافیت اسی میں تھی کہ میں دشمن سے ممکنہ حد تک دور رہوں۔ ہم میں طے ہوا تھا کہ دوران سفر کوئی غیر متعلقہ بات ڈرائیور کے سامنے نہیں کرنی ہے۔ اس لیے فی الحال سب منہ میں کھٹکھٹیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ سفیر نے ایک اخبار لے لیا تھا اور میں نے نصف اخبار اس سے لے لیا۔ موسم خاصا گرم تھا اس لیے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اے سی آن تھا۔ بیٹو نے کچھ دیر بعد مننا کر کہا۔

”ہم کیا کرے؟“

”تم اپنے موبائل پر ویڈیو گیمز کھیلو۔“ سفیر نے مشورہ دیا اور بیٹو نے عمل شروع کر دیا۔ کار پنڈی شہر کے پرجھوم ٹریفک سے گزر رہی تھی۔ میں نے پہلے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کوئی ہمارے پیچھے تو نہیں ہے لیکن ٹیکسٹروں کے حساب سے گاڑیوں میں کسی ایک ٹھکوک گاڑی کا چٹا چٹا ایسا ہی تھا جیسے بھوسے سے سوئی کو الگ سے شناخت کرنا اس لیے کچھ دیر بعد میں نے کوشش ترک کر دی اور اخبار دیکھنے لگا۔ اس بہانے میں نے اپنا رخ روشن بھی چمپا لیا تھا تا کہ اتفاق سے بھی کسی کی بد نظر نہ پڑے۔ ایک گھنٹے بعد ہم جی ٹی روڈ پر پنڈی شہر سے نکل چکے تھے اور اب مضافاتی علاقوں سے گزر رہے تھے۔ اس دوران میں ہمیں اور سفیر پورا اخبار چاٹ چکے تھے اس

لے اب میں نے وقت گزاری کے لیے کار کے ریڈیو سے رجوع کیا۔ شہر سے باہر آنے پر ایف ایم ریڈیو کے سنگل تو نہیں مل رہے تھے لیکن کئی میڈیم ویو ریڈیو آرہے تھے البتہ معیار خراب تھا۔ شاہد نے کہا۔

”سرایم پی قمری میں کئی ہزار سنگز ہیں آپ چاہیں تو اپنی پسند کا میوزک سن سکتے ہیں۔“

ایم پی قمری پلیئری ڈی پلیئر کے ساتھ ہی تھا۔ میں نے اس کا معائنہ کیا اور کچھ غریب منتخب کر کے پل کر دیں۔ کار کے اسپیکر بہت اعلیٰ درجے کے تھے اس لیے میوزک بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب میں، سفیر اور مونا کہیں جمع ہوتے تو ہم میوزک بھی سنتے تھے۔ اگر کوئی اچھی مودی آتی تھی تو سب مل کر دیکھتے تھے۔ کبھی کبھار سینما بھی جاتے تھے۔ اب یہ ساری تفریحات کیے جیسے صدیاں گزر گئی تھیں۔ اس وقت میوزک سنتے ہوئے خیال آیا تھا۔ اقبال بانو نے فیض کے الفاظ میں کہا۔ ”ہم دیکھیں گے۔۔۔“

”ہاں یار ہم دیکھیں گے۔“ سفیر نے پیچھے سے نکلوا لگایا۔ پھر ہم مل کر ہر مصرع کو دہرانے لگے۔ فیض کی یہ فزل ہر مظلوم کے دل کی آواز ہے۔ جو بردستوں کے ظلم کا شکار ہوتا ہے۔ خاصاً سفر موسیقی کے سہارے گزر گیا۔ نہ جانے ڈراما نویس نے موثر دے سے جانے کی کوشش کیوں نہیں کی وہ جی ٹی روڈ پر سفر کر رہا تھا اگرچہ جی ٹی روڈ بھی اب ایک معیاری ہائی وے بن گئی ہے مگر یہ موٹر وے کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ جی ٹی روڈ پر بسوں اور ویکوں کا رش بہت زیادہ ہوتا ہے اور جاہل مسافر لینے یا چھوڑنے کے لیے یہ رک جاتی ہیں اور اس سے ٹریفک کی روانی متاثر ہوتی ہے۔ پٹھوہار کے رجنجن میں اتنا ٹریفک نہیں تھا لیکن میدانی علاقہ شروع ہوتے ہیں ٹریفک کا دباؤ بڑھنے لگا۔ مجھے یاد ہے کالج کے دور میں جب میں پہلی بار لاہور آیا تھا تو جی ٹی روڈ کے دونوں طرف آبادی کم تھی۔ کھیت، جنگل اور میدان زیادہ تھے۔ مگر اب جہلم کے بعد آبادی کا ایک ایسا سلسلہ بن گیا جو لاہور تک چلتا ہی رہتا تھا۔ رفتار سست تھی اور خدا خدا کر کے ہم ایک بجے کے قریب لاہور میں داخل ہوئے تو سب کا بھوک سے برا حال تھا۔

اس لیے پہلے ایک ہوٹل میں لُف کیا۔ اس کے بعد ہم ٹریول ایجنٹس کے لیے نکلے۔ شاہد نے لاہور دیکھا ہوا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ٹریول ایجنٹس کہاں بیٹھے ہیں۔ وہ ہمیں سیدھا وہیں لے گیا۔ تیسرے ٹریول ایجنٹ نے دعائی کے لیے اگلے روز کی فلائیٹ میں جگہ نکال لی۔ فلائیٹ رات نو بجے تھی۔ تب تک ہمیں کہیں ٹھہرنا تھا۔ ابھی ہم رہائش کے بارے میں بحث کر رہے تھے کہ شاہد نے مداخلت کی۔ ”جناب میں ایک تجویز دے سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں برخوردار ضرور دو۔“ میں نے کہا۔

”ادھر مال روڈ پر ذرا اندر کر کے ایک ہاسٹل ہے وہاں روز کے لیے بھی کمرے کرائے پر ملتے ہیں۔ کرایہ بھی زیادہ نہیں ہے سنگل بیڈ کا ہزار روپے اور ڈبل کا پندرہ سو روپے ہے۔“

”بس تو وہیں لے چلو۔۔۔ ویسے بھی ایک دو دن کی بات ہے۔“

ہاسٹل زیادہ دور نہیں تھا اور کوئی پانچ منزلہ جدید طرز کی عمارت تھی۔ یہاں زیادہ تر ایسے ملازم پیشہ رہتے تھے جن کے گھر لاہور میں نہیں تھے اور وہ اچھی اور پُر سکون رہائش کے خواہش مند تھے۔ یہاں دو کمرے لے لیے۔ ایک سنگل اور ایک ڈبل۔ شاہد اپنی کار کے ساتھ موجود ہوتا۔ ہاسٹل میں کھانے کا بندوبست صرف یہاں مستقل رہنے والوں کے لیے تھا جو عارضی مقیم ہوتے ان کو باہر جا کر کھانا پڑتا تھا۔ صبح سے سفر میں تھے اس لیے

کچھ دیر آرام کر کے ہم رات کے کھانے کے لیے نکلے۔ شاہد سے ہمارا صرف کرائے کا معاہدہ تھا اور اس کی کوئی ذمہ داری ہم پر نہیں تھی لیکن اس بار ہم نے اصرار کر کے اسے کھانے میں شامل کر لیا۔ وہ خوش ہو گیا تو اس نے پہلی بار اپنے بارے میں بتایا اس کا باپ اس وقت مر گیا تھا جب وہ صرف سولہ برس کا تھا۔ اس نے نیکی چلانا شروع کر دی کیونکہ صرف میٹرک پاس کو تو چڑا ہی کی ملازمت بھی نہیں ملتی ہے۔ دس سال نیکی چلا کر انہوں نے اپنی بہنوں کی شادی کی۔ اتنی رقم جمع کی جس سے اس نے یہ کار خرید لی۔

”اب اللہ کا شکر ہے جی، اس گاڑی سے کم دھکے کھا کر زیادہ مل جاتا ہے نیکی میں تو صبح سے شام بہ

لگے رہنا پڑتا تھا۔“

”ہمارے ساتھ بھی تو مستقل ہو۔“

”نہیں جی، دیکھیں نامزے میں ہوں۔ اچھی جگہوں پر جاتا ہوں۔ آپ جیسے مہربان صاحب لوگ جاتے ہیں جو ساتھ بٹھا کر کھلا لیتے ہیں۔ گاڑی بھی کم چلتی ہے۔ ابھی آپ سے اتنا مل جائے گا کہ واپس جا ایک دو دن کام نہ ملے تب بھی فرق نہیں پڑے گا۔ ماں کے پاس رہوں گا۔“

”شادی نہیں کی برخوردار؟“

وہ شرمایا۔ ”جی شادی بھی اسی سال ہو جائے گی۔ منگنی ہو گئی ہے۔“

ڈنر کر کے ہم واپس آنے کے بجائے لاہور کی سڑکوں پر سیر کرتے رہے۔ ایک جگہ ہم نے کافی پی اور ایک جگہ فالودہ کھایا۔ واپسی میں پشاور کی آئس کریم سے دل پشوری کی۔ اندر جانے سے پہلے میں نے شاہد۔ رات کا پوچھا۔ ”تم کہاں سو گے؟“

”میں گاڑی میں سو جاؤں گا۔ میں جب اسی طرح دنوں کے حساب سے کسی کے ساتھ ہوتا ہوں تو گاڑی

میں سوتا ہوں آپ کا جب دل چاہے مجھے اٹھا لینا۔“

”سو جاؤ اب ہم خود صبح اٹھیں گے۔“ میں نے کہا۔

ڈبل بیڈ روم میرے اور بیٹے کے حصے میں آیا تھا کیونکہ بیٹے نے سفیر کے ساتھ ٹھہرنے سے انکار کر دیا تو

سفیر بھنا گیا تھا۔ ”کیا میں تمہیں کھا جاؤں گا؟“

”آپ ہم کو تنگ کرتا ہے۔“ بیٹہ بولا۔

”میں کہاں تنگ کرتا ہوں برخوردار۔“ سفیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”جب کسی خاتون سے پالا پڑ۔“

تب معلوم ہوگا کہ تنگ کرنا کسے کہتے ہیں۔“

”ہم سونا دیدی کو بتائے گا۔“

”بتا دینا بی بی، ہم تمہاری سونا دیدی سے نہیں ڈرتا۔“

تو بیٹہ میرے ساتھ تھا۔ ہم حلق تک بھرے ہوئے تھے اس لیے تھکن کے ساتھ نیند سے بھی برا حال تھا؛

جو تے اتار کر جو لیٹا تو صبح بیٹے کے بلانے پر اٹھا تھا۔ ”شوہی اٹھ جاؤ ابھی ناشتہ کرنا ہے۔ سفیر بھائی کہہ رہا ہے

کر نی بھی چینیج کرانا ہے۔“

ہم اٹھے اور تیار ہو کر نیچے آئے تو شاہد مستعدی سے گاڑی کی صفائی میں لگا ہوا تھا۔ اس نے نزدیکی ہا

سے ناشتہ کر لیا تھا اور بقول اس کے ناشتہ بہت اچھا تھا اس لیے ہم بھی مارچ کرنے اسی ہوٹل کی طرف چلے گئے۔ گزشتہ روز سے اپنے معاملات پر بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کبھی شاید ہوتا تھا اور کبھی وقت نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے ناشتے کی میز پر سفیر نے کہا۔ ”یار ہمارے دشمنوں کی طرف سے بالکل خاموشی ہے ہم ایسے گھوم پھر رہے ہیں جیسے بالکل معمول کی زندگی میں ہوں۔“

”بیٹے اس پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ تم خیر سے دعویٰ سدھارو تو ہم بھی واپس جائیں۔“

”نہیں یار یہ خاموشی مجھے عجیب سی لگ رہی ہے۔“

سچی بات تھی کہ مجھے بھی عجیب ہی لگ رہی تھی مگر اب لازمی نہیں تھا کہ ہمارے دشمن ہمہ وقت ہماری تلاش میں ہوں اور وہ بھی لاہور میں۔ اتفاقات کی بات الگ تھی مگر ہر بار دشمن سے سامنا ہونا بھی ضروری نہیں تھا۔ بیٹو نے سفیر کی تائید کی۔ ”ہاں شوبی ایسا لگ رہا ہے سب دشمن اچانک مر گیا ہے اور اب کوئی ہمارے پیچھے نہیں آئے گا۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ میں نے صدق دل سے کہا۔ ”اب میں ایک عام انسان کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں اس مار دھاڑ اور بھاگ دوڑ سے تنگ آ گیا ہوں۔“

”ویسے یار جب ہم اپنی زندگی میں واپس آئیں گے تو یہ دن بھی کتنے یاد آئیں گے۔ جب ہم سب مل کر بیٹھیں گے تو ان یادوں کو دھرائیں گے۔“

”اللہ وہ دن بھی جلدی لائے۔“ اس بار بھی میں نے خلوص دل سے کہا۔ سفیر نے کسی قدر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”تو اس زندگی سے بیزار لگ رہا ہے؟“

”ہاں یار..... میں کوئی سپر ہیرو نہیں ہوں جس نے سماج سدھارنے کا ٹھیکہ لیا ہو اور نہ ہی میں ایک بے گنہ زندگی گزارنے پر یقین رکھتا ہوں۔“

”مگر یار تو اس زندگی میں بھی تو ناکام نہیں ہے بلکہ تو اس طرح تبدیل ہوا کہ ہم سب کو حیرت ہوتی ہے۔“

”میں تبدیل ہوا ہوں لیکن میں نے اسے ہمیشہ کے لیے قبول نہیں کیا ہے میرا مقصد آج بھی ایک عام زندگی جینا ہے۔ مجھے اپنا گھر بسانا ہے اور تم لوگوں کے ساتھ مل کر رہنا ہے۔“

ناشتے کے بعد ہم چہل قدمی کرتے ہی واپس آئے تھے۔ سفیر نے شاید سے کہا۔ ”یار کسی مٹی چوڑھڑ کے پاس چلو۔“

”ادھر پاس بہت ہیں۔“ وہ بولا۔ اس نے دس منٹ بعد ہمیں ایک معروف مٹی چوڑھڑ کے دفتر پہنچا دیا۔ سفیر کو پوائے ای کے درہم کی ضرورت تھی دس لاکھ روپے کے عوض اسے ساٹھ ہزار درہم مل جاتے کیونکہ اس وقت درہم سولہ یا سترہ روپے کا تھا۔ سفیر پندرہ منٹ بعد ہی واپس آ گیا۔ ”چلو کام ہو گیا ہے۔“

دو پہر تک ہم گھومتے پھرتے رہے۔ اب تک کچھ نہ ہونے سے بھی ہم ذرا لا پرواہ ہو گئے تھے۔ مثلاً مار مار مار اور مینار پاکستان دیکھا پھر مقبرہ جہانگیر گئے۔ شام کے قریب واپس ہاسٹل میں آ گئے۔ سفیر نے پوچھا۔ ”تیرا

کیا ارادہ ہے؟“

”تمہیں سی آف کر کے شاہد کے ساتھ واپس جانے کا ارادہ ہے۔“

”میں تو کہہ رہا ہوں حویلی کا ایک چکر لگا لے، ماں جی بہت تڑپتی ہیں تیرے لیے.....“

”ہاں یار ماں ہیں نا۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”لیکن ابھی حویلی جا کر میں خود کو اور دوسروں کو مشکل میں

نہیں ڈالنا چاہتا۔“

بیٹو کولاہو! اچھا لگا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ”شوٹی اتنا جلدی کیا ہے ابھی کچھ دن اور ادھر رہو۔“

”دیکھ تو لیا ہے لاہور۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب کیا رہ گیا ہے۔“

”ادھر باہر گھوم پھر تو سکتا ہے۔“ بیٹو نے منہ بنایا۔ ”ادھر بس گھر میں بیٹھے رہو۔“

”بیٹے یہ تمہارا مقدر ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”ورنہ یہاں کیوں آتے کامی کے ساتھ چینی تمہیں بھی لے

جاتے۔ مگر وہ بھی تمہیں کچرا سمجھ کر چھوڑ گئے۔“

بیٹو خفا ہو گیا۔ ”ہم کیوں کچرا ہونے لگا۔ ایسا ہوتا تو شوٹی ساتھ لاتا۔“

”بیٹے شوٹی کو گلے میں ڈھول لٹکانے کا شوق ہے۔“

”بس۔“ میں نے جنگ چھڑنے سے پہلے سیز فائر کرایا۔ ”اب تک کے لیے اتنا کافی ہے باقی تیری

واپسی کے بعد۔“

کچھ دیر بعد بیٹو سفیر کو فہرست لکھوا رہا تھا کہ اسے دعویٰ سے اس کے لیے کیا لانا تھا۔ سفیر نے سر پر ہاتھ

مارا۔ ”اتنی لمبی فہرست تو کبھی مونا نے بھی نہیں لکھوائی۔“

”مونا دیدی کو پتا نہیں تھا ورنہ اس سے بھی لمبا کاغذ لکھواتا۔“ بیٹو نے دانت نکالے۔

”ادھ بھائی میں صرف دس لاکھ روپے کے مساوی کرنسی لے جا رہا ہوں۔ اس میں یہ سب کہاں سے آئے

گا۔“

”آپ چھوڑ دو۔“ بیٹو نے خفا ہو کر سفیر سے کاغذ لینے کی کوشش کی۔ ”ہم یہیں سے لے لے گا۔“

”ناراض کیوں ہوتے ہوئے۔“ سفیر نے کاغذ بچایا۔ ”لے آؤں گا سب، چاہے اس کے لیے مجھے دعویٰ

کاڈالز والا اکاؤنٹ کیوں نہ استعمال کرنا پڑے۔“

”یار ایسا کیا لکھوا دیا بے چارے نے۔“

”خود دیکھ لو۔“ سفیر نے مجھے پرچا تھا یا۔ ”برخوردار نے جدید ترین آئی فون منگوایا ہے اور دنیا کی مہنگی

ترین چاکلیٹس کا آرڈر بھی ہے۔ باقی فہرست بھی دیکھ لو۔“

مجھے حیرت ہوئی بیٹو کو ان سب چیزوں کا علم کیسے ہوا تھا؟ میں نے پوچھا تو اس نے سادگی سے کہا۔ ”ہم

نے ٹی وی پر دیکھا۔“

”یہ سب ٹی وی ایڈورٹائزنگ کا کمال ہے۔“ میں نے فہرست سفیر کو واپس تھما دی۔ کیونکہ سفیر کو فلائیم

سے تین گھنٹے پہلے انٹر پورٹ پہنچنا تھا اس لیے ہم جلدی تیار ہو کر نکل گئے۔ راستہ بھی طویل تھا۔ میں نے چمک

آؤٹ کر لیا تھا کیونکہ سفیر کو چھوڑ کر ہم واپس پنڈی کے لیے روانہ ہو جاتے۔ شاہد اس اطلاع پر خوش تھا اسے آج

کے دن کی رقم بھی مل گئی تھی اور وہ رات اپنے گھر میں گزارتا۔ ان دنوں اتنی سختی نہیں تھی مسافروں کے ساتھ ان کو چھوڑنے والوں کو بھی اندر لاؤنچ میں جانے کی اجازت تھی۔ ہم اندر آئے لیکن وہاں پولیس اور سیکورٹی کو دیکھ کر سفیر کی قدر پریشان ہو گیا تھا اس نے کہا۔

”پارٹو نکل جا، یہاں کوئی جان پہچان والا نکل آیا تو مشکل پڑ جائے گی۔ جگہ ایسی ہے کہ آدمی مار دھاڑ کر کے بھی نہیں نکل سکتا ہے۔“

خود میں بھی بے چینی محسوس کر رہا تھا اس لیے سفیر کی بات سے اتفاق کیا ہم اس سے گلے ملے اور رخصت ہو کر باہر آ گئے۔ پارکنگ ذرا فاصلے پر تھی۔ اب تک سب ٹھیک تھا لیکن ایئر پورٹ آتے ہی میری چھٹی حس خطرے کا اشارہ دینے لگی تھی۔ اگرچہ آس پاس کوئی خطرہ نہیں تھا۔ شاہد کار کے پاس موجود تھا وہ ہمیں جلدی آتے دیکھ کر حیران اور خوش بھی ہوا تھا۔ خوش اس لیے کہ اب ہم اور جلدی واپس جاسکتے تھے۔ اس نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ ”چلیں صاحب؟“

”اتنی جلدی کیا ہے۔“ بیٹو نے اسے گھورا۔ ”ابھی ہم کھانا کھائے گا ہم بھوکا ہے۔“

اس وقت ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اگر ہم ساڑھے دس بجے بھی یہاں سے روانہ ہوتے تو ڈیڑھ بجے تک واپس پنڈی پہنچ جاتے۔ ایئر پورٹ سے واپسی پر ایک جگہ اوپن ایئر باغ مارے ستوران دکھائی دیا۔ میں نے شاہد سے وہیں رکنے کو کہا۔ شاہد نے بھی ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ مگر اس نے ہاتھ ہلکا رکھا۔ ”ابھی مجھے چار گھنٹے کی ڈرائیو کرنی ہے۔“

بل ادا کر کے ہم باہر آئے۔ کار کے پاس آتے ہی شاہد بے ساختہ کار کی طرف لپکا اس کے منہ سے نکلا۔ ”ہیڈ اغرق یہ کیا کیا ہے کسی کبوتر نے؟“

تب میں نے دیکھا کار کے چاروں ٹائرز فلیٹ تھے اور عملاً کار زمین پر بیٹھی تھی۔ یہ کسی کی شرارت بھی ہو سکتی تھی لیکن سازش کا بھی امکان تھا۔ میں نے چونکا ہوا کہ جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالنا چاہا تھا کہ تاریکی سے سائے اٹل آئے۔ کسی نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ”خبردار کوئی حرکت نہ کرے ورنہ ان ٹائرز کی طرح فلیٹ ہو جائے گا۔“

ان کی تعداد کم سے پانچ تھی اور وہ سب مسلح تھے۔ انہوں نے ہمیں ایسے گھیر رکھا تھا کہ ہماری ذرا سی حرکت ان سے چھپی نہیں تھی سب کے چہرے چھپے تھے۔ میں اور بیٹو ساکت ہو گئے لیکن شاہد کی حالت خراب ہو گئی اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”میرا قصور جناب..... میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“

جواب میں ایک نقاب پوش نے اس کے سر پر شاٹ گن کی ٹال رسید کی اور وہ پکرا کر گرنے والا تھا کہ ایک نقاب پوش نے اسے سنبھال لیا دوسرے نے کار کا چھلا دروازہ کھولا اور شاہد کو اندر ڈال دیا۔ ان کی پھرتی اور مستعدی قابل دید تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ”کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟“

”تمہیں لے جانے آئے ہیں اور لے جانا چاہتے ہیں۔“ سرگوشی کرنے والے نے جواب دیا۔

”مزامعت کا فائدہ نہیں ہے۔ ہم تمہیں زندہ یا مردہ بہر صورت لے جائیں گے۔“

”میرانی الحال مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ میں نے ان کی مستعدی محسوس کرتے ہوئے مزاحمت نہ

کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ پانچوں مسلح تھے اور ان پانچوں کو دھوکا دینا آسان نہیں تھا اگر میں اور بیٹو ہتھیار نکال لیتے۔ اب بھی اتنے افراد کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بادل ناخواستہ میں نے ہاتھ اوپر کیے۔ بیٹو نے میری تقلید کی۔ ایک تیزی سے آگے آیا اس نے میری تلاشی لی اور پستول کے ساتھ پرس اور موبائل بھی نکال لیا۔ پھر اسی نے بیٹو کو بھی نہتہ کر دیا۔ ہماری چیزیں اس نے سرگوشی کرنے والے کے حوالے کیں۔ اس نے نئی ہدایات دیں۔ ”ان کے ہاتھ باندھ دو۔“

ہمارے ہاتھوں میں ٹانگوں کی بنی مخصوص ساخت کی ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ ان کو صرف کاٹ کو کھولا جاسکتا تھا۔ ہاتھ پشت پر باندھے تھے۔ پھر ہمیں دھکیل کر ایک بڑی جیب کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا گیا۔ اندر بیٹھتے ہی ہمارے چہرے پر غلاف چڑھا دیئے گئے تھے۔ مقصد ہمیں باہر دیکھنے سے باز رکھنا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں مرشد کے ہتھے چڑھ گیا تھا؟ اگر ایسا ہی تھا تو صورت حال میرے حق میں اچھی نہیں تھی۔ مرشد نے اسکو برابر کر لیا تھا لیکن اگر یہ مرشد اینڈ پارٹی نہیں تھے تو پھر کون تھے؟ ماضی میں لا:ور کے مشہور بد معاش جانی شاہ اور شاہ نواز میرے دشمن رہے تھے لیکن وہ اپنے اپنے گروہ کے ساتھ فنا ہو گئے تھے اور پھر ان کی طرف سے کوئی میرے راستے میں نہیں آیا تھا لیکن اس کا امکان تھا کہ ان کے گروہ کے کچھ لوگ بچ گئے ہوں اور اتفاق سے مجھے دیکھ لیا ہو دو دن سے میں منہ اٹھائے لاہور میں بے دھڑک گھوم رہا تھا۔ یہ ہماری غلطی اور لا پرواہی تھی اب اس کا خمیازہ بھگتنا تھا۔

ہمارے بیٹھتے ہی جیب گھومی میں نے اس کے ساتھ ہی کسی اور گاڑی کے اشارٹ ہونے کی آواز سنی تھی دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے مشرق کا رخ کیا تھا۔ یہ مصروف سڑک تھی سامنے سے ٹریفک آ رہا تھا اور گاڑیوں کی لائنیں محسوس کی جاسکتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ روشنی میں کمی آرہی تھی۔ ہم ایئر پورٹ کے پاس سے گزر رہے تھے کیونکہ مجھے کسی طیارے کا شور بہت قریب سے سنائی دیا اور اس کے بعد سناٹا چھانے لگا۔ گاڑیاں کسی مضافاتی سڑک پر آگئی تھیں جس پر ٹریفک کم تھا خاصی دیر بعد سامنے سے کوئی گاڑی گزرتی تھی۔ اس دوران میں گاڑی نے اتنے موڑ کاٹے تھے کہ میں سمتوں کا تعین بھول گیا تھا مگر میری چمٹی حس کہہ رہی تھی کہ ہم مشرق کی طرف ہی جا رہے تھے۔ لے جانے والوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا تا کہ ہم نہ جان سکیں کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ جیب اب سنسان راستوں سے گزر رہی تھی۔ بیٹو نے آہستہ سے کہا۔ ”شوبی یہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟“

”کسی قید خانے کی طرف۔“

”خاموش بیٹھو۔“ سرگوشی والا اس بار بلند آواز میں بولا۔ ”تمہیں بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔“

”چلو بات کرنے کی اجازت نہیں ہے لیکن ایک سوال کرنے کی اجازت تو ہوگی؟“

”کیسا سوال؟“

”کیا تم مرشد کے آدمی ہو؟“

”کون مرشد؟“ اس کا لہجہ کسی تسخیرانہ تھا۔ مرشد کا کوئی آدمی اس کے بارے میں اس لہجے میں بات نہیں کر سکتا تھا۔

”تب مجھے کیوں لے جا رہے ہو؟“

”تمہارے خیال میں تم صرف مرشد نامی کسی بندے کو مطلوب ہو سکتے ہو؟“

”تب بتادو کہ مجھے اس طرح اغوا کرانے والا کون ہے۔“

”جلد تمہیں پتا چل جائے گا ہمیں بتانے کی اجازت نہیں ہے اور اب چپ کر کے بیٹھو۔“ آخری الفاظ

اس نے درشت انداز میں کہے۔

یہ جان کر مجھے اطمینان ہوا تھا کہ ہم مرشد کے ہتھے نہیں چڑھے تھے۔ پھر یہ کون ہو سکتے تھے۔ اگر فتح خان تھا تو وہ خود کہاں تھا اور اب اسے مجھ سے کیا کام ہو سکتا تھا۔ ہاں وہ مجھے قتل ضرور کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے بریف کیس اس کے حلق سے لٹکوا لیا تھا اور یہ ناکامی اسے اتنی آسانی سے ہضم نہیں ہوتی۔ مگر اس کے لیے ہمیں اغوا کرنا ضروری تھا بلکہ ہماری بے خبری میں چلایا جانے والا ایک برسٹ بھی کافی ہوتا۔ مجھے لگ رہا تھا یہ کوئی اور پارٹی تھی اور اغوا کا مقصد بھی جلد سامنے آ جاتا۔ مجھے شاید ک فکر بھی تھا مارنے والے نے اس کے سر پر بے دردی سے وار کیا تھا۔ میری دعا تھی کہ اس کی چوٹ شدید نہ ہو اور ہوش میں آنے کے بعد وہ پولیس کے پاس جانے کی حماقت نہ کرے بلکہ سیدھا اپنے گھر کا رخ کرے اور ہمارے بارے میں اپنی زبان بند رکھے۔ بلکہ اس بات کو ہمیشہ کے لیے بھول جائے۔ میں اس کا معاوضہ اسے دے چکا تھا اس لیے کار کے ٹائروں اور سر کی چوٹ کے علاوہ اسے کوئی اور نقصان نہیں ہوا تھا۔

جیپ اب کسی دیران سڑک سے گزر رہی تھی اور سڑک کی حالت بھی اچھی نہیں تھی اس میں جگہ جگہ جپ آ رہے تھے۔ جیپ کو رفتار توڑنا پڑتی تھی۔ ہمارے ساتھ ایک آدمی تھا اور دو آگے تھے جب کہ باقی آدمی دوسری گاڑی میں تھے۔ یہ سفر کوئی دو گھنٹے جاری رہا تھا اور پھر جیپ پہلے کسی گیٹ پر رکی۔ گیٹ کھولا گیا اور جیپ اندر داخل ہوئی۔ ٹائروں تلے پختہ فرش تھا۔ تقریباً سو گز بعد جیپ رکی اور ہمیں نیچے اتار لیا گیا۔ یہاں منہ سے غلاف نہیں اتارا گیا تھا۔ دو افراد مجھے اور بیٹو کو الگ الگ بازو پکڑ کر لے جانے لگے۔ میں نے نیچے اترتے ہی بیٹو کو آواز دے کر ساتھ ہونے کا اطمینان کر لیا تھا۔ بیٹو نے کہا۔ ”شوٹی ہم ادھر ہی ہے۔“

”خاموش رہو۔“ کوئی بولا۔ ہمیں کسی عمارت میں لایا گیا اور اندر لانے کے بعد ہمارے ہاتھوں سے ٹانگوں کی بندشیں کسی چاقو سے کاٹ دی گئیں اور پھر ہمارے چہروں سے غلاف کھینچ کر اتار دیئے گئے۔ ہم ایک خالی کمرے میں موجود تھے۔ غلاف اتارتے ہی وہاں موجود دونوں نقاب پوش کمرے سے نکل گئے اور دروازہ بند ہو گیا۔ کمرہ شکل سے قید خانہ لگ رہا تھا۔ دروازہ فولادی تھا جس میں اوپر والے حصے میں چند سلاخیں لگی تھیں۔ اس کے علاوہ صرف ایک روشن دان تھا جو دروازے کے مخالف سمت میں دیوار کے اوپری حصے میں تھا اور زمین سے کوئی آٹھ فٹ اونچا تھا۔ ظاہر ہے اس سے جھانکنا ممکن نہیں تھا کم از کم کسی ایک آدمی کے لیے آسان نہیں تھا۔ میں نے پہلے دروازے کی اوپری سلاخوں سے باہر جھانکا۔ یہ راہداری تھی کیونکہ سامنے چار فٹ کی دوری پر دیوار نظر آ رہی تھی۔ پھر میں نے بیٹو سے کہا۔ ”اوپر چڑھو اور دیکھو روشن دان کے دوسری طرف کیا ہے؟“

میں نے دونوں ہاتھ جوڑے اور بیٹو نے میرے ہاتھ پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ گیا اس کا سر روشن دان تک پہنچ رہا تھا۔ اس نے اچھی طرح معائنہ کیا اور نیچے اتر آیا۔ ”اس طرف خالی صحن ہے۔ درخت لگے ہیں اور زمین

”کچی ہے۔“

روشن دان آٹھ انچ اونچا اور بارہ انچ چوڑا تھا ظاہر ہے اس سے انسان کا بچہ بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ ”کچھ اندازہ ہے کہ یہ جگہ کیسی ہے؟“

بیٹو نے نفی میں سر ہلایا۔ ”چار دیواری بہت اونچی ہے اور آس پاس کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔“ یہاں نہ صرف خاموشی تھی بلکہ ہوا میں نباتات کی ایسی مہک تھی جو صرف دیہاتوں میں آتی ہے۔ شہر میں یہ مہک دوسری چیزوں کی بو میں دب جاتی ہے۔ اگر یہ کوئی دیہات تھا تب بھی اس وقت یہاں سناٹا ہی ہوتا کیونکہ نصف رات قریب تھی۔ ہمیں جہاں لایا گیا تھا یہاں بھی خاموشی تھی۔ بیٹو ایک طرف فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا اس نے کہا۔ ”شوبی ایسا لگ رہا ہے یہاں زیادہ لوگ نہیں ہیں۔“

میں اس کے پاس آ بیٹھا۔ ”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے مگر کچھ میں نہیں آرہا کہ یہ کون سا نیا دشمن پیدا ہو گیا ہے۔“

”یہ ڈیوڈ شا کا آدمی نہ ہو۔“ بیٹو نے کہا۔

”ہو سکتا ہے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے یہ میرے جانے پہچانے دشمنوں میں سے نہیں ہے یہ کوئی اور ہی ہے۔“

”پتا چل جائے گا۔“ اس نے جمائی لی۔ ”شوبی ہم کو نیند آ رہا ہے۔“

”سو جاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ وہیں کھسک کر دراز ہو گیا۔ فرش پر ماربل لگا تھا اور موسم گرم ہو چلا تھا اس لیے فرش کی ٹھنڈک اچھی لگ رہی تھی میں بھی دراز ہو گیا۔ اس قسم کے حالات سے آئے دن واسطہ پڑتا رہتا تھا اس لیے گھبراتا چھوڑ دیا تھا جو ہوتا جلد سامنے آ جاتا۔ بیٹو کے خرائے سنتے سنتے مجھے بھی کسی وقت نیند آ گئی تھی۔ کمرے میں ایک طرف انرجی سیور روشن تھا مگر اس کا سوئچ باہر تھا اس لیے وہ رات بھر جلتا رہا۔ میری آنکھ کھلی تو روشن دان سے باہر کی قدرتی روشنی جھلک رہی تھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ بیٹو سسکا سنا پڑا تھا۔ گھڑی ہم دونوں کے پاس نہیں تھی اس لیے کہنا مشکل تھا کہ کیا وقت ہوا ہے۔ روشن دان سے یہ بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ روشنی کس قدر پھیلی ہے میں نے انگڑائی لے کر جسم کھولا جو سخت فرش کی وجہ سے اکڑ گیا تھا۔

کچھ دیر چہل قدمی اور ہاتھوں کی حرکت سے جسم گرم ہوا تو میں ذرا پیچھے ہوا اور چند قدم دوڑ کر اچھل کر ہاتھ روشن دان کے کناروں پر جمادینے اور پھر بازوؤں کے بل خود کو اوپر کیا۔ کھلی جگہ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دھوپ کے زاویے سے میں نے اندازہ لگایا کہ مشرق بائیں طرف ہے۔ صحن کچا تھا مگر اس کی باقاعدگی سے دیکھ بھال اور صفائی ہوتی تھی۔ دیوار کے ساتھ گھنے درخت تھے۔ روشن دان سے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ہم جس عمارت میں قید تھے اس کی ساخت کیا تھی اور وہ کتنی بڑی تھی۔ دھوپ بھی بائیں سے دائیں طرف جا رہی تھی اس لیے عمارت کا سایہ بھی نہیں تھا اور جس طرف سایا ہو گا وہاں میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جب بازو دھکنے لگے تو میں نیچے اتر آیا۔ بیٹو اٹھ گیا تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اس نے انگڑائی لی۔ ”شوبی یہ لوگ ناشتہ نہیں دے گا۔“

”کیا کہہ سکتے ہیں برخوردار..... ہو سکتا ہے ناشتے کی جگہ کچھ اور کھانے کو ملے۔“

”کچھ اور کیا؟“ اس نے غور کیا۔

”یہی گولیاں، لات کے اور ڈٹے وغیرہ.....“

”یہ ہم ناشتے میں نہیں کھا سکتا۔“ بیٹو سنجیدگی سے بولا۔ ”دوپہر میں کھالے گا۔ ابھی تو ناشتہ کھائے گا۔“
”وہ کہاں سے آئے گا؟“

بیٹو نے اٹھ کر دروازہ کھینچا اور شور کرنے لگا۔ ”کوئی ہے..... ہم بھوکا ہے..... ناشتہ دو۔“
”بے کار ہے۔“ میں نے کہا لیکن کچھ دیر میں بیٹو کے شور کا نتیجہ نکل آیا اور دروازے کے قریب کسی نے درشت لہجے میں کہا۔ ”چپ کرو۔“

”کیوں چپ کرے، ہم بھوکا ہے تم نے قید کیا ہے اس لیے تم ناشتے دے گا۔“ بیٹو نے بے ساختہ کہا۔
”ناشتہ کچھ دیر میں آجائے گا اور اب دروازہ بجانا بند کرو۔“
”ہمیں لیٹرین بھی جانا ہے۔“

”وہ بھی ناشتے سے پہلے.....“ آدمی نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ بیٹو واپس آ کر بیٹھ گیا اس نے خوشدلی سے کہا۔

”دیکھا شور کرنے کا فائدہ ہوتا؟“

”یہ تو ہے بعض اوقات شور کرنا فائدے مند بھی ہوتا ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور باہر موجود دو افراد نے ہم میں سے ایک کو باہر آنے کو کہا۔ میں نے بیٹو سے کہا۔ ”پہلے تم جاؤ۔“
بیٹو چلا گیا اور دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔ اس کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی تھی پھر میری باری آئی۔ میں باہر آیا ہاتھ روم اسی راہداری کے کونے پر تھا۔ اس راہداری میں دونوں طرف چار چار کمرے تھے اور یہ مکمل طور پر بند تھی۔ مگر باقی کمروں میں لکڑی کے فیض قسم کے دروازے لگے تھے لوہے کا دروازہ صرف ہمارے کمرے پر تھا۔ دونوں افراد صورت سے خطرناک قسم کے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔ وہ شاٹ گنوں سے مسلح تھے اور پوری طرح ہمسک تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ کسی بڑی اور جدید عمارت کا ایک حصہ تھا۔ یہاں خاموشی تھی اور بے ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ سوائے ہمارے یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ ہاتھ روم مکمل اور صاف ستھرا تھا لیکن اس میں اندر کنڈی نہیں تھی صرف فلش لاک تھا جسے باہر سے ہینڈل گھما کر بھی کھولا جاسکتا تھا۔ اندر کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا ایک ایگزاسٹ فین لگا تھا۔ ایک نے مجھے خبردار کیا۔ ”تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں۔“

”بہت ہیں۔“ میں نے خوشدلی سے کہا۔ میں ضروریات سے فارغ ہوا اور منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا۔ وہ مجھے قید خانے تک چھوڑنے آئے میں نے اندر جانے سے پہلے کہا۔ ”ہمیں رات کو یہاں لایا گیا ہے لیکن اب تک ہمیں لانے کا مقصد نہیں بتایا ہے اور نہ ہی کوئی شخص سامنے آیا ہے جو اس کی ذمہ داری قبول کرے۔“
”فکر مت کرو۔“ ایک نے تسخرانہ انداز میں کہا۔ ”سامنے بھی آئیں گے اور ذمہ داری بھی قبول کریں گے۔ ابھی اندر جاؤ۔“

مجھے اندر دھکیل کر وہ دروازہ بند کر کے چلے گئے۔ مزید کوئی آدمی مجھے بعد ناشتہ آ گیا۔ یہ گوشت کے مالان اور تندوری روٹیوں پر مشتمل تھا۔ ساتھ میں چائے کے بھاپ اڑاتے مگ بھی تھے۔ مجھے خاص بھوک نہیں تھی اس لیے میں نے کم کھایا اور پھر مگ لے کر دیوار کے ساتھ ٹک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے مقابلے میں بیٹو نے

ڈٹ کر کھایا اور عملاً سب صاف کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دیر میں کوئی یہاں آئے گا یا ہمیں کہیں بلایا جائے گا کیونکہ ظاہر ہے ہمارا اچار ڈالنے کے لیے تو اغوا نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی شخص اور کوئی نہ کوئی مقصد تھا۔ کوئی پون گھنٹے بعد دروازہ ایک بار پھر کھلا پہلے ایک شخص نے اندر آ کر برتن اٹھائے وہ چلیے سے عام ملازم لگ رہا تھا جب وہ چلا گیا تو مسلح افراد نے مجھے باہر آنے کو کہا۔ بیڑہ بھی اٹھا تھا لیکن اسے روک دیا۔ ایک نے کہا۔

”تم نہیں صرف یہ جانے گا۔“

”شوبی یہ آپ کو کہاں لے جا رہا ہے؟“ بیڑہ تشویش زدہ ہو گیا تھا۔

”میں آتا ہوں۔“ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”نہ بھی آؤں تو پریشان مت ہونا ہم دشمن کی قید میں ہیں اور

ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

میرے باہر آنے پر دروازہ بند کر دیا گیا میں نے دیکھا کہ اسے لاک نہیں کیا جاتا تھا بلکہ باہر سے مضبوط فولادی کنڈی لگا دی جاتی تھی۔ اگر چاہے تو اس میں تالا بھی لگا سکتے تھے لیکن یہاں شاید انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ان میں سے ایک میرے پیچھے آ گیا اور دوسرا آگے آگے چلنے لگا۔ راہداری کے آخر میں ایک دروازہ تھا اسے کھول کر ہم باہر آئے۔ جب میں نے پہلی بار اس عمارت کو دیکھا۔ میں حیران ہوا کیونکہ عمارت باہر سے اتنی ہی بڑی تھی جتنی کہ اندر سے دکھائی دیتی تھی۔ یعنی کل آٹھ کمروں پر مشتمل تھی۔ یہ چاروں طرف سے کھلی تھی اور اس کے چاروں طرف اونچی چار دیواری تھی۔ اس میں زمین کچھ تھی اور اونچے درخت لگے تھے سامنے والے حصے میں کچھ چار پائیاں تھیں اور ایک بڑی جیب کھڑی تھی شاید اسی جیب میں ہمیں لایا گیا تھا۔ وہ دونوں مجھے گیٹ سے باہر لائے۔ میرا خیال تھا کہ ہم کہیں باہر نکلیں گے لیکن اس احاطے سے باہر ہم ایک بہت بڑی حویلی کے احاطے میں تھے۔ راستہ حویلی کے پھاٹک تک جا رہا تھا اور یہ حویلی کے اندر ایک الگ سے چھوٹی عمارت تھی جو شاید اسی قسم کے کاموں کے لیے مخصوص تھی۔ ہم تینوں نے درمیانی باغ عبور کیا اور حویلی کی عالی شان عمارت کی طرف بڑھے۔ یہ عمارت کم سے کم دو کنال رقبہ پر تھی۔ دو منزلہ عمارت کی تعمیر میں مضبوطی کے ساتھ تعمیراتی حسن کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ اس کی تعمیر میں جدید آرٹ کے ساتھ قدیم مثل طرز تعمیر بھی شامل تھا۔ پوری عمارت کو ٹیلے اور ہرے سنگ مرمر سے آراستہ کیا گیا تھا اور اس میں بھی فنکاری سے کام لیا گیا تھا۔ یقیناً اس کی تعمیر پر بہت بڑی رقم خرچ کی گئی تھی۔ حویلی کا احاطہ کم سے کم چار پانچ ایکڑ رقبہ پر پھیلا ہوا تھا۔ مجھے عمارت کے سامنے والے حصے کے بجائے ایک پہلو کی طرف واقع راستے سے اندر لے جایا گیا تھا اور ایک الگو نشست گاہ میں پہنچا دیا جس میں چاروں طرف حریری پردے لگے تھے۔ ماحول انتہائی سفید پوش تھا۔ کیونکہ پردوں، قالین اور دیبڑ صوفوں سمیت سب کچھ سفید تھا۔ ایک نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”یہاں بیٹھ جاؤ اور یہاں سے حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔“

میں بیٹھ گیا۔ ”مجھے کیا ضرورت ہے اتنی مزے کی جگہ سے حرکت کرنے کی؟“

وہ دونوں مجھے چھوڑ کر چلے گئے لیکن مجھے شک تھا کہ وہ یہاں سے گئے تھے اس کا پورا امکان تھا کہ وہ از حریری پردوں کے پیچھے موجود تھے۔ اب اس ہستی کا انتظار تھا جس نے میرے لیے اتنے پاؤں بیلے تھے۔ ویسے حویلی دیکھ کر مجھے پھر سے شک ہونے لگا تھا کہ میں مرشد کے کسی آدمی کے پاس تھا یہ حویلی کسی عام جاگیردار کا

نہیں ہو سکتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اچانک ایک طرف سے پردہ ہٹا اور جو ہستی اندر آئی اسے دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا تھا اگرچہ اس سے ملے خاصا عرصہ ہو گیا مگر میں اسے بھولا نہیں تھا۔ وہ نئی تھی وہی نئی جو مجھے شامی علاقے میں ملی تھی اور میں نے بھاگ بھری سمیت اس کی کونچ میں پناہ لی تھی پھر اس کے خاندانی دشمن کرم دین عرف کرمین سے اس کی اور اس کی بہن ٹیٹا کی عزت بچائی تھی کیونکہ وہ ان کی اخلاق باختہ تصاویر لینے کا منصوبہ بنا کر آیا تھا تاکہ آنے والے انتخابات میں ان کے والد بزرگوار میاں ممتاز حسین کو شکست دی جاسکے۔ اس واحد ملاقات کے بعد مجھے ان سے ملاقات کا موقع نہیں تھا اور نہ میرے ذہن میں کہیں ملاقات کی کوئی خواہش تھی۔ اس لیے نئی کو سامنے دیکھ کر حیران رہ جانا لازمی تھا۔ اس نے سفید شیفون کی ساڑھی پہن رکھی تھی اور اس کے نیچے نہایت مختصر سا سفید ہی ملاوڑ تھا۔ ساڑھی نہایت سنسنی خیز انداز میں باندھی تھی۔ اسے بالی ووڈ اسٹائل کہتے ہیں۔ یعنی ناف سے خاصی نیچی تھی۔ اس کے پیٹ اور کمر کا بیشتر حصہ نمایاں تھا۔ اگرچہ میں اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا لیکن وہ میری محویت کی وجہ کچھ اور سمجھی اور مسکرائی۔

”لگ رہا ہے آج میں تمہیں اچھی لگی ہوں۔“

”لاحول ولا۔“ میں نے ہڑ بڑا کر کہا۔ ”میں تو تمہیں دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔ اب تم نے یہ کام بھی شروع کر دیا ہے؟“

”کون سا کام؟“ وہ لہرا کر ایک خاص زاویے سے میرے سامنے صوفے پر ٹک گئی۔ یہ زاویہ بھی خاصا نظر نواز تھا۔

”بہی مردوں کو اغوا کرانے کا کام.....“

وہ ہنسی۔ ”یہ میرا کام نہیں ہے میرے پاپا کا کام ہے۔“

”اور ظاہر ہے انہیں اس قسم کے جرائم کا وسیع تجربہ ہے۔“ میں نے طنز کیا۔ ”خیر سے وہ اس قوم کے رہنماؤں میں سے ہیں۔“

نئی کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ وہ بولی تو اس کا لہجہ سرد تھا۔ ”شہباز تم اس وقت نہایت مشکل صورت حال میں ہو اور تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمہیں پاپا نے اٹھوایا ہے ورنہ اب تک.....“

”میرا سوئم بھی ہو چکا ہوتا۔“ میں نے طنز جاری رکھا۔ ”لیکن کیونکہ تمہارے پاپا نے مجھے جذبہ خیر سگالی کے لیے اٹھوایا ہے اس لیے مجھے شکوے شکایت کرنے کے بجائے ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔“

نئی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور اپنا نازک لب دانتوں میں دبایا پھر اس نے گہری سانس لی اور کسی قدر عاجزی سے بولی۔ ”پلیز شہباز..... کیا تم کچھ دیر کے لیے یہ سب بھول کر مجھ سے بات نہیں کر سکتے۔“

مجھے احساس ہوا کہ میں ایک عورت سے طنزیہ گفتگو کر کے بدتمیز ہی کا ثبوت دے رہا تھا۔ میرے اعصاب خود بخود تھکے ہوئے تھے اور یہ گفتگو شاید اسی کار و عمل تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر اپنے اعصاب کو نرم کیا اور بولا۔

”سوری..... اب میں نارل بات کروں گا۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”تھینک یو..... اب پہلے بتاؤ کہ تم کیا کھاؤ گے؟“

”کچھ نہیں..... لیکن کچھ معلوم ضرور کرنا چاہوں گا۔“

مگر بنی نے ہلکے سے تالی بجائی اور فوراً ایک طرف سے ایک لڑکی نمودار ہوئی اس نے ”چوڑی دار پاجامہ اور فراک پہن رکھی تھی۔ اپنے انداز اور دلکشی سے وہ کہیں سے خادمہ دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ خادمہ ہی تھی کیونکہ بنی نے اسے تھمسا نہ انداز میں چائے اور کھانے کے لیے لانے کو کہا۔ اس کے جانے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔“ ہاں پوچھو؟“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟“

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے ہلکی کر کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا لیکن یہاں حویلی میں میرے جاسوس ہوتے ہیں جو ہر نئی چیز پر نظر رکھتے ہیں ان سے پتا چلا کہ تم لوگ یہاں لائے گئے ہو لیکن کون ہو یہ آج صبح پتا چلا۔“

”یعنی ہماری اس ملاقات کا علم تمہارے پاپا کو نہیں ہے؟“

”بالکل بھی نہیں، ویسے بھی پاپا لاہور گئے ہوئے ہیں اسی لیے مجھے موقع مل گیا تم سے ملاقات۔“

”اب تم یہ کہو گی کہ تمہیں بھی نہیں معلوم کہ میاں ممتاز نے مجھے کیوں اغوا کرایا ہے۔“

”سمانے کی بات ہے۔ جہاں تک میرے آدمی جانتے ہیں ان کو بھی کچھ نہیں معلوم ہے۔“

”کیا تمہارے باپ نے مرشد سے گلے جوڑ کر لیا ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کے برعکس وہ اس پارٹی میں ہیں جو مرشد کی پارٹی کی مخالف پارٹی ہے۔“

”تب بھی اس اغوا کا کوئی مقصد تو ہو گا۔“

”تم ذرا صبر سے کام لو..... جلد پاپا واپس آئیں گے اور میں ان سے پوچھ لوں گی۔“

”کیا وہ اپنے معاملے میں تمہاری مداخلت پسند کریں گے؟“

”میں اس معاملے میں دخل دے سکتی ہوں۔ تم ہمارے محسن ہو، تم نے صرف ہماری جان ہی نہیں بچائی

بلکہ ہمیں بدنامی سے بھی بچایا۔“

”کر مین والے معاملے کا کیا ہوا تھا۔“

”ان سب کو غائب کر دیا گیا تھا۔ وہ آج تک غائب ہیں حالانکہ کر مین کے خاندان والوں نے بہت

کوشش کی کہ ہم اس کی لاش کا پتا ہی بتا دیں لیکن پاپا نے معافی سے انہیں انکار کر دیا۔“

”ان کی طرف سے جوابی کارروائی نہیں ہوئی؟“

”انہوں نے سوچا تو ہو گا۔“ بنی نے شانے ہلائے۔ ”مگر اس واقعے کے بعد پاپا نے ہماری سیکورٹی بہت

ٹائٹ کر دی ہے۔“

”سیکورٹی ٹائٹ کی ہے یا تم دونوں کو ٹائٹ کیا تھا۔“

وہ ہنسی۔ ”یہ بھی کیا تھا پورے ایک مہینے کے لیے پاپا نے ہمارا حویلی سے باہر جانا بند کر دیا تھا۔ ٹینا تو روتی

تھی۔“

”حالانکہ اسے اپنے کتوتوں پر رونا چاہیے تھا۔“ میں نے دل میں کہا اور بنی سے پوچھا۔ ”تمہارے پاپا

میرے بارے میں جانتے ہیں.....؟ آئی مین میں نے تم لوگوں کے لیے کیا کیا تھا؟“

”بہت اچھی طرح.....“

”اس کے باوجود مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کر لیا میرے ڈرائیور کے سر پر ضرب لگائی گئی تھی پتا نہیں اس کا کیا ہوا اور مجھے اور میرے ساتھی کو ایک خالی فرش والے کمرے میں رات گزارنی پڑی۔“

بٹی کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ اس کا نام شاید نورالتسا ہے مگر اس نے اسے بٹی کر لیا تھا۔ بیٹا کا نام بھی شاید اسی قسم کا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”میرا خیال ہے پاپا کو تمہارے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب کہ یہ قول تمہارے وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”اسی وجہ سے تو میں کہہ رہی ہوں یہ مس انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ تم فکر مت کرو اب تم آرام سے رہو گے۔“

”قید میں؟“

”ہاں سوائے قید کے تمہیں اور کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“ بٹی نے یقین سے کہا۔ میں نے اسے خاصے مہرے بعد دیکھا تھا اور اس دوران میں اس نے اپنے وزن میں مناسب کمی کی تھی اور افزائش حسن کے دوسرے لوگوں سے بھی کام لیا تھا اس نے بال لائٹ گولڈن براؤن ڈائی کرائے تھے۔ آنکھوں میں لائٹ گرے کلر لینس تھے۔ وہ بلاشبہ پہلے سے زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ تیار ہو کر کہیں جا رہی تھی کہ اسے میرے بارے میں پتا چلا اور اس نے مجھے یہاں بلا لیا۔ اس دوران میں ملازمہ چائے اور دوسرے لوازمات لے آئی تھی۔ ہٹی نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور خود چائے بنائی۔ لوازمات میں خستہ بیش تھے، ہنک پارے اور کوکیز تھے۔ اس نے اپنے لیے صرف چائے بنائی تھی سیاہ اور بغیر شوگر کے، مجھ سے پوچھ کر سب ڈالا تھا۔ میں نے کچھ چیزیں لیں۔

”میں کیسی لگ رہی ہوں؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

”تم..... اچھی لگ رہی ہو۔“

”پہلے کے مقابلے میں کیسی لگ رہی ہوں۔“

”بہت بہتر۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”پہلے تم ذرا وزنی تھیں اب وزن کم کر لیا ہے۔ کسی اچھے پارلر نے تمہارے حسن کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کیا تم کہیں جا رہی تھیں؟“

”نہیں تو۔“ وہ بولی۔ ”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”تمہاری تیاری دیکھ کر.....“ میں نے جھینپ کر کہا۔ وہ ہنسی تو میں مزید خفیف ہو گیا۔ وہ جس طبقے سے تھی وہاں آدی نارل میں اتنا تیار ہوتا ضروری نہیں ہے کہ کہیں جاتے ہوئے تک سب سے تیار ہو۔

”میں تو ہمیشہ اسی طرح تیار رہتی ہوں۔“

”دراصل تمہیں پہلے دیکھا تھا تو تم عام سے لا پر واہلیے میں ہوتی تھیں۔“

”ہاں وہاں ہم تفریح کرنے گئے تھے اور وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا لیکن یہاں حویلی میں ہم اس طرح میں رہ سکتے پاپا ہمیشہ کے نہیں۔“

خاطر متواضع ہو چکی تھی اس لیے اب میری واپسی کا وقت آ گیا تھا یہ بات میں نے اس کے انداز سے

محسوس کر لی اس لیے میں کھڑا ہو گیا۔ ”تمہارے پاپا کی واپسی کب تک ہوگی؟“
 ”آج شام تک آئیں گے وہ پارٹی رہنماؤں کی میٹنگ میں شرکت کرنے گئے ہیں۔“ اس نے کہا۔
 ”پلیز تم خود پر قابو رکھنا اور انتظار کرنا میں اس مسئلے کو سمجھا لوں گی۔“

بٹی نے کہا اور حریری پردوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔ میں نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش نہیں کی۔
 ایک منٹ بعد وہی دونوں مسلح افراد نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھے چلنے کے لیے کہا لیکن اس بار ان کا انداز بہتر
 اور محتاط تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بٹی نے میرے بارے میں خاص طور سے ہدایت دی ہے۔ وہ مجھے اسی عمارت میں
 لائے لیکن اس کمرے کے بجائے انہوں نے ایک دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہ اندر سے اچھا خاصا آراستہ
 بڑا رستہ تھا۔ قالین کے ساتھ ڈبل بیڈ تھا۔ اس کے سامنے ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ ایک طرف چھوٹا صوفیہ سیٹ اور اس
 کے سامنے گلاس ٹاپ ٹیبل تھی۔ دیوار میں کھڑکی تھی اور اس کے ہلکے نیلے رنگ کے پردے سرسرا رہے تھے۔ ایک
 طرف الٹھ والی روم تھا۔ دیوار پر اسپلٹ اے سی کا یونٹ لگا ہوا تھا۔ مجھے لانے والے نے کہا۔ ”اب آپ یہاں
 رہیں گے؟“

”میرا سا بھئی؟“

”اسے بھی یہیں لا رہے ہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ انٹر کام کا بٹن ہے لیکن خیال رہے آپ کوئی غلط
 حرکت نہیں کریں گے۔“

”میں نے تو اس وقت بھی کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی جب تم لوگوں نے ہمیں لا کر نچے فرش پر ڈال دیا
 تھا۔“

”کھانے کے لیے ایک گھنٹہ پہلے بتانا ہوگا۔“ اس نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ لہجہ اور طرزِ خطاب تبدیل
 ہونے سے ان کی چوکی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ میری طرف سے اسی طرح محتاط تھے۔ کچھ دیر بعد بیٹو بھی
 آگیا اور کمرہ دیکھ کر حیران ہوا پھر اس نے سر ہلایا۔

”لگتا ہے آپ کا دشمن لوگ سے بات بنا ہے۔ ویسے یہ کون ہے؟“

”دشمن نہیں ہیں بلکہ میں نے ایک بار ان لوگوں کو بھجایا تھا۔“

”بھجایا تھا۔“ بیٹو دنگ رہ گیا۔ ”جب اس نے قید کیوں کیا؟“

میں نے سر آدھ بھری۔ ”ایک بزرگ نے پانی میں ڈوبے بچھو کو بچایا اور پانی سے نکال دیا اس نے باہر
 آتے ہی بزرگ کو ڈنک مارا۔ کسی نے بزرگ سے پوچھا کہ یہ کیا آپ نے ان کی جان بچائی اور اس نے بجائے
 شکر یہ ادا کرنے کے ڈنک مار دیا۔ بزرگ نے کہا۔ یہ اس نے شکر یہ ہی ادا کیا ہے۔ بچھو، سانپ اور بعض انسان
 اسی طرح شکر یہ ادا کرتے ہیں۔“

بیٹو مسکراتے لگا۔ ”ہم سمجھ گیا یہ لوگ اسی طرح شکر یہ ادا کرتا ہے۔ پر یہ ہے کون؟“

بیٹو ان کے بارے میں نہیں جانتا تھا کیونکہ وہ مجھے اس سے پہلے ملے تھے۔ میں نے اسے تفصیل سے ان
 دنوں کے واقعات سنائے۔ وقت گزاری کے لیے یہ ایک اچھا شغل ثابت ہوا اور اسی میں ایک بچ گیا۔ ہم نے
 انٹر کام پر لٹچ کے لیے اپنی پسند کے نوں کہا۔ ایک کھنڈے بعد گھڑی قسم کا لٹچ فراہم کیا گیا۔ یہ یقیناً حویلی کے

بادرہی خانے سے تیار ہو کر آیا تھا کیونکہ ہر چیز بہت اعلیٰ درجے کی اور بہترین بنی ہوئی تھی۔ اس شاندار لہجے کے بعد میں نے کافی منگوائی۔ بیوہ کو چائے کافی جیسی چیزوں کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ اس نے اپنے لیے کیلے کا ٹیک منگوایا تھا۔ ٹیک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس نے میاں ممتاز کے بارے میں پوچھا۔ ”شوبی آپ کبھی اس سے ملا ہے؟“

”نہیں۔“

”جب اسے آپ سے کیا بات ہو سکتا ہے۔ اس طرح تو دشمن کرتا ہے۔ بلکہ ایسا سلوک تو دشمن بھی نہیں کرتا ہے۔ اب تک جب فتح خان نے ہم کو پکڑا اچھے طریقے سے رکھا۔ پر اس نے تو ہم کو جانور کی طرح خالی کمرے میں ڈال دیا۔“

”یہ بات اس کی بیٹی بھی نہیں جانتی ہے بہر حال ہم سے بہتر سلوک اسی کی وجہ سے کیا جا رہا ہے۔“

”شوبی کیا وہ مرشد سے نہیں مل سکتا؟“

”نہیں وہ مرشد کی مخالف پارٹی میں ہے۔“

”اس نے پارٹی بدل لیا ہوگا۔ ہم دیکھتا آپ کا لیڈر ایسے پارٹی بدلتا جیسے ہم کپڑے بدلتا ہے۔“

”ہاں تقریباً ایسا ہی ہے لیکن مرشد کے بارے میں آخری اطلاع یہ تھی کہ اس نے وہ پارٹی بھی چھوڑ دی ہے اور اب آزاد سیاست کرے گا۔“

”یعنی سب کا عورت بنے گا۔“ بیوہ نے غور کیا۔ ”ادھر ہمارے علاقے میں جو کسی کا عورت نہیں بننا تھا وہ سب کا عورت بننا تھا۔“

”یہ مثال بھی اچھی دی ہے تم نے..... ہماری سیاست کچھ اسی قسم کی ہے۔ طوائف بھی اس کے سامنے شریک نظر آتی ہے۔“

اچانک بیوہ سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”شوبی اگر یہ میاں صاحب ہمارا دشمن نکلا تو ہمارے لیے بہت مشکل ہوگا۔ یہ تو کنور جیسا بڑا آدمی لگتا ہے۔“

”درحقیقت یہ ویسا ہی ہے۔ ہدی ہشتی جاگیردار اور سیاست دان۔“ میں نے بیوہ سے اتفاق کیا اور اب مجھے بھی تشویش ہونے لگی تھی آخر میاں ممتاز جیسے ممتاز سیاست دان کو مجھ سے کیا پُر خاش ہو گئی تھی جو اس نے مجھے اس طرح اغوا کر لیا۔ اگر بیوہ کا خدشہ درست تھا تو میری اور میرے ساتھیوں کی مشکلات میں اضافہ ہونے والا تھا کیونکہ میاں ممتاز کی سیاسی طاقت مرشد کی نسبت کہیں زیادہ تھی۔ وہ مرکزی سطح کا سیاست دان تھا جب کہ مرشد علاقائی سیاست دان تھا۔ آخر اسے مجھ سے یا میرے ساتھیوں سے کیا پُر خاش تھی؟ بیوہ پر پتہ بھر کر کھانے کے بعد غبار طاری ہو رہا تھا وہ جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اے سی چل رہا تھا اس لیے کمرہ خنک تھا یہ خنکی بھی ذہن پر سستی طاری کر رہی تھی۔ بیوہ کچھ دیر میں خراٹے لینے لگا تھا میں نے اٹھ کر پہلے کھڑکی کا معائنہ کیا۔ اس پر شیشے اور المونیم سے بنے سلائیڈنگ پٹ تھے۔ باہر کی طرف مضبوط قسم کی فینسی گرل لگی تھی۔ واش روم میں باہر کی طرف چھوٹا ساروشن دان تھا لیکن اس سے گزرتا کسی بلی کے بچے کے لیے تو ممکن تھا ہمارا گزرتا ناممکن تھا۔ آخر میں دروازے کا معائنہ کیا۔ یہ کسی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا پالش والا دروازہ تھا۔ شاید اس کے وسط میں پلائی دی ہوئی تھی

جس سے دروازہ نہ صرف موٹا بلکہ مضبوط بھی ہو گیا تھا۔ اس پر نہ صرف مضبوط قسم کا ہینڈل لاک تھا بلکہ باہر کی طرف کنڈی بھی تھا جسے اندر سے کسی صورت نہیں کھولا جاسکتا تھا۔ یہ ذرا پُر تعیش قسم کا قید خانہ تھا۔

شام ہوئی اور باہر روشنی مدہم ہونے لگی تو میں نے اندر کی روشنیاں جلا لیں۔ بیٹو اٹھ گیا اس نے آنکھیں ملے ہوئے دقت پوچھا۔ دیوار پر لگی گھڑی کے مطابق شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ میں نے انٹرکام پر چائے کا کہا۔ ”شوٹی کسی نے آپ سے بات کیا؟“

”ابھی تک تو کسی نے رابطہ نہیں کیا ہے۔“

”پیچھے سب پریشان ہو رہا ہوگا۔“ بیٹو نے کہا۔ ”سفیر بھائی کو تو پتا بھی نہیں ہوگا۔“

”اسے پتا چل گیا ہوگا کیونکہ ہم سے رابطہ نہ ہونے پر عبداللہ نے اس سے رابطہ کیا ہوگا یوں اسے معلوم ہو

گیا ہوگا کہ ہم غائب ہیں۔“

سورج ڈوبا تو باہر کی روشنیاں بھی جل اٹھی تھیں۔ یہاں لوڈ شیڈنگ کی لائٹ نہیں جا رہی تھی اس کا مطلب تھا کہ بجلی کا کوئی متبادل سسٹم تھا جیسے ہیوی ڈیوٹی جنریٹر اور یو پی ایس ہوں گے۔ جو لائٹ جانے کی صورت میں بھی بجلی بحال رکھتے ہوں گے۔ میں نے رات کا کھانا بھی ہلکا کھایا تھا۔ جب کہ بیٹو نے تکلف ایک طرف رکھ کر کھایا تھا اس لیے اسے پھر جلدی نیند آنے لگی تھی۔ میں نے کافی بھی لی تھی اس لیے نیند غائب تھی۔ کوئی گیارہ بجے دروازہ کھلا اور وہی دو مسلح افراد دکھائی دیئے۔ انہوں نے مجھے باہر آنے کو کہا۔ میں نے بیٹو کو سونے دیا اور باہر آیا۔ ”کیا بات ہے؟“

”آپ کو میاں صاحب نے طلب کیا ہے۔“

میاں ممتاز حسین محل نما عمارت کے ایک کمرے میں میرا منتظر تھا۔ کمرہ سادہ سا تھا وہاں صرف ایک صوفہ نما کرسی اور فرش پر قالین تھا۔ کرسی پر میاں ممتاز براجمان تھا اور اس کے ساتھ تپائی پر بے نوشی کے لوازمات تھے۔ وہ تقریباً پچاس برس کا سرخ و سفید رنگت کا صحت مند شخص تھا۔ بال کسی اچھے ہنر کار سے ڈارک گرے ہو رہے تھے جو نیچرل کلر لگ رہا تھا۔ اس نے ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا اور آنکھوں میں قریب کی عینک لگی تھی کیونکہ وہ ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کتاب اپنے زانوؤں پر رکھ لی جب میں نے دیکھا وہ جان گریٹیم کا ناول تھا۔ جان گریٹیم میرا پسندیدہ ناول نگار ہے اور میں نے اس کے تمام ناول پڑھ رکھے ہیں۔ میاں ممتاز نے میری توجہ بھانپ لی اور بولا۔ ”غضب کا لکھنے والا ہے۔“

”درست فرمایا، میں نے اسے کوئی ہلکی چیز لکھتے نہیں دیکھا ہے۔ بڑے لوگ ہمیشہ بڑا کام کرتے ہیں۔“

اس نے میری بات پر غور کیا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”یہی کہ میں نے آپ کو بڑا آدمی سمجھا ہے اور میں آپ سے کسی چھوٹے کام کی توقع نہیں کر سکتا۔“

میاں ممتاز نے میرے ساتھ آنے والے دونوں افراد کی طرف دیکھا تو وہ آنکھ کا اشارہ سمجھ کر خاموشی سے باہر چلے گئے۔ اب وہاں سوائے میرے اور میاں ممتاز کے کوئی نہیں تھا۔ وہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کا ایک ہاتھ گاؤن کی جیب کے پاس تھا اور اس میں یقیناً کوئی ہتھیار تھا۔ اپنے آدمیوں کے جانے کے بعد اس نے سر دلچے میں کہا۔ ”تمہارے خیال میں مجھ سے کوئی چھوٹا پن سرزد

ہوا ہے۔“

”میرے اور میرے ساتھی کے اغوا کو آپ کیا کہیں گے؟“ میرا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔ ”ہمارا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے مجھ سے آپ کو کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ شاید فائدہ ہی ہوا ہے۔“

”تم شاید کوٹھی والے واقعے کی طرف اشارہ کر رہے ہو۔“

”میاں صاحب میں کوئی اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ میں مرشد جیسے طاقتور شخص سے لڑ رہا ہوں اور میں نے اسے کسی حد تک مجبور بھی کر دیا ہے۔ اب آپ درمیان میں آگئے ہیں۔“

”تم سمجھ رہے ہو کہ میں مرشد کی حمایت کر رہا ہوں۔“

”ان حالات میں، میں اور کیا سمجھوں..... آپ کو مجھ سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔“

”میرا مرشد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ دوستی کا اور نہ دشمنی کا۔“

میں کسی قدر حیران ہوا تھا۔ ”جب مجھے اس طرح اٹھوانے کا مقصد..... میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے کم سے کم ایسا نہیں ہے کہ مجھے جبراً اٹھوانے کی ضرورت پیش آئے۔“

میں اب تک اس کے سامنے کھڑا تھا اور کمرے میں کسی بھی دوسری نشست کی عدم موجودگی بتا رہی تھی کہ مجھے کھڑے ہی رہنا تھا۔ غالباً میاں ممتاز کے خیال میں، میں اس کے سامنے بیٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ اگر وہ دشمن تھا تب بھی اس کا رویہ نہایت گھٹیا تھا۔ وہ بڑا آدمی بن ضرور گیا تھا لیکن اندر سے وہ برتری کے دھم میں مبتلا شخص تھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے پیتا رہا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سوچ رہا ہو کہ مجھے اپنے اغوا کی وجہ بتائے یا نہ بتائے۔ آخر اس نے گلاس رکھا اور بولا۔ ”شہباز ملک میں تمہیں صرف نام سے جانتا ہوں یا میں نے تمہارے کچھ کارنامے سن رکھے ہیں جو تم نے انجام دیئے ہیں۔ سرحد کے اُس پار بھی اور اس طرف بھی۔ کچھ عرصے پہلے میرے ایک دوست نے مجھ سے رابطہ کیا اور اس نے تمہیں تلاش کرنے میں میری مدد مانگی۔ میں نے اس سے معذرت کر لی۔ کیونکہ تم میری حدود سے باہر پنڈی اسلام آباد کی طرف سرگرم عمل تھے۔ مگر اتفاق سے تم میرے آدمیوں کو لاہور میں نظر آگئے۔ انہوں نے مجھے اطلاع دی اور میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔ اس نے کہا کہ وہ کسی بھی قیمت پر تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہے اس لیے میں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ تمہیں لے آئیں اور وہ تمہیں لے آئے۔“

”گو یا آپ نے کسی کی فرمائش پر یہ کام کیا ہے۔ یعنی آپ کو مجھ سے کوئی پُر خاش نہیں ہے؟“

”نہیں بلکہ ایک طرح سے تم سے ہمدردی ہے۔ مگر یہ معاملہ دوستی کا ہے میں اسے انکار نہیں کر سکتا تھا۔“

دوسرے میں اسے انکار کرتا تو وہ کسی اور کے توسط سے کام کر لیتا اور ممکن ہے اس طرح تم براہ راست اس کی تحویل میں چلے جاتے۔“

”یہ آپ نے مجھے اس سے محفوظ رکھا ہے؟“

”ہاں تم اس کے بارے میں جانتے ہو وہ بہت بڑی آفت ہے۔ مجھے دلچسپی ہے کہ آخر وہ تمہیں کیوں

حاصل کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا ہے۔“

”آپ مجھے اس کے حوالے کر دیں گے؟“ میں نے پوچھا ویسے میں اس کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ وہ

مجھے ابھی اس شخصیت کے بارے میں نہیں بتائے گا۔ اس لیے میں نے اس کے بارے میں پوچھا بھی نہیں۔

”نہیں جب تک میں پوری بات نہیں جان جاؤں گا اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔“

”میاں صاحب آپ کی بات سے لگ رہا ہے کہ آپ میری حوالگی کا فیصلہ بھی کر سکتے ہیں ممکن ہے جس طرح آپ نے دوستی میں مجبور ہو کر یہ کام کیا ہے اسی طرح مزید مجبور ہو کر آپ مجھے اس کے حوالے کر سکتے ہیں۔“

”اب میں ایسا بھی مجبور نہیں ہوں میں انکار بھی کر سکتا ہوں۔“ اس نے لہجے میں بے نیازی برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگا جیسے میں نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔ وہ سیاست دان تھا جو ویسے ہی بدنام ہوتا ہے ہوا کے رخ کے ساتھ بدل جانا اپنے قول و فعل کو کپڑوں کی طرح بدلنا اور وعدے کر کے ڈھٹائی سے مکر جانے کو ہی ہمارے ہاں فنِ سیاست کہتے ہیں۔ میاں ممتاز اسی قسم کا سیاست دان تھا۔ اس کی اور اس کی اولاد کی اخلاقی حالت میں دیکھ چکا تھا ایسے لوگوں کو صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ میں اس کی قید میں تھا اور اسے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ مجھے صفائی پیش کرتا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی وجہ سے ایسا کرنے پر مجبور ہوا تھا اور یہ مجبوری یقیناً اس کی بیٹی تھی۔ اب مجھے اس شخص کی فکر ہو رہی تھی کہ جس نے میاں ممتاز سے میری فرمائش کی تھی۔ وہ کون ہو سکتا تھا۔ میاں ممتاز انکاری تھا کہ وہ مرشد نہیں ہے اگر وہ مرشد نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ دوسرے ضروری نہیں تھا کہ میاں ممتاز دیگر معاملات کی طرح اس بارے میں بھی سچ بول رہا ہو۔ میں نے سوچا اور بہت تپ تول کر کہا۔

”میاں صاحب..... آپ اچھی طرح جانتے ہیں انسان کو اپنے کیے ہر فعل کا کہیں نہ کہیں حساب اور جواب دینا پڑتا ہے۔“

”فی الحال تو ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جو مجھ سے حساب اور جواب لے سکے۔“ اس کے لہجے میں تکبر آ گیا۔

”میاں صاحب..... اس کا پتا اس وقت چلتا ہے جب وقت آ جاتا ہے۔ آپ اگر میرے بارے میں جانتے ہیں تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں اتنا لاوارث بھی نہیں ہوں۔ میرا ایک خاندان ہے۔ میرے کچھ سرپرست ہیں اور میرے کچھ ساتھی ہیں جو میری بازیابی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور جب ان کو معلوم ہوگا کہ میری گمشدگی میں کس کا ہاتھ ہے تو آپ.....“

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“ میاں ممتاز کا چہرہ کسی قدر سرخ ہو گیا تھا۔

”میں آپ کو نتائج سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ سیاست دان ہیں حکومت سے باہر ہوں یا حکومت کے اندر جو کرتے ہیں اپنا ہاتھ پاؤں بچا کر کرتے ہیں تاکہ آپ آئندہ کہیں پھنس نہ جائیں۔ مگر معذرت کے ساتھ مجھے اٹھانے کا کام کرتے ہوئے شاید آپ نے زیادہ غور نہیں کیا۔“

”میں چھوٹے موٹے معاملات پر زیادہ غور نہیں کرتا۔“

”ایک بار پھر معذرت کے ساتھ چھوٹے موٹے معاملات ہی اکثر اوقات آدمی کے گلے پڑ جاتے ہیں، ہمارے ہاتھ کی لکھی ایک تحریر منتخب وزیراعظم کو ملک یا دنیا سے باہر پہنچا دیتی ہے جسے انہوں نے کسی وقت بہت معمولی سمجھا ہوتا ہے۔ میری آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اس معاملے پر ایک بار پھر غور کر لیں۔“

میاں ممتاز کی کشادہ پیشانی پر لکیریں ابھرنے لگیں۔ اس کا ہاتھ تپائی کی طرف گیا تھا میں سمجھا کہ شاید وہ

گلاس اٹھا رہا ہے لیکن اس کے بجائے اس نے کچھ اور کیا جو میں دیکھ نہیں سکا تپائی کا کچھ حصہ میری نظروں سے اوجھل تھا کیونکہ فوراً ہی وہ دونوں گارڈز آئے۔ میاں ممتاز نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”اسے لے جاؤ۔“

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر بے کار سمجھتے ہوئے گارڈز کے ساتھ باہر آ گیا۔ نہ جانے میاں ممتاز نے انہیں کیا اشارہ دیا تھا کہ وہ میری طرف سے بہت چونکا نظر آنے لگے تھے۔ وہ مجھے حویلی سے باہر لے جا رہے تھے میرا خیال تھا کہ وہ مجھے وہاں قید خانے میں لے جائیں گے لیکن اس کے بجائے وہ مجھے اسی حریری پردوں والے سفید براق تاثر رکھنے والے کمرے میں لے آئے جہاں بنی سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس بار وہ پہلے سے وہاں موجود تھی اس نے گارڈز کی طرف دیکھا تو ان میں سے ایک نے معذرت کی۔ ”بی بی صاحبہ..... میاں صاحب نے سخت نگرانی کا حکم دیا ہے۔“

”بکومت۔“ بنی غرائی۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے.....“

بادل نا خواستہ وہ دونوں پردوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔ بنی نے لباس بدل لیا تھا۔ وہ اسکن فٹ جینز اور رکی ریشم جیسے کپڑے سے بنے کرتے میں تھی۔ کرتے کے اوپری ٹین کھلے ہوئے تھے۔ اس کی طرف دیکھنا آسان کام نہیں تھا۔ گارڈز کے جاتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”پاپا سے کیا بات ہوئی؟“

”انہوں نے کسی کے فرمائش پر وگرام پر مجھے اٹھایا ہے یلن وہ اس کے بارے میں بتانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“

بنی تشویش زدہ ہو گئی۔ ”میری پاپا سے بات ہوئی تھی لیکن انہوں نے مجھے اس معاملے سے الگ رہنے کو کہا ہے۔“

”بنی مجھے لگ رہا ہے میاں صاحب میرے بارے میں کوئی فیصلہ کر چکے ہیں۔ ان کے خیال میں ہمیں نے تم دونوں کو بچا کر اگر کوئی احسان کیا تھا تو وہ بہت معمولی درجے کا تھا اس لیے انہیں میرا زیر بار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ان کے لیے اپنے دوست کی فرمائش پوری کرنا زیادہ اہم ہے۔“

”پاپا ایسا نہیں کر سکتے۔“ وہ کسی قدر برہمی سے بولی۔ ”اگر ان کے خیال میں تم نے کوئی احسان نہیں کیا ہے تو یہ ان کا خیال ہے میں سمجھتی ہوں تم نے ہم پر احسان ہی کیا ہے اور میں تمہیں اتنی آسانی سے کسی کے حوالے نہیں کرنے دوں گی۔“

”اسی میں تم لوگوں کی بھی بہتری ہے۔ میں میاں صاحب کو بھی بتا چکا ہوں کہ میں کوئی لاوارث آدمی نہیں ہوں اور میرے لوگ مجھے تلاش کریں گے یقین کرو انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ جب معاملہ ان کے ہاتھ میں ہو گا تو وہ مجھے بازیاب کرانے کے لیے سب کر گزریں گے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہوتا؟“

بنی نے اپنا لب مخصوص انداز میں دانتوں میں دبایا تھا جب وہ پریشان ہوتی تو ایسا ہی کرتی تھی۔ ”میں پاپا کی نسبت تمہارے بارے میں کہیں زیادہ جانتی ہوں کیونکہ مجھے تم سے دلچسپی رہی ہے۔ میں بھی سمجھتی ہوں پاپا غلطی کر رہے ہیں۔“

”تم جانتی ہو وہ کس کے لیے یہ سب کر رہے ہیں؟“

بنی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”لیکن وہ کوئی بھی ہوا اتنا اہم نہیں ہو سکتا کہ پاپا اس کے لیے یہ سب کریں۔ میں

پھر ان سے بات کرتی ہوں۔“

”میں تمہارے لیے دعا کروں گا کہ پاپا تمہاری بات سمجھ جائیں اور اس سے پہلے خرابی حد سے بڑھ جائے اس مسئلے کو حل کر لیا جائے۔“

نٹی نے سر ہلایا۔ اس نے تالی بجائی تو دونوں گارڈز اندر آئے۔ ”تم فکر مت کرو اور جا کر آرام کرو۔“
میں گارڈز کے ساتھ روانہ ہوا اس بار وہ مجھے میرے کمرے میں چھوڑ گئے۔ بیٹو بدستور محو خواب تھا اور میری نیند اڑ گئی تھی۔ آنے والا کل میرے لیے کیا لانے والا تھا اس کا پتا کل ہی چلتا۔ میں نے جاگتے رہنے سے بہتر سمجھا کہ سو جاؤں۔ میں نے غسل کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو باہر روشنی کا آغاز ہو رہا تھا۔ میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی بلکہ آنکھ کسی وجہ سے کھلی تھی میں نے غور کیا تو باہر سے ایسی مشینی گڑگڑاہٹ کی آواز آرہی تھی جیسے کوئی بڑا انجن چل رہا ہو۔ میں اٹھ کر کھڑکی تک آیا اور پٹ سر کا یا تو آواز یک دم واضح ہو گئی یہ ہیلی کا پٹر تھا جو اتر گیا تھا کیونکہ اب اس کی آواز گھٹ رہی تھی اور پھر آواز آتا بند ہو گئی۔ یہاں صبح سویرے کوئی ہیلی کا پٹر آیا تھا۔ میاں ممتاز کی حویلی اتنی بڑی تھی کہ یہاں آرام سے کئی ہیلی کا پٹر اتر سکتے تھے۔ میری چھٹی حس اشارہ دینے لگی کہ ہیلی کا پٹر کی آمد اور میری یہاں موجودگی کا آپس میں تعلق ہے۔ میں کھڑکی بند کر کے واپس آیا۔ تقریباً دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور گارڈز نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ بیٹو اس بار بیدار ہو گیا تھا۔

”آپ کہاں جاتا ہے؟“

”ہاں نہیں مجھے بلایا ہے۔“ میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔

”دیر مت کرو جلدی کرو۔“ گارڈز نے سخت لہجے میں کہا تو اس کے طرزِ مخاطب سے میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ کیا میرے حوالے سے کوئی فیصلہ ہو گیا تھا تب ہی گارڈز کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔ وہ مجھے لے کر عمارت سے باہر آئے اور حویلی کی طرف بڑھے۔ لان سے گزرتے ہوئے میں نے حویلی کے پہلو میں کھلی جگہ کھڑے ہیلی کا پٹر کی جھلک دیکھی یہ ایک چھوٹا اور جدید قسم کا ہیلی کا پٹر تھا۔ مجھے حویلی کے اسی کمرے میں لے جایا گیا جہاں میاں ممتاز نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔ اب وہاں ایک کے بجائے دو صوفے نما کرسیاں تھیں اور دوسری کرسی پر موجود شخص نو دیکھ کر میں اچھل پڑا تھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔



وہ راج کنور تھا۔ وہی راج کنور جو مجھے انڈیا میں ملا تھا اور جس نے اپنے بڑے بھائی کے لیے میرے جسم سے خون نچوڑ لینا چاہا تھا بلکہ خاصا خون نچوڑ لیا تھا اور یہ میری زندگی تھی کہ بچ گیا ورنہ ان لوگوں نے مجھے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ راج کنور کے بڑے بھائی کو جسے سب بڑے کنور کہتے تھے۔ اسے ایک سانپ نے ڈس لیا تھا اور اس کے پورے جسم پر کوڑھ جیسا مرض چھا گیا تھا یہ آہستہ آہستہ اس کے جسم کو گھار رہا تھا۔ سندھو نامی ماہر سپیراس کا علاج کر رہا تھا اور اس نے بڑے کنور کے مرض کا علاج بھی دریافت کر لیا تھا۔ اس کے علاج کے لیے ایسے فرد کا خون درکار ہوتا تھا کہ جسے شیش ناگ قسم کے سانپ نے ڈسا ہو اور وہ بچ جائے۔ اس کے خون میں کچھ ایسی خاصیت پیدا ہو جاتی جو بڑے کنور کے علاج کے لیے بنائی جانے والی دوا کا خاص جزو بن جاتا تھا جیسے حکیم قادس کی دواؤں میں اس پراسرار دوا سے آنے والا خاص پتھر استعمال ہوتا تھا۔ بد قسمتی سے مجھے انڈیا میں ایک سانپ نے ڈس لیا تھا اور اس نے معمول سے کوئی چار گنا زیادہ زہر میرے جسم میں اتار دیا تھا مگر ایک تو قدرت کی طرف سے میرا وقت نہیں آیا تھا دوسرے میں سپیرے سندھو کو مل گیا۔ یہ اصل میں اس کا ایک مفرور سانپ تھا جس نے مجھے ڈسا تھا اس کی تلاش میں نکلے سندھو کو مل گیا اور اس نے میرا علاج کیا تھا۔

جب میں سندھو کے ہاتھ لگا تو اس کی کم عمر بیٹی اوشا مجھ پر فریفتہ ہو گئی تھی اور اس نے میری مدد کی کوشش بھی کی لیکن بد قسمتی سے ہم دونوں پکڑے گئے اور کنوروں کے قبضے میں چلے گئے۔ اس کے بعد وہاں ہنگامہ ہوا اور میں وہاں سے نکل گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کنوروں، سندھو اور اوشا پر کیا گزری تھی۔ صرف سندھو کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ ہنگامے میں مارا گیا ہے لیکن یہ بھی یقینی نہیں تھا۔ بعد میں رانا ویاس نے تصدیق کی کہ کنور خاندان بچ گیا تھا اور کنوروں کی بہن سادھنا ہمارے ساتھ آگئی تھی۔ اب وہ سعدیہ تھی اور اس کا کنوروں سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا اس نے خود یہ تعلق توڑ دیا تھا۔ زمین اور ہیروں کی لالچ میں انہوں نے بے دریغ ہزاروں قبایلوں کا قتل عام کر لیا تھا اور اب وہ زمین اور ہیروں کی کان یقیناً ان کے قبضے میں تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ طاقتور بن چکے تھے اور اس کا ثبوت راج کنور کی یہاں موجودگی تھی۔ وہ مجھے طنز یہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”شہباز جی کیا پہچانا نہیں مجھے..... جو ایسے دیکھ رہے ہو؟“

”شیطان کو میں ہر روپ میں پہچان لیتا ہوں۔“ میں نے دھمی آواز میں کہا۔ ”تمہیں تو میں پہلے بھی دیکھ

چکا ہوں۔“

اس کا چہرہ گمراہ تھا۔ ”آج بھی تمہاری زبان بہت تیز ہے۔“
 ”کام کی بات کرو۔“ میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میاں صاحب نے بتایا ہے کہ تم مجھ سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔“

اس بات پر غالباً اسے خیال آیا کہ وہ کس لیے یہاں آیا تھا۔ اس کی پہلی کاہل سے آمد بتا رہی تھی کہ وہ قانونی طریقے سے سرحد پار کر کے نہیں آیا ہے بلکہ اس کے پہلی کاہل نے ہماری فضائی حدود کی خلاف ورزی کی تھی اور اب پورے دھڑلے سے اس سرزمین پر موجود تھا۔ مجھے افسوس ہوا میں میاں ممتاز کو صرف ایک مخصوص ذہنیت کا سیاست دان سمجھتا تھا لیکن کنور کی یہاں موجودگی بتا رہی تھی کہ وہ اس زمین کا غدار بھی ہے ورنہ ایک بھارتی جاگیردار اور سیاست دان کی اس طرح یہاں موجودگی کو کیا کہا جاسکتا تھا۔ مگر یہ سب میں نے دل میں سوچا تھا اور اپنی زبان اور تاثرات کو قابو میں رکھا تھا۔ کنور نے سر ہلایا۔ ”یہ درست ہے میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ تم جانتے ہو تم بھارتی حکومت کو مطلوب ہو اور تم پر دہشت گردی کے بے شمار الزامات ہیں.....“
 ”انہیں میں اپنے جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”کنور میں نے کہا نا..... کام کی بات کرو۔“

”مہاشے جی۔“ وہ پھر پٹ گیا۔ ”یہاں تم ایک قیدی ہو اس لیے زیادہ بڑھ کر مت بولو۔“
 ”ٹھیک ہے میں قیدی ہوں۔ اس سے تمہیں کیا؟“
 ”میاں جی..... میرے اچھے واقف کاروں میں سے ہیں۔ ہم ایک جیسے لوگ ہیں۔ میں نے ان سے کہا اور انہوں نے تمہیں تلاش کر لیا۔“

گو یا میاں ممتاز نے اسے یہ کہا تھا کہ اس نے مجھے تلاش کیا ہے۔ میں نے سوچا مگر راج کنور کی بات کی تردید نہیں کی۔ اول تو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا پھر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میاں ممتاز نے یہ غلط بیانی کیوں کی؟ میں ابتدائی جھٹکے سے سنبھل گیا تھا اور کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ راج کنور یہاں کیوں آیا ہے اور وہ میاں ممتاز کے تو سنا سے مجھے کیوں تلاش کروا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”بڑے کنور کا کیا حال ہے کیا وہ زندہ ہے؟“

اپنے بھائی کے بارے میں سن کر اس کا رنگ بدلا تھا۔ ”ہاں وہ زندہ ہیں مگر ان کا مرض بڑھ رہا ہے۔“
 ”ظاہر ہے اب تم لوگوں کے پاس نہ سندھو ہے جو کسی کے خون سے اس مرض کی دوائی تیار کر کے دے اور نہ کوئی ایسا فرد جس کا خون مخصوص قسم کا ہو۔“

”سندھو کی جگہ دوسرا آدمی تلاش کر لیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ماہر ہے مگر کوئی ایسا بندہ اب تک نہیں ملا ہے جس کا خون کام آسکے۔“

”تم لوگوں کے پاس مجبور انسانوں کی کیا کمی ہے تم سینکڑوں لوگوں کو بھی سانپ سے ڈسا کر ایسا آدمی تلاش کر سکتے ہو جو زہر سے بچ جائے اور اس کے خون میں وہی چیز آجائے۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔“ میرے طنز کے جواب میں اس نے دہلی زبان میں کہا۔ ”ہم نے کچھ لوگوں تجربہ کیا مگر وہ بچ نہ سکے۔ اصل میں سندھو ایسے لوگوں کو مخصوص جزی بوٹیاں دے کر بچاتا تھا ان جزی بوٹیوں کو کسی کو پتا نہیں ہے۔“

”ابھی تم کہہ رہے تھے کہ نیا آدمی سندھو سے زیادہ ماہر ہے۔“

”اس کا طریقہ علاج دوسرا ہے لیکن جب اس بارے میں پتا چلا تو اس نے دعویٰ کیا کہ وہ تمہارے خون سے کہیں زیادہ موثر دوا بنا سکتا ہے جو بڑے کنور کو چند مہینوں میں بالکل ٹھیک کر سکتی ہے اور خون بھی زیادہ نہیں درکار ہوگا۔ ہر ہفتے صرف آدھا لیٹر خون چاہیے ہوگا۔“

میرا خدشہ درست نکلا تھا وہ اسی مقصد کے لیے یہاں آیا تھا۔ میں میاں ممتاز کا قیدی تھا اگر وہ مجھے بے دست و پا کر کے اس کے حوالے کر دیتا تو میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ”یہ خون تمہیں میرے جسم سے چاہیے؟“

”ہاں مگر اس کے بدلے تمہیں بھی فائدہ ہوگا۔ تمہارے خلاف انڈیا میں جتنے کیس ہیں ان سب سے تمہارا نام نکال دیا جائے گا اور دوسرے تم جو رقم مانگو گے وہ تمہیں دی جائے گی۔“

ایسے ہی وعدے مرشد نے بھی کئی بار مجھ سے کیے تھے لیکن ان پر عمل درآمد کی نوبت اس وقت آئی جب وہ میرے سامنے بالکل مجبور ہو گیا تھا۔ جب کہ کنوروں کو ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی اور وہ مرشد سے کہیں زیادہ گھنیا قسم کے سیاست دان تھے۔ گزشتہ رات جب میاں ممتاز نے اچانک ہی مجھے معزز مہمان سے معزز قیدی کا درجہ دیا تھا تو میں دنگ رہ گیا تھا اور فوری طور پر میرے ذہن میں اس مشکل سے نکلنے کا کوئی طریقہ نہیں آیا۔ جب کہ میاں ممتاز نے پوری منصوبہ بندی سے مجھے جکڑ لیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کو بھی دھوکا دیا تھا۔ میں یوں بھی کنفیوز تھا کہ مجھے اس دشمن کا علم نہیں تھا جس نے میاں ممتاز سے رابطہ کیا تھا۔ اب وہ دشمن سامنے تھا اور مقصد بھی واضح تھا۔ وہ مجھے یہاں سے لے جانے آیا تھا جب کہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کسی صورت اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”راج کنور اگر میں تمہارے ساتھ جانے سے انکار کروں تو.....“

”تو اس صورت میں جلد بھارتی حکومت کی طرف سے تمہاری حوالگی کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اگر تمہیں حوالے نہیں کیا گیا تو یہ معاملہ عالمی اداروں میں جائے گا۔ تمہیں کسی مستند دہشت گرد تنظیم کا رکن قرار دیا جائے گا تم سوچ سکتے ہو اس کے بعد کیا ہوگا۔“ راج کنور کا لہجہ مجھے ڈرانے والا تھا۔

”میرے خلاف بھارتی حکومت کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

”ثبوت ہیں۔“ اس نے زور دے کر کہا۔ ”فوج کے خلاف استعمال ہونے والے اور ہمارے سینا کے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے کئی ہتھیاروں پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں۔ اسی طرح کم سے کم سوافراد موجود ہیں جنہوں نے تمہیں انڈیا میں مجرمانہ کارروائیاں کرتے دیکھا ہے۔ دوسرے ثبوت بھی ہیں۔“

مجھے لگا اس بار راج کنور ٹھیک کہہ رہا تھا میں نے بھارتی کی سرزمین پر بے شمار ہتھیار استعمال کیے تھے اور ان پر سے میری انگلیوں کے نشانات لینا عین ممکن تھا۔ میں اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا مگر موازنے کے لیے ان کے پاس میری انگلیوں کے نشانات کہاں سے آئے میں نے یہی سوال راج کنور سے کیا تو اس نے کہا۔ ”یہ کوئی شکل کا م نہیں ہے یہاں میری موجودگی سے تمہیں اندازہ ہو گیا کہ ہماری رسائی کہاں تک ہے۔“

راج کنور اپنی گفتگو میں ہندی کے وہ الفاظ استعمال کر رہا تھا جو ناجائز طور پر اس میں شامل کیے گئے تھے اور اسے شدھ ہندی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر الفاظ میرے سر سے گزر رہے تھے اور مجھے اندازے سے سمجھنا رہا تھا کہ وہ کیا فرما رہا ہے۔ میں اس کی گفتگو کو آسان بنا کر پیش کر رہا ہوں۔ میں تشویش زدہ ہو رہا تھا مگر اپنے

انداز سے میں نے ظاہر نہیں کیا۔ اس کے بجائے میں نے لاپرواہی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم یہاں بہت اثر و رسوخ رکھتے ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مجھے اتنی آسانی سے لے جا سکو گے۔“

”آسانی سے نہیں تو مشکل سے لے جاؤں گا۔“ راج کنور نے غرا کر کہا۔ وہ اپنے اصل روپ میں آ رہا

تھا۔ ”میاں جی نے مجھے وجہ دیا ہے کہ وہ میری مدد کریں گے۔“

”تب تم میاں جی سے بات کرو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرا دماغ کیوں کھا رہے ہو؟“

”تم راضی خوشی چلو گے تو تمہیں بھی فائدہ ہوگا۔ ورنہ تمہیں قیدی بنا کر لے گیا تو تم کو کچھ نہیں ملے گا۔“

اس نے دھمکی دی۔

میں خاموش رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا نہیں کہ میں راضی خوشی بھی گیا تو مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ سوائے اذیت ناک موت کے۔ اسی لمحے میاں ممتاز وہاں آ گیا۔ حسبِ معمول وہ تروتازہ اور سویر لگ رہا تھا اس نے گاؤں پہن رکھا تھا۔ وہ اپنی نشست پر آیا اور اس نے راج کنور کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے تمہاری بات ہو گئی ہے۔“

”کہاں میاں جی۔“ اس نے شکایت کرنے والے انداز میں کہا۔ ”یہ کچھ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

”بھیڑ یا بھیڑ سے کہے کہ دیوار سے نیچے آ جاؤ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا تو کیا بھیڑ اس کی بات مان لے

گی؟“ میں نے سادہ سے لہجے میں پوچھا۔

”میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ راج کنور بولا۔ ”بس چند مہینوں کی بات ہے۔“

”اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد رہا ہے عدالت میں ایک خاتون نے وکیل کے سوال پر اپنی عمر اٹھائیس سال

اور چند مہینے بتائی، جب وکیل نے چند مہینوں کی وضاحت کرنے کو کہا تو یہ مہینے ڈیڑھ سو نکلے تھے۔ تو راج کنور

صاحب مجھے یقین ہے آپ کے چند مہینے بھی اس سے کم نہیں ہوں گے۔“

میاں ممتاز زیر لب مسکرایا تھا مگر اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تب اس مسئلے کا کیا حل نکل سکتا ہے؟“

”میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا اور اگر مجھے زبردستی اس کے ساتھ روانہ کیا گیا تو میاں صاحب سمجھ سکتے

ہیں آئندہ میرا اور میرے ساتھیوں کا رویہ عمل کیا ہوگا۔“

”میں تمہارا ہمدرد ہوں۔“ اس نے ناگواری سے کہا۔ ”مگر کنور فیملی سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔“

”تب آپ مجھے ان کے حوالے کر دیں۔“

میاں ممتاز نے تپائی سے سگار کیس اٹھایا۔ سگار نکال کر سلگایا اور ایک گہرا کش لے کر دھواں چھوڑا اور نفی

میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔“

میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ یہ کیوں ممکن نہیں ہے۔ یقیناً بنی باپ کے آڑے آئی تھی۔ میری معلومات

کے مطابق میاں ممتاز حسین کی دو بی بیئیں تھیں۔ نورالتعارف بنی اور مہرالتعارف بیٹا۔ کوئی بیٹا نہیں تھا مگر

جہاں تک اس کا نام روشن کرنے کا تعلق تھا تو یہ دو بیٹیاں دس بیٹوں پر بھاری تھیں ان کے کروت میں خود ملاحظہ

کر چکا تھا۔ وہ ان کے آگے مجبور تھا۔ راج کنور یہ سن کر اچھل پڑا تھا اس نے کسی قدر برہمی سے کہا۔ ”میاں جی

آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں اتنا خطرہ مول لے کر اس لیے یہاں آیا ہوں کہ ایسے ہی واپس چلا جاؤں۔“

”دیکھو ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اگر دونوں طرف افہام و تفہیم کا جذبہ ہو۔“
 ”جو ہمارے سیاست دانوں میں بہت پایا جاتا ہے۔“ میں نے لقمہ دیا۔ مگر میاں ممتاز نے برا نہیں منایا اس کے بجائے اس نے سر ہلایا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ فطری اصول ہے جو طبقہ جتنا متحد ہوگا وہ دوسرے طبقوں پر اتنا ہی حاوی ہوگا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ وہ اقلیت میں ہے اور اکثریت پر حکمران ہے۔ دنیا میں دیکھو تو یہودی اس کی بہترین مثال ہیں۔“

”اور ہماری حکمران کلاس۔“ میں نے کسی قدر تعنی سے کہا۔ ”انہوں نے اپنے مفاد کے لیے ایکایک کیا ہوا ہے اور عوام کو تقسیم کر رکھا ہے۔“

راج کنور بولا۔ ”صرف پاکستان نہیں ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ انڈیا میں بھی سیاست دان متحد ہیں لیکن میاں جی میں یہاں سیاست پر بحث کرنے نہیں آیا ہوں آپ مجھے بتائیں کہ اس شخص کو میرے حوالے کر رہے ہیں یا نہیں، اگر آپ کا جواب انکار میں ہوتا ہے تو سوچ لیجئے گا بعد میں ہمارے پاس بھی انکار کا موقع آئے گا۔“
 یقیناً میاں ممتاز اور کنوروں کے درمیان کوئی مالی مفاد کا چکر تھا اور راج کنور اسے اسی حوالے سے دھمکی دے رہا تھا۔ مگر میاں ممتاز نے بہ ظاہر کوئی اثر نہیں لیا۔ اس کے بجائے اس نے ایک گہرا کش اور لیا اور نرم لہجے میں بولا۔ ”میرے پاس ایک تجویز ہے اگر تم دونوں مان لو؟“

”میاں صاحب میں اس شخص سے کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گا۔“ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”اس سے بہتر ہے میں شیطان سے تعاون کر لوں آپ جانتے ہیں یہ شخص ہزاروں معصوم افراد کا قاتل ہے جن میں اکثریت عورتیں اور بچے تھے۔“

”اگر تمہارا اشارہ قبائلیوں کے قتل عام کی طرف ہے اس کی ذمہ داری جتنی کنور خاندان اور بھارتی حکومت پر عائد ہوتی ہے اتنی ہی ان قبائل کی زحما پر ہوتی ہے جنہوں نے ہیرے کی کان اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے اپنے لوگوں کو مردا دیا۔“ میاں ممتاز نے سرد لہجے میں کہا۔ ”انہیں پٹیش کی گئی تھی کہ وہ یہ جگہ چھوڑ دیں تو انہیں نہ صرف متبادل جگہ فراہم کی جائے گی بلکہ اس کا معاوضہ بھی دیا جائے گا۔“

”متبادل زمین۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”میاں صاحب میں اس لفظ کے معنی بہت اچھی طرح جانتا ہوں ہزاروں سال سے طاقتور حکومتیں محکوموں کو اس طرح کے لارے دیتی رہی ہیں۔ امریکہ کی تو پوری تاریخ ہی اس لفظ کے گرد گھومتی ہے جب مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر کے متبادل زمین کے دھوکے دیئے گئے اور انڈیا میں متبادل زمین ہے کہاں؟“

میاں ممتاز کے چہرے پر ہیزاری دکھائی دینے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ میں فوراً اس کی تجویز مان لوں گا اور میرا رد عمل اس کی توقع کے خلاف تھا۔ راج کنور خاموش تھا ایسا لگ رہا تھا کہ مذکورہ تجویز پہلے سے اس کے علم میں تھی کیونکہ اس نے بارے میں ذرا بھی اشتیاق کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ امکان یہی تھا کہ دونوں مل کر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں خاموش ہوا تو میاں ممتاز نے جھنجھلا کر کہا۔ ”شہباز تم ایک بار میری تجویز سن تو لو۔“

”مجھے معلوم ہے آپ کیا تجویز پیش کریں گے۔“

میری اس بات پر وہ چونکا۔ ”تمہیں کیسے معلوم؟“

”میاں صاحب اللہ نے مجھے عقل دی ہے۔ آپ یہی تجویز کرتے تاکہ میں یہیں رہوں۔ آپ مجھے راج

کنور کے حوالے نہیں کریں گے لیکن اسے ضرورت کے مطابق میرا خون مہیا کیا جاتا رہے گا۔“

اس بار میاں ممتاز کے ساتھ راج کنور بھی چونکا تھا۔ انہوں نے بے ساختہ ایک دوسرے کو جس طرح دیکھا

اس سے ان کی ملی بھگت واضح ہو گئی۔ میاں ممتاز نے بادل ناخواستہ سر ہلایا۔ ”یہ درست ہے۔“

”میں راضی خوشی اپنے جسم سے صرف اضافی پانی ہی دے سکتا ہوں۔“ میں نے کہا تو راج کنور اچھل پڑا

تھا۔

”بس میاں جی میں اس سے زیادہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”بے عزتی۔“ میں نے طنز کیا۔ ”جو لوگ اپنی سگی بہن کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہو جائیں وہ

بے عزتی کا مطلب سمجھتے ہیں۔“

راج کنور کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس نے غرا کر کہا۔ ”بکواس مت کرو، آشا قبا کیوں کے حملے میں ہلاک ہو

گئی تھی انہوں نے اس کی لاش بھی جلادی تھی۔“

”چلو یہ مسئلہ بھی حل ہوا اور تمہاری عزت بچ گئی۔“ میں نے فس کر کہا۔ ”لاش بھی تم نے شناخت کی ہو

گی۔“

میاں ممتاز نے سگار نئے سرے سے سلکا کر فضا کو دھواں آلود کرتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں بیکار کی بحث

میں الجھ گئے ہو۔ ماضی میں جو ہوا اسے بھول جاؤ، حال کے مسئلے پر بات کرو۔“

”میاں جی میں اسے لے کر جاؤں گا۔“ راج کنور نے میری طرف اشارہ کیا۔

”میں کسی صورت اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا اور یہ بات میاں صاحب بھی سمجھتے ہیں کہ

میرے ساتھ زبردستی کرنے کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔“

”اسی لیے میں نے متبادل تجویز رکھی ہے۔“

”میاں جی، شہباز انکار کر رہا ہے۔“ راج کنور نے کہا۔

”شہباز تم اپنے رویے سے میرے اور اپنے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہو۔“ اس بار میاں ممتاز نے

بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میاں صاحب، مشکلات نہ آپ کے لیے نئی ہیں اور نہ میرے لیے نئی ہیں۔“ میں نے لا پرواہی سے

کہا۔ ”اس لیے آپ یہ مت سوچیں کہ میں مشکلات کی وجہ سے آپ کی تجویز سے متفق ہو جاؤں گا۔“

”اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ میاں ممتاز نے بھر لہجے میں شہد گھول کر کہا۔ وہ بلاشبہ ماہر سیاست دان تھا

ورنہ اس کی جگہ اس حیثیت کا کوئی اور شخص ہوتا تو اب تک مختل ہو کر اپنے اصل روپ میں آچکا ہوتا۔ ”راج کنور

کا کہنا ہے کہ اسے فتنے میں نصف لیٹر خون درکار ہے جب کہ اس سے پہلے تم کئی بار ایک لیٹر تک خون دے چکے

ہو۔ یہاں بہترین ڈاکٹر تمہاری دیکھ بھال کریں گے۔ تمہیں بہترین غذائیں اور پہلی منٹ دیئے جائیں گے اگر

کوئی کی ہوئی تو وہ متبادل طریقے سے پوری کر دی جائے گی۔“

”میں جانتا ہوں میاں صاحب کہ نصف لیٹر خون دینے سے میری صحت پر خاص فرق نہیں پڑے گا۔ اگر کسی کی جان بچانے کا سوال ہوتا تو میں اپنی پروا بھی نہ کرتا لیکن ان بھائیوں کے لیے میرے پاس کیا ہے وہ میں بتا چکا ہوں۔“ میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

اس گفتگو کے ابتدائی حصے میں، میں سمجھ چکا تھا کہ میاں ممتاز اور راج کنور اصل میں ایک پارٹی ہیں مگر میاں ممتاز بہ ظاہر اقوام متحدہ کا کردار ادا کر رہا تھا اور وہ درحقیقت اقوام متحدہ کا کردار ہی ادا کر رہا تھا یعنی وہ کردار جو اقوام متحدہ ثالثی کے نام پر بڑی طاقتوں کے لیے ادا کرتی ہے۔ وہ سب پہلے سے طے کر کے آئے تھے اور اس میں یقیناً یہ بھی شامل تھا کہ میں تعاون سے بالکل انکار کر دوں تو وہ پھر کیا کریں گے۔ میاں ممتاز نہ سہی لیکن راج کنور مجھے اچھی طرح جانتا تھا اسے معلوم تھا میں کسی صورت نہیں مانوں گا۔ بات اس طرف جاری تھی جب متبادل طریقہ سامنے آتا۔ دوسرے لفظوں میں ملی تھیلے سے باہر آ جاتی۔ میاں ممتاز نے گہری سانس لی۔ ”شہباز مجھے افسوس ہے کہ تم نے میری تجویز مسترد کر دی۔“

”اس لیے آپ اب مجھے راج کنور کے حوالے کر دیں گے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر تم راضی خوشی چلے جاتے تو ٹھیک تھا لیکن اس صورت میں جب کہ تم کنور خاندان کو اپنا دشمن قرار دے رہے ہو تبہیں ان کے حوالے کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”یعنی مجھے یہیں رکھ کر میرا خون نچوڑا جائے گا۔“

”مجبوری ہے۔“ میاں ممتاز نے پُر فکر انداز میں کہا۔ ”تم نے کوئی اور راستہ چھوڑا نہیں ہے۔“

”میاں صاحب تب بہتر ہے یہ کام آپ پوری احتیاط سے کریں۔ میں اس سلسلے میں آپ سے کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گا۔ بلکہ ہر ممکن مزاحمت کروں گا۔“

”مجھے بھی اسی بات کا خدشہ تھا۔“ میاں ممتاز نے سر ہلایا۔ اس نے اپنا موبائل نکال کر نمبر ملایا اور پھر کسی سے کہا۔ ”کیا رپورٹ ہے.....؟“ دوسری طرف سے سن کر اس نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ ”لو بات کرو۔“

میں نے موبائل کان سے لگایا تو دوسری طرف سے بیٹو کی آواز آئی۔ ”شوہی..... شوہی آپ کہاں ہے؟“

”بیٹو۔“ میرا دل دھڑکا تھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”یہ لوگ ہم کو محل سے کہیں باہر لایا ہے۔ آنکھ پر پٹی باندھ کر..... ادھر ہم کو قید کیا ہے..... آپ ٹھیک ہو

یا۔“

”بیٹو میں ممتاز ہاؤس میں ہی ہوں۔“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اسی اثنا میں کسی نے بیٹو سے موبائل لے کر کال کاٹ دی۔ میں ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔ میں نے غصے میں میاں ممتاز کا موبائل ایک دیوار پر دے مارا اور اس کے پرزے بکھر گئے تھے۔ مگر میاں ممتاز پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اس کے بجائے اس نے سگارا کا ایک گہرا کش لیا اور بولا۔ ”شہباز ملک اب تم سمجھ گئے ہو گے۔“

”جی سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے دانت پر دانت جما کر کہا۔ ”مجھے امید ہے ابھی آپ نہیں سمجھے ہیں لیکن جلد

سمجھ جائیں گے۔“

ظاہر ہے اس دمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ راج کنور کھل اٹھا تھا اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”اچھا میاں جی بہت شکریہ..... میں پھر چکر لگاؤں گا۔“

”لیکن سرحد کے راستے۔“ میاں ممتاز نے کہا۔ ”آپ کا اس طرح آنا جانا ٹھیک نہیں ہے۔“

راج کنور نے یہاں نہ تو کچھ کھایا پیا تھا اور نہ ہی اس نے میاں ممتاز سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی۔ وہ چھوٹ چھات کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے اس رویے کے باوجود یہ قول میاں ممتاز اس کے کنور خاندان سے مراسم تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ورنہ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں میاں ممتاز مجھے راج کنور کے حوالے نہ کر دے۔ اگر وہ ایسا کرنے پر تمل جاتا تو میں اس کے سامنے قطعی بے بس تھا۔ اگرچہ یہاں بھی حالات اچھے نظر نہیں آرہے تھے لیکن ایک تو میں اپنے ملک میں تھا دوسرے یہاں میں فرار کی کوشش کر سکتا تھا۔ راج کنور کے جانے کے بعد میاں ممتاز نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے شہباز مگر میں بعض وجوہات کی بنا پر راج کنور کو صاف انکار نہیں کر سکتا تھا۔“

”آپ افسوس نہ کریں ممکن ہے اس کا موقع کبھی بعد میں آئے۔“

اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ ”تم خود کو کچھ سمجھنے لگے ہو۔ میں نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ انہیں کسی اور کا خون دے دوں گا۔ مگر ان کے پاس تمہارے خون کا نمونہ موجود ہے اس لیے وہ دھوکا نہیں کھائیں گے۔“

”آپ نے بہت دور تک کا سوچا ہوا تھا۔“ میں نے سادگی سے طنز کیا۔ ”دھوکا بھی آپ انہیں ہی دیتے ہیں جو راضی خوشی دھوکا کھالیں۔ جیسے اس بد نصیب ملک کی عوام جس کے آپ جیسے لیڈرز ہیں۔“

اس بار اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے اپنے گارڈز کو طلب کر لیا۔ وہی دونوں اندر آئے۔ میاں ممتاز نے ان سے کہا۔ ”اسے لے جاؤ اور پوری طرح چوکس رہنا۔“ ان کو ہدایت دے کر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”شہباز تمہاری کسی غلط حرکت یا عدم تعاون کا خمیازہ کسے بھگتنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے تم سمجھ گئے ہو؟“

وہ مجھے بیٹو کی دمکی دے رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ بیٹو کی اہمیت سمجھتا تھا۔ بیٹو ترشہ دیکھا جاسکتا تھا اسے قتل بھی کیا جاسکتا تھا یا اسے کنور خاندان کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ وہ کنوروں کے دشمن قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے میں شرافت سے واپس اس کمرے میں پہنچ گیا جو میرا زندان تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ مجھے راج کنور کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں وہ میرے ماضی کا ایک حصہ بن چکا تھا لیکن اس نے اچانک سامنے آکر بتا دیا تھا کہ کبھی کبھی وقت خود کو دہراتا ہے۔ اس وقت سورج کسی قدر بلند ہوا تھا۔ کمرے میں آکر میں دیکھا تو سياتنغ رہے تھے اور وہاں ناشتہ میرا منتظر تھا۔ یہ قوت بخش قسم کا ناشتہ تھا۔ اس میں ایک گلاس دودھ، ایک گلاس اورنج جوس، ہاف بوائل انڈے، شہد، پنیر اور براؤن بریڈ تھی۔

چائے یا کافی جیسی منفرد صحت چیزوں کا دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے جب کنوروں کے محل میں میرا خون لیا جا رہا تھا تب بھی مجھے چائے یا کافی نہیں دی جاتی تھی کہ اس سے کچھ مسئلہ ہوتا تھا۔ اب بھی میرے ساتھ یہی کیا گیا تھا۔ میرا دل نہیں چاہا، رہا تھا کہ ناشتہ کروں لیکن مجبوری تھی اگر میں ناشتہ نہ کرتا یا بھوک ہڑتال کر دیتا تب بھی یہ میرا خون ضرور نچوڑتے۔ اس لیے اگر مجھے خود کو صحت مند اور جدوجہد کے قابل رکھنا تھا تو

کھانا پینا لازمی تھا۔ میں نے پہلے تو خود کو معمول پر لانے کے لیے سانس کی چند مشقیں کیں۔ پھر کمرے میں ہی ہلکی پھلکی ایکسرسائز کی۔ واش روم میں نہانے کی سہولت تھی لیکن فی الحال میں نے صرف منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں لیٹ گیا۔

اب تک میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ میرے ساتھیوں پر میری اور بیٹو کی گمشدگی کا کیا اثر ہوگا اور وہ مجھے تلاش کرنے کی کوشش کس طرح کر سکتے ہیں۔ یہ سوچ آتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ میرے ساتھی سب سے پہلے اس شہاد کو تلاش کریں گے۔ اگرچہ شاہد کو سفیر نے ہار کیا تھا اور پھر ہم نے اسے کوٹھی نہیں بلایا تھا بلکہ خود فیض آباد کے ایک کینے کے سامنے پہنچے تھے جہاں وہ ہمارا منتظر تھا۔ عبد اللہ ہمیں چھوڑنے آیا تھا لیکن وہ بھی ہمیں دور اتار کر چلا گیا تھا۔ اس لیے اب شاہد کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا سوائے سفیر کے، لیکن یہ کوئی مشکل کام نہیں عبد اللہ سفیر سے رابطہ کر کے شاہد کے بارے میں پوچھ سکتا تھا اور ایک بار اس کا نمبر مل جاتا تو اسے تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مگر شاہد نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا اور امکان یہی تھا کہ مار کھا کر اور لہو لہان ہونے کے بعد شاہد کو اس کا ہوش ہی نہ ہو کہ وہ ہمیں اغوا کرنے والوں یا ان کی گاڑی کو دیکھ سکے۔

شاہد زیادہ سے زیادہ یہ بتا سکتا تھا کہ ہمیں کہاں سے اغوا کیا گیا۔ اس صورت میں مجھے اور بیٹو کو تلاش کرنا آسان نہ رہتا۔ بہر حال امید پر دنیا قائم ہے۔ بہت سارے معاملات انسان قسمت پر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرتا ہے۔ سوچوں کا رخ فنی کی طرف مڑ گیا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اب اصل معاملے سے واقف ہو گئی تھی اور شاید اسی کا دباؤ تھا جس کی وجہ سے میاں ممتاز مجھے راج کنور کے حوالے نہیں کر سکا۔ اپنی باتوں سے میں نے اسے جتنا مشتعل کیا تھا اس کے بعد وہ یقیناً ایسا کرنا چاہ رہا ہوگا۔ سوال یہ تھا کہ میرے ساتھ جو ہونے والا تھا کیا اس میں فنی کی رضا شامل تھی؟

اگر فنی کی رضا اس میں شامل تھی کہ مجھے قید میں رکھ کر میرا خون لیا جائے تو اس کی طرف سے کوئی امید بے کار تھی ویسے بھی وہ ایک حد سے زیادہ اپنے باپ کی مخالفت نہیں کر سکتی تھی۔ میں اس کا محسن بھی لیکن وہ مجھے اپنے باپ اور اس کے مفادات پر ترجیح نہیں دے سکتی تھی۔ بیٹو کا ساتھ میرے لیے پھندہ بن گیا اب میں کسی بھی کارروائی کے لیے آزاد نہیں تھا۔ میاں ممتاز نے چالاکی سے کام لیا اور اسے کہیں اور منتقل کر دیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ میں میری کمزوری بن گیا تھا۔ میں سوچ میں گم تھا کہ دروازہ کھلا اور وہی دو گاڑیوں دکھائی دیں۔ لگتا تھا انہیں مستقل میرے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ ان میں ایک گورا تھا اور ایک سانولا تھا۔ گورا باس لگتا تھا کیونکہ وہی مجھ سے بات کرتا تھا اور حکم دیتا تھا۔ سانولا چپ رہتا تھا اور حکم کی تعمیل کرتا تھا۔ گورے نے مجھ سے کہا۔ ”آپ کو بلایا گیا ہے جناب؟“ اس کا لہجہ پھر بدل گیا تھا اور وہ اب عزت سے بات کر رہا تھا۔ اس سے پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے میں جوتے پہن کر باہر آیا۔ البتہ راستے میں مجھے خیال آیا۔

”میرے ساتھی کے پاس ایک بیگ تھا اس میں میری چیزیں اور کپڑے تھے۔“

”آپ کی ہر چیز محفوظ ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”مجھے اپنے کپڑے چاہئیں۔“

”آپ کے کمرے میں پہنچا دیے جائیں گے۔“

میرا خیال تھا کہ مجھے عمارت میں ہی کہیں لے جایا جا رہا ہے لیکن وہ مجھے ایک عقی دروازے سے باہر نکال لائے۔ اس طرف بھی دور تک پھیلا ہوا لان تھا۔ یہاں گھنے درخت بھی تھے اور پھولدار پودوں کے تختے بھی تھے۔ ہم پختہ روشوں سے گزرتے درختوں کے پیچھے پہنچے تو وہاں چار دیواری کے گوشے میں ایک سفید رنگ کی مخمر عمارت تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی دواؤں کی بو نے بتایا کہ یہ عمارت طبی مقاصد کے لیے مخصوص تھی۔ مجھے ایک کمرے میں لایا گیا۔ وہاں ایک ڈاکٹر اور ایک نرس پہلے سے موجود تھے۔ سانولا باہر رک گیا تھا لیکن گورا میرے ساتھ اندر تک آیا۔ گورے نے مجھ سے کہا۔ ”آپ کے لیے میاں صاحب کا حکم ہے کہ ڈاکٹر سے مکمل تعاون کریں۔“

میں نے دل ہی دل میں میاں صاحب اور ان کے حکم کی ایسی کم جیسی کی اور ڈاکٹر کی طرف دیکھا وہ سوکھے چہرے اور بڑی بڑی اٹلی ہوئی سرخ آنکھوں والا کرپٹ نظر آنے والا شخص تھا۔ ”تم ڈاکٹر ہو۔“ اس نے سر ہلایا اور اسٹریچر نما کاؤچ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس پر آ جائیں۔“

میں لینا تو اس نے پہلے معمول کا طبی معائنہ کیا۔ یعنی درجہ حرارت اور بلڈ پریشر چیک کیا۔ اس کے بعد آنکھوں اور زبان کا معائنہ کیا۔ زبان دکھانے کے مطالبے پر میں نے چڑانے والے انداز میں زبان دکھائی جس پر نرس کی ہنسی نکل گئی اور جب ڈاکٹر نے اسے گھورا تو یہ ہنسی رک گئی تھی۔ وہ نو عمر اور گول منوں سی لڑکی تھی۔ سرخ و سفید رنگت اور قدرتی لائٹ براؤن بالوں کے ساتھ وہ دلکش لک رہی تھی۔ جسامت بھاری تھی مگر یہ بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔ چست یونیفارم میں اس کا جسم بھی چست لگ رہا تھا۔ وہ موٹی لڑکیوں کی طرح تھل تھل نہیں کر رہی تھی بلکہ خوش جسامت کی مالک تھی۔ اپنا کام مکمل کر کے ڈاکٹر نے اسے حکم دیا۔ ”بلڈ سپر لو۔“

”ایک منٹ۔“ میں نے نرس کو سرخ گھونپنے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ”یہ سپر کس لیے لیا جا رہا ہے۔“

”بلڈ کا جزل چیک آپ ہوگا کہ کوئی کمی تو نہیں ہے اور کسی بیماری کے جڑوے تو نہیں ہیں۔“

اس بار میں نے اعتراض نہیں کیا اور نرس نے کوئی ایک چھٹانک خون میری رگوں سے کشید کر لیا اور پھر سرخ کوہمت احتیاط سے کیپ لگا کر ایک پلاسٹک شاپر میں پیک کیا۔ ڈاکٹر نے مارکر سے اس پر کچھ لکھا اور اسے ایک طرف موجود چھوٹے سے فریج میں رکھ دیا۔ اس کا کام ہو گیا تھا اس لیے اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ مجھے واپس کمرے میں پہنچا دیا گیا اور میں وقت گزاری کے لیے الیکٹرک سازز کرنے لگا۔ وقفے وقفے سے کی جانے والی وزرش نے جب مجھے تھکا دیا اور کسی قدر پسینہ بھی بہہ نکلا تو میں نے واش روم کا رخ کیا اور شاور لیا۔ میرے کپڑے آگئے تھے لیکن یہ صرف کپڑے تھے۔ ان کے علاوہ بیگوں کا سارا سامان غائب تھا تھپتھپ کے کپڑے بھی نہیں تھے اور میرے بیک کے ساتھ صرف میرے کپڑے تھے۔ اسلے اور دوسری چیزوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال کپڑے مل گئے تھے یہی بڑی بات تھی۔ اب تک گاڑ کے علاوہ کسی کی صورت دکھائی نہیں دی تھی لیکن کچھ دیر بعد کھانے کے وقت بنی کی خاص خادمہ بانو کھانے کی فری لے کر آئی تھی۔ گورا اس دوران میں اندر نہیں آیا تھا لیکن وہ مستعدی سے باہر موجود رہا تھا۔ بانو نے حسب معمول حیدر آبادی فراک اور چست پاجامہ پہن کر کھانا جو اس کی تناسب جسامت پر رچ رہا تھا۔ اس نے میز پر کھانا لگاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”بے بی کہہ رہی ہیں آپ فکر نہ کریں آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

اس سے بڑا نقصان نہ ہو سکتا تھا کہ میرا خون ایک خبیث انسان کو صحت دینے میں کام آتا اور وہ صحت پا کر نہ جانے کتنے انسانوں کی بربادی کا باعث بن جاتا۔ یہاں زبردستی میرا خون لیا جاتا۔ یہ بھی کم نقصان نہیں تھا۔ میں نے بھی آہستہ سے کہا۔ ”میں ہنسی سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”میں پیغام دے دوں گی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کھانا دینے میں ہی آؤں گی۔ آپ کو اور کوئی کام ہے تو مجھے بتادیں۔“

مجھے چائے یا کافی کا خیال آیا مگر وہ ملتی نہیں۔ پھر مجھے اپنے کپڑوں کا خیال آیا۔ ”کپڑے دھلوانے ہیں۔“

”دے دیں میں چند گھنٹوں میں دھو کر لادیتی ہوں۔“ وہ بولی۔ میں نے اسے اپنے اتارے کپڑے دے دیئے۔ لُچ میں بھی سادہ اور قوت بخش غذائیں تھیں۔ جیسے دیسی چوزے کی بخنی، ولے، مٹن اور مشروم سمیت بعض سبزیوں کی مدد سے ایک ڈش تیار کی گئی تھی۔ یہ گاڑھے سوپ کی طرح تھی۔ پھر ایک کھیر نما میٹھی ڈش تھی جس میں کھجور کے ککڑے ڈالے گئے تھے۔ تمام چیزیں غیر روایتی لیکن حرے کی تھیں اور قوت بخش تو لازمی تھیں۔ انہیں دینے کا مقصد یہی تھا کہ میری صحت میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو وہ بحال ہو جائے اور میرا جسم بہترین حالت میں آجائے۔ اس طرح ہر ہفتے ہونے والی خون کی کمی کو آسانی سے پورا کیا جاسکے گا لیکن خون لینے کا سلسلہ ایک حد سے اوپر جاتا تو لازمی مجھ پر اثر ہوتا۔ کنوروں نے میرے ساتھ جو کیا تھا اس کے بعد میں تقریباً مرتے بچا تھا۔ آخری بار جب قبا کیوں نے محل پر حملہ کیا تھا تو میرا دو گنا خون یعنی دو لیٹرز سے زیادہ خون نکال لیا گیا تھا۔ وہ تو قبا کیوں نے میری دیکھ بھال کی اور کچھ بھی میں سخت جان تھا اس لیے بچ گیا تھا لیکن ضروری نہیں تھا ہر بار میری بچت ہو جاتی۔ میں نے دل میں دعا کی کہ کاش میری خون کی وہ تاثیر ختم ہوگئی ہو جس کی وجہ سے وہ بڑے کنور کے علاج کے لیے تریاق بن گیا تھا۔ وہ شخص بلکہ یہ پورا خاندان اس قابل تھا کہ گھل گھل کر مر جائے۔ مگر ابھی اللہ نے ان کی رسی دراز رکھی ہوئی تھی۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے تمام چیزوں سے پوری طرح انصاف کیا تھا۔ کھانے کے دوران مجھے بیڑہ کا خیال آیا۔ وہ بھی قید میں تھا اور اس کی سوائے اس کے کوئی اہمیت نہیں تھی کہ میاں ممتاز نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ اسے ٹھیک طرح سے رکھنا اور اس کا خیال رکھنا ان لوگوں کے لیے ضروری نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے اسپتال لے جایا گیا یا کسی وجہ سے اس کمرے سے نکالنے کی بات کی تو میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک میری بیڑہ سے بات نہیں کرادی جائے گی۔ کھانا بانو لے کر آئی تھی لیکن برتن ایک ملازم لڑکا لے گیا۔ وہ صاف ستمرا اور سپاسنور اہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں تمام ملازم شخصیت کے لحاظ سے اچھے اور تربیت یافتہ تھے ان کے انداز میں رکھ رکھاؤ تھا۔ شاید ان کو باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی اور خاص ملازموں کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا ہوگا۔ جیسے ہانا اپنے انداز اور رکھ رکھاؤ سے کہیں سے خادمہ نہیں لگتی تھی۔ رات کے کھانے کے ساتھ بانو میرے دھلے ہوئے کپڑے اور ان کے ساتھ ایک بڑا شاپر لائی تھی۔ اس نے شاپر کرسی پر رکھا۔

”بے بی نے یہ آپ کے لیے بھیجا ہے۔“

میں نے شاپر میں جھانکا۔ اس میں دو پیٹ اور شرٹ سوئس تھے۔ ایک سلپنگ سوٹ اور سوئی پاجامہ تھا یہ شاید ایک سرساز کے لیے تھا۔ میں نے اپنے پیغام کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ”میں نے بے بی سے کہہ دیا تھا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

”ٹھیک ہے تم اس سے بھر کھانا دو میرے ساتھی بیٹو کے بارے میں پتا ہے اگر نہیں تو مجھے اس کے بارے میں معلوم کر کے بتاؤ یا میری اس سے بات کراؤ۔“

بانو نے سر ہلایا اور کھانا لگا کر رخصت ہو گئی تھی۔ گورا مجھے اور ہالوکو بات کرتے دیکھتا تھا لیکن اس نے اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی کوئی پابندی لگائی تھی۔ کھانے کے بعد میں کچھ دیر کمرے میں چھل قدمی کرتا رہا اور جب تھک گیا تو لیٹ کر سو گیا۔ اگلی صبح مجھے ناشتے سے پہلے بیدار کیا گیا۔ یہاں دروازے میں کنڈی تھی اور میں کنڈی لگا کر سویا تھا۔ کوئی دروازے پر مستقل دستک دے رہا تھا۔ میں نے کنڈی کھولی تو باہر گورا موجود تھا۔ ”چلنا ہے۔“ اس نے بلا تمہید کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جب تک میرے ساتھی بیٹو سے میری بات نہیں کرائی جائے گی میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“

گورے نے چونکنا ہو کر شات گن ہارن میری طرف کر دیا اور غرایا۔ ”تم انکار نہیں کر سکتے ہو۔“
 ”کر سکتا ہوں تم مجھے گولی مار سکتے ہو لیکن یہاں سے چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے ہو۔“ میں دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ چند لمحوں میں مجھے گھورتا رہا پھر اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ غالباً وہ اس بارے میں ہدایات لے رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور گورے نے ایک موبائل میری طرف بڑھایا اور ساتھ ہی وارننگ دی۔
 ”اپنے ساتھی سے بات کر لو مگر کوئی غلط حرکت مت کرنا۔“

دوسری طرف بیٹو موجود تھا اس نے میری آواز سنتے ہی بے تابی سے کہا۔ ”شو بی یہ کیا ہے یہ ہم کو آپ کے پاس کیوں نہیں لاتا۔“

”بس میری جان مجبوری ہے۔ تمہیں کنور یاد ہیں۔“
 ”ہم ان کو کیسے بھول سکتا ہے۔“ اس نے نفرت سے کہا۔ ”وہ ہمارا گھرا اور لوگوں کا قاتل ہے۔“
 ”یہ منحوس یہاں بھی آ گیا۔“ میں نے کہا اور بیٹو کو کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ راج کنور کیوں آیا اور کیا چاہتا ہے۔ بیٹو دم بخود رہ گیا تھا۔

”تو ہم کو اس لیے الگ کیا ہے۔“
 ”یہ تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں کر رہے ہیں؟“
 ”نہیں شو بی دیسے ٹھیک ہے۔ اچھا کرہ ہے اور کھانا بھی ٹھیک ہے پر ہم کو آپ کا فکر ہے۔ یہ آپ کے ساتھ پھرو ہی کر رہا ہے۔“

”اللہ مالک ہے یار، پہلے بھی ایسی صورت حال میں وہ مدد کرتا رہا ہے آگے بھی وہی کرے گا۔ تم فکر مت کرو۔“ میں نے تسلی دی اور موبائل گورے کو واپس کر دیا کیونکہ وہ اب کچھ بے چین ہو رہا تھا۔ بیٹو کی خیریت معلوم کر کے مجھے تسلی ہو گئی تھی۔ اس لیے میں ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ وہ مجھے اسی کلیٹک میں لے گئے جہاں

ڈاکٹر اور گول مٹول سی نرس موجود تھے۔ اتنی صبح بلانے کا مقصد ناشتے سے پہلے کچھ سہل لینا تھا۔ یہ یورین، تھوک اور بلڈ سہل تھے۔ اس بار خون کم لیا گیا تھا۔ پھر ڈاکٹر نے مجھے ایک انجکشن لگانا چاہا تو میں پوچھا۔ ”یہ کس لیے ہے؟“

”یہ ایکسی لیٹر ہے جسمانی پر فارمنس بہتر بناتا ہے۔“

”یعنی اسٹراڈز جیسی کوئی چیز ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”لیکن اسی جیسی چیز ہے۔“

میں اسٹراڈز کے نقصانات سے واقف ہوں کیونکہ میرا تعلق کوہ پیادس سے بھی رہا ہے۔ وہ پہاڑوں میں اپنی جسمانی کارکردگی بڑھانے کے لیے اپنے پاس ایسی دوائیں اور انجکشن رکھتے تھے جن میں اسٹراڈز ہوتے تھے۔ دوسرے کھیلوں میں ان کا استعمال عرصے سے جاری ہے اور اسپورٹس مین اور وٹمن کی ایک بڑی تعداد کارکردگی بڑھانے کے لیے ان کا بے دریغ استعمال کرتی ہے۔ کئی دہائیوں پہلے جب ان پر پابندی نہیں تھی تو کھلاڑی بیچ جیتنے اور میڈل حاصل کرنے کے لیے انہیں استعمال کرتے تھے۔ اب ان پر پابندی لگ گئی ہے اس کے باوجود ہر سال بے شمار کھلاڑی انہیں استعمال کرتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں۔ انہیں جیت کا ایسا جنون ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے اپنی جان پر کھیلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

اسٹراڈز کی وضاحت کر دوں۔ یہ ایسی ادویات ہوتی ہیں جو انسانی جسم میں موجود توانائی کے چھپے ذرائع کو کام میں لے آتی ہیں۔ یہ ہماری ریزرو توانائی ہوتی ہے۔ جب ہم بیمار پڑتے ہیں، کسی حادثے کا شکار ہوتے ہیں یا ہمارے اعصاب کو کوئی بڑا صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے تو یہ توانائی ہمیں اس حادثے یا صدمے یا بیماری سے لڑنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ توانائی طویل عرصے میں بنتی ہے اور اگر اسے خرچ کر دیا جائے تو انسان میں غیر متوقع حالات کا سامنا کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے اور یہ ظاہر ٹھیک ٹھاک انسان کسی معمولی بیماری یا وجہ سے دنیا سے گزر جاتا ہے۔ کئی شاندار صحت رکھنے والے کھلاڑی اسی وجہ سے اچانک نوجوانی میں دنیا سے رخصت ہوئے تو اسٹراڈز کے نقصانات سامنے آئے اور ان پر پابندی لگی۔

مگر اب بھی لوگ انہیں استعمال کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ اب اسٹراڈز کا استعمال عام لوگوں نے بھی شروع کر دیا ہے اور وہ ایسا بے خبری میں کر رہے ہیں۔ اس میں زیادہ ہاتھ ان نام نہاد ڈاکٹروں اور عطائیوں کا ہے جو معمولی بیماریوں میں لوگوں کو اسٹراڈز دے دیتے ہیں۔ فلو کا شکار کوئی شخص کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور وہ اسے اسٹراڈز کا انجکشن دیدیتا ہے۔ چند منٹ کے بعد آدمی کو لگتا ہے جیسے اسے کبھی فلو تھا ہی نہیں اور وہ خود کو کسی گھوڑے کی طرح فٹ اور طاقتور محسوس کرنے لگتا ہے۔ جنسی معاملات میں بھی ان کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے اور لوگوں کو پتا ہی نہیں چلتا کہ اس طرح وہ خود اپنی قبر تیار کر رہے ہیں ایک دن اچانک ہی بغیر کسی خاص وجہ کے وہ مر جاتے ہیں اور لوگ کہتے رہ جاتے ہیں کہ کیا دور آ گیا ہے اب انسان بیٹھے بٹھائے مر جاتا ہے۔ ان کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ ایسا بے وجہ نہیں ہے۔ کوئی ان ڈاکٹروں کو نہیں پوچھتا ہے لیکن لوگوں کو تو اپنا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کسی ڈاکٹر سے جو دو لے رہے ہیں وہ اصل میں ہے کیا؟ بد قسمتی سے اسٹراڈز بہت سستے مل جاتے ہیں۔ ان کی گولیاں اور انجکشن ہول سیل میں چند روپے میں دستیاب ہیں۔

”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے انکار کیا۔

”یہ ضروری ہے۔“ اس نے اصرار کیا۔

”ڈاکٹر مجھے بے وقوف مت بناؤ۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”مجھے اچھی طرح معلوم ہے اس قسم کی

دوائیں کیسے کام کرتی ہیں۔“

بادل ناخواستہ اس نے آنکھشن واپس رکھ دیا اور بولا۔ ”اس صورت میں تمہیں طاقتور غذائیں لینا پڑیں گی

اور اس کے ساتھ باقاعدگی سے سہلی منٹس بھی لینا ہوں گے۔“

”یہ ٹھیک ہیں۔“

اس نے مجھے گولیاں اٹھکھپول دیئے اور بتایا کہ کس طرح کھانے ہیں۔ ساتھ ہی مشورہ دیا۔ ”پانی زیادہ

سے زیادہ پیو۔ اس سے گردوں کا فنکشن بہتر ہوگا۔“

میں نے اس کی ہدایات ذہن نشین کر لیں۔ واپسی پر میں نے گورے سے کہا۔ ”مجھے جم درکار ہے اگر

یہاں جم نہیں ہے تو مجھے کھلی جگہ چاہیے جہاں میں ایکسرسائز کر سکوں۔“

”اس کا بندوبست ہو جائے گا۔“ وہ بولا۔ ”جم ہے لیکن وہ صرف میاں صاحب کی فیملی کے لیے ہے۔“

میں نے ایک بار پھر دل میں میاں صاحب اور ان کی فیملی کی ایسی کم تہی کی اور اس سے مطالبہ کیا۔

”میری بھئی سے بات کر دو دوسری صورت میں، میں کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گا۔“

بھئی کا نام اس طرح لینے پر اس نے مجھے گھورا لیکن کچھ کہا نہیں اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ مگر میری

وارننگ کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ناشتے کے ساتھ بانو آگئی۔ اس نے ناشتہ لگانے کے دوران

حسب معمول دھیمی آواز میں کہا۔ ”بے بی آپ سے نہیں مل سکتی ہیں میاں صاحب کی طرف سے پابندی ہے۔“

”یہ مجھ سے تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ دوسری صورت میں، میں بھوک ہڑتال کروں گا۔“

بانو نے اپنی فراک کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا دوا کی ٹاکی نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

”یہ بے بی نے آپ کے لیے بھیجا ہے اس سے آپ کسی وقت بھی ان سے رابطہ کر سکتے ہیں۔“

یہ دو طرفہ دوا کی ٹاکی سیٹ تھا جس کی فریکوئنسی طے شدہ ہوتی ہے اور اس سے کہیں اور رابطہ نہیں کیا جاسکتا

ہے۔ دوا کی ٹاکی ہلکا سا گرم ہو رہا تھا اور ہلکا سا نم بھی تھا۔ یہ گرمی اور نمی بانو کی تھی میں اسے لیتے ہوئے جھینپ گم

لیکن وہ بالکل نارمل رہی تھی۔ میں نے پہلے ناشتہ کیا اور پھر دوا کی ٹاکی آن کر کے بھئی کو پکارا۔ اس کی طرف سے

جواب نہیں ملا۔ شاید وہ کہیں مصروف تھی مگر میں مستقل مزاجی سے ہر دو تین منٹ بعد اسے پکارتا رہا تھا۔ بالآخر

اس نے جواب دیا۔ ”سوری میں ہاتھ لے رہی تھی۔“

”بھئی تم جانتی ہو میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔“

”میں جانتی ہوں اور تم فکر مت کرو میں تمہیں کوئی نقصان نہیں ہونے دوں گی۔“

اگرچہ وہ بہت خلوص سے کہہ رہی تھی لیکن میں اس کی ضمانت پر بھروسہ کرنے والا نہیں تھا وہ تو میں ابھی

مجبور تھا۔ اس لیے میں نے اس کی بات تسلیم کر لی۔ ”میں جانتا ہوں میرے لیے تم نے اپنے پاپا سے رعایت ا

ہے اور مجھے راج کنور کے حوالے کیے جانے سے بچایا ہے۔“

”شکر ہے تم سمجھ گئے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”پاپا نے مجھے ضمانت دی ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا۔“

”تمہیں معلوم ہے یہ ہر ہفتے میرا خون چاہتے ہیں اور کوئی انسان ہر ہفتے خون نہیں دے سکتا چاہے وہ جسمانی طور پر کتنا ہی فٹ کیوں نہ ہو۔“

”اسی لیے میں نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق تمہاری ڈائنٹ ترتیب دی ہے۔“
 ”اسے بھاڑ میں جھونکو۔ میں اپنا پروگرام خود بنارہا ہوں اور مجھے میری مرضی کے مطابق کچھ سہولیات درکار ہوں گی؟“
 ”مثلاً؟“

”ایک تو مجھے جم چاہیے۔ دوسرے خوراک میری مرضی کے مطابق اور میرے بتائے وقت پر دی جائے۔ قصہ مختصر میں اپنا ٹائم ٹیبل خود بنائوں گا۔“

”جم یہاں موجود ہے۔ نیچے ڈسمنٹ میں ہے۔ تم جیسے کہو گے تمہیں ویسی سہولت مہیا کی جائے گی۔“
 ”یہ بات گارڈز کو بھی سمجھا دو۔“

”تمہاری خوراک کا معاملہ بانو کے ہاتھ میں ہے تم اس سے جو کہو گے وہ کرے گی۔“
 ”تم پر پابندی کیوں ہے؟“

اس نے گہری سانس لی۔ ”پتا نہیں، پاپا اس شرط پر میری بات مانے کہ میں تم سے نہیں ملوں گی۔“
 ”تم نے جووا کی ٹاکی بھیجا ہے اس کی بیٹری کتنی دیر چلتی ہے؟“
 ”خاصی دیر چلتی ہے جیسے ہی بیٹری کمزور ہوگی اس کے اوپر ایک سرخ لائٹ ہر پانچ سیکنڈ بعد جلتی گی۔ بانو کو بتا دینا وہ دوسری بیٹری لا دے گی۔“

”مجھے بیٹو کی بھی خبریت معلوم ہونی چاہیے۔“
 ”روز تو نہیں لیکن میں حیات سے کہہ دوں گی وہ تمہاری اس سے بات کرادیا کرے گا۔“
 ”حیات کون؟“

”جو گور اگاڑ ہے۔ وہ بہت ماہر آدمی ہے اور پاپا کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔“
 ”تبھی انہوں نے میرے سر پر مسلط کیا ہے۔“ میں نے کہا اور واکی ٹاکی بند کر دیا۔ دس منٹ بعد بانو اندر آئی وہ ایک نوٹ پیڈ لے کر آئی تھی۔ میں نے اسے لکھوایا کہ مجھے کس کس وقت کیا چاہیے ہوگا۔ لکھوا کر میں نے اس سے پوچھا۔ ”اس میں آگے پیچھے بھی ہو سکتا ہے تو میں تمہیں کیسے بتاؤں گا۔“
 ”اب بے بی کا واکی ٹاکی میرے پاس ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”آپ اس پر مجھ سے کسی وقت بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔“

میں نے اپنی ڈائنٹ تین کے بجائے چار بار کر لی تھی اور اس میں مختلف مائع جات کا اضافہ کر لیا تھا۔ صبح سات بجے سے رات دس بجے تک ہر پانچ گھنٹے کے بعد مجھے کھانا فراہم کیا جاتا۔ صبح میں کمرے میں ہلکی پھلکی ورزش کرتا اور ناشتے کے دو گھنٹے بعد میں دو گھنٹے کے لیے جم جاتا۔ اسے طرح شام سات بجے میں دوبارہ دو گھنٹے

کے لیے جم جاتا۔ یہ پروگرام اسی دن سے شروع ہو گیا تھا اور نو بجے حیات نے دروازہ کھولا اور مجھ سے کہا۔
”آپ نے جم جاتا ہے۔“

حیات اور اس کا ساتھی مجھے ممتاز ہاؤس کے تہہ خانے میں واقع جم تک لائے۔ اس میں آنے جانے کے دورا تے تھے۔ مجھے ایک ایسے راستے سے لایا گیا تھا جو اصل میں سروس ڈور تھا اور ہم کی صفائی اور دوسرے کاموں کے لیے مخصوص ملازمین یہیں سے آتے جاتے تھے۔ مالکان جس دروازے سے آتے جاتے تھے وہ اندر کے حصے میں واقع تھا۔ ظاہر ہے اسے بند کر دیا گیا ہوگا۔ اس پر بھی حیات اور اس کا ساتھی احتیاطاً جم میں براجمان ہو گئے تھے۔ گویا وہ مجھے سوائے میرے کمرے کے کسی جگہ بھی اکیلے چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ جب میں کلینک میں ہوتا تب بھی حیات خود میرے سر پر مسلط رہتا تھا۔ یہ چھوٹا سا جم تھا جہاں ایک سرساز کی تمام سہولتیں مہیا تھیں حتیٰ کہ ایک طرف ایک چھوٹا سا سونٹنگ پول بھی بنا ہوا تھا۔ مجھے جو ایک سرساز کرنا تھیں ان کا سامان یہاں موجود تھا۔ میں تمام باتیں ذہن سے جھٹک کر ایک سرساز میں لگ گیا۔

شاید میرا رویہ عجیب لگے۔ میں ایک دوست نمادشن کی قید میں تھا اور اس نے اس قید کو مضبوط کرنے کے لیے بیڑ کو پرغمال بنالیا تھا کہ میں فرار کا سوچوں بھی نہیں۔ میرے ساتھیوں کو پتا نہیں تھا کہ میں کہاں تھا اور میری جان کے دشمن میرا خون نچوڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایسے میں بے فکری سے ڈائن پلان بنانا اور ایک سرساز کرنا عجیب ہی لگے گا۔ مگر اس کی کچھ وجوہات تھیں۔ میں اس جدوجہد کے آغاز سے دیکھتا آیا کہ جب کوئی مشکل پیش آتی اور میں مبرد حوصلے کے ساتھ اس کا سامنا کرتا تو جلد یا بدیر مجھے موقع ملتا تھا اور میں آزاد ہو جاتا یا دشمن پر حاوی ہو جاتا۔ یہ چیز اب میری عادت بن چکی تھی کہ کسی بھی موقع پر پریشان نہیں ہوتا۔ دوسرے اگر میں یہ سب نہ بھی کرتا تب بھی یہ میرے جسم سے لازمی خون حاصل کرتے اور اس کا نقصان مجھے ہوتا۔ اس لیے مجھے اپنا خیال رکھنا تھا کہ ان ڈریکولاؤں سے مجھے کم سے کم نقصان ہو اور جب قدرت مجھے موقع دے تو میرا جسم اتنا توانا ضرور ہو کہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خود کو آزاد کر اسوں۔ یہی سوچ کر میں یہ سب کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا ہمیشہ کی طرح مجھے موقع ضرور ملے گا اور نہ بھی ملا تب بھی میں زندہ اور صحت مند تو رہوں گا۔ دشمن کی قید میں رہتے ہوئے مجھے موقع مل رہا تھا تو میں کیوں نہ فائدہ اٹھاتا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی ایک سرساز کے بعد میں نے آدھا گھنٹہ سونٹنگ کی اور جب میں کمرے میں واپس آیا تو مجھے خوفناک قسم کی بھوک لگ رہی تھی میں نے بانو کو کال کر کے کھانا لانے کو کہا اور خود نہانے چلا گیا۔ میرے پاس محدود کپڑے تھے اس لیے جب بانو آئی تو میں نے اس سے چند اسپورٹس شارٹس اور ایک گاؤن کا کہا۔ ”میں ابھی لاتی ہوں۔“ اس نے کہا اور پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ ”میرا خیال ہے آپ کو ایک الماری اور کپڑے پینگ کرنے کی جگہ کی ضرورت ہے۔“

میں آرام کر رہا تھا تو بانو کچھ ملازمین کے ساتھ آئی انہوں نے ایک درمیانے سائز کی دوپٹ والی الماری اٹھا رکھی تھی۔ وہ انہوں نے کمرے میں ایک طرف رکھ دی۔ پھر انہوں نے واش روم میں کپڑے ٹانگنے والی ایک خوب صورت کھوئی لگائی۔ جب ملازمین چلے گئے تو اس نے میرے کپڑے بیک سے نکال کر سلیپے سے الماری میں لگائے۔ وہ مزید سوتی پا جاوے، اسپورٹس شارٹس، بنیائیں، گاؤن اور چار عدد نئے تولیے لائی تھی۔ وہ میرا ہر

ممکن خیال رکھ رہی تھی۔ صرف وہی نہیں کر رہی تھی جو میں اسے کہتا تھا۔ اپنے طور پر اسے جو بہتر لگتا وہ بھی کر رہی تھی۔ اپنا کام کر کے اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ مطمئن ہیں ناسر، کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔“

”میں بور ہوتا ہوں.....“ میں نے کہا۔

”میں ہوں ناسر۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”آپ کہیں گے تو میں آپ کو کپہنی بھی دے سکتی ہوں۔“

اگرچہ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات نہیں تھی اس نے بہت سادہ اور عام سے انداز میں پیشکش کی تھی لیکن میں نے جلدی سے کہا۔ ”میری بوریت، کسی پڑھنے والی چیز، جیسے اخبار رسالے اور ٹی وی سے بھی دور ہو سکتی ہے۔“

”اس بارے میں مجھے بے بی سے پوچھنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے معلوم کر لو۔“ میں نے دوبارہ بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ میں نے جو ڈائنٹ پلان بنایا تھا اس میں صبح کا ناشتہ بھاری اور بارہ بجے کسی قدر ہلکا کھانا ہوتا۔ شام پانچ بجے پھر بھاری کھانا اور رات سونے سے پہلے ہلکا کھانا تھا۔ دوپہر اور رات کے وقت میں آرام کرتا۔ صحت کے لیے جتنا ضروری کھانا پینا اور ورزش ہے اتنا ہی ضروری آرام اور نیند ہے۔ مجھے دوپہر میں سونے کی عادت نہیں تھی اس لیے آرام کر سکتا تھا۔ شام کے کھانے کے دو گھنٹے بعد میں نے حیات اینڈ کپہنی کے ساتھ دوبارہ جم کا رخ کیا۔ میں ورزش کر رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر وہاں میاں ممتاز آ گیا۔ اس کے آدمی الرٹ ہو گئے تھے لیکن میں توجہ دیئے بغیر مشین پر رننگ کرتا رہا۔ اس نے دلچسپی سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”لگتا ہے تم نے خود کو پوری طرح تیار کرنا شروع کر دیا ہے۔“

”ظاہر ہے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میں یہ نہیں بھی کروں گا تب بھی میرے جسم سے خون نکالا جائے گا۔“

”اس سے تمہاری ری کوری تیز ہو جائے گی۔“ میاں ممتاز نے سر ہلایا۔ ”کیا مرشد سے تمہاری کوئی سیشن منٹ ہو رہی ہے؟“

اس کا سوال غیر متوقع تھا لیکن میں گڑبڑایا۔ ”کیسی سیشن منٹ؟“

”یہی کہ وہ تمہارے خلاف موجود مقدمات جو اصل میں اسی کے اشارے پر شروع ہوئے تھے۔ اب ختم کر رہا ہے؟“

”اگر وہ ایسا کر رہا ہے تو اس کا علم میرے وکیل کو ہوگا۔ میں نے قانونی معاملات اسی پر چھوڑ رکھے ہیں۔“

میاں ممتاز کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا۔ ”تم بتانا نہیں چاہتے ہو تو تمہاری مرضی لیکن اگر تم واقعی ایسا کچھ کر رہے ہو تو میں اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا بلکہ تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

میں رننگ مشین سے اتر آیا اور ایک تولیے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”میاں صاحب آپ میری قسبی مدد کر رہے ہیں میرے لیے وہی کافی ہے۔“

وہ ایک لمحے کو کھسکیا پھر بولا۔ ”مرضی تمہاری۔“ وہ واپس جانے کے لیے مڑا پھر رکا اور بولا۔ ”پرسوں وں لیا جائے گا۔“

میاں ممتاز کہہ کر چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد حیات نے غرا کر کہا۔ ”میاں صاحب کے سامنے لہجہ اور زبان قابو میں رکھا کرو۔“

میں نے تمہرا نہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”میاں صاحب کو میری زبان اور لہجہ پر کوئی اعتراض نہیں ہے تب تم کو کیا اعتراض ہے؟“
”وہ مالک ہیں۔“

”تمہارے ہوں گے میرے نہیں ہیں۔“ میں نے کہتے ہوئے سوئمنگ پول کا رخ کیا۔ حیات کا چہرہ بگڑ گیا تھا لیکن مجھے ایسے لوگوں کی کوئی پروا نہیں ہوتی جو ایک انسان کی غلامی میں حد سے آگے چلے جاتے ہیں۔ میں واپس کمرے میں آیا تو غیر متوقع طور پر وہاں دیاوار پر ایک خاصا بڑا سائیل سی ٹی وی لگا ہوا تھا۔ اس میں ڈی وی ڈی پلیئر پلٹن تھا اور ڈی وی ڈی بھی دیکھی جاسکتی تھی۔ بیڈ کی سائیڈ دراز پر آج کے اخبارات اور کچھ رسائل رکھے تھے۔ گویا میرے مطالبے کو مان لیا گیا تھا۔ بانو بھی وہاں تھی اس نے مجھے بتایا کہ ٹی وی ایک ہزار چینیل والے سیٹلائٹ سسٹم سے منسلک تھا۔ اس کی مدد سے میں دنیا کا کوئی بھی چینیل دیکھ سکتا تھا۔ وہ ڈی وی ڈی کا ایک ہنڈل بھی لائی تھی۔ یہ سب موزیک تھیں۔

”یہ آج کے اخبارات ہیں دو انگریزی کے ہیں اور تین اردو کے اور یہ کچھ رسائل ہیں۔“
رسائل میں اکثر فیشن میگ تھے ظاہر ہے یہاں اگر سنجیدہ نوعیت کے رسائل آتے تھے تو بنی کے پاس نہیں تھے اور اس کے پاس یہی ہو سکتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”یہ کافی ہیں لیکن رسائل میرے کام کے نہیں ہیں انہیں لے جاؤ۔“

رات کا کھانا کھا کر میں نے کچھ دیر ٹی وی دیکھا اور اخبارات سرسری نظر ڈالی۔ اس بھاگ دوڑ کی زندگی میں ہم حالات حاضرہ سے اتنے بے خبر ہو گئے تھے کہ ہمیں پتا نہیں چلا کہ کب الیکشن بھی ہو گئے۔ ہم خود سے غافل ہو گئے تھے۔ زندگی میں روٹین نام کی کوئی چیز نہیں تھی جب موقع ملا کھالیا، جب موقع سو لیے۔ ورزش بھول چکے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے دو بار کی ایکسرسائز سے ہوا جب معمولی ورزشوں سے میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ میرا اسٹیمنا بہت کم ہو گیا تھا۔ رنگ مٹھین پر دس منٹ بعد میرا سانس پھولنے لگتا تھا۔ اس لیے بھی میں اسے قدرت کی طرف سے موقع سمجھا تھا اور اپنے جسم کو آنے والے حالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔ رات میں گیارہ سے صبح چھ بجے تک سات گھنٹے کی نیند میرے لیے کافی تھی۔ سونے سے پہلے میں نے حیات سے کہا کہ وہ مجھے صبح بچے اٹھا دے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں بانو سے کوئی کلاک کیوں نہ منگوا لوں۔ میں نے اسے کال کی تو وہ جاگ رہی تھی۔ میں نے اس سے الارم کلاک کا کہا تو اس نے کہا۔ ”میں ابھی لاتی ہوں سر۔“

”نہیں اتنی جلدی کی ضرورت بھی نہیں ہے ابھی میں نے حیات سے کہہ دیا ہے وہ مجھے صبح اٹھا دے گا۔ تم کل لا دینا، ابھی آرام کرو۔“

”میں یہاں آرام کرنے کے لیے نہیں ہوں، اپنی ذمے داریاں نبھانے کے لیے ہوں۔“ اس نے کہا۔
”میں کلاک لا رہی ہوں۔“

چند منٹ بعد اندر آئی۔ اس نے ایک چھوٹا سا ڈیجیٹل کلاک اٹھا رکھا تھا۔ پہلی بار میں نے اسے دوسرے

لباس میں دیکھا۔ اس نے سادہ سالان کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ شرٹ سیلوئس تھی اور کسی قدر کشادہ گلے سے اس کی سنہری جلد جھلک رہی تھی۔ شاید یہ اس کا آرام کا لباس تھا۔ اس نے مجھے کلاک کا استعمال سمجھایا۔ اس دوران میں وہ اتنی قریب آگئی کہ اس کے وجود سے ہشتی بھینسی سے مہک مجھے پریشان کرنے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں سمجھ لوں گا۔ اب تم جاسکتی ہو۔“

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ شاید یہاں کوئی ایسا نہیں ملتا ہوگا جو اس کے قریب آنے سے یوں گھبرائے۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں سوائے گڈ ٹائٹ کے اور کمرے سے نکل گئی۔ میں نے الارم سیٹ کیا اور سو گیا۔ آنے والے دو دن تک یہ معمول برقرار رہا تھا۔ میاں ممتاز نے بتایا کہ دو دن بعد خون لیا جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اس کے بجائے اگلے دن صبح سویرے میرا خون لیا گیا۔ خون نکالنے کا سارا پرویس ڈاکٹر نے خود کیا تھا۔ صرف کیونولا گول منول نرس نے لگایا تھا۔ ڈاکٹر نے بہت احتیاط سے نصف لیٹر کی تھیلی بھری اور اس نے مجھے واضح دکھایا کہ تھیلی میں نصف لیٹر خون ہی گیا ہے۔ اس نے اپنا کام کرنے کے بعد مجھے طاقت کا ایک انجکشن دیا اور فوری طور پر جوں اور اس کے ساتھ منرل سالٹ دیا۔ ”ہمارے پاس پلازما ہے لیکن ابھی آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اس کی ضرورت کب پڑے گی؟“

”شاید چوتھی بار خون لینے کے بعد۔“

”ڈاکٹر ایک شخص کتنا خون اور کتنے عرصے بعد دے کر صحت مندرہ سکتا ہے؟“

”ایک لیٹر خون دو مہینے بعد۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور میرے جسم سے مہینے میں دو لیٹرز سے زیادہ خون نکالا جائے گا۔“ میں نے فکر مندی سے کہا۔ ”کیا یہ خطرناک نہیں ہے؟“

”آپ کی جان کو خطرہ نہیں ہے لیکن آپ کمزور ہو جائیں گے۔ البتہ ہم دواؤں اور خوراک سے اس کمزوری کو کم سے کم رکھنے کی کوشش کریں گے۔“ ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خطرے کو کم سے کم کر کے دکھا رہا ہو۔

اس پہلی بار خون نکالے جانے کے بعد مجھے محسوس نہیں ہوا تھا اگر کمزوری ہوئی بھی تھی تو وہ طاقت کے انجکشن اور جوس سے پوری ہو گئی تھی۔ البتہ ڈاکٹر نے احتیاطاً مجھے صبح کے سیشن میں ایکسر سائز سے منع کر دیا تھا۔ اس سے توانائی استعمال ہوتی جب کہ مجھے آنے والے چوبیس گھنٹے میں توانائی کی ضرورت تھی۔ اس نے ڈھکے چھپے انداز میں بتایا کہ اگلی بار خون نکالے جانے کے بعد مجھے آرام کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ میں نے شام کو دو گھنٹے تک ایکسر سائز کی اور مجھے اپنی طاقت میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مگر یہ آغاز تھا۔ اس کے بعد ایک معمول بن گیا۔ چوبیس گھنٹے میں میرا ہر لمحہ کسی نہ کسی مصروفیت میں گزرتا تھا مجھے ٹی وی یا اخبارات دیکھنے کا موقع بھی کم ملتا تھا۔ رات کو بستر پر لیٹتے ہی نیند آ جاتی اور صبح الارم سے آکھ کھلتی تھی۔ دو دن بعد بیٹو سے میری بات ہوتی تھی۔ ہد ستور آرام سے تھا اور اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ بانو ہمہ وقت میرے لیے مخصوص تھی اور میں کسی بھی وقت اس سے کوئی کام کہہ سکتا تھا یا اسے طلب کر سکتا تھا۔ گویا بیٹی نے اپنی خادمہ مجھے ادھار دے دی تھی مگر خود وہ مجھ سے

ملنے نہیں آ سکتی تھی۔ اس کے باپ کی طرف سے پابندی تھی۔

خون دینے کے بعد چوتھے دن میں جم میں تھا۔ حسبِ معمول حیات میری مگرانی پر تھا اور اس کا ساتھی اوپر جم کے دروازے پر موجود تھا۔ اچانک ہی بانو وہاں آئی اور اس نے حیات سے کہا۔ ”تم کچھ دیر کے لیے باہر جاؤ۔“

”مجھے یہاں سے جانے کا حکم نہیں ہے۔“ حیات نے انکار کیا۔

”مجھے یہاں کچھ کام ہے۔“ بانو نے تھکسانہ انداز میں کہا۔ ”یہ بے بی کا حکم ہے۔“

حیات سوچ میں پڑ گیا۔ اگرچہ اسے میاں ممتاز نے میری مگرانی کا حکم دیا ہوا تھا لیکن بنی بھی اس کی مالک تھی اور وہ اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”کیا بی بی سے میری بات ہو سکتی ہے؟“

بانو نے اپنے واک ٹاکی سے بنی سے رابطہ کیا۔ ”بے بی، حیات آپ سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔“

اس نے واک ٹاکی حیات کی طرف بڑھا دیا اس نے لے کر بات سنی اور پھر واک ٹاکی واپس کر کے اپنی شاٹ گن سنبھالتا ہوا اوپر کی طرف چلا گیا۔ بانو اس کے ساتھ تھی وہ دروازہ اندر سے بند کر کے آئی۔ میں ویٹ مشین پر پیروں سے وزن اٹھانے والی ورزش کر رہا تھا۔ اب تک میں نے بانو سے پوچھا نہیں تھا کہ اسے کیا کام تھا جس کے لیے اس نے حیات کو باہر بھیج کر اندر سے دروازہ بھی بند کر لیا تھا مگر وہ میری طرف نہیں آئی اور جم میں آنے والے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گئی جہاں سے مالکان آتے جاتے تھے۔ اس نے اندر سے دروازہ کھولا اور خود باہر چلی گئی اس کی جگہ بنی اندر آئی تھی۔ میں نے گہری سانس لی تو یہ سارا چکر بنی مجھ سے ملاقات کے لیے چلا رہی تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ اس نے بھی ورزش کا لباس پہن رکھا تھا اور یہ خالص ویسٹرن اسٹائل کا تھا۔ یعنی چست نیکر اور مختصر بنیان، بہ ظاہر وہ ایکسٹریمز کرنے یہاں آئی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

”اگر تمہارے پاپا کو پتا چل گیا کہ تم ان کے حکم کی خلاف ورزی کر رہی ہو اور وہ بھی کس حلیے میں تو ان کا کیا ردِ عمل ہوگا۔“

”کچھ نہیں۔“ وہ ایکسٹریمز سائیکل پر آتے ہوئے بولی۔ ”ویسے وہ باہر ہیں ان کو پتا نہیں چلے گا۔“

”تقریباً تمام اولاد کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ ان کی حرکتوں کا ان کے والدین کو پتا نہیں چلے گا۔“

”وہ دوسری اولادیں ہوتی ہیں۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ ”ویسے تم اس کے لیے فکر مت کرو اگر انہیں پتا بھی چل گیا تو میں سنبھال لوں گی۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”میں نے دیکھا ہے تم میاں صاحب سے اپنی بات منوالیتی ہو کیا ٹینا میں بھی یہ کوٹانی ہے؟“

”نہیں اسے ان معاملات سے کوئی غرض نہیں ہے اور ویسے بھی پاپا نے اسے اسٹڈی کے لیے انگریز بھیج دیا ہے۔“

”اسٹڈی کے لیے یا اسے کر مین جیسے لفٹنگوں سے دور کرنے کے لیے۔ ظاہر ہے اس کے اور بھی ایسے دوست ہوں گے۔“

”شاید“ اس نے تسلیم کیا۔ ”تمہیں جم کیسا لگا؟“

”بہترین، یہاں ہر سہولت موجود ہے۔“

”میں نے خاص طور سے ڈیزائن کرایا ہے۔“ وہ فخر سے بولی۔ ”جب میں تم سے ملی تو مجھے اس کے بعد سے ایک سرسبز کا شوق ہوا۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”مجھ سے ملنے کے بعد کیوں؟“

”میں نے سوچا کہ انسان کی زندگی میں کسی وقت بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے جسمانی طور پر فٹ ہونا چاہیے۔ جیسے تم ۶۰۔ اسی لیے میں نے جم بنوایا اور میں نے سیلف ڈیفنس کی تربیت بھی حاصل کی ہے۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”اچھا، لگتا نہیں ہے۔ تم تو پہلے سے زیادہ نازک اندام ہو گئی ہو۔“

”میرا استاد جاپانی ہے۔“ وہ بولی۔ ”اس نے مجھے اس طرح سے سیلف ڈیفنس کی تربیت دی ہے کہ میرے جسم پر اثر نہیں پڑا ہے۔ اگر یقین نہیں آ رہا تو ایک دوستانہ مقابلہ کر کے دیکھ لو۔“ وہ سائیکل سے اتر آئی ذرا سی دیر میں اس کے چہرے پر پسینہ مونہوں کی طرح نمودار ہو گیا تھا۔ میں ویٹ مشین سے اٹھ گیا۔ اور تولیہ سے جسم صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے یقین ہے تم نے اچھی تربیت حاصل کی ہے۔“

”پلیز میں اسے آزمانا چاہ رہی ہوں۔“

مجھے بھی ہاتھ پاؤں کھولے خاصے دن ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا اور تولیہ اچھال کر اس کی طرف بڑھا۔

”کیا خیال ہے مقابلے کے ساتھ ساتھ کچھ گفتگو بھی کر لی جائے۔“

”کیسی گفتگو؟“ اس نے میرے پاس آتے ہی اسٹانس لیا اور ایک پیر اور ایک ہاتھ آگے نکال کر مخصوص کرائیڈز کے انداز میں کھڑی ہو گئی۔

”یہی کہ کنور فیملی تمہارے پاپا پر اس قدر حاوی کیسے ہے؟“

”ان سے پاپا کے پرانے تعلقات ہیں۔“

”میں ان تعلقات کی نوعیت سمجھنے سے قاصر ہوں کیونکہ کنور خاندان اعلیٰ ذات، ہندو ہے اور وہ چھوٹے مات کے قائل ہیں۔ راج کنور اتنا بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آیا اور اس نے یہاں سے ایک گلاس پانی پیتا بھی وار نہیں کیا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا۔ کنور خاندان مسلمانوں سے شدید نفرت کرتا ہے اور یہ بات میں نے ہاکی قید میں رہ کر بہت واضح محسوس کی پھر وہ تمہارے پاپا کے دوست کیسے ہو گئے؟“

وہ میری بات میں الجھ کر اپنا اسٹانس بھول گئی اور میں نے اچانک زمین پر بیٹھتے ہوئے سوپ لگ لگائی۔

میں زور نہیں تھا ورنہ اسے بہت زیادہ چوٹ لگتی۔ پھر بھی وہ چیخ مار کر گری تھی۔ یہاں فرش پر موٹا ربر میٹرز تھا لیے اسے چوٹ نہیں لگی۔ میں نے کہا۔ ”جب کسی سے مقابلے کے لیے تیار ہو تو اس کی باتوں سے زیادہ اس کے بلے پر دھیان دیا کرو۔“

وہ اٹھتے ہوئے غصے سے مسکرائی۔ ”تم نے سوال ہی ایسا کیا، میں الجھ کر رہ گئی۔ خیر اب نہیں الجھوں گی۔“

اس نے دوبارہ اسٹانس بنایا اور بولی۔ ”میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی، لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ کوئی مالی مفاد کا معاملہ ہے۔ پاپا اور ان کے درمیان کوئی ڈیل ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے بجلی کی طرح لپک کر میرا اور مجھ پر کرنے کی کوشش کی یعنی سوپ کک باری مگر میں اچھل کر بچا گیا۔ وہ گھومی اور اپنے بدن کی قدرتی لپک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کک کور پواز کیا۔ مگر زمین پر قدم پڑتے ہی میں دوبارہ اچھلا تھا اور اس کا یہ وار بھی ناکام گیا۔ وہ بچوں کے بل اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ”تم بہت پھرتیلے ہو۔“

میں نے اس سے کہا نہیں کہ وہ سست تھی۔ شاید اس نے کچھ معمولی سا سیکھا تھا اور اسے کسی عام آدمی کے مقابلے میں اپنا دفاع کرنا آ گیا تھا۔ مگر وہ میرا یا کسی ماہر فن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ پر کئی حملے کیے مگر میں نے با آسانی انہیں ناکام بنا دیا۔ ساتھ ساتھ اس سے بار بار بھی کرتا رہا تھا۔ اس نے مجھے باتوں سے زیادہ کچھ دوسری چیزوں میں الجھانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ آخر میں اس نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ”میں ہار گئی، تم سے نہیں جیت سکتی۔“

”چند مہینے میں تم نے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن ابھی تمہیں اس سے کہیں زیادہ سیکھنا ہو گا۔“

اس کا اسٹینا بھی زیادہ نہیں تھا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا اور میری نسبت کہیں زیادہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ جب کہ میرا سانس بھی معمول پر تھا۔ اس چند دن کی ورزش نے میرا اسٹینا اور قوت کار کو خاصا بہتر بنایا تھا اس نے رشک سے مجھے دیکھا۔ ”تمہارا سانس ذرا نہیں پھولا۔“

”ہاں میرا اسٹینا بہتر ہوا ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”ابھی ایک بار میرا خون لیا گیا ہے۔ جب مزید خون لیا جائے گا تب میں اتنا بہتر نہیں رہوں گا۔“

”لیکن پاپا نے تو کہا تھا کہ تمہاری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ وہ بے چین ہو گئی۔

”شاید انہوں نے درست نہیں کہا ہے میری ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ کسی صحت مند آدمی کے لیے دو مہینے میں ایک بار ہی ایک لیٹر خون دینا مناسب ہے اس سے زیادہ خون دینا اس کی صحت پر اثر ڈالتا ہے جب کہ میرا ہر ہفتے نصف لیٹر خون لیا جائے گا۔ اگر اس سے میری جان کو خطرہ نہ بھی ہوا تب بھی میں کمزور پڑ جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے میں بیمار پڑ جاؤں۔“

میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی تشویش بڑھ رہی ہے۔ یہ اچھی بات تھی وہ جتنا تشویش زدہ ہوتی میرے لیے اتنی ہی کوشش کرتی۔ ”ایسا نہیں ہو گا اگر تم کمزور ہوئے تو خون لینے کا سلسلہ روک دیا جائے گا۔“

”کیا یہ تمہاری میاں صاحب سے ڈیل ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں تم سے ملنا چاہ رہی تھی لیکن موقع نہیں ملا، اس لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا میں نے سوچا اس بہانے کیسر ساز بھی کر لوں گی۔“

اگرچہ نئی کاروبہ کوئی بہت زیادہ متوجہ ہو۔ نہ والا نہیں تھا پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ وہ میری توجہ چاہتی تھی۔ مختلف بہانوں سے قریب آنا اور خود کو نمایاں کرنا شاید اسی سلسلے کے کڑی تھی لیکن وہ میری فطرت اچھی طرح جان گئی تھی اس لیے کسی براہ راست کارروائی سے گریز کر رہی تھی۔ میرے ساتھ ہمدردی کی آڑ میں یقیناً اس کی ذاتی دلچسپی تھی۔ ورنہ شاید اسے مجھ سے کوئی غرض بھی نہ ہوتی۔ کونھی میں جب میں نے اسے اور ٹینا کے کرم دین اور

کرین کی سازش سے بچایا تھا تب بھی اس کا رویہ بہت لگاؤ والا ہو گیا تھا۔ مجھے اس وقت بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ وہ میرے نزدیک نہ آنے پائے اور اسے اپنی توہین کا احساس بھی نہ ہو ورنہ وہ اپنے پاپا کی صف میں جا کھڑی ہوتی اور میرے لیے مشکل ہو جاتی۔ ایک گھنٹے کے دوران اس نے ایک سرساز تو اتنی نہیں کی لیکن باتیں زیادہ کیں۔ جب میں اسے کنور خاندان اور اس کے پاپا کے موضوع کی طرف لانے کی کوشش کرتا وہ صفائی سے کئی کتر جاتی۔

جب میں نے سوئمنگ پول کا رخ کیا تو وہ واپس چلی گئی اور اس کی جگہ بانو اندر آئی۔ وہ حسب معمول حیدر آبادی فراک اور پاجامے میں تھی۔ ڈیوٹی کے وقت ایک طرح سے یہ اس کا یونیفارم تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر حیات کو اندر بلایا اور خود اسی دروازے سے باہر چلی گئی۔ اندر آ کر حیات نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں کچھ عناد بھی تھا جیسے اسے بانو کا میرے ساتھ یہاں اکیلے رہنا پسند نہیں آیا تھا مگر میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ورزش کے بعد تیراکی سے جسم ایک تو ٹھنڈا ہو جاتا ہے دوسرے اس سے جسم کے پھیل جانے والے مسلز تیزی سے اپنی پوزیشن میں آ جاتے ہیں اور ان میں سختی پیدا نہیں ہوتی ہے جیسا کہ ہاڈی ملڈر کے مسلز میں آ جاتی ہے اور وہ بھرتی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ میں اکثر ایسی ورزشیں کر رہا تھا جو جسم کو بنانے کے بجائے اسٹیمنا اور قوت میں اضافہ کرتی ہیں ساتھ ہی جسمانی چلک اور رد عمل کو بھی بڑھاتی ہیں۔

دو دن بعد بنٹی پھر اسی طرح آئی اور اس دن وہ ذرا معقول چلنے میں تھی یعنی اس نے ٹراؤزر کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ میاں ممتاز کے بارے میں اس نے انکشاف کیا کہ وہ صوبائی حکومت کی تشکیل کے لیے لاہور میں مقیم تھا اور اس کی جلد ممتاز ہاؤس واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا اسی لیے بنٹی پھر جم چلی آئی تھی۔ اس دن بنٹی نے بھی سنجیدگی سے ورزش کی۔ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا مگر یہ گفتگو زیادہ تر حالات حاضرہ اور دلچسپی کے دوسرے موضوعات پر تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنے باپ اور کنور خاندان کے تعلقات کے بارے میں بات کرنے سے گریز کرتی ہے اس لیے میں نے دوبارہ یہ ذکر نہیں چھیرا۔ البتہ اس نے بانو کا ذکر چھیڑ دیا۔ ”کیا بات ہے تم اس سے اتنا گریز کیوں کرتے ہو؟“

”میں گریز کرتا ہوں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”وہ بے چاری تو سارا دن میری خدمت میں لگی رہتی ہے۔ ہر تھوڑی دیر بعد میں اسے کسی نہ کسی کام کے لیے کہتا ہوں۔“

”میں وہ بات نہیں کر رہی ہوں۔“ بنٹی نے منہ بنایا۔ ”وہ خوب صورت لڑکی ہے۔“

”اگر تمہارا مطلب ہے کہ میں اس کی خوب صورتی کی طرف توجہ نہیں دیتا ہوں تو تم جانتی ہو میں عورت کو صرف عورت سمجھنے کا قائل نہیں ہوں۔“

”میں جانتی ہوں۔“ بنٹی نے مفہمانہ انداز اختیار کیا۔ ”کیونکہ میرا لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔“ تم اکیلے ہو، کوئی نافرمان نہیں ہے۔ ایک طرح سے قید میں ہو۔ میں تمہارے پاس نہیں آ سکتی ہوں اس لیے میں چاہتی ہوں بانو تم کو کمپنی دے وہ پڑھی لکھی اور ذہین لڑکی ہے۔ تم اس سے بات کر سکتے ہو۔“

”تم سے بات ہو تو جاتی ہے۔“ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

”ہاں لیکن اس طرح کئی دن بعد۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”تم نہیں جانتے اس ایک ملاقات کے

لے مجھے کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں۔“

”میری ساکھ پر کیا گزرتی ہے اس بارے میں تم سوچتی بھی نہیں ہوگی۔“

وہ چوگی۔ ”تمہاری ساکھ، کیا ہوا اسے؟“

”تم خود سوچو کہ بانو اس طرح حیات کو یہاں سے رخصت کر کے اندر سے دروازہ بند کرتی ہے اور حیات کے خیال میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ تو میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔“

”وہ حکم کا غلام ہے اس کی جرأت کہ کچھ سوچ سکے۔“ بنٹی کو غصہ آ گیا۔ ”کیا اس نے تم سے کچھ کہا ہے۔“

”نہیں.....“

”تب تمہیں اپنی ساکھ کی فکر کیوں لگ گئی ہے؟“

”کیونکہ میں سیلف ریپکٹ کا قائل ہوں۔“ میں نے بھنا کر کہا۔ ”میری عزت سب سے پہلے میری

اپنی نظر میں ہے۔“

”ٹھیک ہے جب تم کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہو تو یہ عزت تمہاری اپنی نظر میں بحال دینی چاہیے۔“ اس نے مجھے لا جواب کرنے کے انداز میں کہا۔ ”حیات ایک معمولی سالزام ہے۔“

”کچھ دن پہلے تو تم اسے میاں صاحب کا اہم ترین گارڈ اور آدمی قرار دے رہی تھیں۔“

”سالزام کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو سالزام ہی ہوتا ہے۔“ بنٹی نے ایک آفاقی حقیقت بیان کی۔

اس دن جب میں حیات کے ساتھ واپس کمرے کی طرف جا رہا تھا تو اس کا موڈ پہلے سے زیادہ خراب تھا اس نے آج بیتو سے میری بات بھی نہیں کرائی تھی جب میں نے خود توجہ دلائی تو وہ رکھائی سے بولا۔ ”بیٹری چارج کر رہا ہوں، ابھی نہیں کرا سکتا۔“

”تب ایک گھنٹے بعد کرا دو اور میں نے کون سا گھنٹوں بات کرنی ہوتی ہے مجھے اپنے ساتھی کی خیریت معلوم کرنی ہوتی ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ جب اس نے ایک گھنٹے بعد بھی بیتو سے میری بات نہیں کرائی تو میں نے بانو کو کال کی وہ میرے لیے کھانا لا رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ حیات کے دماغ میں کوئی کیڑا کھلا رہا ہے اور وہ بیتو سے میری بات کرانے سے گریز کر رہا ہے تو اس نے کہا۔ ”میں آ رہی ہوں ابھی حیات سے بات کرتی ہوں۔“

شاید بیتو بھی حیات کی تحویل میں تھا اور اس سے بات کرانے کی ذمہ داری اس کی تھی۔ یعنی وہ نمبر کسی اور کے پاس نہیں تھا جس سے بیتو سے بات کی جاسکتی تھی اس لیے حیات کو بائی پاس کر کے اس سے رابطہ ممکن نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ دروازے کے باہر کوئی بول رہا ہے۔ میں نے دروازے سے کان لگائے تو دوسری طرف سے بانو کی آواز آئی۔ ”تم نے شہباز صاحب کی ان کے ساتھی سے بات کیوں نہیں کرائی؟“

”یہ میرا کام ہے تمہیں اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ حیات نے اکھڑ انداز میں کہا۔

”میرا بھی اس سے تعلق ہے۔ بے بی نے ان کی ذمہ داری مجھے سونپی ہے۔ اگر ان کو کوئی مشکل ہوگی

تو.....“

”بہت خیال ہے تمہیں اس کی مشکلوں کا۔“ حیات کا لہجہ زہریلا ہو گیا تھا۔ ”تم میں دروازہ اندر سے بند کر کے تم اس کی کون سے مشکل آسان کرتی ہو؟“

”ذلیل شخص۔“ بانو نے کہا اور ایسی آواز آئی جیسے اس نے حیات کو تھپڑ مارا ہو۔ ایسا ہی ہوا تھا کیونکہ پھر حیات کی سرد آواز آئی۔

”بانو میں یہ تھپڑ ہمیشہ یاد رکھوں گا اور ایک وقت آئے گا جب تمہیں اس کا حساب دینا ہوگا۔“

”اس سے پہلے میں تمہیں دوسرا تھپڑ لگاؤں میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔“ بانو برہمی سے بولی۔ ”تم اس قابل بھی نہیں ہو کہ میں تم سے بات کروں۔ میں نے بے بی سے شکایت کر دی تم ایک منٹ میں فارغ کر دیئے جاؤ گے۔“

”وہ بہت قابل آدمی ہے۔“ حیات پھر زہریلے انداز میں بولا۔ اس پر بنٹی سے شکایت کرنے کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ بانو اس کی بکواس پر توجہ دے بغیر دروازے تک آتی تھی اس سے پہلے وہ دروازہ کھول کر اندر آتی میں واپس بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اندر آئی تو اس کا گلابی چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ اپنا ٹھنڈا گلابی دانتوں میں دبای رہی تھی۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”خیریت..... یہ لال پیلی کیوں ہو رہی ہو۔“

اس نے گہری سانس لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ عام طور سے وہ اندر آنے کے بعد دروازہ بند نہیں کرتی تھی لیکن اس وقت اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اس وقت وہ چپ چاپ میز پر کھانا لگانے لگی۔ جب میں ہاتھ دھو کر آیا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کچھ نہیں، آدمی ملازمت میں مجبور ہو جاتا ہے لیکن میری مجبوری ان سے کہیں زیادہ ہے وہ ملازمت چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتے ہیں۔“

”ایسی کیا بات ہو گئی؟“ میں نے کہا۔ ”اور میرا خیال ہے تم بنٹی کے پاس ملازم ہو۔“

”نہیں..... میں میاں صاحب کی پروردہ ہوں۔ بچپن سے اسی جگہ رہی ہوں۔ انہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا اور پھر مجھے بے بی کو دے دیا۔ یہ ملازمت نہیں ہے۔“

وہ جذباتی طور پر منتشر تھی اس لیے یہ بات کہہ گئی پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اس نے جلدی سے معذرت کی۔ ”سوری سر، یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے میں نے بلاوجہ آپ کو بتا دیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے نرمی سے جواب دیا۔ ”اول تو میں نے خود پوچھا تھا اور دوسرے آدمی کسی کے سامنے دل کا بوجھ پلکا کر لے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔“

”تھینک یو سر۔ آپ اچھے آدمی ہیں۔“ اس نے ممنونیت سے کہا۔

میں ہنسا۔ ”میرے اکثر جاننے والے یہی کہتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ درست کہتے ہیں۔“

”نہیں سر، آپ سچ بچ اچھے آدمی ہیں۔“ اس بار وہ بے ساختہ بولی۔ ”آپ نے کبھی ان نظروں سے مجھے نہیں دیکھا جن سے یہاں کا ہر فرد دیکھتا ہے۔“

میں نے موضوع بدل دیا۔ ”میرے لیے کھانا کون بنا تا ہے؟“

”میں خود بناتی ہوں۔“

میں نے حیرت سے کہا۔ ”اچھا میں تو سمجھتا تھا کہ شیف بناتا ہے۔“
 ”وہ عام کھانے بناتا ہے دراصل میں نے محسوس کیا کہ وہ آپ کے لیے مخصوص کھانے اس طرح نہیں بناتا جیسے اسے بنانے چاہئیں اس لیے اب میں خود بناتی ہوں۔“
 ”اسی وجہ سے مجھے چار پانچ دن سے کھانے کے ذائقے میں واضح فرق لگ رہا ہے۔“
 اس نے ڈرے ڈرتے پوچھا۔ ”کیا مزے کا نہیں ہے سر، میں نے تو اسی لیے شیف سے لیا تھا کہ.....“
 ”بہت مزے کا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”شیف بھی برا نہیں بناتا تھا لیکن تمہارے بنائے کھانے کا ذائقہ الگ سے محسوس ہوتا ہے۔“
 ”تھینک یوسر۔“

”مجھے سمرت کہا کرو، مجھے اس لفظ سے الرجی ہے۔ سن کر ہی برا لگتا ہے میرا نام شہباز ہے اگر تم چاہو تو نام لے سکتی ہو یا چاہو تو شہباز صاحب کہہ سکتی ہو۔“
 ”شہباز صاحب ٹھیک رہے گا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”آپ کھانا کھائیے پھر مجھے کال کیجئے گا میں نے آپ کے لیے اسٹیل فیک بنایا ہے۔“

جاتے ہوئے اس کا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ میرے لیے فیک لے آئی۔ یہ خاص کالے انگور، پلچی اور انٹاس سے بنایا ہوا فیک تھا اور واقعی لا جواب تھا۔ میں نے فیک کی دکانوں سے بے شمار قسم کے پھلوں کا اور کاک ٹیل فیک بھی پیا ہے لیکن اس کا ذائقہ واقعی سب سے منفرد تھا۔ میں نے تعریف کی تو وہ خوش ہو گئی۔ ”اب میں آپ کے لیے روز بناؤں گی۔“

”روز نہیں ایک دن چھوڑ کر ورنہ میں عادی ہو جاؤں گا اور پھر مجھے اتنا اچھا نہیں لگے گا۔“

”جیسے آپ کہیں، میں بدل بدل کر بھی فیک بنا سکتی ہوں۔“

”جب ٹھیک ہے تم روز فیک لے آؤ۔“ میں نے اجازت دے دی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد حیات نے دروازے پر دستک دی اور موبائل مجھے کچڑا دیا۔ مجھے شرارت سوجی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

”خیریت تمہارا منہ سو جا ہوا ہے کیا کسی نے مارا ہے۔“

اس نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر بولا۔ ”ابھی تک کوئی مائی کالا ایسا پیدا نہیں ہوا جو میرے منہ پر تھپڑ مار سکے۔“

میں نے مزید شرارت آمیز سا دگی سے کہا۔ ”اچھا تھپڑ مارا ہے، میاں صاحب تو یہاں ہیں نہیں تو پھر کس نے اتنی جرأت کی؟“

جواب میں اس نے دروازہ دھڑام سے بند کر کے مجھے شٹ آپ کال دی۔ میں نے بیٹو سے بات کی اور وہ نبرذہن نشین کر لیا جس سے وہ بات کر رہا تھا۔ کال ختم کر کے میں نے جوابی کال اور پھر ایس ایم ایس کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں بار مجھے بینکس ختم ہونے کی کوٹھری سنائی گئی۔ ٹھنڈی سانس لے کر میں نے موبائل حیات کو واپس کر دیا۔ وہ بہ وقوف نہیں تھا کہ بینکس کے ساتھ موبائل مجھے دے دیتا۔ اس وقت لون لینے کی سہولت بھی نہیں تھی ورنہ میں لون لے کر کال کرتا۔ بانو کے معاملے میں اس کا غصہ اپنی جگہ لیکن اس نے میرے

معاملے میں اپنی مکاری برقرار رکھی تھی اور مجھے کوئی ہلکا سا موقع دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

دو دن بعد میرا خون نکالا گیا تھا اس بار بھی نصف لیٹر تھا لیکن خون دینے کے بعد میں نے ہلکی سی کمزوری محسوس کی تھی۔ اگرچہ یہ کمزوری چند منٹ کے لیے تھی جیسے ہی مجھے انجکشن لگا اور جوس پیا میں خود کو پہلے کی طرح محسوس کرنے لگا تھا۔ اس دن صبح کی ایکسر سائز نہیں کی تھی اور آرام کیا تھا لیکن جب شام کو جم گیا تو خلاف معمول میں نے تھکاوٹ محسوس کی تھی۔ میں دو گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے میں واپس آ گیا تھا۔ مجھے تشویش ہونے لگی تھی کہ صرف دوسری بار خون دینے سے میں تھکاوٹ اور کمزوری محسوس کر رہا تھا آئندہ نہ جانے میرا کیا حال ہونے والا تھا۔ میں قوت بخش زود ہضم غذا کیں زیادہ مقدار میں لے رہا تھا۔ باقاعدگی سے ورزش نے میری صحت کو پہلے سے کہیں بہتر بنا دیا تھا۔ مجھے اتنی جلدی کمزوری کا شکار نہیں ہونا چاہیے تھا مگر اگلے دن تک میں نارمل ہو گیا تھا اس لیے تشویش بھی مدہم پڑ گئی۔

ایک وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی تھی کہ جب پہلی بار میرا خون لیا جا رہا تھا تو مجھے حکیم قاسم سے علاج کرائے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور اس وقت میرے جسم میں معجزاتی دواؤں کا اثر باقی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بہت زیادہ خون نکالنے کے باوجود کمزوری کا شکار نہیں ہوا تھا اور آخری مرتبہ غیر معمولی مقدار میں خون لینے کے باوجود بچ گیا تھا۔ مگر اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دواؤں کا اثر بہت کم ہو گیا تھا۔ ممکن ہے اس وجہ سے میں کم مقدار میں خون دینے کے باوجود میں کمزوری کا شکار ہو رہا ہوں۔ مگر ضروری نہیں تھا یہی وجہ ہو۔ ان دواؤں کا ایک اثر اب تک برقرار تھا کہ میرے زخم چاہے وہ کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں غیر معمولی تیزی سے بھر جاتے تھے۔ پھر خون بھی صرف نصف لیٹر لیا جا رہا تھا جب کہ آدمی ایک لیٹر خون دے کر بھی بغیر کمزوری کے صحت مند رہ سکتا ہے۔



میاں ممتاز واپس آ گیا تھا یہ اطلاع مجھے بانو نے دی۔ مگر وہ آرام کرنے آیا تھا کیونکہ سیاسی جوڑ توڑ نے اسے توڑ دیا تھا اور دن رات اس میں لگے رہنے کے بعد وہ تھک گیا تھا اس لیے چند دن کے لیے سستانے کو ممتاز ہاؤس آیا تھا۔ بانو کا کہنا تھا کہ وہ چند دن بعد دوبارہ جائے گا۔ ابھی صوبائی حکومت کی تشکیل کا مرحلہ باقی تھا۔ اگرچہ میاں ممتاز کی موجودگی اور غیر موجودگی کا مجھ پر زیادہ اثر نہیں پڑتا تھا۔ سوائے اس کے کہ بنی مجھ سے ملنے نہیں آ سکتی تھی مگر اس سے ملنا اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔ اتنا تو میں نے جان لیا تھا کہ وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ پھر بھی میں اس سے مایوس ہونا نہیں چاہتا تھا اور پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ کے مصرع پر عمل پیرا تھا۔

بانو اب کھانا کے لانے کے ساتھ کبھی کبھی وپس رک جاتی تھی اور جب تک میں کھانا کھاتا وہ گپ شپ کرتی تھی۔ ظاہر ہے وہ میرے ساتھ کھانے کی سکتی حالانکہ میں نے کئی بار اسے دعوت دی مگر اس نے سوری کر لی۔ یہ حفظ مراتب کے خلاف ہوتا۔ میں بھی زیادہ اصرار نہیں کرتا تھا۔ ورنہ شاید حفظ مراتب کی اس خلاف ورزی پر اسے کچھ سہنا پڑتا۔ اس کی حیات سے جھڑپ پرانی بات ہو گئی تھی اور میرا خیال تھا کہ دونوں نے معاملہ گول کر دیا تھا۔ بانو کے لیے اس میں بے عزتی تھی اور حیات کے لیے بے عزتی کا خطرہ اور بھی زیادہ تھا۔ شاید اس نے بعد

میں موقع پا کر بانو سے معافی مانگ لی ہوگی۔ جب میں کمرے میں ہوتا تھا تو حیات یا اس کے ساتھی میں سے ایک ہی شخص باہر ہوتا تھا اور دوسرا اس دوران میں آرام کرتا تھا لیکن میرے کمرے سے باہر نکلنے کے وقت حیات لازمی موجود ہوتا تھا۔ میاں ممتاز کی طرف سے یہ اس کی لازمی ذمہ داری تھی۔

تیسری بار خون نکالنے سے ایک دن پہلے جب میں جم میں مصروف تھا تو بانو اندر آئی اسے دیکھ میں سمجھ گیا کہ بنی آنے والی ہے اور یقیناً میاں ممتاز سیاسی دنگل میں دوبارہ شرکت کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ اسے دنگل سے زیادہ اقتدار کی چھین چھٹ کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ بانو کو دیکھ کر حیات حسب معمول کچھ اور سمجھا تھا اور اسے گھورتا ہوا باہر گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بانو دانت دھستی واپس آئی۔ وہ دروازہ بند کرنے لگی تھی۔ حیات اور اس کے ساتھی کو بے خبر رکھنا لازمی تھا اس لیے بنی کی آمد سے پہلے جم کا سرور ڈور اندر سے لازمی بند کیا جاتا تھا ورنہ اس بات کا خطرہ تھا کہ حیات کسی وقت بھی اندر آ سکتا تھا۔ بانو دوسرے دروازے سے باہر نکلی اور اس کی جگہ بنی اندر آئی۔ آج وہ پھر مختصر سے لباس میں تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ لباس وہ صرف میری موجودگی میں پہن کر آتی تھی یا پھر وہ اس جم میں اسی لباس میں ورزش کرتی تھی۔ ویسے یہ جتنا روشن خیال گھرانہ تھا اس کے افراد سے ہر چیز کی توقع کی جاسکتی تھی۔

”میاں صاحب چلے گئے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں..... تم سناؤ کیسا چل رہا ہے سب؟“

”دوسری بار خون دینے کے بعد مجھے ہلکی سی کمزوری محسوس ہوئی تھی حالانکہ جب میں کنوروں کی قید میں تھا اور انہوں نے میرے جسم سے فی ہفتہ ایک لیٹر خون نکالا تھا تب بھی میں نے اتنی کمزوری محسوس نہیں کی تھی۔“ وہ فکرمند ہو گئی۔ ”ایسا کیوں ہے۔ میں ڈاکٹر سے پوچھتی ہوں۔“

کنوروں کی بات آئی تو اس نے پہلی بار خود پوچھا۔ ”تم ان کے ہاتھ کیسے لگے؟“

”یہ لمبی داستان ہے۔“

”تم مختصر کر کے سناؤ۔“ اس نے اصرار کیا تو میں ایک سرساز کے ساتھ ساتھ اسے بتانے لگا کہ میں کنوروں کے ہاتھ کیسے لگا تھا۔ حسب معمول سوالات کی مدد سے داستان لمبی ہوتی چلی گئی۔ اوشا کا ذکر آیا تو وہ چونک گئی۔ ”پیرے کی بیٹی، کیسی تھی؟“

”سیاہ فام تھی لیکن خوب صورت تھی۔“

”تم سے متاثر ہوئی ہوگی؟“ اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”ایسا بھی نہیں ہے کہ میری زندگی میں آنے والی ہر لڑکی مجھ سے متاثر ہو جائے۔“

”لیکن متاثر ہونے والیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔“

اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اوشا کس طرح میری دیوانی ہو گئی تھی کہ اپنے باپ سے بغاوت کر بیٹھی تھی اور اس سے اپنی کھال اتروا لی تھی تو نہ جانے اس کا کیا رد عمل ہوتا۔ اس لیے اوشا کا ذکر ایک حد میں رکھتے ہوئے میں نے اسے کنور خاندان کے ہاتھ لگنے کا واقعہ سنایا پھر انہوں نے کیوں میرا خون نچوڑنے کی کوشش کی اور کس طرح میری جان بچی۔ جب میں نے قبائلیوں کے خلاف کنور خاندان کی سازش اور بھارتی حکومت کی بربریت کا بتایا تو

وہ حیران ہوئی تھی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ”اتنے سفاک لوگ ہیں۔“
میں نے ملائمت سے کہا۔ ”تمہیں ایک جاگیردار خاندان کی نور چشم ہو کر بھی نہیں معلوم کر غریبوں کے ساتھ اس قسم کے لوگ کیا سفاکی دکھاتے ہیں۔“

”ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا ہے۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے ہم جاگیر دار ہیں لیکن اپنے لوگوں کا خیال بھی رکھتے ہیں۔“

”جیسے بانو کا رکھا ہوا ہے؟“

میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تمہیں بانو نے بتایا ہے؟“
میں نے سر ہلایا اور پھر اسے حیات کے ساتھ بانو کی جھڑپ کے بارے میں بتایا۔ ”وہ اس سے دل برداشتہ تھی اس لیے اس کے منہ سے نکل گیا۔“

بنی نے سر ہلایا۔ ”میں جانتی ہوں وہ میری وفادار ہے مجھ سے محبت کرتی ہے۔“
 ”لیکن ہے تو تم لوگوں کی پروردہ۔“

”اس کا باپ پاپا کی زمین پر کام کرتا تھا اور ماں یہاں ملازم تھی۔ ایک بار یہ لوگ کسی کی رشتے داری شادی میں جا رہے تھے کہ بارات کی بس کو حادثہ پیش آ گیا۔ دونوں ماں باپ مارے گئے بس یہی بچی تھی۔ پولیس بانو کو ہمارے پاس لے آئی تھی۔ اس کے اور رشتے دار بھی تھے لیکن جب میں نے اسے دیکھا تو بابا سے کہا کہ اسے رکھ لیں۔ بابا مان گئے۔ اسے ایک ملازمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ بڑی ہوئی تو اسکول میں داخل کرایا گیا۔ اس نے لاہور کے ایک اچھے کالج سے گریجویت کیا۔ میں تو چاہتی تھی کہ وہ مزید پڑھے اور اپنا مقام بنائے ہو سکے تو کوئی پروفیشنل ڈگری حاصل کرے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے مجھ سے اور بابا سے کہا کہ اسے کوئی ذمے داری دی جائے وہ ایسے ہی یہاں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ تب میں نے اس سے کہا کہ وہ میری سیکرٹری بن جائے۔“

”میں اسے سیکرٹری کا درجہ دیتی تھی مگر اس نے مجبور کیا کہ اسے ملازمہ کے لحاظ سے ٹریٹ کیا جائے۔“

مجھے حیرت ہوئی اگر بنی درست کہہ رہی تھی تو یہ لوگ بانو پر مہربان تھے اور اس نے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ کوئی پروفیشنل ڈگری حاصل کر لیتی تو اپنی لائف خود بنا سکتی تھی۔ بے شک وہ ممتاز ہاؤس میں ملازمہ تھی اور بنی کی خادمہ کی حیثیت سے وہ الگ ہی تھی لیکن تھی تو بے زلمہ۔ چاہے اسے کوئی بھی تنخواہ دے دی جاتی یا یہاں وہ کتنے ہی سکون و آسائش سے رہتی۔ شاید اس میں بہت سی کمی تھی اور وہ باہر نکال کر دنیا سے اپنا حصہ طلب کرتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ ممتاز ہاؤس بچپن سے اس کے لیے گوشہ عافیت رہا تھا اور وہ یہاں سے نکلتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ بنی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے آج بانو میں بہت دلچسپی لے رہے ہو؟“

”ایسے ہی۔“ میں نے سوئمنگ پول کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”کیا“ انہیں ہو سکتا کہ کل تم خون لینے کے موقع پر میرے ساتھ وہاں رہو۔“

”میں کوشش کروں گی۔“ اس نے وعدہ کرنے سے گریز کیا۔ جب میں سوئمگ کرنے جاتا تو وہ رخصت ہو جاتی تھی اس روز بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے جاتے ہی بانو آئی اور سروس ڈور کی طرف گئی۔ اس نے

جانے کے کچھ دیر بعد حیات اندر آیا۔ وہ کب آیا میں نے غور نہیں کیا تھا ایک بار میں نے دیکھا تو وہ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ سونگ کر کے میں واپس کمرے میں آیا۔ نہادھو کر میں کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر جب مقررہ وقت پر بانو نہیں آئی تو میں نے اسے واکی ٹاکی پر کال کی۔ مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا بس سائیں سائیں کرتی آواز آرہی تھی۔ غالباً کسی وجہ سے واکی ٹاکی کا رابطہ نہیں رہا تھا۔ میں نے انتظار کیا پھر دروازہ بجایا۔ باہر سے حیات نے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

”بانو ابھی تک کیوں نہیں آئی کھانا لے کر؟“

”بڑی بے چینی ہے تمہیں بانو کی۔“ اس نے تسخرانہ انداز میں کہا۔

میں نے اسے گھورا۔ ”میری بات کا جواب دو وہ اب تک کیوں نہیں آئی ہے؟“

وہ رکھائی سے بولا۔ ”مجھے کیا معلوم، میں اس کا نگران نہیں ہوں۔“

مجھے کھانے سے زیادہ بانو کی فکر ہو رہی تھی جب سے اس نے یہ ذمے داری سنبھالی تھی گھڑی کی سوئیوں کی سی باقاعدگی سے کام کرتی تھی۔ اور آج بارہ بج کر بیس منٹ ہونے والے تھے اور وہ نہیں آئی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور دروازہ کھلا۔ میں سمجھا کہ بانو ہوگی لیکن اس کی جگہ وہی نوجوان ملازم تھا جو پہلے دن نظر آیا تھا وہ کھانے کی ٹرالی لایا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”بانو کیوں نہیں آئی ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم جناب۔“ وہ بولا۔ ”میرا تعلق کچن سے ہے۔“

”بانو میرا کھانا بتاتی ہے کیا وہ کچن میں آئی تھی؟“

”پتا نہیں جناب، مجھے شیف نے بلا کر یہ ٹرالی آپ کے لے جانے کا حکم دیا میں لے آیا۔“

دوسرے لفظوں میں اسے بالکل علم نہیں تھا کہ کھانا بانو نے بنایا ہے یا نہیں اور وہ کہاں تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا بے بی تک میرا پیغام لے جاسکتے ہو۔“

”بے بی تک صرف بانو پیغام لے جاسکتی ہے۔“ اس نے معذرت کی اور رخصت ہو گیا۔ کھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ایسی کیا بات ہوگئی کہ بانو نہیں آئی۔ اگرچہ یہ کوئی خاص بات بھی نہیں تھی بانو کا نہ آنا اور آنا تقریباً برابر تھا اگر بنی اس سے لے کر یہ ذمے داری کسی اور کے سپرد کر دیتی تب بھی مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ مگر اچانک بانو کا نہ آنا مجھے کھٹک رہا تھا اس کا تعلق بنی سے تھا اور بنی اس گھر میں میری واحد ہمدرد تھی۔ اس کی کوششوں سے میں راج کنور کے قبضے میں جانے سے محفوظ رہا تھا۔ اگر اس کی سوچ میں کوئی تبدیلی آئی تھی تو مجھ پر اس کا لازمی اثر پڑتا اس لیے میں بانو کے لیے فکر مند تھا۔ بہر حال یہ فکر مجھ پر زیادہ دیر سوار نہیں رہی تھی کیونکہ میں ہر قسم کے حالات کا بہت جلد عادی ہو جاتا ہوں۔ اس قید میں میرے لیے سب سے زیادہ تشویش ناک بات بیوی کی قید تھی۔ اس کی وجہ سے میں اپنے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ ورنہ اب تک آزاد ہونے کی کوشش کر چکا ہوتا۔ مگر اب میری ایسی کسی کوشش کا اثر بیوی پر پڑتا اور اسے خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ اس لیے میں دیکھو اور انتظار کر دو کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔

اگلے روز میں خون کے لیے صبح سویرے کلینک پہنچا۔ ڈاکٹر نے پھر نصف لیٹر خون نکالا اور جب میں لے

خون دے کر اٹھنے کی کوشش کی تو ایک لمحے کو مجھے چکر آ گیا تھا۔ اس لمحے میں سب بلیک آؤٹ ہو گیا۔ گول منول نرس پاس کھڑی تھی اس نے میری کیفیت بھانپ لی اور مجھے سہارا دیا اور نہ شاید میں گر جاتا۔ مگر دوسرے لمحے میں ہوش میں آ گیا اور میں نے خود کو سنبھال لیا۔ ڈاکٹر نے مجھے دوبارہ لیٹنے کو کہا اور مجھے اس بار طاقت کا انجکشن چھوٹی ڈرپ میں لگا کر دیا۔ اس سے میری کیفیت خاصی بہتر ہوئی تھی پھر جوس بی کر میری طبیعت تقریباً بحال ہو گئی تھی۔ مگر اپنی لمحاتی کیفیت نے مجھے فکر مند کر دیا تھا۔ کیا میری صحت عام معیار سے بھی نیچے جا چکی تھی۔ واپسی کے بعد بھی میں اپنی کیفیت بھانپنے کی کوشش کرتا رہا۔

گزشتہ دن سوائے ناشتے کے باقی دن وہی لڑکا مجھے کھانا لاکر دیتا رہا تھا لیکن میں اسے ہر وقت طلب نہیں کر سکتا تھا اسی طرح میرا بنٹی سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ کمزوری کی وجہ سے میں صبح جم نہیں گیا اور شام کو بھی میری ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن صرف اس وجہ سے جم گیا کہ شاید اب بانو آئے اور حیات کو یہاں سے رخصت کر دے اور میری بنٹی سے ملاقات ہو۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی مجھ سے ورزش ہوئی تھی۔ واپسی پر میں نے کتوں کا شور سنا وہ زور سے بھوک رہے تھے اور آوازوں سے لگ رہا تھا کہ کتوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ اگر یہاں کتے نہ ہوتے تو مجھے تعجب ہوتا کیونکہ ہمارے ہاں جاگیردار کتوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لڑکا آخری بار آیا تو میں نے کہا۔ ”سنو اگر تم بے بی تک رسائی نہیں رکھتے ہو تو کسی ایسے شخص کو تو جانتے ہو گے۔ بے بی تک رسائی رکھتا ہے۔ اس سے کہو میں بے بی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”رستم صاحب سے کہہ دوں گا۔“ وہ بولا۔ ”وہ ممتاز ہاؤس کے منتظم ہیں۔“

”میری بہت سی چیزوں کا خیال بانو رکھ رہی تھی اب کون ان کو دیکھے گا۔“

”مجھے اس بارے میں نہیں معلوم ہے۔“ اس نے حسب معمول جواب دیا۔

”تو پھر کسے معلوم ہے؟“ میں نے بھنا کر کہا اور دروازہ کھول کر حیات کو پکارا۔ ”اھر آؤ تم؟“

”کیا ہے؟“ اس نے کھر دے لہجے میں کہا۔

”جا کر اپنے میاں صاحب کو بتا دو کہ اب میں خون نہیں دوں گا اور اگر وہ نہیں ہیں تو بے بی کو یہ بات بہت ہے۔“ میں نے کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔ حیات کے تاثرات نہیں دیکھے تھے البتہ اپنے تاثرات غیض و غضب والے کھے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ برآمد ہوگا۔ میں بنٹی سے رابطہ چاہتا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد بات نے مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ اور اس کے ساتھی دونوں موجود تھے اور وہ مجھے بنٹی والے حصے میں لائے۔ اپنی نشست گاہ میں موجود تھی اور اسے دیکھتے ہی لگا کہ وہ پریشان ہے۔ اس نے آنکھ سے حیات کو اشارہ کیا اور خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔ اب وہاں میں اور بنٹی تھے۔

”تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟“

”بانو کیوں نہیں آ رہی؟“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے؟“

”کیا معلوم ہے؟“

”یہی کہ بانو کل صبح سے غائب ہے۔“

میں چونک گیا۔ ”غائب ہے..... کب سے اور کس طرح سے غائب ہے؟“
 ”وہ کل صبح جب جم سے نکلی تو اس کے بعد میرے پاس نہیں آئی۔ بارہ بجے میں نے اس کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ تب مجھے تمہارا خیال آیا اور میں نے شیف سے پوچھا اس نے کہا کہ بانو کچن میں بھی نہیں آئی۔ میں نے اسے تمہارے کھانے کے بارے میں ہدایت دی اور پھر بانو کو پورے ممتاز ہاؤس میں دیکھا گیا لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔ اس کے کمرے میں اس کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ حد یہ کہ اس کا پرس اور موبائل بھی موجود ہے۔ آج اسے کتوں کی مدد سے تلاش کیا گیا۔ پاپا کے ڈاگ ہاؤس میں بلند ہاؤنڈ ہیں جو کسی شخص کی بو میلوں دور سے سونگھ لیتے ہیں۔ وہ بھی اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے۔“
 ”مگر میں کتوں کی مدد سے تلاش؟“

”ہاں تم نے دیکھا ہے نامتاز ہاؤس کتنا بڑا ہے اس میں کوئی بندہ گم ہو جائے تو اتنی آسانی سے نہیں ملتا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ بیمار یا بے ہوش ہو کر نہ پڑی ہو اس لیے کتوں سے مدد لی۔“
 ”مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔“ گیٹ کپہر زکیا کہتے ہیں؟“
 ”ان کا کہنا ہے کہ بانو نہ تو پیدل اور نہ ہی کسی گاڑی میں باہر نکلی ہے۔“
 ”ممتاز ہاؤس سے باہر جانے کا اور بھی کوئی راستہ ہے؟“
 اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے ایک گیٹ اور تھا مگر سیکورٹی کے کٹہ نظر سے اسے بند کر دیا گیا۔“
 ”کوئی خفیہ راستہ ہے؟“
 ”لازمی بات ہے لیکن اسے صرف میں، پاپا اور ٹینا استعمال کرنا جانتے ہیں۔ اس سے کوئی اور نہیں گزر سکتا ہے۔“

”جب کیا بانو کبھی بن کر یہاں سے نکلی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس پر مجھے یاد آیا یہاں ہیلی پڈ بھی ہے۔“
 ”لیکن کل یہاں نہ تو کوئی ہیلی کاپٹر آیا اور نہ گیا۔“
 ”اگر وہ خود سے جاتی تو اس کا کوئی نہ کوئی نشان ملتا اور اس کا سامان بھی غائب ہوتا۔“
 ”تمہارا مطلب ہے اسے کسی نے غائب کیا ہے۔“ ہنسی چونک گئی۔
 ”سامنے کی بات ہے وہ کل جم سے نکلی اور اس کے بعد غائب ہو گئی۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔
 ”گیٹ پر آنے جانے والوں کا مکمل ریکارڈ ہو گا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”وہ ریکارڈ بھی چیک ہوا ہے کل سے اب تک کوئی دو درجن گاڑیاں اندر آئی اور گئی ہیں۔ ان میں سپلائی کی گاڑیاں بھی ہیں اور لائڈری کی گاڑی بھی اور ہماری گاڑیاں بھی ہیں۔“
 ”میں چونکا۔“ لائڈری کی گاڑی کیا اس میں بانو کو بے بس کر کے نہیں لے جایا جاسکتا ہے؟“
 ”لے جایا جاسکتا ہے لیکن آخر کسی کو اس سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔“
 ”دشمنی ضروری نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم بھول رہی ہو وہ نوجوان اور دلکش لڑکی ہے اور شاید کنواری بھی ہے۔“

اس نے مجھے گھورا۔ ”شاید نہیں وہ یقیناً کنواری ہے۔“

”تب کسی کی نیت بھی اس پر خراب ہو سکتی ہے۔“

”تم ممتاز ہاؤس کے کسی فرد کو الزام دے رہے ہو۔“

”ظاہر ہے اسے یہاں سے یہیں کا کوئی بندہ لے جاسکتا ہے اور کیا یہاں سب شریف اور پارسا لوگ

ہیں۔“

بنی سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ”میری سمجھ میں تو نہیں آرہا ہے۔ میں نے کل پاپا کو کال کر دی تھی۔ مگر ان کا کہنا ہے ابھی پولیس کے پاس جانے کے بجائے اسے خود تلاش کیا جائے۔ ہمارے آدمی اس پاس کے علاقے میں دیکھ رہے ہیں۔“

”فرض کرو کہ بانو کی گمشدگی میں اندر کا آدمی ملوث ہے تو تلاش کی اس مہم کو ناکام بنانا اس کے لیے نہایت آسان ہوگا۔“

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے آج یا کل پاپا آرہے ہیں وہی اس معاملے کو دیکھیں گے۔“

”تب تک اس بے چاری کے ساتھ نہ جانے کیا ہو جائے۔“ میں نے سر آہ بھری اور ساتھ ہی اطمینان محسوس کیا کہ بنی اور دوسرے حالات میں میرے حوالے سے کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پھر مجھے شرمندگی ہوئی۔ اس لڑکی کا خیال کم تھا اور اپنا خیال مجھے زیادہ تھا۔ مگر یہ انسان کی فطرت ہے وہ کسی بھی معاملے میں پہلے اپنا مفاد دیکھتا ہے اور اس کے بعد کسی اور کی فکر کرتا ہے۔ بنی نے کہا۔

”میں نے تمہاری ذمہ داری اکرم کو سونپ دی ہے۔“

اکرم وہی لڑکا تھا جو آج کل میرے لیے کھانا لاتا تھا۔ بنی کے حکم پر اب وہ ہمہ وقت کمرے کے باہر موجود رہتا اور میرے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔ بنی نے پھر معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اب تم نہیں کہہ سکتے کہ تمہیں بانو کی فکر نہیں ہے۔“

”فکر ہے لیکن ان معنوں میں نہیں اور دوسرے آدمی خود غرض ہوتا ہے مجھے لگا کہ شاید تم نے اسے ہٹا دیا ہے اور شاید تم مجھ سے فرٹ ہو گئی ہو۔“

”سوری میں کلینک نہیں آسکی تھی لیکن میں نے رپورٹ لی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمہیں چکر آیا تھا۔“

”ہاں یہ میرے لیے تشویش کا بات ہے کیونکہ میں نے اتنا خون نہیں دیا ہے کہ مجھے کمزوری محسوس ہو۔“

مجھے ایسا لگ رہا ہے میں نے اس سے دو گنا خون دے دیا ہے جتنا مجھے دینا چاہیے تھا۔“

”ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمہاری بلڈ ٹیسٹ رپورٹ بہترین آئی ہے۔ اسی طرح یورین اور دوسرا بلڈ ٹیسٹ بھی

کلیر ہے۔ یعنی جسمانی طور پر تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”یہ ڈاکٹر تم لوگوں نے ہار کیا ہے؟“

بنی چوکی۔ ”نہیں تو، یہ صرف اسی کام کے لیے آیا ہے۔“

اس بار میں چونکا۔ ”باہر.....؟ کہاں سے؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن پاپا کہہ رہے تھے اسے خاص طور سے اسی کام کے لیے بلایا ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا بنی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ”اس میں کوئی خاص بات ہے جو تم پوچھ رہے ہو اور

اب کچھ فکر مند بھی لگ رہے ہو؟“

میں نے جلدی سے خود کو تار مل کیا۔ ”نہیں ایسے ہی میں سوچ رہا ہوں کہ ڈاکٹر سے کہہ کر ایک بار اپنے ٹیسٹ کراؤں۔“

”میرا مشورہ ہے اب خون دینے کے بعد تم پلازما لے لینا اس سے خون کی مقدار پوری ہو جائے گی۔“
میں نے سر ہلایا۔ ”اس سے کہوں گا۔“

بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ میں اپنی صحت کے بارے میں بہت فکر مند ہوں اور میں بنی کو بھی یہی تاثر دینا چاہتا تھا۔ یعنی میں ان سے پوری طرح تعاون کر رہا تھا۔ میں نے گفتگو کا رخ دوبارہ بانو کی طرف موڑ دیا۔ ”اگر سے غائب کیا گیا ہے تو اسے لے جانے والے اسے زندہ چھوڑنے کا خطرہ تو کسی صورت مول نہیں لے سکتے۔“
بنی نے گہری سانس لی۔ ”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ شاید اب اسے نہ دیکھ سکوں۔“

”مگر اس طرح سے ایک جیتا جاگتا بندہ غائب ہو جانا اس گھر کی سیکورٹی پر بہت بڑا سوالیہ نشان نہیں ہے؟“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہاں فول پروف سیکورٹی ہے پورے ممتاز ہاؤس کو دوسو سے زائد سیکورٹی کیمرے کور کرتے ہیں لیکن کسی کیمرے میں کوئی خلاف معمول بات نہیں آئی ہے۔“
”اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کرنے والے سیکورٹی سے پوری طرح واقف تھے اور انہوں نے ہاتھ پاؤں بچا کر کام کیا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ بانو کی گمشدگی ریپرسل ہو۔“
بنی پھر چوگی۔ ”کیا مطلب؟“

”یہ کام کرنے والوں کا نشانہ کوئی اور ہو سکتا ہے لیکن اسے اٹھانے سے پہلے انہوں نے بانو پر ریپرسل کر لی۔“

بنی کچھ خوف زدہ ہوئی تھی۔ ”تمہارا مطلب ہے ہم میں سے کسی کو اغوا کرنے کا پلان ہو سکتا ہے؟“
”کیوں نہیں کیا تم لوگوں کے دشمن نہیں ہیں۔ کرین والے واقعے کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور اس کے خاندان والے تم لوگوں سے اس کی لاش کا مطالبہ بھی کر چکے ہیں اگر وہ تم میں سے کسی کو قبضے میں کر لیں تو میاں صاحب پھر ان کا مطالبہ مسترد کر سکتے ہیں۔“
”نہیں..... مگر یہ بہت مشکل کام نہیں ہے۔“

”تم اس نکتہ نظر سے سوچو کہ تمہارے پاپا ایک معروف سیاست دان ہیں اگر گھر سے باہر ایسی کوئی کارروائی ہوئی تو سب یقین کریں گے لیکن اگر تم گھر سے غائب ہو جاؤ اور تمہارے پاپا شور کریں تو کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا۔ اسے ان کا سیاسی اسٹنٹ قرار دیا جائے گا۔“

بنی قائل نظر آنے لگی حالانکہ یہ نہایت احمقانہ تھیوری تھی۔ گھر میں اس قسم کی کارروائی گھر کے افراد کے تعاون کے بغیر ناممکن ہے اور پولیس جب جھڑپ کرے گی تو اصل مجرم کو اگلتے ہی بنے گی۔ اس قسم کے کام ہمیشہ گھر سے باہر ہوتے ہیں۔ اس میں آسانی ہوتی ہے اور پولیس کے ہاتھ آنے کا امکان بھی نہیں ہوتا ہے لیکن بنی کی سوچ محدود تھی اس لیے وہ فوراً فکر مند ہو گئی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ وہ اس رخ پر سوچے اور اپنے باپ کو قائل

کرے اس طرح سے وہ زیادہ تندی سے بانو کو تلاش کر سکتے تھے۔ جب بانو کی تلاش کی جاتی تو لازمی بات تھی یہ ممتاز ہاؤس کے معمولات سے ہٹ کر ہوتی اور ممکن ہے اس دوران میں مجھے کوئی موقع ملتا۔ جب میں واپس کمرے میں آیا تو اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ میری تین دن سے بیٹہ سے بات نہیں ہوئی تھی اور بنی نے روانگی سے پہلے حیات کو دارنک دی تھی کہ اب مجھے شکایت کا کوئی موقع نہ دے۔ میں نے اس سے مطالبہ کیا۔

”میری بیٹہ سے بات کرائی جائے۔“

بادل نا خواستہ اس نے اسی موائل پر بیٹہ سے میری بات کرائی۔ وہ ٹھیک تھا۔ مگر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا اس نے کہا۔ ”شوبی اب ہم سے برداشت نہیں ہو رہا ہے یہ ہم کو آپ کے پاس لائے ورنہ ہم اب شرافت سے نہیں رہے گا۔“

”ابھی تم کچھ نہیں کرو گے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”دیکھو ہمیں موقع ملے گا اس لیے جلد بازی نہیں کرو۔“

”شوبی آپ قید ہو کر سکون سے رہ سکتا ہے ہم نہیں۔“ اس نے فریادی۔ ”ہم کو اس کا عادت نہیں ہے۔“

”تو ڈالو یار۔“ میں نے کہا۔ ”بلاوجہ ہنگامہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ الٹا یہ تمہارا کھانا پانی بند کر دیں گے۔“

”ہم کو یہ فکر ہے کہ جیسے جیسے یہ آپ کا خون نکالتا رہے گا ویسے ویسے آپ کمزور پڑ جائے گا۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے تسلی دی۔ ”یہاں میرا پورا خیال رکھا جا رہا ہے اور ڈاکٹر میری دیکھ بھال کرتا ہے اگر میں کمزور ہوا تو یہ خون لینا بند کر دیں گے۔“

”شوبی ہم کو یقین نہیں ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”ڈمن کی بات کا کبھی اعتبار نہ کرو۔“

”میں کون سا ہنسی خوشی کر رہا ہوں مجبوری ہے۔“

”ہم بھی مجبور ہے۔“ اس نے سر دھام بھری۔

”بس تو ابھی صبر کرو۔“

اس دن میں دونوں وقت ورزش نہیں کر سکا تھا کیونکہ کمزوری کا احساس باقی تھا بس کھانے کے بعد چہل قدمی کر لیتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے لیکن یہ گڑبڑ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ صرف ایک چیز سمجھ میں آرہی تھی کہ اس کا تعلق خون نکالنے سے تھا۔ یعنی گڑبڑ کلینک میں کی جا رہی تھی۔ دوسرے دن جا کر میری حالت اس قابل ہوئی کہ میں جم جا کر ایک سرساز کر سکوں اور یہ بھی میں پورے اسٹینڈا سے نہیں کر سکا تھا۔ آخر میں میری مانس بے قابو ہونے لگی تھی اس لیے میں ورزش ادھوری چھوڑ کر سوئمنگ پر مجبور ہوا تھا۔ جیسے جیسے میں اس بارے میں سوچ رہا تھا میری چھٹی حس خبردار کرنے لگی تھی کہ میرے ساتھ کوئی چکر کیا جا رہا تھا۔ مگر کیسے کیا جا رہا تھا یہ سمجھ سے باہر تھا۔ ڈاکٹر میرے سامنے میرے کیڑوں سے نصف لیٹر کی قھیلی منسلک کرتا تھا اور جب یہ بھر جاتی تو مجھے مانتا تھا کہ اس نے میرا کتنا خون نکالا ہے۔ بہ ظاہر اس میں کہیں گڑبڑ نظر نہیں آرہی تھی۔ مجھے بنی کے انکشاف نے مشکوک کر دیا تھا کہ ڈاکٹر اسی کام کے لیے باہر سے آیا اور ممتاز ہاؤس کا ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی باہر سے کسی لکڑ بولانا مجھے کھٹک رہا تھا کیونکہ خون لینا کوئی اتنا بڑا کام نہیں تھا جس کے لیے خاص طور سے ڈاکٹر اور نرس ہائر

کرنے کی ضرورت پیش آتی۔

تیسرے دن میری حالت ٹھیک ہو گئی اور میں پوری توانائی محسوس کرنے لگا تھا۔ بانو کی جگہ اکرم آ گیا تھا اور وہ میرا پورا خیال رکھتا تھا۔ میں نے مٹی سے کہا تھا کہ وہ اکرم کو رابطہ کرنے کی اجازت دے تاکہ اگر میں اسے کوئی فوری پیغام دینا چاہوں تو مجھے مشکل نہ ہو۔ دودن گزر جانے کے باوجود بانو کا کہیں پتا نہیں تھا اور میاں ممتاز بھی نہیں آیا تھا۔ شاید حکومتی جوڑ توڑ اسے واپس آنے کی سہلت نہیں دے رہا تھا۔ اس ہفتے کے دوران مٹی سے میری ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی بانو کا پتا چلا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بے سہارا لڑکی کسی زور آور کی زبردستی کا شکار ہو گئی تھی۔ بد ظاہر میاں ممتاز اور مٹی اس کے سر پرست تھے لیکن اس کی پراسرار گمشدگی پر ان کا رویہ واضح تھا۔ میاں ممتاز نے پولیس میں رپورٹ کرنے سے منع کر دیا تھا اور مٹی بھی خاص فکر مند نہیں تھی۔ وہ ان کے لیے صرف ملازمہ تھی اور وہ نہیں رہے گی تو اس کی جگہ دوسری ملازمہ آ جائے گی۔ اگر اس کے ساتھ کچھ برا ہوتا ہے تو یہ لوگ صرف افسوس کریں گے۔ اس سے زیادہ کی توقع نہیں جاسکتی تھی۔ غالباً اس سے زیادہ فکر انہیں اپنے سیکورٹی نظام کی ناکامی کی ہوگی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس کے لیے کیا کر رہے تھے۔

میرا خون جمعرات کی صبح لیا جاتا تھا۔ چوتھی جمعرات آئی اور میں صبح کلینک جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ حیات نے چھ بجے ہی دروازہ بجانا شروع کر دیا تھا لیکن میں آرام سے تیار ہو کر سات بجے نکلا۔ اس نے مجھے تاخیر کرنے پر گھورا تھا لیکن منہ سے کچھ کہا نہیں۔ وہ اپنے ساتھی سمیت مجھے کلینک کی عمارت میں لے کر آیا۔ جہاں حسب معمول ڈاکٹر اور گول منول نرس میرے منتظر تھے۔ اس دن میں نے پہلی بار اس کمرے کا بغور معائنہ کیا۔ یہاں صرف دو کرسیاں اور ایک وہ اسٹریچر نما بیڈ تھا جس پر میں لیٹ کر خون دیتا تھا۔ یہ زمین سے کوئی تین فٹ اونچی تھی۔ کیونکہ خون لینا ہوتا تھا اس لیے اسٹینڈ استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ خون کی تھیلی اسٹریچر کے ساتھ نیچے لٹکانی جاتی تھی۔ بیڈ کے نیچے غلائیں تھا بلکہ یہ چاروں طرف سے بند تھا۔ یہ بات مجھے ذرا ہٹ کر لگی تھی ورنہ عام طور سے اس قسم کے بیڈز کے نیچے خلا ہوتا ہے کیونکہ یہ اینگل آئرن سے بنے ہوتے ہیں۔ کرسیاں ڈاکٹر اور نرس کے لیے تھیں اور حیات کا کام کھڑے رہنا تھا اس لیے وہ مستعد کھڑا رہتا تھا۔ ایک چھوٹی سی ٹرائی تھی جس پر دو اینیاں، پانی اور منرل جوس کی بوتل رکھی تھی۔ یہ سب خون لینے کے بعد میرے لیے تھا۔

گول منول نرس نے مجھے بیڈ پر لیٹنے کو کہا اور پھر میرے بازو سے کیونولا منسلک کرنے لگی۔ خون نکالنے کے لیے جو کیونولا استعمال کیا جاتا ہے اس کی سوئی خاصی موٹی ہوتی ہے اور جب اسے نکال لیا جاتا تھا تب بھی کچھ دیر تک سوئی والی جگہ سے ہلکا سا خون رستا تھا جسے اینٹی سپیک روٹی پر لگا کر دبانا پڑتا تھا تب کہیں جا کر خون رکتا تھا۔ نرس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو اس نے آکر تھیلی کی نگلی کیونولا سے منسلک کی۔ میں نے جھک کر دیکھا وہ تھیلی ہی لگا رہا تھا اس کے علاوہ وہاں کچھ نہیں تھا۔ البتہ تھیلی سے منسلک نگلی خاصی لمبی تھی یہ شاید ڈیڑھ گز تھی جب کہ اس سے نصف لمبی نگلی سے بھی کام چل سکتا تھا۔ تھیلی منسلک کر کے ڈاکٹر نے اس پر کھولا تو خون نگلی سے ہوتا ہوا تھیلی میں جانے لگا تھا۔ میں سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ خون جانے کی رفتار تیزی تیز نہیں تھی۔ مگر اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر نے پھر اسٹریچر کو پھیڑا ہے۔ میں نے جھک کر دیکھا چاہا لیکن گول منول نرس جو میرے بائیں طرف کھڑی تھی اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بار بار مت جھکیں اس سے کیونلا پرو پاؤ پڑ سکتا ہے۔“

میں سیدھا لیٹ گیا اور اپنی ساری حیات کسی آہٹ یا معمولی سی حرکت پر مرکوز کر لی تھیں۔ ڈاکٹر واپس جا کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا تھا۔ میں آنکھ بند کر کے ساکت لیٹا ہوا تھا۔ یہاں کوئی گھڑی نہیں تھی۔ جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ کتنی دیر تک خون لیا جائے تو تھیلی بھر جائے گی۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ خاصی دیر گزر گئی ہے اور یہ وقفہ تھیلی کو بھرنے کے لیے کافی تھا۔ اسی لمحے بیڈ کے ساتھ بہت معمولی سی حرکت کا احساس ہوا۔ ایسا لگا جیسے بیڈ سے منسلک کوئی چیز ہل رہی ہو۔ ہلکی کو ہلنے سے روکنے کے لیے بچانے سے بیڈ کے ساتھ ایک کپ سے فکس کر دیا گیا تھا۔ پھر کیا چیز ہل رہی تھی۔ میرے ان چیزوں پر پہلے توجہ نہیں دی تھی۔ قدرتی طور پر میری توجہ اپنے بدن سے نکلنے والے خون پر مرکوز ہوتی تھی۔ میں نے یہ بھی پہلے نوٹ نہیں کیا تھا کہ گول منول نرس، ہمیشہ میرے دائیں طرف بالکل ساتھ کھڑی ہوتی تھی۔ جیسے میری نگرانی ہو اور مجھے حرکت کرنے سے روک رہی ہو۔ عام طور سے اس کے چہرے پر نرم تاثرات ہوتے تھے لیکن اس وقت اس کے چہرے پر سخت اور کچھ عجیب سے تاثرات تھے۔ میں نے مسکرا کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ اور اپنا بایاں پہلو کھمایا۔

”پلیز بلیس مت۔“ نرس نے کرخت لہجے میں کہا۔

”مجھے خارش ہو رہی ہے۔“ میں نے بدستور بایاں پہلو کھاتے ہوئے اچانک دائیں طرف کروٹ لی۔ ڈاکٹر بڑا برا اٹھا تھا اور پیچھے سے نرس نے بھی مجھے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اتنی دیر میں، نہیں دیکھ چکا تھا۔ بیڈ کے نچلے حصے میں جہاں تھیلی ہونی چاہیے تھی وہاں تھیلی نہیں تھی بلکہ ہلکی ایک چھوٹے سے خلا میں جاری تھی۔ ظاہر ہے اس خلا میں کوئی تھا جس نے تھیلی کو ہلکی سمیت اندر کر لیا تھا اور مقصد بھی واضح تھا۔ اندر کسی اور تھیلی میں میرا مزید خون لیا جا رہا تھا۔ یہ دھوکا تھا کہ میرا صرف نصف لیٹر خون لیا جا رہا ہے۔ اس طریقے سے کہیں زیادہ مقدار میں خون لیا جا رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے کیونلا کھینچ کر بازو سے الگ کر دیا۔ ڈاکٹر میری طرف آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو خون ضائع ہو جائے گا۔“

وہ میری زندگی ضائع کر رہے تھے۔ جتنا خون لینا تھا شاید اس سے دو گنا یا تین گنا زیادہ خون لے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے ان کا دھوکا کھانچا ہے۔ مگر اسے فکر تھی کہ ہلکی کھینچنے سے تھیلی میں موجود خون نہ نالغ ہو جائے۔ اس دوران میں، نہیں ملے کہ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے میں نے گھوم کر عقب سے مجھے قابو کرنے کی کوشش کرتی گول منول نرس کے نرم وجود سے سر لگایا اور نزدیک آتے ڈاکٹر کی گردن پر لات ماری۔ بڑی پوری قوت سے اور درست جگہ لگی تھی۔ ہڈی جھنسنے کی آواز آئی اور ڈاکٹر حیات پر جا گرا۔ میں تڑپ کر اٹھنے لگا۔ یہ موقع تھا میں حیات سے گن جھین سکتا تھا۔ ایک بار ہتھیرا میرے ہاتھ میں آجاتا تو میں پانسابلٹ دیتا۔

مگر اس موقع پر گول منول نرس جیر تسمہ پابن کر عقب سے چٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ میری بظوں کے گزارتے ہوئے مجھے جکڑ لیا۔ یہ بڑی نرم گرم اور گدازیت سے بھرپور جکڑ تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو مجھے اس سے آزاد ہونے کی اتنی جلدی بھی نہ ہوتی لیکن اس وقت میری جان پر پنی ہوئی تھی۔ خون نکلنے سے مجھے کسی رکزوری کا احساس بھی ہو رہا تھا اور میں حیات کے سنبھلنے سے پہلے اس پر قابو پانا چاہتا تھا۔ مگر جب خود کو نرس، جھڑانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ وہ صرف موٹی نہیں تھی بلکہ اس میں اچھی خاصی

قوت بھی تھی اس کے باوجود وہ مجھے اتنی آسانی سے قابو نہیں کر سکتی تھی لیکن جدوجہد کے ساتھ ساتھ ہی مجھے تیزی سے بڑھتی کارکردگی کا احساس ہونے لگا اور میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں نے زور آزمائی کے بجائے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور زس کو کہیں مارنے لگا مگر میری پہلی کوشش کی طرح یہ وار بھی کمزور تھے۔

زس چلائی۔ ”جلدی کرو..... یہ نکل رہا ہے۔“

میں نے ڈاکٹر کی لاش کو ایک طرف دھکیل کر حیات کو اپنی سمت جھپٹنے دیکھا۔ ڈاکٹر یقیناً مر چکا تھا کیونکہ اس کی گردن غیر فطری انداز میں جھول رہی تھی اور اس کا جسم دیوار سے لگا تو سر گھوم کر پیچھے آگیا۔ حیات نے شاٹ گن میری طرف کر رکھی تھی اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے شوٹ کرنے والا ہے لیکن پاس آنے پر اس نے اس کی نال گھما کر میری بائیں کینچی پر رسید کی۔ میرا سر جو پہلے ہی تکر رہا تھا اس ضرب کی تاب نہ لاتے ہوئے یک دم ہی تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ ایسا لگا جیسے میں کسی تاریک دلدل میں اتر رہا ہوں۔ یہ احساس لمحات تھا اس کے بعد ہر احساس فنا ہو گیا۔ یہ دو چار ہاتھ لب بام رہ جانے والی بات تھی جب ایک کمزور اور صنف نازک سے تعلق رکھنے والی زس نے میری جدوجہد کو ناکام بنادیا اور میں آزاد ہوتے ہوتے دوبارہ قید ہو گیا تھا۔ اگر مجھے اس کی گرفت سے آزادی مل جاتی تو میں حیات کو بھی ناکارہ کرنے کی کوشش کرتا اور اس سے شاٹ گن حاصل کر لیتا تو اس کے بعد دوسروں کو قابو کرنا زیادہ مشکل نہ رہتا۔ مگر ہر خواہش اور کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتی ہے۔



مجھے ہوش آنے لگا تو پہلا احساس شدید تکلیف کا تھا۔ سر میں درد یوں حرکت کر رہا تھا جیسے واٹر بیلون کے غباروں میں پانی حرکت کرتا ہے۔ بہت تیز اور تند انداز میں۔ ایسے ہی درد کھوپڑی کی شاید بہت ہلکی ہو جانے والی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی کھوپڑی تو ڈکر پانی کی طرح بہہ نکلے گا۔ میں نے اٹھنے یا آنکھیں کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ میں درد کے قابل برداشت ہونے کا انتظار کر رہا تھا ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے آنکھ کھولی یا اٹھا تو درد کی شدت مجھے دوبارہ بے ہوش کر دے گی۔ اس وقت مجھ سے سوچا بھی نہیں جا رہا تھا اس لیے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے اور میرے سر پر کیا قیامت گزری ہے؟ شاید اس وقت بھی اپنی شخصیت بھی یاد نہیں تھی۔ میں سب بھولا ہوا تھا بس درد اور تکلیف کا احساس تھا۔ میں سانس بھی لیتا تو درد بھرجاتا اس لیے سانس بھی بہت سنبھل کر اور آہستگی سے لے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ درد میں کمی آنے لگی۔

میں سوچنے کے قابل ہوا تو مجھے سب سے پہلے یہ یاد آیا کہ میں کون ہوں اور پھر یاد آیا کہ میرے ساتھ ہوا کیا تھا؟ مجھے آغاز سے دھوکا دیا جا رہا تھا اور اس دھوکے میں میاں ممتاز بھی شامل تھا۔ نہایت چالاکی سے مجھے باور کرایا گیا کہ ہر ہفتے میرے جسم سے صرف نصف لیٹر خون لیا جائے گا۔ مگر اس طرح سے یقیناً نصف لیٹر سے زیادہ ہی خون لیا جا رہا تھا۔ نصف لیٹر تو بے ظاہر لیا جاتا۔ بڈ کے اندر خالی حصے میں کوئی پہلے سے موجود ہوتا تھا اور جب میں سیدھا لیتا جاتا تو وہ چھوٹا سا خانہ کھول کر تھیلی کو تھکی سمیت اندر کھینچ لیتا اور تھکی کو الگ کر کے دوسری تھیلی سے لگا دیتا تھا۔ جب وہ بھر جاتی تو تھکی دوبارہ نصف لیٹر والی تھیلی سے لگا دیتا اور دوبارہ اس کی جگہ لگا کر خانہ بند کر دیتا۔ ڈاکٹر چالاکی سے اسٹاپر کو پورا کھول دیتا تھا اور مجھے علم ہی نہیں ہوتا تھا کہ میرا کتنا خون لیا جا رہا تھا۔ اسی وجہ

سے میں دوسری بار ہی خون دے کر کمزوری محسوس کرنے لگا تھا اور تیسری بار تو میں واضح کمزور ہوا تھا۔ اس دن مجھے نہیں معلوم کہ میرا کتنا خون نکالا گیا تھا۔ سر کی چوٹ نے مجھے ویسے ہی کمزور کر دیا تھا اس لیے بھی میں اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ خون نکلنے سے ہونے والی کمزوری کتنی ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس بار ہر دفعہ میرا ڈیڑھ لیٹر خون نکالا گیا تھا۔ ورنہ پچھلی بار ایک لیٹر خون دینے سے اتنی کمزوری نہیں ہوئی تھی اس لیے لازمی اس سے زیادہ خون لیا جا رہا تھا۔

درد اب قابل برداشت حد میں آ گیا تھا۔ اس لیے میں نے پہلے آنکھیں کھولیں۔ میں ایک تاریک کمرے میں تھا۔ دیواروں کا رنگ کبھی سفید تھا مگر اب میلا ہو گیا تھا۔ چھت پر لکڑی کی بلیوں کے سہارے سینٹ شیٹ کی چھت تھی۔ میں ایک کھات نما بستر پر پڑا تھا جس پر پتلا سا گدا تھا اور اس سے ناگوار سی بو اٹھ رہی تھی۔ میری طبیعت ایسی ہو رہی تھی کہ یہ ہلکی سی بو بھی چھ رہی تھی۔ میں یقیناً ممتاز ہاؤس میں نہیں تھا وہاں اس جیسے کمرے کا تصور بھی محال تھا۔ کمرہ بہت چھوٹا تھا۔ شاید دس بائی آٹھ کا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب میں درد میں اضافے کا خطرہ مول لیے بغیر اٹھ سکتا ہوں تو میں اٹھ بیٹھا اور فوراً ہی لیٹ گیا تھا۔ سر چکرایا تھا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا تھا۔ یقیناً میرا اتنا خون نکال لیا گیا تھا کہ میں کمزوری کا شکار ہوا تھا اور اس کے بعد میری توانائی کیا بحال کی جاتی اٹنا مجھے سر پر چوٹ برداشت کرنا پڑی تھی۔ میں نے سر چھوا تو کنپٹی سے کھال پھٹ گئی تھی یہاں ہلکے بال تھے اس لیے چوٹ شدید آئی تھی اور خون بہہ کر جم گیا تھا۔

کچھ دیر بعد میں ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ اگر میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں لیٹا ہی رہتا۔ دشمن کی قید میں رہتے ہوئے آرام کرنا عقل مندی نہیں تھی۔ کھڑا ہوا تو چکر آیا تھا مگر میں نے دیوار کا سہارا لے لیا۔ بستر لکڑی کا تخت تھا جس پر ردی کا پتلا سا گدا بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف چھوٹے سے روشن دان سے دن کی روشنی جھلک رہی تھی۔ روشن دان زمین سے سات فٹ سے زیادہ اوپر نہیں تھا اور تقریباً چھت سے لگ رہا تھا۔ فرش کچے سینٹ کا تھا۔ بظاہر یہ جگہ کسی دیہاتی ڈیرے میں لگ رہی تھی اور اندازہ بھی غریبانہ تھا۔ ابھی میری حالت بہتر نہیں ہوئی تھی اور سر کا درد ورہ کر اٹھ رہا تھا۔ چکروں میں کمی آئی تھی مگر یہ اب بھی ذہن پر حملہ کر رہے تھے۔ کسی ایڈ ونگر سے پہلے ضروری تھا کہ میں اپنی حالت بہتر کر لوں۔ اس لیے واپس تخت پر بیٹھ گیا اور سانس کی مشق کرنے لگا۔

اب سوال یہ تھا کہ حیات نے مجھ پر قابو پا لیا تھا تو وہ مجھے کہاں لے آیا تھا اور یہاں کس کی اجازت سے عقل کیا گیا تھا۔ ممتاز ہاؤس میں قید خانوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جس کمرے میں میں تھا وہ بھی اچھا خاصا قید خانہ تھا۔ جب مجھے ایسی کسی جگہ منتقل کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ کیا یہ میاں ممتاز کے حکم سے ہوا تھا؟ اگر وہ مجھے اپنی قید مار کھنا چاہتا تھا تو کسی اور جگہ بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سانس کی مشقوں سے میری حالت خاصی بہتر ہوئی تھی اب میں بہتر طور پر سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بہتر ہو رہی تھی یہ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اس کارروائی میں شاید میاں ممتاز کا اتنا ہاتھ نہیں تھا۔ اس کے پس پشت حیات اور وہ لڑ تھا جو میرے ہاتھوں جنم رسید ہوا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس میں ان کا کیا مفاد تھا تو اس کا جواب بہت سادہ ان کا مفاد نوٹ تھے اور یہ نوٹ انہیں راج کنور سے ملے تھے اس لیے وہ معاہدے سے ہٹ کر میرا زیادہ سے

زیادہ خون نکالنے پر راضی ہو گئے تھے اور یہ سارا کام میاں ممتاز اور مجھ سے چمپا کر کیا جا رہا تھا۔ ان کی بد قسمتی کہ میں نے گڑبڑ بھانپ لی اور پھر اسے دیکھ بھی لیا۔ ڈاکٹر کی وفات نے الگ مصیبت پیدا کر دی ہوگی۔ اس لیے حیات نے مناسب سمجھا کہ مجھے ممتاز ہاؤس کہیں اور منتقل کر دے اور یہ کام اس کے لیے مشکل نہیں تھا وہ میاں ممتاز کا معتمد ترین شخص تھا اور یقیناً ممتاز ہاؤس کے بہت سارے رازوں سے واقف تھا۔ ممکن ہے وہ خفیہ راستے سے بھی واقف ہو جس کے بارے میں بنٹی کا یقین سے کہنا تھا کہ صرف وہی تین اس کے بارے میں جانتے تھے لیکن پہلے بانو اور پھر میری گمشدگی سے واضح تھا کہ کوئی اور بھی اس راستے سے واقف تھا۔ بانو سے مجھے خیال آیا اور میں چونک گیا۔ کہیں بانو کی گمشدگی میں بھی حیات کا ہاتھ تو نہیں تھا۔ وہ جس طرح جم میں بانو کے میرے ساتھ اکیلے ہونے پر خار کھاتا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ شاید اس کی بانو پر نظر تھی اور جب یہ بات اس کی برداشت سے باہر ہوگئی تو اس نے اسے غائب کر دیا۔

حیات کسی طرح یہ رسک نہیں لے سکتا تھا کہ میں اس کا پول کھول دوں۔ وہ میاں ممتاز کا کتنا ہی معتمد سہی لیکن اگر وہ غدار نکل آتا تو اس کا انجام عبرت ناک ہی ہوتا۔ اب ممکنہ طور پر حیات نے ڈاکٹر کی موت میرے کھاتے میں ڈال کر مجھے مفروضہ ظاہر کیا ہوگا۔ نرس زندہ تھی لیکن وہ اس کام میں برابر کی شریک تھی اس لیے وہ کسی صورت حقیقت نہیں اگل سکتی تھی۔ کچھ دیر آرام کے بعد میری حالت اتنی بہتر ہوگئی تھی کہ میں روشن دان تک آیا اور دونوں ہاتھ اس کے کنارے پر جما کر خود کو اوپر کیا اور باہر جھانکا۔ اس طرف شاید چھوٹا مچن تھا کیونکہ سامنے ایک دیوار دکھائی دے رہی تھی اور نیچے کچی زمین تھی۔ کچرہ سا پڑا تھا جیسے وہاں صفائی معمول نہ ہو اور دیوار کچی مٹی کی تھی۔ اگر یہ کسی احاطے کی دیوار تھی تو یہ بہت معمولی سا ڈبرہ تھا۔ شاید مجھے اس لیے یہاں رکھا گیا کہ کسی کا شک اس طرف نہ جائے۔ یہ تو طے تھا کہ اگر میرے فرار کی کہانی سنائی گئی تھی تب بھی میاں ممتاز کے آدمی مجھے شکاری کتوں کی طرح قرب و جوار کے علاقوں میں تلاش کر رہے ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ میں ان کی پہنچ سے دور ہی ہوں گا۔ یہ جگہ محفوظ ہوگی اس لیے ہی حیات نے مجھے یہاں رکھا تھا اسے یقین ہوگا کہ نہ تو کوئی مجھے یہاں تلاش کر سکے گا اور نہ میں یہاں سے فرار ہو سکوں گا۔

میاں ممتاز کے شکاری کتوں کے ساتھ ہی مجھے بیٹو کا خیال آیا اور میں جو کسی قدر سکون میں آ گیا تھا پھر سے مضطرب ہو گیا۔ اگر حیات نے میری گمشدگی کو فرار بتایا ہوگا تو اس وقت بیٹو اس کی سزا بھگت رہا ہوگا۔ میاں ممتاز کے نزدیک بیٹو مجھ پر صرف دباؤ ڈالنے کا ایک حربہ تھا اور اس کی کوئی اور اہمیت نہیں تھی۔ میں اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کی راج کنور سے مفروضہ ذیل خطرے میں پڑتی تو اس کا انتقام بیٹو سے لیا جاتا۔ وہ یقیناً اس وقت مشکل سے گزر رہا ہوگا۔ ممکن ہے میاں ممتاز نے اسے فوری کوئی تکلیف نہ دی ہو لیکن اگر میں اسے نہ ملتا یا اسے حقیقت کا پتا نہ چلتا تو بیٹو اس کے لیے بے مصرف ہو جاتا اور ایسے لوگ بے مصرف چیزوں اور انسانوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میرے جسم میں خوف کی سرد لہری دوڑ گئی تھی۔ پتا نہیں دسم اور عبداللہ کی تلاش کہاں تک پہنچی ہوگی یہ بات تو یقینی تھی کہ وہ پوری کوشش کر رہے ہوں گے۔ دسم اب تک لازمی واپس آچکا ہوگا میری گمشدگی کا سن کر اس کے لیے حویلی میں بیٹھے رہنا ممکن ہی نہیں تھا اس کا زخم بھی تک بھر گیا ہوگا اس لیے وہ پوری سرگرمی سے میری تلاش میں ہوگا۔ اگر وہ اب بھی ہتلا لیس تو کم سے کم

بیڑ کو چھڑا سکتے تھے۔

میں واپس تخت پر آکر بیٹھ گیا بلکہ لیٹ گیا۔ باہر کی روشنی سے ایسا لگ رہا تھا کہ سورج مغرب کی طرف جھلکا شروع ہو گیا تھا یعنی دوپہر کے دو یا تین بج رہے تھے اور اس بند کمرے میں کسی قدر گرمی تھی۔ میرے جسم پر وہی لباس اور جوتے تھے جو میں نے بے ہوش ہوتے ہوئے پہنے تھے۔ کمرے کے باہر اور آس پاس خاموشی تھی۔ میں نے اب تک جو حرکت کی تھی وہ بنا آہٹ کے کی تھی۔ ممکن ہے جیسے میں خاموش تھا اسی طرح کوئی باہر بھی خاموشی سے موجود ہو اور اگر میں کوئی آواز پیدا کروں تو وہ جان جائے کہ میں ہوش میں آ گیا تھا جب کہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ سر کا درد بہتر تھا لیکن اب مجھے پیاس لگنے لگی تھی اور ہر گزرتے لمحے اس کی شدت میں اضافہ ہو رہا۔ خون لگنے سے میرے جسم میں دیسے ہی پانی کی کمی ہوئی تھی۔ پھر گرم موسم اور پھر سر کی چوٹ، یہ سب مل کر پیاس کو رفتہ رفتہ انتہا کی طرف لے جا رہے تھے۔ مگر میرے پاس سوائے برداشت کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ پانی حاصل کرنے کے لیے مجھے دروازہ بجانا پڑتا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ قید کرنے والوں کو میرے ہوش کی خبر ہو۔ اگر تین بج رہے تھے تو مجھے بے ہوش ہوئے پونے نو گھنٹے ہو گئے تھے۔ یہ مدت کافی سے زیادہ ہوتی ہے اور میری طویل بے ہوشی دیکھنے کے لیے کسی نہ کسی کو آتا تھا۔

مگر ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے یہاں ڈالنے والے جیسے ڈال کر بھول گئے تھے۔ یہاں شاید کوئی نہیں تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا کہ یہاں کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے میں ہتھیار کا کام لے سکوں لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ تخت کیکر اور پڑتلی کی لکڑی کا بنا ہوا تھا اور یہ ساری لکڑی نہایت مضبوطی سے آپس میں جڑی ہوئی تھی میں خالی ہاتھ سے تخت سے لکڑی الگ نہیں کر سکتا اور اگر میں کوشش کرتا تو اس سے بہت شور ہوتا۔ باقی کمرہ خالی تھا۔ تخت کے نیچے تاریکی تھی لیکن میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر تسلی کر لی تھی کہ وہاں کچھ نہیں تھا سوائے مدتوں سے جمع ہونے والی گرد کے۔ یہاں شاید صفائی کا کوئی رواج نہیں تھا اس لیے کوٹری گرد آلود ہو رہی تھی۔ بستر شاید اس لیے صاف تھا کہ استعمال ہوتا تھا ورنہ اس پر بھی مٹی جمی ہوتی۔ مگر گدے سے آتی بو بتا رہی تھی کہ اسے استعمال کرنے والا کوئی گندہ آدمی تھا ورنہ انسان اپنے ذاتی استعمال کی چیز تو صاف رکھ سکتا ہے۔ یہ کوٹری اور اس کا محدود سامان بتا رہا تھا کہ یہاں کوئی بہت ہی نچلے طبقے کا فرد رہتا ہے۔

نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں عارضی طور پر یہاں قید کیا گیا تھا۔ ورنہ یہ جگہ باقاعدہ قید خانہ نہیں تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد میں نے دوبارہ روشن دان سے جھانک کر دیکھا تو صحن میں کسی درخت کا طویل ہوتا سا یا نظر آیا۔ اس سے لگ رہا تھا کہ سورج واضح طور پر مغرب کی طرف جھک چکا تھا۔ کچھ دیر میں سورج غروب ہو جاتا اور یہاں اندیرا چھا جاتا جب کہ یہاں بجلی بھی نہیں تھی۔ کم سے کم اس کوٹری میں مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی ایک طرف دیوار سے لٹکی ہوئی کھوٹی تھی جس سے شاید لاشیں لٹکائی جاتی ہوگی۔ میں نے احتیاط سے دروازہ ہلانے کی کوشش کی لیکن یہ نہایت مضبوط لکڑی سے بنا دو پٹ کا دروازہ تھا جس میں کہیں خلا بھی نہیں تھا کہ باہر جھانکا جاسکتا۔ اگر اس میں لکڑی لگی تھی تو وہ خاصی بڑی اور مضبوط تھی جس نے دروازے کو مکمل طور پر بند کر دیا تھا۔

کچھ دیر میں اندیرا چھا گیا۔ رات بہت تیزی سے آئی تھی۔ اندر تو تقریباً تاریکی تھی بس روشن دان سے

کسی قدر روشنی چمک رہی تھی جو ستاروں کی تھی۔ چاند کی ابتدائی تاریکیں تھیں اور ابھی چاند نکلا بھی نہیں تھا اس لیے روشنی بہت کم تھی۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی تھی کہ کیا مجھے اس جگہ بند کر کے وہ لوگ بھول گئے تھے۔ اتنی دیر میں مجھے نہ تو کسی انسان کی آواز آئی تھی اور نہ کسی جانور کی، کبھی کبھی کسی پرندے کی آواز آتی تھی۔ ہوا میں نباتات کی مہک تھی۔ مگر کوئی مخصوص خوشبو نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ جگہ کسی ویرانے میں تھی۔ ایک بار میں نے تخت پر کھڑے ہو کر چھت پر زور آزمائی کی لیکن وہ بھی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ سینٹ کی شیٹ مضبوط تھی لیکن ساتھ ہی ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر خاصا بوجھ رکھا ہوا تھا اور اسے اٹھانا میرے بس کی بات نہیں تھا۔ تھک ہار کر میں لیٹ گیا اور اپنی توانائی برقرار رکھنے کے لیے سانس کی مشق کرنے لگا۔ اس سے میرے سر درد میں بہت افادہ ہوا تھا۔ مگر اس قید سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

اچانک ہی ایسا لگا کہ کہیں دور کوئی بول رہا ہے۔ پہلے میں اسے اپنا وہم سمجھا تھا لیکن جب آواز دوبارہ اور واضح آئی تو میں اٹھ بیٹھا۔ یہ دو افراد تھے۔ ان میں سے ایک بلند آواز میں بول رہا تھا اور دوسرا جیسی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ بلند بولنے والا اسے لتھاڑ رہا تھا کہ وہ نشہ کر کے سو رہا تھا اگر قیدی یعنی میں فرار ہو جاتا تو باپوان دونوں کی کھال کھینچ لیتا۔ جیسی آواز والا منمننا کر وضاحت کر رہا تھا۔ یعنی میں یہاں اکیلا نہیں تھا بلکہ ایک عدد مگر ان تھا اور وہ سو رہا تھا۔ آنے والا کوٹھری کے پاس آیا۔ مگر اس نے کوٹھری کھول کر اندر جھانکنے کی زحمت نہیں کی کہ میں کس حال میں تھا۔ دونوں پنجابی میں بات کر رہے تھے اور مجھے ان کی انداز میں کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ آنے والے نے کسی بابو کا ذکر کیا تھا جو ان دونوں کی کھال کھینچ لیتا اگر یہ خاکسار کوشش کر کے یہاں سے شارٹ ہو جاتا۔ مگر میں نے موقع کنوا دیا کہ کوشش ہی نہیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ مجھے یہاں حیات نے قید کیا لیکن یہاں کوئی بابو نکل آیا کیا وہ حیات کا گرگ تھا۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ میری یہاں موجودگی کے پیچھے حیات کا ہاتھ تھا۔ اب پیاس ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ پھر باہر دو افراد کی موجودگی بھی ثابت ہو گئی تھی اور ان کا اندر آنے کا کوئی ارادہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں آزاد ہونے کی ایک کوشش ہی کرتا۔ اس لیے اب میں نے دروازہ بجانے میں کوئی تکلف نہیں کیا اور ایسے بجایا جیسے توڑنے کی کوشش کر رہا ہوں بلند آواز والا بوکھلا کر آیا۔ ”اوئے کی ہے آرام نال بہ۔“

”مجھے پانی دو۔“

”کوئی پانی نہیں اے۔“

”تب میں اسی طرح دروازہ بجاتا رہوں گا۔“ میں نے کہا اور پھر دروازہ پینے لگا۔ اگرچہ میرا ہنذا دماغ خراب ہو رہا تھا مگر میں مستقل مزاجی سے بجاتا رہا۔ حتیٰ کہ بلند آواز نے چلا کر کہا۔ ”اوئے لاتا ہوں..... بند کر شور۔“

میں نے ہاتھ روک دیا۔ میرا خیال تھا کہ دروازہ کھلے گا۔ مگر اس کے بجائے دروازے کے اوپری حصے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی۔ مشکل سے دس بائی سات انچ کی اس کھڑکی کو الگ سے پت میں ایک تختہ لگا کر بنا گیا تھا اور پتا نہیں اس کا کیا مقصد تھا بہر حال اس سے اس وقت ایک گلاس سامنے آگیا۔ ”لے پانی بن چپ کر کے پیئیں۔“

یہ بڑا ساجیل کا گلاس تھا جیسا کہ عام طور سے گاؤں دیہات میں کسی یاد دودھ پینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گلاس کے پیچھے ایک ہاتھ تھا لیکن بندہ کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے فوری پانی نہیں پیا حالانکہ پیاس ایسی تھی کہ میں پورا گلاس ایک بار میں پی جانا چاہتا تھا۔ مگر میں دل پر جبر کر کے چسکی لینے کے انداز میں تھوڑا تھوڑا پینے لگا۔ اگر میں ایک ساتھ پیتا تو عین ممکن تھا خالی پیٹ مجھے الٹی ہو جاتی۔ اس طرح میری پیاس میں کمی آئی اور سر کا درد بھی بہتر ہوا تھا۔ نصف گلاس بچا کر ایک طرف رکھ دیا۔ میں نہ جانے کیسے لوگوں کے قبضے میں تھا جو مجھے بعد میں پانی دیتے بھی یا نہیں۔ پانی پی کر میں نے ایک بار پھر دروازہ بجایا۔ پہلے تو کوئی اثر نہیں ہوا مگر دوبارہ بجانے پر دھیمی آواز والے نے پوچھا۔ ”کیا اے تینوں چین میں اے۔“

”مجھے یہاں کون لایا ہے اور یہ کون سی جگہ ہے۔“

”چپ کر کے بیٹھ۔“ اس نے گھرک کر کہا۔ ”ہن ہوانہ کھڑکائیں۔“

مجھے اس کی زبان میں پھر کوئی بات عجیب لگی تھی۔ مگر اس وقت میں سمجھا نہیں تھا۔ ”ٹھیک ہے اب میں دوبارہ نہیں بولوں گا لیکن اگر کھانے کو کچھ دے سکتے ہو دے دو۔“

اس نے جواب نہیں دیا مگر چند منٹ بعد دروازے کے اوپر والی کھڑکی کھلی اور ایک چنگیز اندر آئی۔ جیسے ہی میں نے چنگیزی کھڑکی بند ہوگئی۔ روشن دان سے آتی ہلکی روشنی میں میری آنکھیں کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہوگئی تھیں مگر پھر بھی چیزوں کو باریکی سے نہیں دیکھ سکتا تھا بس ہولے سے دکھائی دے رہے تھے اس لیے مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ چنگیز میں کیا ہے؟ میں نے نٹول کر دیکھا تو روٹی کے ساتھ کچھ اچار تھا۔ روٹی وہی انداز کی تھی یعنی موٹی اور تندور کی لگی تھی اور کم سے کم چوبیس گھنٹے کی باقی تھی۔ بہر حال کھانے کے قابل تھی۔ پھر اچار کے ساتھ اس نے رہ دیا تھا۔ جب میں نے کھانا شروع کیا تو مجھے پتا چلا کہ میں کس قدر بھوکھا تھا دیکھتے ہی دیکھتے دونوں روٹیاں میرے پیٹ میں منتقل ہوگئی تھیں۔ کھا کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور تخت پر دراز ہو گیا۔ حالات کے بارے میں سوچتا رہے گا رہتا رہتا ہوتا سامنے آ جاتا۔ ایک بار میں نے کھڑکی والے حصے پر زور آزمائی کی لیکن وہ بھی دروازے جتنی مضبوط ثابت ہوئی تھی۔

نصف رات کو میری پیاس سے آنکھ کھلی تو اس نصف گلاس پانی نے مجھے سہارا دیا تھا گریں آغاز میں اسے پی جاتا تو اس وقت مارے پیاس کے مجھے دوبارہ نیند نہیں آتی۔ نیند نے میری طبیعت کو تقریباً ٹھیک کر دیا تھا۔ جب میں صبح کے قریب اٹھا تو میرے سر کا درد ختم ہو چکا تھا اور اب کمزوری بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بھوک پیاس کا احساس تھا لیکن یہ قابو میں تھا۔ روشن دان سے باہر صبح کی روشنی نمایاں تھیں۔ سورج نہیں نکلا تھا مگر نکلنے والا تھا۔ میرے سر کا زخم خشک ہو رہا تھا البتہ خون کے کٹڑے جھے ہوئے تھے اور انہیں صاف کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ مجھے یہاں تک لانے والے یا تو نہایت بے حس اور انسانیت سے عاری لوگ تھے یا پھر وہ اتنی جلدت میں تھے کہ انہیں میرے زخم کو صاف کرنے کا ہوج نہیں ملا اور وہ مجھے یہاں ایسے ہی ڈال کر چلے گئے تھے۔ مجھے سات آٹھ گھنٹے بعد ہوش آیا تھا اور اس دوران میں مجھے متنازع ہاؤس سے سینکڑوں میل دور لے جایا جاسکتا تھا۔

مجھے دوسری بات درست لگ رہی تھی کیونکہ اگر حیات راج کنور کے لیے کام کر رہا تھا تو لازمی بات ہے ان لوگوں کو میرے خون کی مزید ضرورت تھی اور وہ مجھے جسمانی طور پر کمزور کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے

تھے۔ یقیناً کوئی ایسی مجبوری تھی کہ وہ مجھے یہاں بے سروسامانی کی حالت میں چھوڑ گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے ہر قیمت پر اسی کوٹھری میں محدود میں رکھنا تھا کیونکہ ان کے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اس سے باہر نکال کر مجھ پر قابو رکھتے۔ بعد میں میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ صرف یہی کوٹھری مجھے قید رکھ سکتی تھی۔ کیونکہ کھانا پانی بہت کم میرے پیٹ میں گیا تھا اس لیے ابھی تک اخراج کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا مگر میں نے اس کا شور کرنا مناسب سمجھا اس طرح شاید مجھے باہر جانے کا موقع ملتا۔ میں نے دروازہ بجایا تو اسی دھیمی آواز والے نے غنودگی کی کیفیت میں پوچھا۔ ”ہن کی اے؟“

میں نے اسے دیہاتی زبان میں بتایا کہ مجھے کیا تکلیف تھی اور اس کے لیے مجھے یہاں سے باہر نکالنا ضروری تھا مگر اس نے انکار کر دیا۔ ”اندر ہی کر لے۔“

”تمہارا دماغ درست ہے۔“ میں نے بھنا کر کہا۔ ”یہاں کچھ کیا تو میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔“
 ”میں ہو گا۔“ وہ بدستور پہلے کے سے انداز میں بولا۔ اس نے کوئی نشہ کر رکھا تھا۔ ”میں نہیں کھول سکتا، باہر تالا پیا اے، چابی میرے کول نہیں اے۔“
 ”اچھا مجھے پانی اور کچھ کھانے کو تو دو۔“

اس نے کھڑکی کھولی۔ ”گلاس دے، میں پانی لے آؤں، پر ہن کھانے کو کچھ نہیں اے۔“
 میں نے اسے گلاس تھمایا تو اس نے بھر کر پانی لا دیا۔ میں نے اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک طرف تھا۔ مجھے بس ایک جھلک دکھائی دی۔ وہ سیاہی مائل شخص تھا۔ چہرے پر گھٹی داڑھی تھی۔ اس بار بھی میں نے بہت احتیاط سے پانی پیا۔ اس لیے نہیں کہ پانی ملنے کا امکان نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ اخراج کے مسئلے کو تا دیر تالا جاسکے۔ میں نے چٹون کی جیب ٹٹولی تو اتفاق سے اس میں رکھا ہوا رمال نکل آیا۔ میں نے اسے پانی سے بھگوایا اور اپنی کنپٹی پر جمادھن صاف کرنے لگا۔ میری توقع کے عین مطابق چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد اندر کا زخم تقریباً خشک ہو گیا تھا صرف اوپر خون لگا ہوا تھا۔ وہ صاف ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب زخم بھی قابل توجہ نہیں رہا ہو گا کوئی غور سے دیکھے گا تو اسے محسوس ہو گا ویسے بھی وہ بالوں تلے تھا۔ اس موالی نے خوشخبری سنا دی تھی کہ اب کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ اس لیے میں مزید کی توقع نہ رکھو۔ بہر حال دو بڑی تندوری روٹیاں کھانے کے بعد اب میں شام تک رہ سکتا تھا۔

میں دوبارہ لیٹ گیا اور آرام کرنے لگا۔ جب ذہن پر سوچوں کی یلغار ہوتی تو سانس کی مشق کرتا اس سے ذہن پرسکون ہو جاتا۔ روشن دان سے باہر روشنی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ صبح دروازہ بجانے پر موالی کے آنے سے لگتا تھا کہ بلا آواز والا یہاں نہیں تھا شاید وہ صرف دیکھنے آیا تھا اور رات کو ہی یہاں سے چلا گیا تھا۔ اب یہاں موالی چوکیدار کے طور پر موجود تھا۔ مجھے یہاں بند کرنے والوں کو یقین تھا کہ میں کسی صورت یہاں سے نہیں نکل سکوں گا۔ سوائے اس کے کوئی میری باہر سے مدد کرے اور باہر سے مدد کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے ہی مجھے یہاں رکھا گیا تھا۔ اب تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب تھے۔ باہر میری تلاش جاری تھی اور شاید اس کھنڈر نما احاطے کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا ہو گا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر میاں ممتاز کے آدمی مجھے تلاش کر رہے ہوئے تو وہ مجھے لاہور جانے والی سمت میں تلاش کرتے کیونکہ آزاد ہوتے ہی میں شہر جانے کی کوشش کرتا۔ تاکہ اپنے

ساتھیوں سے رابطہ کر سکوں۔

میرا ذہن الجھنے لگا۔ اگر مجھے میاں ممتاز سے بچانے کے لیے یہاں رکھا گیا تھا تو اب خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر ان لوگوں کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ جب میں لیٹے لیٹے تھک گیا تو اٹھ کر کوٹھری میں چہل قدمی کی کوشش کی۔ اسے کوشش ہی کہا جاسکتا تھا یہاں چہل قدمی کی محجاش نہیں تھی۔ میں دروازے کے پاس تھا تو مجھے لگا جیسے باہر کوئی دور سے کچھ کہہ رہا ہو۔ آواز باریک سی تھی مگر میں نے سنی تھی۔ میں نے دروازے سے کان لگایا۔ آواز بس ایک لمحے کو آئی تھی۔ اگر یہ سچ کچ کسی کی آواز تھی تو اسے دوبارہ آنا چاہیے تھا۔ مگر جب کئی منٹ گزرنے کے باوجود آواز نہیں آئی تو میں نے دروازے سے سر ہٹانا چاہا اور اسی لمحے مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

”خدا کے لیے مجھے پانی دو۔“

آواز بہت مدہم اور دور کی تھی لیکن الفاظ صاف سنائی دیے تھے۔ میں شناخت نہیں کر سکا کہ آواز بانو کی تھی یا نہیں کیونکہ اس میں ایک تھکن اور درد والی کیفیت بھی شامل ہو گئی تھی۔ پھر وہ پوری قوت سے بول رہی تھی اور ایسے میں آواز کا تبدیل ہونا لازمی تھا۔ بانو کا ذکر میں نے یوں کیا کہ یہ نسوانی آواز سنتے ہی میرے ذہن میں بانو کا خیال آیا تھا۔ وہ بھی میری طرح غائب تھی۔ اس لیے یہاں اس کی موجودگی بھی عین ممکن تھی۔ مجھے پہلے بھی حیات پر شبہ تھا کہ بانو کی گشدگی میں اس کا ہاتھ تھا اور وہ جس طرح مجھے ممتاز ہاؤس سے نکال کر لے گیا تھا اس سے یہ شبہ تقریباً یقین کو پہنچ گیا تھا۔ اس لیے عورت کی آواز سنتے ہی مجھے بانو کا خیال آیا۔ میں واپس آتے آتے رک گیا اور دوبارہ کان دروازے سے لگا دیا۔

عورت کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خاصی دور تھی۔ میرا نہیں خیال تھا کہ یہ احاطہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں کسی کو دور بھی رکھا جاتا ہو۔ یہ تاثر کوٹھری کا سائز اور روشن دان سے نظر آنے والے صحن سے آیا تھا لیکن اس کا بھی امکان تھا یہ احاطہ خاصا بڑا ہوتا اور اس میں کہیں اور بھی تعمیرات ہوتیں۔ جہاں کسی اور کو رکھا جاسکتا تھا۔ عورت کی آواز پھر نہیں آئی مگر اس کے ایک جملے سے واضح تھا کہ وہ تقریباً میری جیسی صورت حال سے دوچار تھی اور شاید اس کا کھانا پانی بھی بند تھا۔ یہاں پانی تھا مگر موالی کو اٹھ کر دیتے ہوئے موت آتی تھی۔ کھانے کا اس نے منع کر دیا تھا اور اس کا کسی صورت پتا نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا اسے کھانا دیتے ہوئے بھی موت آ رہی تھی۔ میں نے بے دھڑک شور مچا دیا تھا مگر اس عورت میں شاید اس کی جرأت نہیں تھی اور وہ صرف فریاد کر رہی تھی۔ جب دوبارہ اس کی آواز نہیں آئی تو میں بھی آکر بستر پر لیٹ گیا۔

دوپہر ہو چکی تھی اور رات کا کھانا مہضم ہو چکا تھا اس لیے معدے نے فریاد شروع کر دی تھی مگر یہ اب بلند آہنگ نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے شور کرنا مناسب سمجھا۔ دروازہ بجانے پر موالی آیا اور ٹھگی سے بولا۔ ”تیوں چین نہیں اے۔“

”مجھے کچھ کھانے کو دو ورنہ میں اسی طرح شور کرتا رہوں گا۔“ میں نے مکث حد تک بلند آواز میں کہا۔

”ہن کج نہیں اسے۔“

”نہیں ہے تو منگواؤ، ورنہ میں دروازہ بجاتا رہوں گا۔“

”میں سر توڑ دیاں گا۔“

”اس کے لیے تمہیں اندر آنا پڑے گا اور ایک بار تم اندر آ گئے تو تمہارا صرف سر نہیں ٹوٹے گا میں گردن بھی توڑ دوں گا۔“

”اوہ میرے بیو، میں دی بھوکا واں۔“ اس نے عاجزی سے کہا۔

”تم یہاں اکیلے ہو؟“

”وہ محتاط ہو گیا۔“ ”توں کیوں بچھریا ایس؟“

”میں نے ابھی کسی عورت کی آواز سنی تھی وہ پانی مانگ رہی تھی۔“

”اس نوں وی پانی دے دیتا اے۔“

”تم یہاں چوکیدار ہو؟“

”آہو۔“ وہ جان چھڑانے کے انداز میں بولا۔ ”ہن مینوں تنگ نہ کریں۔“

”تم اس عورت کو جانتے ہو۔“

”نہیں جی اس نوں وی تیری طرح لائے سی۔“

”کون؟“

اس نے صاف انکار کیا۔ ”اے میں نہیں دس سکدا۔“

”اچھا لڑکی نے نیلی فراک پہنی ہے جس پر پیلے پھول کاڑھے ہوئے ہیں؟“

”وہ حیران ہوا۔“ ”تینوں کیوں پتا چلیا۔“

”وہ میری ساتھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے تم غریب آدمی لگ رہے ہو ہمیں یہاں لانے والے جرائم

پیشہ ہیں۔ اگر کوئی مصیبت آئی تو تم مارے جاؤ گے اور یہ بچ جائیں گے۔“

”کیسی مصیبت؟“ وہ فکر مند ہو گیا۔

”فرض کرو ہمیں چھڑانے کے لیے یہاں پولیس نے چھاپہ مارا تو تم ہی پکڑے جاؤ گے۔“

”میں کیوں۔“ وہ بدکا۔

”کیونکہ تم ان کے ساتھی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے یہ جگہ کہاں ہے؟“

”تو نہیں جانتا؟“ اس نے الٹا سوال کیا۔

”میں جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا، ویسے یہ میاں ممتاز کا علاقہ ہے؟“

”وہ حیران ہوا۔“ ”کون میاں ممتاز؟“

”تم میاں ممتاز کو نہیں جانتے وہ صوبائی اسمبلی کا ممبر ہے اور بہت بڑا جاگیردار ہے۔“

”اچھے کوئی میاں ممتاز نہیں اے۔“ اس نے صاف انکار کیا۔

اس کا مطلب تھا کہ مجھے کسی بہت دور دراز جگہ لایا گیا تھا امکان یہی تھا کہ میں لاہور کی حدود سے باہر

تھا۔ تبھی صوبائی کومیاں ممتاز کا علم نہیں تھا ورنہ دیہات میں عام طور سے لوگوں کو چالیس کوس تک پائے جالے

والے تمام مشہور افراد اور خاص طور سے سیاست دانوں کی پوری ہسٹری مع خاندانی تاریخ کے زبانی یاد ہوتی تھی۔

جب کہ یہ نام بھی نہیں جانتا تھا۔ اس خیال سے ایک سوال اور پیدا ہوا کہ اگر مجھے اتنی دور لے آیا گیا تھا کہ یہاں

میاں ممتاز کے آدمی نہیں پہنچ سکتے تھے تو پھر اس طرح رکھنے کا کیا جواز تھا؟ اگر حیات راج کنور کے لیے کام کر رہا تھا تو مجھے اس طرح رکھنے کا جواز نہیں تھا۔ اگر وہ میاں ممتاز سے بچ رہا تھا تب بھی ضروری نہیں تھا۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ حیات مجھے انتقاما یہاں لے آیا تھا وہ خود ہانوں کے چکر میں تھا اور اس کے خیال میں میرے ہانوں سے غلط قسم کے تعلقات تھے۔ اسی لیے ہانوں سے جم سے نکال کر میرے ساتھ وہاں رہ جاتی تھی۔ مگر یہ بھی ایک مفروضہ تھا اور یہاں قید رہ کر میں صرف مفروضے قائم کر سکتا تھا حقیقت اپنے وقت پر میرے سامنے آتی۔

اب مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔ آج تک میرے کسی دشمن نے مجھے اتنی بے نیازی سے قید نہیں کیا تھا کہ پلٹ کر پوچھنا ہی بھول جائے۔ ایسا لگ رہا تھا مجھے قریطیہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس قید میں مجھے سوائے بھوک پیاس کے اور کوئی تکلیف نہیں تھی۔ مگر اب میں اس سے لکنا چاہتا تھا اور اس کے لیے باہر موجود کسی مشکل کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔ مگر میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ ان حالات میں ہونا وہی تھا جو میرے دشمن چاہتے یا جو انہوں نے میرے لیے سوچ رکھا تھا۔ دن ڈھلنے لگا۔ دوپہر کے بعد سورج مغرب کی طرف جھکا۔ روشنی کے دائیں طرف مغرب کی سمت تھی اور بائیں طرف مشرق کی سمت تھی۔ اگرچہ مجھے اس معلومات کا فائدہ نہیں تھا۔ جب تک میں آواز نہ ہو جاتا۔ آج بھی ابھی تک کوئی ایسی آواز نہیں آئی تھی جس سے اس جگہ کے بارے میں کچھ اندازہ ہوتا۔ مجھے یاد تھا کہ کل جب بلند آواز والا آیا تھا تب بھی کوئی ایسی آواز نہیں آئی تھی جسے مشین انجن کی آواز سمجھا جاتا۔ وہ پیدل آیا تھا یا سائیکل نما کسی خاموش سواری پر آیا تھا۔ اگر وہ کسی گھوڑے یا جانور پر آیا تھا تب بھی اس نے اسے یہاں سے دور چھوڑا تھا۔

سوچ سوچ کر میرا دماغ خراب ہونے لگا تھا اب تو سانس کی مشق کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے ایسی جھنجھلاہٹ بہت کم محسوس کی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی میں ایسے صبر آزمایا موقوفوں سے دوچار ہوا تھا۔ شاید خون نکالنے سے میں کمزور ہوا تھا اور جب انسان کا جسم کمزور ہوتا ہے تو اس کے اعصاب خود بہ خود کمزور ہو جاتے ہیں۔ بیمار انسان اسی وجہ سے زیادہ غصہ کرتا ہے۔ اوپر سے ان لوگوں کا رویہ بھی ایسا تھا۔ یہ مجھے کسی بوری کی طرح یہاں ڈال کر بھول گئے تھے۔ جب مجھے اپنی جھنجھلاہٹ کا احساس ہوا تو میں اس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اپنا ذہن موجودہ معاملے سے ہٹانے کے لیے اپنے ساتھیوں اور پیاروں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ یہ حربہ بہتر رہا۔ خاص طور سے جب سوچوں کا رخ سویرا کی طرف آیا۔ پھر مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ وقت کس طرح گزر گیا تھا۔

باہر سے آتی آوازیوں نے مجھے چونکایا۔ باہر تاریکی چھا رہی تھی اور کوٹھری کے اندر تاریکی چھا چکی تھی۔ بہت معمولی سا نظر آرہا تھا۔ میں اٹھ کر دروازے تک آیا۔ اس بار بولنے والوں کی تعداد دو سے زیادہ تھی اور پھر ان میں حیات کی آواز سن کر میری رگوں میں خون تیز ہو گیا تھا۔ وہ موالی اور بلند آواز والے سے بات کر رہا تھا۔ شاید وہ ان سے رپورٹ لے رہا تھا کیونکہ اس کا انداز تحکمانہ تھا۔ وہ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ موالی دہلی زبان میں اسے بتا رہا تھا کہ اس دوران میں، میں نے کیا کیا۔ پھر حیات نے حکم دیا۔ ”اسے نکال کر لاؤ۔“

چند لمحے بعد دروازے پر آہنی کھٹ پٹ ہوئی اور تالا و کنڈی کھل گئی۔ دروازہ کھلتے ہی جیسے روشنی کا سیلاب اندر آیا تھا کیونکہ سورج اسی سمت میں غروب ہونے والا تھا اور اس کی آخری کرنیں براہ راست کوٹھری میں

تھس آئی تھیں۔ چند لمحے کے لیے میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ جب میں کسی قدر دیکھنے کے قابل ہوا تو میں نے دو افراد کو سامنے پایا جن کی داڑھیاں بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھیں اور سر پر انہوں نے مخصوص ساخت کی چڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ میں چونک گیا کیونکہ وہ سکھ تھے۔ اب میں سمجھا کہ مجھے ان کی زبان کیوں عجیب لگ رہی تھی وہ سکھوں والی پنجابی بول رہے تھے جو ہماری پنجابی سے کسی قدر مختلف ہوتی ہے۔ یہ فرق الفاظ سے زیادہ بولنے کے انداز کا ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک نے چھوٹی نال والا بریٹا اٹھا رکھا تھا۔ اعشاریہ اڑتیس کا بریٹا دنیا کی چند مہلک ترین پینڈنگوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ بلند آواز والا تھا اس نے مجھے حکم دیا۔ ”باہر آؤ۔“

میں آنکھوں پر ہاتھ رکھتا ہوا باہر آیا۔ میری توقع کے خلاف یہاں بہت بڑا کچا احاطہ تھا اور میں جس کوٹھری میں قید تھا وہ اس احاطے میں بالکل الگ تھلگ تھی۔ اس کے تین اطراف میں بلند قامت درخت تھے اور دور شمالی طرف چند کوٹھریاں اور نظر آ رہی تھیں درمیان میں درختوں تلے کئی چار پائیاں پڑی تھیں اس کے علاوہ یہ احاطہ بالکل خالی تھا جو کم سے کم دو کنال رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ مغرب کی سمت احاطے میں ایک چھوٹا سا لکڑی کا دروازہ تھا۔ چار پائیوں پر حیات کے ساتھ اس کا وہی ساتھی موجود تھا جو ممتاز ہاؤس میں میری نگرانی کرتا تھا۔ گویا وہ غداری میں حیات کے ساتھ شریک تھا۔ لازمی بات تھی حیات اکیلا نہیں تھا بلکہ وہاں اور مجھے وہاں سے بحفاظت اور کسی کی نظروں میں لائے بغیر نکالنے کے لیے اسے یقیناً کئی افراد کی مدد حاصل رہی ہوگی۔ ممکن تھا کہ اس سانولے رنگ کے شخص کے علاوہ بھی وہاں اس کے کئی ایک ساتھی ہوں۔ بلند آواز والے نے مجھے لے جا کر حیات کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں میرا جائزہ لیا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔

”کیا حال ہیں سورما.....؟“

”اللہ کا شکر ہے وہ جس حال میں بھی رکھے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم لوگ اپنے اللہ کا ذکر بہت کرتے ہو۔“ اس کے انداز میں طنز مزید بڑھ گیا تھا۔

میں چونکا۔ ”کیوں تمہارا اللہ نہیں ہے؟“

اس نے میرا سوال نظر انداز کیا اور بولا۔ ”تمہیں اندازہ ہے کہ تم کہاں ہو؟“

الفاظ سے زیادہ اس کے انداز نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا تھا اور میرے اندر ایک سردی لہر دوڑ گئی۔ سکھوں کو دیکھ کر مجھے پہلے ہی خدشہ محسوس ہونے لگا تھا مگر اب یہ شبہ یقین کی حدود میں داخل ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے حیات مجھے مزید وہانے کی کوشش کرتا میں نے لا پرواہی سے کہا۔ ”ہاں شاید میں انڈیا میں کہیں ہوں۔“

حیات نے حیرت سے دیکھا۔ ”تمہیں پروا نہیں ہے کہ تم اب سرحد کے اس طرف ہو۔“

اگرچہ مجھے نانوائے فیصلہ یقین ہو گیا تھا لیکن حیات نے تصدیق کر کے اسے سو فیصد کر دیا کہ میں انڈیا میں ہی تھا۔ ”اگر میرے پروا کرنے سے میں واپس اس طرف جاسکتا تو تم مجھ سے زیادہ پریشان کسی کو نہ پاتے۔“ ”یہاں تمہارے خلاف بے شمار مقدمات ہیں۔“ اس نے ڈرانے والے انداز میں کہا۔ ”ہر کیس میں تم کو کم سے کم سزائے موت ہوگی۔“

”یہاں پاکستانیوں کو بغیر کسی جرم کے بھی سزائے موت ہو جاتی ہے۔“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”اس لیے مجھے ڈرانا بے کار ہے۔ دو میں سے ایک ہی بات ہوگی یا تو میں یہاں سے بچ کر واپس چلا جاؤں گا یا

نہیں بچ سکوں گا۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہو سکتی ہے۔“

میں حیات اور اس کے ساتھیوں کے سامنے خود کو بے خوف ظاہر کر رہا تھا اور درحقیقت مجھے خوف نہیں تھا کیونکہ جو میں نے کہا تھا وہ الفاظ نہیں میرا ایمان تھا لیکن میں فکر مند ضرور ہو گیا تھا۔ جس جگہ اتفاقاً آنے کے بعد میں کتنے جتن کر کے نکلا تھا ایک بار پھر ایک غدار کی وجہ سے وہیں آ پھنسا تھا۔ حیات نے صرف میاں ممتاز سے غدار کی نہیں کی تھی اس نے اپنی زمین سے بھی غدار کی کی تھی۔ غداروں کا انجام اچھا نہیں ہوتا ہے لیکن فی الحال وہ مڑے میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”تم جانتے ہو تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟“

”ظاہر ہے تم راج کور کے زرخید ہو اور یہاں اسی کے لیے مجھے لائے ہو۔ وہاں بھی میرا خون لیا جا رہا تھا اور یہاں بھی تم میرا خون نکالو گے۔“

”اور اس کے بعد.....؟“ اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

”اس کے بعد..... مجھے کسی بھارتی ایجنسی کے حوالے کر دیا جائے گا۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تمہیں خوف نہیں ہے؟“

”کیوں نہیں ہے، جب کہ میں جانتا ہوں کہ ان کے مقابلے میں جنگل کے درندے بھی رحم دل ہوتے ہیں۔ مگر سوال وہی ہے خوف زدہ یا پریشان ہونے سے میری بچت ہو جائے گی۔“

حیات کے علاوہ اس کے دو ساتھی بھی مسلح تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار ریڈی پوزیشن میں رکھے تھے۔ گویا وہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ صرف موالی خالی ہاتھ تھا اور اس کی شاید کوئی حیثیت نہیں تھی اگر میں اس پر قابو پا بھی لیتا تو اس کے مرنے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری بے خونی سے وہ دونوں سکھ متاثر ہوئے تھے خاص طور سے موالی جواب مجھے قابل تحسین نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی ہے؟“

”کون سی بات؟“

”یہی کہ گزشتہ چوبیس گھنٹے سے مجھے یہاں کیوں رکھا گیا ہے اب تک تو مجھے کنور خاندان کے کسی زندان میں ہونا چاہیے تھا۔“

”جلد ایسا ہی ہوگا۔“ حیات نے کہا۔ ”اصل میں مجھے ممتاز ہاؤس کے معاملات منشا کر آنے میں کچھ وقت لگا ہے۔“

”وہاں کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔ ”ویسے میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر کی موت اور پھر فرار کا الزام لگا کر تم صاف بچ گئے ہو گے۔“

وہ مسکرایا۔ ”اتنی آسانی سے نہیں..... میاں ممتاز نے مجھے بھی رگڑ دیا تھا۔ مجھے ایک مصنوعی زخم بھی بنانا پڑا تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح جان چھوٹ گئی۔“ اس نے اپنی قمیص کی آستین الٹ کر زخم دکھایا جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ”تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تمہارے اس طرح غائب ہونے سے میاں ممتاز کس طرح تلملارہا تھا۔“ اب اس کے لہجے میں میاں ممتاز کے لیے کوئی احترام نہیں تھا جب کہ ایک وقت اس نے مجھے دبانے کی کوشش تھی کہ میں میاں ممتاز سے لاپرواہی سے بات کرتا ہوں۔

”مگر تم یہاں ہو، اس طرح غائب ہونے سے میاں صاحب کو شک نہیں ہوگا؟“
 ”ہوتا رہے اب مجھے واپس تو نہیں جانا ہے۔“ اس نے شانے اچکا۔
 ”میرے ساتھی کا کیا ہوا؟“

”وہ میاں ممتاز کے پاس ہے اسے دوسری جگہ رکھا گیا تھا اور وہاں بندے میرے قابو میں نہیں تھے اس لیے اسے نہیں لاسکا ورنہ اسے بھی لے آتا۔“
 ”اسے کیوں؟“

”وہ بھی کنور جی کا مجرم ہے۔ باقی قبائل سے تعلق رکھتا ہے۔“

میں نے سکون محسوس کیا کہ وہ بیٹو کو لانے میں ناکام رہا تھا ورنہ اسے یہاں سوائے موت کے اور کچھ نہ ملتا۔ راج کنور اسے فوری سزا دیتا البتہ مجھے وہ زندہ رکھنے پر مجبور ہوتا۔ اگرچہ میاں ممتاز سے بھی امید نہیں تھی کہ وہ بیٹو سے کوئی اچھا سلوک کرے گا یا اسے آزاد کر دے گا مگر یہاں سے تو بہتر ہی ہوتا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے بلا وجہ اس کوٹھری سے نہیں نکالا گیا تھا۔ شاید حیات مجھے لے جانے کے لیے آیا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا جب وہ اٹھ کھڑا ہوا اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دو۔“

تین گنوں کے سامنے مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا میرا خیال تھا کہ وہ رسی سے ہاتھ باندھیں گے لیکن انہوں نے جدید ترین اسٹیل اور ٹائلون کی بنی ہوئی جھکڑیاں میرے ہاتھ میں ڈال دیں۔ پھر ایسی ہی بیڑیاں بیروں میں ڈالیں۔ ان کے درمیان ایک فٹ کی ٹائلون کی ڈوری تھی میں زیادہ قدم اٹھا کر نہیں چل سکتا تھا۔ جب مجھے باندھ دیا تو حیات نے موالی کو حکم دیا۔ ”اسے بھی لے آ۔“

موالی سچ سچ موالی ہی لگتا تھا وہ بلا پتلا لیکن لمبا اور نہایت غلیظ سکھ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کئی مہینوں سے نہیں نہایا تھا اور اس کے پاس سے بد بو آرہی تھی۔ مجھے یہ سوچ کر کچھ ہورہا تھا کہ اسی نے مجھے کھانا پانی دیا تھا شکر ہے کھانے میں گوشت والی کوئی چیز نہیں تھی ورنہ وہ حرام ہوتی اور مجھے کیا معلوم ہوتا کہ میں کہاں تھا اس لیے میں تو کھا لیتا۔ وہ کونے میں بنی کوٹھریوں کی طرف گیا تو مجھے عورت کا خیال آیا جس کے بولنے کی آواز آئی تھی۔ موالی نے لباس کی حد تک تصدیق کر دی تھی کہ وہ بانو ہی تھی مگر پھر بھی ایک شبہ باقی تھا اور مکمل تصدیق ہونا باقی تھی۔ حیات نے شاید اسے لانے کا حکم دیا تھا۔ میری نظر کوٹھریوں کی طرف تھی۔ موالی نے درمیان والی کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ موالی نے اندر موجود عورت کو بازو سے پکڑ کر باہر نکالنا چاہا تو وہ خوف سے چلانے لگی۔ ”چھوڑ مجھے..... کتے..... ذلیل۔“

اس بار میں نے واضح پہچانا۔ وہ بانو ہی تھی۔ موالی اسے کھینچتا ہوا باہر لایا اور حیات کے پاس لا کر ہلکا سا دھکا دیا وہ لڑکھڑا کر گرنے لگی تھی کہ حیات نے اسے سنبھال لیا۔ مگر اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ ”مت ہاتھ لگاؤ مجھے۔“

حیات نے برا نہیں مانا اور ہنس کر بولا۔ ”اچھا نہیں لگا تا پر جلد تجھے ہر طرح سے ہاتھ لگاؤں گا اور تو مجھے نہیں روک سکے گی۔“

بانو کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ آسانی میں نہیں رہی تھی شاید اسے بھی کھانا پانی نہیں دیا جا رہا تھا۔

مسلسل خوف اور آرام کی کمی نے اس کے چہرے کی رونق ختم کر دی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے آ گئے تھے۔ لباس ملبغا مگر ٹھیک حالت میں تھا صرف کسی قدر میلا ہو گیا تھا۔ اسی طرح اس کے بال بھی کنگھی اور صفائی کے بغیر روکھے ہو رہے تھے ان کی ریٹھی چمک غائب تھی۔ البتہ کسی نے اس سے دست درازی نہیں کی تھی ورنہ اس کا لباس ٹھیک حالت میں نہ ہوتا۔ یہ نفیس قسم کی ہلکی لان تھی جو آسانی سے پھٹ سکتی تھی۔ مجھے غائب ہوئے دو دن ہوئے تھے تو اسے غائب ہوئے دس دن ہوئے تھے۔ لڑکی ہونے کے ناطے اسے کہیں زیادہ خدشات تھے اس لیے اس کی ظاہری حالت کہیں زیادہ خراب تھی۔ اب تک اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا پھر اس کی نظر پڑی تو وہ چونک گئی۔ ”شہباز صاحب آپ ان کے ساتھ.....“

”میں بھی قیدی ہوں۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

”شہباز صاحب۔“ حیات نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اب بھی اتنی عزت سے نام لے رہی ہو؟“ ”کیونکہ یہ عزت کے قابل ہیں۔ تمہاری طرح گندی سوچ اور آنکھیں نہیں رکھتے ہیں۔“ بانو نے کہا تو حیات نے مشتعل ہو کر اسے تھپڑ مارا۔ تھپڑ میں زیادہ زور نہیں تھا ورنہ بانو چیخے جا گرتی۔ البتہ اس کا سر گھوم گیا تھا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ مگر اس نے آواز نہیں نکالی۔

”اب بھی اس کی حمایت کر رہی ہو۔ اور کتنا عزت والا ہے مجھے معلوم ہے۔ جم میں تم دونوں دروازہ بند کر کے کیا کرتے تھے؟“

”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہاں بے بی آتی تھی۔“ بانو نے روہانے لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم سب کو اپنی طرح سمجھتے ہو۔“

میں نے اس کی حمایت کی۔ ”حیات تم ایک بلا وجہ کا شک لے کر ایک مظلوم لڑکی پر تشدد کر رہے ہو۔“

”بکومت۔“ وہ غریبا۔ ”تم دونوں اتنے شریف نہیں ہو جتنے بن رہے ہو۔“

انہوں نے بانو کے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے تھے۔ حیات اسے اچھی طرح جانتا تھا اور اسے اس سے فرار یا دوسری طرح کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لیے اسے جھٹکڑیاں پہنانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اتنی دیر میں سورج غروب ہو گیا تھا اور تاریکی چھانے لگی تھی موائی نے پہلے ہی دو گیس لیپ جلا لیے تھے اس لیے صحن کی حد تک فرق نہیں پڑا تھا۔ مجھے جھٹکڑیاں پہنانے اور بانو کو باہر نکالنے سے لگ رہا تھا کہ اب ہم یہاں سے روانہ ہونے والے تھے۔ ایسا ہی ہوا۔ ایک منٹ بعد حیات نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”انہیں لے چلو..... لیکن اس سے ہوشیار رہنا یہ بندھے ہاتھوں سے بھی کم خطرناک نہیں ہے۔“

”اب اتنا بڑھا چڑھا کر بھی نہ بیان کرو۔“ میں بولا۔ ”میں ایک عام سا انسان ہوں۔“

”میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ حیات کے لہجے کی تلخی کم ہو گئی۔

سوائے موائی کے ہم سب باہر آئے تھے جہاں احاطے سے ذرا دور ایک بڑے سائز کی جیب کھڑی تھی۔ در یوں کہ احاطہ بلند زمین پر تھا اور جیب ڈھلان چڑھ کر اتنی اوپر نہیں آ سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی یہاں سناٹا تھا کیونکہ زمین سے کوئی سوفٹ کی بلندی پر تھے اور آس پاس کی ہموار زمین اور کھیتوں میں کام کرتے لوگوں اور مشینوں اور شور ہم تک نہیں آ پاتا تھا۔ ہم ڈھلان سے اتر کر جیب کی طرف جانے لگے۔ باقی سب آرام سے چل رہے

تھے لیکن مجھے مشکل ہو رہی تھی کیونکہ میرے پاؤں ایک فٹ سے زیادہ دوری تک نہیں جاسکتے تھے۔ کہیں کہیں اس سے زیادہ قدم بڑھانے کی ضرورت پیش آتی تو مجبوری کی وجہ سے میں لڑکھڑا جاتا تھا لیکن اس موقع پر کسی نے میرے پاس آنے اور مجھے سہارا دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بہت محتاط تھے۔ ان کی بلا سے میں لڑھک کر نیچے پہنچتا۔ جیسے تیسے میں نیچے پہنچا۔ بانو کو بھی مشکل پیش آرہی تھی وہ بھی ناہموار راستوں پر چلنے کی عادی نہیں تھی۔ ہم نیچے نیچے پہنچے تھے اور سب سے پہلے مجھے اور بانو کو جیپ کے عقبی حصے میں بٹھا دیا گیا۔ یہ حصہ خالی فرش تھا جس پر ربر میٹ بچھا ہوا تھا اور شکر ہے یہاں اسٹپنی یا اس قسم کی کوئی چیز نہیں تھی ورنہ شاید ہمیں اس پر بیٹھنا پڑتا۔ اس کے باوجود اس میں سفر آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر ناہموار راستوں پر سفر کرتے تو ہم لڑھکتے ہی رہتے۔ سکون سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ وہ لوگ جیپ میں بیٹھ رہے تھے کہ اچانک بلند آواز والے نے کہا۔ ”بابو بی ایس ایف والے آرہے ہیں۔“

میں سن رہ گیا۔ بی ایس ایف سے مراد یقیناً بارڈر سیکورٹی فورس تھی۔ بی ایس ایف بھارتی فوج کا ایک حصہ تھا۔ کیا ان کی آمد میرے لیے تھی؟



بی ایس ایف کی آمد کا سن کر وہاں سنسنی پھیل گئی تھی اور اس سنسنی کا ستر فیصد یقیناً میری رگوں میں تھا۔ باقی سب کو اتنا فرق نہ پڑتا لیکن بی ایس ایف والے مجھے لے جاتے تو مجھے بہت فرق پڑتا۔ یہ فرق شاید زندگی اور موت کا ہوتا۔ حیات نے بھی فکر مندی لہجے میں کہا۔ ”یہ کبھر کہاں سے آگئے۔“

وہ کنور خاندان کا زرخیز تھا مگر تھا تو پاکستانی اور غیر قانونی طور پر انڈیا کی حدود میں موجود تھا اس لیے اس کا فکر مند ہونا بھی لازمی تھا۔ اب جیپ کے ڈیزل انجن کا شور سنائی دینے لگا تھا اور پھر یہ شور آ کر اس جیپ کے پاس رکا۔ کسی نے بلند آواز سے پوچھا۔ ”اوائے جیپ میں کون ہے؟“

حیات نیچے اتر آیا۔ ”ہم راج کنور کے آدمی ہیں سرکار۔“

”میں نے پوچھا ہے جیپ میں کون ہے؟“ بولنے والا صاف اردو یا ہندی میں بول رہا تھا اور لہجے سے فسر ریک کا لگ رہا تھا۔

”کیپٹن صاحب.....“ حیات نے کہنا چاہا۔

”بکواس بند کرو۔“ کیپٹن نے گرج کر کہا اور شاید اپنے آدمیوں سے بولا۔ ”جیپ کی تلاشی لو۔“

”ایک منٹ کیپٹن۔“ حیات کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ ”میرے ساتھ ادھر آؤ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں..... ڈرو نہیں۔“

”میں ڈروں گا.....“ کیپٹن نے مشتعل ہو کر گالی دی۔

”تو پھر بات سن لو۔“ حیات ہنس کر بولا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کیپٹن سے کم نہیں تھا۔ اس کے لہجے نے بیٹن کو اس کی بات ماننے پر مجبور کر دیا اور وہ اسے کہیں دور لے گیا اور جب کیپٹن واپس آیا تو اس کا لہجہ بالکل اہوا تھا اس نے اپنے آدمیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ حیات اور وہ تقریباً پانچ چھ منٹ الگ رہے تھے۔ اس دوران حیات نے کوئی گیدڑ نہ کھنسی گھمائی تھی جس کے بعد بی ایس ایف کا کیپٹن بالکل رام ہو گیا تھا۔ جیپ اشارت ماورابی ایس ایف والے روانہ ہو گئے۔ حیات اور اس کے ساتھی بھی جیپ میں آئے۔ پچھلا خاندان درمیان میں دی جالی لگا کر اگلے خانے سے الگ کر دیا تھا۔ اس کا دروازہ بھی صرف باہر سے کھل سکتا تھا۔ گویا یہ قیدیوں لانے لے جانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ بی ایس ایف کے واپس جانے پر میں نے سکون کا سانس لیا۔ بانو سے برابر میں دیکھی بیٹھی تھی۔ جیپ روانہ ہوئی اور اس کے انجن کا شور گونجنے لگا۔ بانو نے آہستہ سے کہا۔

”انہوں نے آپ کو کیوں اور کیسے پکڑا؟“

”یہ میرے پرانے دشمن کے آدمی ہیں اسی کے لیے میرا خون لیا جا رہا تھا مگر اب وہ مجھے براہ راست اپنی تحویل میں دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ دھوکا کر رہے تھے یہ ظاہر میرا آدھا لیر خون لیتے تھے لیکن میز کے نیچے خفیہ خانے میں موجود کوئی آدمی تھیلی بدل دیتا تھا اور مجھے پتا ہی نہیں چلتا کہ میرا کتنا خون لیا جا چکا ہے۔ اسی لیے میں خلاف توقع کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ اب دیکھو یہ کیا کرتے ہیں میرے ساتھ۔ میں نے ڈاکٹر کو مار دیا تھا لیکن بد قسمتی سے سر چکرانے کی وجہ سے میں حیات کے قابو میں آ گیا اور پھر مجھے ہوش آیا تو میں یہاں تھا۔“

بانو سب سے انداز میں بولی۔ ”یہ بہت خطرناک آدمی ہے وہاں کیسے میاں صاحب کا تابعدار بن کر رہتا تھا لیکن یہ ان کو بھی دھوکا دے رہا تھا۔“

”میاں ممتاز جیسے لوگ ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ دوسروں کو دھوکا دیں اور مرکافات عمل میں دوسروں سے دھوکا کھائیں۔“ میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

بانو ذرا چپ ہوئی تھی پھر اس نے کہا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

میں نے موضوع بدل دیا۔ ”تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”جب میں بے بی کے جانے کے بعد سردس والے دروازے سے باہر آئی تو اچانک ہی کسی نے عقب سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس میں دبے رومال سے کلوروفارم کی بو آ رہی تھی۔ میں نے مزاحمت کی لیکن جیسے ہی سانس لی مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔“

”دروازے سے باہر نکلتے ہی؟“

”ہاں بس میں ایک یا دو قدم آگے نکلی ہوں گی۔“

”حیات اور اس کے ساتھی وہاں تھے؟“

”نہیں وہ مجھے نظر نہیں آئے تھے۔“ بانو نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پھر مجھے غور کرنے کا موقع ہی کہاں ملا تھا یوں سمجھ لیں کہ ایک دو سیکنڈ لگے تھے۔“

”تمہارے جانے کے کچھ دیر بعد حیات آ گیا تھا۔ پھر تمہاری گمشدگی کا پتا چلا تو ممتاز ہاؤس میں تمہاری تلاش شروع ہو گئی تھی۔ آدمیوں سے تلاش کرانے کے بعد نبی نے کتوں کی مدد بھی لی تھی مگر تمہارا سراغ نہیں ملا۔ پولیس کو رپورٹ نہیں کی تھی لیکن میاں ممتاز کے آدمی تمہیں پھیل سے باہر تلاش کرتے رہے تھے۔“

”وہ مجھے کیسے تلاش کر سکتے تھے جب کہ اسی دن میں سرحد پار آ گئی تھی۔“

”ممتاز ہاؤس میں لگے کیمروں سے بھی کچھ پتا نہیں چلا تھا اور نہ ہی تم مین گیٹ سے نکالی گئی تھیں۔ نبی نے بتایا کہ پولیس میں آمدورفت کا ایک خفیہ دروازہ بھی ہے۔“

بانو نے سر ہلایا۔ ”میں نے دیکھا ہے لیکن اسے کیسے کھولا اور بند کیا جاتا ہے میں نہیں جانتی۔“

”مجھے شبہ ہے کہ حیات نہ صرف اس راستے سے واقف ہے بلکہ وہ اسے کھولنے اور بند کرنے کا طریقہ بھی جانتا ہے۔ مجھے اور تمہیں اسی راستے سے نکالا گیا اور کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلا۔“

”یہ جتنی آسانی سے ہمیں سرحد پار لے آیا ہے مجھے لگ رہا ہے حیات وہ نہیں ہے جو دکھائی دیتا ہے۔“

میں چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مجھے یہ پاکستانی نہیں لگتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہی ایس ایف کا کیمپن کیسے ڈم دبا کر چلا گیا۔“

بانو پڑھی لکھی تو تھی اور پھر ممتاز ہاؤس کی پڑوہ بھی اس لیے سیاست اور سرحدی معاملات سے عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ واقفیت رکھتی تھی۔ خود میاں ممتاز کا تعلق بھی سرحد پار سے ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو اس کی بات درست لگی تھی۔ حیات یہاں آکر اس طرح پُر اعتماد تھا جیسے کوئی بچہ اپنے گھر میں پُر اعتماد ہوتا ہے۔ سوال یہ تھا کہ حیات کا تعلق اصل میں کس سرزمین سے تھا۔ اس نے مجھے سو رہا کہا تھا جو خالص ہندی کا لفظ ہے اسی طرح اللہ کے نام پر اس نے مجھ پر طعن کیا تھا۔ پھر اس کے ساتھی اسے مسلسل بابو کہہ رہے تھے کسی نے اسے ایک بار بھی حیات نہیں کہا تھا۔ اگرچہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ حیات کا تعلق اصل میں کہاں سے تھا۔ وہ پہلے ہی مکمل دشمنی پر آمادہ تھا۔ مگر وہ بھارتی تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ میاں ممتاز کی جاسوسی کے لیے وہاں موجود تھا۔ وجہ تو واضح ہے میاں ممتاز ایک اہم سیاست دان تھا اور بہت سے حکومتی راز یقیناً اس کے علم میں بھی ہوتے ہوں گے۔ حیات کے توسط سے یہ راز سرحد پار جاتے ہوں گے۔

بدقسمتی سے ہمارے سیاست دان، میڈیا اور خاصی حد تک عوام بھی بھارت کے معاملے میں سافٹ کارز رکھتے ہیں۔ انٹیلی جنس کے معاملات سے تو ہم روشن خیالی کے دور میں ہاتھ اٹھا چکے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت کو ہر معاملے میں فری ہینڈل گیا۔ یہ ایسا ہی تھا کہ آپ پھرے ہوئے کینہ پرور نیل کے سامنے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیئے جائیں کہ وہ آپ کے ساتھ جیسا سلوک چاہے کرے۔ دوسری طرف بھارت کے عزائم دن بہ دن خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ پانی کی بندش سے لے کر ملک میں جاری فسادات میں اس کا ہاتھ روز روشن کی طرح واضح ہے مگر ساتھ ہی وہ ان معاملات میں بھی پوری طرح سرگرم ہے جن پر ہمارے ارباب اختیار اور ملکی سلامتی کے ذمے داروں کی نظر نہیں مگنی ہے۔ حیات کا میاں ممتاز کے گھر میں موجود ہونا اور اس کے معتمد کی حیثیت رکھنا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ بھارتی کینسر کی طرح ملک کے ہر شعبے میں سرایت کر رہے ہیں اور ہم آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ اس کی آتش کے راگ الاپ رہے ہیں۔

جیپ ناہوار راستوں پر تیزی سے چل رہی تھی۔ اس لیے ہم بھی سکون سے نہیں بیٹھ پارہے تھے کبھی بانو مجھ پر لڑھک جاتی اور کبھی میں ناچاچتے ہوئے بھی اس سے ٹکراتا۔ وہ جب ٹکراتی تو شرمندہ ہو کر معافی مانگتی تھی۔ حالانکہ وہ نازک لڑکی تھی اور اس کے لیے زیادہ مشکل ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ دونوں پاؤں دروازے پر جمادیں اور پشت جالی سے ٹکادی اس طرح میں لڑھکنے سے بچ گیا تھا۔ بانو کے ہاتھ پاؤں کھلے تھے مگر وہاں پکڑنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے وہ حرکت میں رہنے پر مجبور تھی۔ باہر تار کی چھار ہی تھی اور کچھ دیر میں مکمل تاریکی ہو گئی۔ اب جیپ ہیڈ لائٹس کے سہارے سفر کر رہی تھی کیونکہ اس کے رستے پر کہیں کوئی روشنی نہیں تھی۔

خدا خدا کر کے یہ بیہودہ راستہ ختم ہوا اور جیپ ایک ہموار سڑک پر آئی اگرچہ سڑک بھی اتنی ہموار نہیں تھی لیکن اس کے رستے کی نسبت کہیں بہتر تھی۔ دن ڈھلنے کے بعد گرمی کا اثر بھی زائل ہو رہا تھا لیکن جیپ کے اس بندھے میں گرمی لگ رہی تھی۔ ذرا سکون ملنے کے بعد میں نے بانو سے پوچھا۔ ”ان لوگوں نے تمہارے ساتھ

کوئی مس بی ہیو تو نہیں کیا؟“

”نہیں اللہ کا شکر ہے سوائے قید اور بعض اوقات کھانے پینے کی تکلیف کے اور کوئی تکلیف نہیں دی۔ ورنہ جب ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو اس جگہ پایا تو مرنے کی حد تک خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ایک بے بس لڑکی کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا سوچ کر ہی میں مرنے کی آرزو کر رہی تھی مگر انسان کو موت بھی اپنی مرضی سے ۱ کہاں آتی ہے؟“ اس کا لہجہ بے بس ہو گیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

”آدی پر ایسی مشکلات آتی رہتی ہیں اسے ہمت سے کام لینا چاہیے اور موت کے بجائے اللہ سے آسانی مانگو۔“

وہ افسردگی سے مسکرائی۔ ”میں جانتی ہوں آپ ایسے ہی شخص ہیں جو سخت ترین حالات میں بھی ہار نہیں مانتے ہیں۔ بے بی اکثر مجھے آپ کے بارے میں بتاتی تھیں۔ وہ دنیا میں کسی آدی سے متاثر ہیں تو وہ آپ ہیں لیکن میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔“

”کوئی کمزور یا طاقتور نہیں ہوتا۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”یہ ہمارے سوچنے کی بات ہے۔ اصل چیز کامیابی ہے میں نے بڑے بڑے سوراؤں کو مٹی میں ملے دیکھا ہے اور کمزور لوگ قہقہے جاتے ہیں۔ میں خود کو کمزور ہی سمجھتا ہوں کہ موت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوں وہ جب آئے گی تو مجھے یوں لے جائے گی جیسے شیر کسی کمزور ہرن کو اچک کر لے جاتا ہے۔“

”مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا ہے مگر بے آبرو ہو کر مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”اللہ پر بھروسہ رکھو وہ بہتر ہی کرے گا۔“ میں نے اپنے پاؤں کھولتے ہوئے کہا سختی سے دروازے پر جمانے سے وہ اکڑ گئے تھے۔ بانو بھی اب سکون سے بیٹھی تھی۔ رات تاریک تھی اور چاند بھی نہیں نکلا تھا جس سے سمت کا اندازہ ہوتا۔ مگر میری چمچی حس کہہ رہی تھی کہ ہم شمال کی طرف جا رہے تھے جہاں کنوروں کی جاگیر تھی۔ یہ شاید ہماچل پردیش کے شمالی حصے میں تھی۔ بھارت کی یہ ریاست بیک وقت کشمیر، پنجاب، ہریانہ اور اتر کھنڈ سے لگتی تھی۔ یہاں زیادہ تر تہنی نسل کے لوگ رہتے تھے اور یہیں دھرم شالہ میں تبت کے روحانی پیشوا دلائی لاما جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہاں صرف دلائی لاما ہی نہیں ان کے لاکھوں پیروکار بھی بستے تھے۔ شملہ نامی تاریخی مقام ہے جہاں انگریز وائسرائے گر میاں گزارنے آتا تھا اور شملہ کو بہت سی تاریخی سیاسی سرگرمیوں کی میزبانی کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب سندھو کے ڈیرے سے راج کنور ہم سب کو لے گیا تھا تب بھی اس کی جاگیر تک پہنچنے میں چند گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ راستے میں ایک جگہ رگ کر جیب میں ایندھن بھردایا گیا لیکن اس دوران میں ہمیں پانی کا بھی نہیں پوچھا تھا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی اور یقیناً بانو کو زیادہ لگ رہی تھی مگر اس نے ایک بار بھی شکایت نہیں کی تھی۔

جیسے جیسے رات گہری ہو رہی تھی اور جیب شمال کی طرف جاری تھی موسم سرد ہو جاتا رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے ہم اسلام آباد جتنی بلندی پر آ گئے تھے۔ اسلام آباد سطح سمندر سے تقریباً آٹھ سو میٹر یا تین ہزار فٹ بلند ہے۔ اسی وجہ سے یہاں موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ ہماچل پردیش اسلام آباد رینجن کی سیدھ میں آتی ہے اور یہ کشمیر سے نیچے ہے لیکن یہ تقریباً کشمیر جتنے بلند پہاڑوں پر مشتمل ہے اور اس کا شمالی حصہ ہمالیہ کے برف والے حصے

سے لگتا ہے جہاں دنیا کی بلند ترین چوٹیاں ہیں۔ اب گرمی زائل ہو گئی تھی اور کسی قدر خشکی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ پیاس کی شدت کم ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد جیب نے جلدی جلدی موڑ کاٹنا شروع کر دیے اور اب اس کا رخ اوپر کی طرف تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بیٹو کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ میں اس وقت اس کے آبائی علاقے کی طرف جا رہا تھا جہاں سے اسے اور اس کے قبیلے کو مار کاٹ کر نکالا گیا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ کنور پیلس اب ایک گھنٹے کی مسافت پر رہ گیا تھا۔ مگر رات ہونے کی وجہ سے زیادہ دیر لگی تھی اور ہم تقریباً مزید ڈیڑھ گھنٹہ سفر کے بعد کنور پیلس کی عالی شان عمارت تک پہنچے تھے۔ جب قبائلیوں نے یہاں حملہ کیا تھا تو یہاں شدید تباہی پھیلی تھی اور خاص طور سے محل اور کلیک قبائلیوں کا نشانہ بنے تھے اور یہاں آگ بھی لگا دی گئی تھی۔ مگر جب جیب روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے پیلس میں داخل ہوئی تو وہاں اس تباہی کا ذرے برابر معمولی نشان بھی باقی نہیں رہا تھا اور کوئی اجنبی دیکھتا تو وہ بالکل نہیں جان سکتا تھا کہ تقریباً چھ مہینے پہلے یہاں کیا ہوا تھا۔ بہار کا موسم آنے پر مرجھایا ہوا سبزہ اور پودے بھی مکمل اٹھے تھے اور اب یہ جگہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت ہو گئی ہوگی۔ مگر اس کے اندر چھپی بد صورتی میں دیکھو اور بھگت چکا تھا اس لیے میں ظاہری خوب صورتی سے دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا یہاں میرے لیے مشکلات ہوں گی اور قسمت ہی ہوگی جو میں یہاں سے زندہ سلامت جاسکوں گا۔

جیب محل کے بجائے ایک اور چھوٹی عمارت کے پورچ میں رکی۔ یہ قید خانہ تھا اور یہاں پہلے بھی ایک بار میں رہ چکا تھا۔ جیب کا عقوبی دروازہ کھلا اور حیات کے سانولے ساتھی نے مجھے کھینچ کر نیچے اتارا۔ بانو خود اتر آئی تھی۔ وہاں وہ غیبیت صورت شخص موجود تھا جس سے میں نفرت کرتا تھا۔ یعنی راج کنور کا دست نارا ست نائیک موجود تھا۔ اس کے چہرے پر کمرہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے شدید طنز یہ انداز میں کہا۔ ”کھوش آمدید شہباز جی۔“

”ظاہر ہے میری آمد پر تمہیں خوشی ہوگی تم اپنی پچھلی چوٹیں بھولے نہیں ہو گے۔“

اس کا چہرہ بگڑ کر سوز جیسا ہو گیا۔ ”جیادہ کھوش مت ہو اس بار تمہیں پتا چلے گا۔ اس بار کوئی چھڑانے والا بھی نہیں آئے گا۔“

”تمہاری خوشی نہیں ہے۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔ حیات خاموش کھڑا تھا اس نے نائیک سے کہا۔

”اب یہ تمہارے سپرد ہیں۔“

نائیک نے حریص نظروں سے بانو کی طرف دیکھا۔ ”اور یہ دیوی جی؟“

”اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ حیات نے جس طرح دونوک انداز میں کہا تھا اس سے مجھے لگا کہ وہ اس سے برتر نہیں تو کم تر بھی نہیں تھا۔ اس نے بانو کا بازو پکڑا اور اسے لے جانے لگا۔ اس نے مزاحمت کی۔

”چھوڑو مجھے۔“

میں نے قدم بڑھایا تھا کہ سانولے نے پستول میری کمر سے لگا دیا۔ ”آرام سے کھڑے رہو۔“

”حیات تم اسے کیوں لائے ہو؟“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”میں اسے اپنے لیے لایا ہوں۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”میرا نام حیات نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر وہ بانو کو کھینچتا ہوا وہاں سے لے گیا تھا۔ میں فی الحال بانو کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا اس لیے صرف ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے سانوں کے لیے طرف دیکھا۔ ”اس کا نام کیا ہے اور تمہارا اصل نام کیا ہے۔“

”وہ راسن بابو ہے اور میں جوشی ہوں۔“

اگرچہ مجھے ایسی ہی امید تھی لیکن یہ جان کر مجھے دھچکا لگا تھا کہ وہ دونوں ہندو تھے۔ بانو اب راسن کے قبضے میں تھی۔ اس کی عزت جس کے لیے وہ خوفزدہ تھی اب واضح خطرے میں دکھائی دے رہی تھی۔ جوشی نے میری ہتھکڑی اور بیڑی کھولی۔ نائیک کے ساتھ قید خانے کا نگران اور اس کے مسلح گارڈ موجود تھے۔ مجھے ان کے حوالے کیا گیا۔ میرے مطالبے پر پہلے مجھے رفع حاجت کا موقع دیا گیا۔ یہ کسی قدر صاف سترا لیٹرین تھا۔ شاید اڑتالیس گھنٹے بعد مجھے فارغ ہونے کا ملا تھا اس لیے بڑا سکون ملا تھا۔ اتفاق سے قید خانے میں مجھے وہ کوفٹری ملی جس میں پہلی بار بھی آیا تھا۔ پہلی بار جب میں آیا تو شدید سردی کا موسم تھا اور کوفٹری میں ڈیڑھ ساری خشک گھاس تھی۔ یہ گرم ترین گھاس قیدیوں کو شدید سردی میں بھی گرم رکھتی تھی اور ان کو اوڑھنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی تھی۔ اگرچہ سردی ہوتی تھی مگر وہ قابل برداشت ہو جاتی تھی لیکن اب موسم بدل گیا تھا۔ کوفٹری کے خالی فرش پر صرف ایک چٹائی اور ایک کبل تھا۔ میں نے چینی نقوش والے نگران سے کہا۔ ”مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“

”فکر نہ کر ٹو شای مہمان ہے تجھے سب ملے گا۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا شاید اسے بھی معلوم تھا کہ مجھے قربانی کا بکرا بنا کر لایا گیا تھا۔ جسے قربان کرنے سے پہلے اچھی طرح کھلایا پلایا جاتا۔ یہاں گارڈز مجھے پہلے کی طرح بیٹھنے کا بجلی لگے تھے ان کے نقوش دیسے ہی تھے۔ کنور خاندان قبائلی بچوں کو اپنے قبضے میں کر کے ان سے کام لیتا تھا۔ ان میں مرد عورت دونوں شامل ہوتے تھے۔ مردوں کو حفاظت اور دوسرے بیرونی کام سونپے جاتے تھے جب کہ عورتوں کو کل کے اندر ذمے داریاں دی جاتی تھیں اور ان کی سب سے اہم ذمے داری کنور خاندان اور ان کے معزز مہمانوں کی تمام جسمانی ضروریات پورا کرنا تھا۔ یہ سب میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے منرل واٹر کی ایک بوتل فراہم کی گئی۔ میں پانی پی رہا تھا کہ مجھے کوفٹری کے روشن دان سے راسن کی آواز سنائی دی۔

روشن دان فرش سے کوئی سات فٹ اونچا تھا۔ میں نے اچھل کر اس کے کناروں پر ہاتھ جمائے اور پھر خود کو اوپر اٹھایا۔ سلاخوں کے پار پار رنگ نظر آئی تھی اور وہاں جیب کے پاس راسن اور جوشی دونوں موجود تھے۔ راسن کہیں جا رہا تھا اور وہ جوشی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ بات مکمل کر کے اس نے جیب آگے بڑھائی۔ جوشی وہ رہ گیا تھا۔ میں سن نہیں سکا تھا کہ ان دونوں میں کیا گفتگو ہو رہی تھی لیکن راسن کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کہیں غلط میں جا رہا ہے اس نے ابھی تک وہی میلا لباس پہنا ہوا تھا۔ مجھے امید ہوئی کہ اگر وہ کچھ دن کے لیے دفع ہوا ہے تو بانو اس دوران میں اس سے محفوظ رہے گی۔ جب بانو کے بارے میں اس کے عزائم محسوس کرتا تو میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ مگر فی الحال میں مجبور تھا۔ البتہ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر بانو کو اس سے ذرا سا بھی نقصان ہوا تو میں اسے ہرگز معاف نہیں کروں گا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کوئی راستہ ہو کہ بانو محفوظ رہے۔ کنور خاندان اور اس کے سارے چیلے وچھے میرے

شدید قسم کے دشمن تھے اگر میں ان سے کہتا کہ بانو سے کوئی برا سلوک نہ کریں تو عین ممکن تھا وہ مجھے اذیت دینے کے لیے میرے سامنے اس سے برا سلوک کرتے۔ یہ انسان کو صرف مطلب برابری کی چیز سمجھنے والے لوگ تھے اور ایک بانو ان کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی میں سوچ رہا تھا کہ کوٹھری کا دروازہ باہر سے کھلا۔ یہ فولادی دروازہ تھا جس میں اوپری حصے میں سلاخیں لگی تھیں اور باہر سے کوئی اندر دیکھ سکتا تھا۔ دروازہ کھلا تو منشی دل جی کی صورت نظر آئی۔ یہ بڑے کنور کا معتد خاص تھا جیسے بیک راجا عمر دراز کا سیکرٹری تھا۔ اس کے ساتھ ایک پٹھان نظر آنے والے شخص نے بڑی سی ٹرے اٹھا رکھی تھی اور ٹرے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ یقیناً میرے لیے طعام لایا گیا تھا۔ منشی دل جی اور پٹھان اندر آئے۔ پٹھان نے ٹرے رکھ کر گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

”صیب ام دل نواز خان اے، آپ کا خادم..... آپ کا طعام ام بنایا۔“

منشی دل جی نے کہا۔ ”شہباز جی، یہ مسلمان ہے اور آپ کا کھانا اسی کی ذمہ داری ہے۔ جانور بھی یہ خود ذبح کرتا ہے۔“

میں نے سرسری نظر سے ٹرے کی طرف دیکھا اگرچہ یہ دل گردے کا کام تھا کیونکہ میں چوبیس گھنٹے سے بھوکا تھا اور بھوک سے بیتاب تھا۔ مگر میں نے ظاہر کیا کہ فی الحال کھانے کی میری نظر میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔

”منشی جی آپ مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کھانا حلال ہے اور مجھے بلا کھانے کھا لینا چاہیے؟“

”آپ ٹھیک سمجھ شہباز جی۔“

”اس کے بعد آپ میرا خون نچوڑیں؟“ میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

”آپ جانتے ہیں یہ کام تو بہر صورت ہوتا ہے۔“ منشی دل جی کا لہجہ ساٹ ہو گیا۔

”ایک انسان کے جسم میں کوئی ساڑھے چار لیٹرز خون ہوتا ہے اگر تم لوگ ایک وقت میں کوشش کرو تو شاید چار لیٹرز خون حاصل کر لو لیکن اس کے بعد میرے مردہ جسم سے تمہیں ایک قطرہ خون نہیں ملے گا۔“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔“ منشی دل جی نے عیاری سے کہا۔ ”ڈاکٹر ہدایت کے خلاف آپ کا زیادہ خون لے رہا تھا اور اسے آپ نے خود سزا دے دی لیکن یہاں آپ سے ہفتے میں صرف نصف لیٹر خون لیا جائے گا اور یہ بڑے کنور کے علاج کے لیے کافی ہوگا۔ نصف لیٹر کا مطلب ہے دو مہینے میں آپ ساڑھے چار لیٹرز خون دیں گے اور ڈاکٹر کا کہنا ہے معمولی کمزوری کے سوا آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

”جو ڈاکٹر میرے ہاتھ بلکہ لات سے جہنم رسید ہوا وہ بھی یہی کہہ رہا تھا مگر اس نے کیا کچھ اور تھا اور وہ تم لوگوں کی ہدایت کے مطابق کام کر رہا تھا۔“

”بڑے کنور کا کہنا ہے کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ خون آپ کی تسلی کے بعد لیا جائے گا۔“

میں نے دل ہی دل میں بڑے کنور اور اس کی ضمانت کی ایسی کم تپسی کی اور بولا۔ ”منشی دل جی، آپ مزید بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔ آپ لوگ اس مقصد کے تحت مجھے زبردستی ڈرپ یا طاقتور دواؤں سے زندہ نہیں رکھ سکتے کیونکہ مقصد زندہ رکھنا نہیں بلکہ مجھ سے مسلسل خون حاصل کرنا ہے اور یہ اس صورت میں ممکن نہیں رہے گا۔ آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں اور جب کوئی فیصلہ کر لوں تو اسے نبھا بھی سکتا ہوں۔“

منشی دل جی کے تاثرات میں فکر مندی محسوس کر کے مجھے یقین ہو گیا کہ میری دھمکی کارگر تھی۔ اگر میں واقعی ہموک ہڑتال پر آجاتا تو وہ منصوبے کے تحت مجھ سے خون حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ شاید یہ صورت حال اس کے لیے غیر متوقع تھی اس لیے اس نے سر ہلایا اور بولا۔ ”میں بڑے کنور تک یہ بات پہنچا دیتا ہوں اس کے بعد وہ جو فیصلہ کریں۔“

”منشی جی میرا فیصلہ کوئی حتمی نہیں ہے ممکن ہے آپ لوگوں کی طرف سے کوئی ضمانت ملے تو میں مان جاؤں۔ ابھی آپ میرے فیصلے میں نرمی کے لیے ایک کام کر سکتے ہیں۔“

منشی دل جی نے پُر امید نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کون سا کام؟“

”میرے ساتھ ایک لڑکی بھی یہاں لائی گئی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ محفوظ رہے اور اسے اچھی طرح رکھا جائے۔“

”منشی دل جی نے سر ہلایا اور جانے لگے تو میں نے ان سے کہا۔ ”یہ خوان بھی لیتے جائیں۔ جب مجھے بانو کے بارے میں معلوم ہو جائے گا تو میں کھالوں گا۔“

منشی دل جی کے اشارے پر دل نواز خان نے ٹرے اٹھائی۔ ان کے جاتے ہی فولادی دروازہ بند ہو گیا۔ میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔ میرے خیال میں ابھی دس یا گیارہ بجے کا وقت ہوا تھا۔ گویا مجھے لیٹ ٹائٹ ڈر دیا جا رہا تھا۔ میری دھمکی پر منشی دل جی کا رد عمل حوصلہ افزا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بڑے کنور کو میرے خون کی اشد ضرورت تھی۔ ممتاز ہاؤس میں نکلا جانے والا خون شاید ابتدائی علاج کے لیے کافی تھا لیکن اب علاج کو مستقل جاری رکھنے کے لیے مزید اور مسلسل خون کی فراہمی کی ضرورت تھی۔ مجھے امید تھی کہ جلد اس کا رد عمل سامنے آئے گا۔ میرا اندازہ درست نکلا جب نصف گھنٹے بعد کنوڑی کا دروازہ دوبارہ کھلا اور پہلے دل نواز خان اندر آیا وہ اکیلا تھا اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی اور بیڑی تھی اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”صیب ام کو حکم اے آپ کو یہ پینا دے۔“

لہجے سے وہ کپا قبائلی لگتا تھا لیکن انڈیا میں بھی اب تک بہت سی جگہوں پر پٹھان صدیوں سے اپنے مخصوص قبائلی انداز میں زندگی بسر کر رہے ہیں ان کی زبان اور طرز معاشرت وہی ہے جو علاقہ غیر کے پٹھانوں کی ہوتی ہے۔ اسے یوں اندر بھیجنے کا مطلب تھا کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور اگر میں اسے قابو کر لیتا یا مار دیتا تو ان لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر میں اس بے چارے سے ان لوگوں کی ملازمت کا انتقام نہیں لے سکتا تھا۔ ممکن ہے اس کی خدمات عارضی طور پر صرف میرے لیے حاصل کی گئی ہوں۔ اس لیے میں نے خاموشی سے ہتھکڑی اور بیڑی پہن لی۔ میرے بے بس ہوتے ہی منشی دل جی ایک گارڈ کے ساتھ نمودار ہوئے۔ یہ قید خانے کا گارڈ نہیں تھا بلکہ یقیناً محل کا گارڈ تھا اور اس کے نقوش نیپالی گورکھاؤں سے ملتے تھے۔ شاید قبائلیوں کے حملے کے بعد محل کے تمام محافظ بدل دیے گئے تھے۔ اب مقامی قبائلی محل میں نہیں رکھے گئے تھے۔ مجھے تو حیرت تھی کہ اتنے بڑے سامنے کے بعد بھی یہاں قبائلی موجود تھے۔ جب کہ کنور خاندان نے ان کی ساری نسل کو ختم کر دیا تھا۔ شاید ان کو اعتماد تھا کہ اب یہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے تھے یا پھر وہ غیا فطرت کے مطابق مفت کے ہاتھ آئے غلام چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

منشی دل جی گاڑ کے ساتھ لے کر مجھے روانہ ہوئے۔ قید خانے اور محل کے درمیان کھلی جگہ سے گزرتے ہوئے پتا چلا کہ یہاں رات کو اچھی خاصی سردی ہو جاتی تھی میرے جسم پر گرمیوں کے لحاظ سے کپڑے تھے اور یہ ناکافی تھے۔ راستے میں منشی دل جی نے مجھے بانو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے بھی پوچھنے سے گریز کیا جو بھی تھا جلد سامنے آ جاتا۔ عین ممکن تھا کہ میرا اندازہ غلط ہو یہ مجھے اپنا جبر و قوت دکھانے کے لیے لے جا رہے ہوں۔ محل میں داخل ہوئے تو موسم معتدل ہو گیا۔ وہاں ہر طرف رنگ و خوشبو تھی۔ چند مہینے پہلے یہاں جو ہوا تھا اس کا کوئی اثر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رات کے اس پہر بھی محل میں ملازم موجود تھے اور حسین و دلکش خادماں اسی مختصر سے لباس میں گھوم بھر رہی تھیں۔ مجھے اب تک راج کنور کا منحوس چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔ شاید اسے مجھ سے دور رہنے کو کہا گیا تھا۔ بڑے کنور اور منشی دل جی نرم پالیسی کا چکر چلا رہے تھے۔ جب وہ ناکام رہتے تو مجھے راج کنور اور ٹائیک کے سپرد کیا جاسکتا تھا۔

بڑا کنور اسی کمرے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ کمرے میں آتش دان جل رہا تھا اور شمال کی طرف کھلی کھڑکی سے سرد ہوا اندر آرہی تھی۔ بڑا کنور اسی مخصوص جگہ میں تھا جس نے اسے سر سے پاؤں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ عام طور سے اس قسم کے چنے شیطان کے پجاریوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ اپنی مجبوری یا فطرت کی وجہ سے وہ یہ چنہ پہننے پر مجبور تھا۔ اصل میں اسے جلد کی بیماری تھی۔ پورے جسم پر سانپ جیسی دھاریاں تھیں اور شاید جلد روشنی سے بھی حساس ہو گئی تھی اس لیے وہ اپنی حفاظت اور دوسروں کی نظروں سے بچنے کے لیے چنہ پہننے پر مجبور تھا۔ میں اس کے سامنے آیا تو اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ”شہباز ملک تم ایک بار پھر یہاں ہو۔“

”بد قسمتی سے۔“ میں نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔

”لیکن اب یہاں تباہی نہیں ہیں جو آپ کو آزاد کرانے کے لیے جائیں۔“ منشی دل جی نے کسی قدر طنز یہ انداز میں کہا وہ مسلح گاڑ سمیت میرے پیچھے موجود تھا۔

”مجھے معلوم ہے وہ سب خود زندگی کی قید سے آزاد کر دیئے گئے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے قبا کیوں کا حملہ اصل میں تم لوگوں کی سازش تھی تاکہ ان کے خلاف فوجی کارروائی کا جواز پیدا کیا جائے اور پھر ان کا قتل عام کیا جائے۔ حملے میں تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ اس ساری جاگیر سے سینکڑوں گنا زیادہ مالیت کی ہیروں کی کان تمہارے ہاتھ آگئی۔ ہاں ایک نقصان ہوا کہ تمہاری بہن اس حملے میں ماری گئی تھی یا قبا کیوں کے ہاتھ لگ گئی اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔“

میں نے جان بوجھ کر سعدیہ کا ذکر کیا۔ کیونکہ راج کنور کی گفتگو اور انداز سے لگا تھا کہ وہ بے خبر ہے کہ اس کی بہن یعنی سابقہ سادھنا عرف آشا اور موجودہ سعدیہ ہمارے پاس ہے۔ مگر یہ ان مکاروں کی کوئی چالاکی بھی ہو سکتی تھی۔ اس کا امکان تھا کہ وہ جانتے ہوں کہ ان کی بہن اصل میں ہمارے پاس ہے اور وہ اسے بھی خاموشی سے تلاش کر رہے ہوں۔ اگر وہ میاں ممتاز تک رسائی رکھتے ہوں گے تو انہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ مرشد میرا جانی دشمن ہے اور وہ مرشد سے رابطہ کر کے میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں پوری معلومات لے سکتے تھے۔ ان میں سعدیہ بھی شامل تھی۔ مگر بڑے کنور پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اس نے صرف سر ہلایا۔ ”یہ سب اب ماضی کا حصہ بن گیا ہے۔ میں نے تمہیں حال پر بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔“

”یعنی آپ میرا خون چاہتے ہیں لیکن منشی جی نے بتا دیا ہوگا کہ اب میں تیار نہیں ہوں اور زبردستی کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ ایک شخص مر جائے جو آپ کا دشمن ہے۔“

”تم نے بانو کا ذکر کیا تھا کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔“ وہ بدستور نرم لہجے میں بول رہا تھا دیسے یہ اس کا انداز تھا۔

”ہاں وہ ایک بے گناہ لڑکی ہے جسے تمہارا آدمی رامن بلا وجہ اٹھا لایا ہے۔ وہ میاں ممتاز کی منہ بولی بیٹی بھی ہے اور جب یہ بات اسے معلوم ہوگی تو یقیناً اس سے تمہارے جو بھی تعلقات ہیں ان پر اثر پڑے گا۔“

”وہ ایک معمولی ملازمہ ہے۔“

”یہ جھوٹ رامن نے بولا ہوگا۔ آپ بانو سے معلوم کر سکتے ہیں اور اگر ایسا نہیں بھی ہے تب بھی میں ایسا چاہتا ہوں اگر آپ کو میرا خون ورکار ہے تو اس کی کچھ نہ کچھ قیمت تو ادا کرنی پڑے گی۔“

بڑا کنور خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے منشی جی سے کہا۔ ”لڑکی کو لے آؤ۔“

منشی دل جی باہر چلا گیا اور چند منٹ بعد وہ بانو کو لے آیا۔ اس نے لباس بدل لیا تھا۔ وہ ساڑھی میں تھی اور بہتر حالت میں لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے مرجھائے چہرے پر رونق آگئی۔ بڑے کنور نے اس سے پوچھا۔ ”لڑکی تیری ممتاز ہاؤس میں کیا حیثیت تھی؟“

”میں میاں صاحب کی منہ بولی بیٹی اور ان کی بیٹی نورالنسا بی بی کی پرسنل سیکرٹری ہوں۔“ بانو نے وہی جواب دے کر مجھے حیران کر دیا جو میں چاہتا تھا میں نے منہ بولی بیٹی والی بات اپنی طرف سے کی تھی مگر بانو نے بھی کہہ دیا۔ بڑے کنور نے اشارہ کیا تو منشی دل جی بانو کو واپس لے گیا۔ اس کے جانے کے بعد بڑے کنور نے مجھ سے پوچھا۔

”اب کہو تم کیا چاہتے ہو؟“

”سب سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ بانو کی عزت آبرو محفوظ رہے اور اسے یہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔ پھر میں چاہتا ہوں کہ اسے واپس ممتاز ہاؤس بھیج دیا جائے۔ اس کے بدلے میں خون کی فراہمی کے لیے تم سے مکمل تعاون کروں گا۔“

بڑا کنور پھر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میری چھٹی جس نے خبردار کیا کہ اس کی خاموشی بلا سبب نہیں تھی۔ یقیناً کوئی ایسی بات تھی کہ بڑا کنور میرے مطالبے پر خاموش ہو گیا تھا۔ اگر بانو کو حیات لایا ہوتا تو شاید اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا لیکن اب مجھے لگ رہا تھا کہ اس کے پس پشت کچھ اور چکر تھا۔ کچھ دیر بعد بڑے کنور نے کہا۔ ”فی الحال میں بانو کو واپس نہیں بھیج سکتا اس میں کچھ پیچیدگیاں ہیں لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے واپس ضرور بھیجوں گا۔ البتہ وہ بالکل محفوظ ہوگی اسے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

بڑے کنور کے وعدے کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جس طرح ڈیوڈ شامیکا ولی کا سیاسی پیروکار تھا اسی طرح بھارت کا برہمن چالکیہ کا شاگرد تھا۔ ان کے نزدیک صرف اپنا مفاد اہم ہوتا ہے اور اس کے لیے ہر حربہ اور ہر چیز جائز تھی۔ بہر حال اتنا بھی کافی تھا کہ وہ بانو کو محفوظ رکھنے کا وعدہ کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”مجھے دن میں ایک بار اس سے ملنے کا موقع بھی دیا جائے گا۔“

”اگر تم کہو تو وہ تمہارے ساتھ بھی رہ سکتی ہے۔“ بڑے کنور نے پیشکش کر کے مجھے حیران کر دیا۔
 ”وہ نازک لڑکی ہے اس قید خانے میں کیسے رہے گی۔“
 ”تم اب اسی محل میں رہو گے۔ لڑکی تمہارے ساتھ یہاں رہے گی۔“

میں نے سوچا تو مجھے عجیب لگا تھا کہ میں ایک لڑکی کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہوں لیکن میں اور بانو عام حالات میں نہیں تھے۔ ہم یہاں درندوں کے درمیان تھے۔ اگرچہ اس کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ بانو میرے ساتھ رہ کر بھی محفوظ رہے گی۔ اگر وہ اپنی من مانی کرنا چاہتے تو میں انہیں نہیں روک سکتا تھا۔ بہر حال پھر بھی مجھے تسلی رہتی۔ مجھے بڑے کنور کی پیشکش پر حیرت ہو رہی تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے اس صورت میں، میں آپ سے تعاون کروں گا۔“

”کل ڈاکٹر تمہارا معائنہ کرے گا۔ اس دوران میں تمہارا ہر ممکن خیال رکھا جائے گا۔ اگر خون نکالنے کے دوران تمہاری حالت خراب ہوئی تو یہ عمل عارضی طور پر روک دیا جائے گا جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے۔“
 ”میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“ میں نے کوشش کی کہ میرے لہجے سے طنز نہ جھلکے۔ بڑے کنور نے کہا کچھ نہ اور نشی دل جی کو اشارہ کیا۔ وہ مجھے لے کر روانہ ہو گیا۔ محل کے الگ تھلگ حصے میں جہاں گورکھا محافظ موجود تھے مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ خاصہ آسائش اور سجا سجا یا کمرہ تھا جس میں دور جدید کی ہر سہولت اور چیز موجود تھی۔ ایک بڑا سائیل سی ڈی ٹی تھا۔ اس کے ساتھ ڈی وی ڈی پلیئر تھا۔ مگر ایک مسئلہ تھا کہ وہاں بڑا سبھی لیکن ایک ہی بیڈ تھا۔ بہر حال اس مسئلے کو بھی حل کیا جاسکتا تھا۔ کمرے میں ایک طرف سلائیڈنگ ڈور والی کھڑکی تھی لیکن اس کے باہر بہت مضبوط قسم کی گرل لگی تھی۔ کھڑکی پائین باغ میں کھل رہی تھی اور اس کے عین سامنے ایک سیب کا درخت تھا۔ جس کی ہری بھری شاخ کھڑکی تک آرہی تھی۔ فرش پر سرمئی اور سفید دھاریوں والا دبیز قالین تھا۔ ایک طرف آتش دان تھا لیکن اس موسم میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ آتش دان کے پاس دو عدد ڈبل سیٹ والے لیڈر صوفے تھے اور ان کے سامنے چھوٹی سی گلاس ٹاپ ٹیبل تھی۔ کمرے کے ساتھ پرنٹیشن قسم کا واش روم بھی تھا۔ کمرے کا معائنہ کرتے ہوئے میں اپنے فیصلے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

بہ ظاہر بڑے کنور نے بانو کو میرے ساتھ ٹھہرنے کی اجازت دے کر کھلے پن کا ثبوت دیا تھا لیکن یہ اس کی چالاک بھی تھی۔ بانو میرے ساتھ ہوتی تو میں اس کی طرف سے بے فکر ہو جاتا لیکن ساتھ ہی میں یہاں سے رار کے بارے میں مشکل سے سوچتا۔ اکیلے آدمی کے لیے کچھ کرنا آسان ہوتا ہے لیکن جب اس کے ساتھ ایک لڑکی یا خاتون ہو تو وہ کوئی بھی قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتا ہے۔ بڑے کنور نے ایک زنجیر اور میرے پیروں میں ڈال دی تھی۔ میں جھنجھلا رہا تھا۔ اس خبیث راسن کو بھی ضروری تھا کہ بانو کو بھی لے آتا پھر مجھے خیال آیا کہ بانو پہلے لیا ہوئی تھی اور میں بعد میں اغوا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور بانو اندر آئی۔ اس بار وہ پہلے سے زیادہ خوفزدہ نہ تھی اور مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر زیادہ اطمینان آیا تھا۔ اسے اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ بانو نے ہانپے لہجے میں کہا۔

”شہباز صاحب یہ سب کیا ہے، یہ کون لوگ ہیں اور مجھے کیوں یہاں لائے ہیں؟“
 میں نے گہری سانس لی اور اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”بانو یہ میرے پرانے دشمن ہیں اور تم جانتی

ہو یہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں لیکن تمہیں کیوں لائے ہیں اس سے میں بھی اتنا ہی بے خبر ہوں۔ پہلے میں سمجھ رہا تھا کہ حیات یعنی راسن تمہیں اپنی مرضی سے لایا ہے۔“

بانو دنگ رہ گئی تھی۔ ”راسن..... وہ مسلمان نہیں ہے؟“

”ہاں وہ نہ صرف ہندو ہے بلکہ انڈین ہے وہ پاکستان میں کسی خاص مقصد کے تحت حیات بن کر رہ رہا تھا۔“

”کیا وہ مجھے اپنے لیے.....“ بانو بولتے ہوئے جھجکی۔ ”میرا مطلب ہے وہ کیوں لایا ہے؟“

”میں نہیں جانتا، میں نے یہاں کے بڑے آدمی کے سامنے شرط رکھی ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے اور تمہیں واپس بھیج دیا جائے تو میں اس سے تعاون کروں گا۔“

بانو کھل اٹھی تھی۔ ”وہی چنے والا آدمی نا..... وہ مان گیا ہے؟“

”ہاں وہ راج کنور کا بڑا بھائی ہے اس کا نام مجھے یاد نہیں ہے لیکن سب اسے بڑا کنور کہتے ہیں۔ اس نے میری ایک بات مان لی کہ تم محفوظ رہی گی اور یہاں میرے ساتھ رہو گی لیکن پاکستان واپس بھجوانے والی بات ابھی نہیں مانی ہے۔“

بانو کا جوش و خروش ماند پڑ گیا تھا۔ ”مجھے بھی اس کی قید میں رہنا ہو گا۔ مگر وہ مجھے کیوں روک رہا ہے؟“

”ممکن ہے وہ ابھی میاں ممتاز سے یہ بات چھپانا چاہتا ہو میاں ممتاز کو یہ معلوم ہے کہ میں کلینک میں ڈاکٹر کو قتل کر کے فرار ہو گیا ہوں۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ میں اصل میں کنور خاندان کے قبضے میں ہوں تو اس کے اور کنور خاندان کے تعلقات متاثر ہوں گے۔“

بانو نے سر ہلایا۔ ”اب سمجھ میں آ رہا ہے اگر میں واپس گئی تو میاں صاحب تک یہ بات پہنچ جائے گی۔“

”بالکل اور کنور ابھی یہ نہیں چاہتا۔“

بانو نے گہری سانس لی۔ ”شکر ہے اب میں ذرا مطمئن ہوں ورنہ یہاں آنے کے بعد تو میرا اندیشوں اور فکر سے برا حال ہو گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں درندوں سے بھرے جنگل میں آگئی ہوں۔“

وہ ٹھیک محسوس کر رہی تھی۔ جنگل کے درندے بھی ان لوگوں کے مقابلے میں رحم دل ہوتے ہیں۔ دروازے پر دستک ہوئی اور پھر دروازہ کھلا اس بار دل نواز خان کھانے کی ٹرائی کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے ساتھ گارڈ تھا جو باہر ہی رہا۔ دل نواز خان میز پر کھانا لگانے لگا تھا کہ بانو نے اسے روک دیا۔ ”تم جاؤ، میں دیکھ لوں گی۔“

”آدھے گھنٹے بعد کافی لے آنا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر کوئی روکے تو میرا حوالہ دینا۔“

دل نواز خان سر ہلا کر رخصت ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے ساتھ بانو کو دیکھ کر کسی قدر بد مزہ ہوا تھا۔ شاید اس کا ذہن اس نئی پہلو کی طرف گیا تھا جو ایک مرد اور ایک عورت کو ایک جگہ موجود دیکھ کر عام آدمی کے ذہن میں فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ بانو نے بھی اس کے تاثرات محسوس کر لیے تھے اور وہ جھینپ رہی تھی۔ ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ میں کئی وقت سے بھوکا تھا مگر میں نے ہاتھ روک کر کھایا۔ ابھی مجھے سونا تھا اور پیٹ کی گرانی کے ساتھ نیند مشکل سے آتی۔ کھانا ختم ہوتے ہی دل نواز خان کافی لے آیا تھا۔ میں نے ٹپلے

ہوئے کافی پی۔ دل نواز برتن سمیٹ کر لے گیا تھا اور اس بار اس نے زیادہ تاثرات دکھائے تھے۔ اس کے جانے کے بعد بانو روہاںسی نظر آنے لگی جب میں نے کافی ختم کی تو اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔
 ”آپ نے دیکھا وہ مجھے کس طرح دیکھ رہا تھا۔“

”میں نے بھی محسوس کیا ہے۔ میں نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا جب میں نے بڑے کنور کی پیشکش مانی تھی۔ ہماری تہذیب اور معاشرت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ مرد اور عورت ایک جگہ رہیں، ہمارا مذہب بتاتا ہے کہ دو مرد اور عورت کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے لیکن یہاں ہم دونوں مجبور اور ہنگامی حالت میں ہیں۔ مجھے تمہاری فکر تھی کہ کہیں کوئی مںس بی بیو نہ کریں اور دوسرے مجھے ان پر اعتبار نہیں ہے خاص طور سے بڑے کنور کا بھائی راج کنور پورا شیطان ہے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں اپنے ساتھ ہی رکھوں لیکن اگر تم سمجھتی ہو کہ ٹھیک نہیں ہے تو تم الگ رہ سکتی ہو۔“

”ہرگز نہیں۔“ وہ کانپ اٹھی۔ ”یہاں مجھے ہر آنکھ میں شیطان نظر آیا ہے۔“

”تب لوگوں کی فکر نہ کرو اور آرام سے یہاں رہو۔ کوئی ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے ہمیں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے اگر ہمارا ضمیر مطمئن ہے۔ باقی میری طرف سے تم بے فکر ہو۔“

”آپ کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ جسے بے بی باک رد کر سکیں وہ شخص یقیناً پا کردار ہوگا۔“
 بانو کی بات سے ہرگز یہ مراد نہیں تھی کہ بنی بے بی خود بڑی با کردار تھیں اس لیے وہ دوسروں کو کردار کا سرٹیفکیٹ دے سکتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ بنی نے اپنی ناکام تک دود کی کہانی بانو کو سنا دی ہوگی جب میں نے اس کا ناسی حملہ کامیابی سے پسپا کیا تھا۔ ”بس تو سب اپنے ذہن سے نکال دو اور تم بستر پر لیٹ جاؤ۔“

”آپ.....“ اس نے جھج کر پوچھا۔

”میں نیچے قالین پر لیٹ جاؤں گا۔“

”آپ اوپر لیٹ جائیں۔“

”یہ میرا حکم ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے سر ہلا دیا تھا۔

چہل قدمی کر کے میں بہتر محسوس کر رہا تھا اس لیے میں نے ہاتھ لینے کا فیصلہ کیا۔ میرے جسم پر ممتاز ہاؤس الالباس تھا اور یہ خاصا میلا ہو گیا تھا۔ میں نے دروازہ بجایا تو گور کھے گاڑنے باہر سے کھولا وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک اور بھی تھا۔ میں نے کہا۔ ”مجھے اپنے ساز کا ایک آرام دہ لباس چاہیے اسی وقت اور اگر تم نہیں سکتے ہو تو نشی دل جی سے کہو۔“

دس منٹ بعد موٹا سوتی پا جامہ اور کرتہ آ گیا تھا۔ ساتھ میں میرے ساز کی نئی بنیان بھی تھی۔ بانو واش روم سے آگئی اور ہلکا کبل لے کر لیٹ گئی تھی۔ شاید اس کے لیے یہاں شلوار سوٹ نہیں ملا تھا یا جان بوجھ کر اسے اڑھی دی گئی تھی جب کہ وہ اس کی عادی نہیں تھی۔ اس کے لیے میں بعد میں بات کر سکتا تھا۔ گرم پانی سے غسل رکے میری طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی تھی۔ کسل مندی، تھکن اور ایک عجیب سی کیفیت تھی وہ سب غائب ہو گئی۔ میں ہلکا کبل اور ٹکیے لے کر قالین پر لیٹا تو پھر مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب سو گیا اور صبح مجھے بانو نے اٹھایا۔

”اٹھ جائیں، یہ لوگ دوبارنا شتے کا پوچھ چکے ہیں۔“

”اچھا مجھے پتا ہی نہیں چلا کیا وقت ہو رہا ہے؟“

”نوج رہے ہیں، کناری موٹھوں والا بھی آیا تھا۔“ بانو نے کہا اس کی مراد نٹی دل جی سے تھی اسی کی کناری موٹھیں تھیں۔ میں اٹھا اور واش روم سے آیا اس دوران میں ناشتہ آچکا تھا۔ بانو ناشتے کے دوران بار بار ساڑھی کا پلوٹیک کر رہی تھی شاید اس لیے بھی کہ اسے عادت نہیں تھی اور دوسرے اس کا بلاؤز خاصا مختصر اور ناپ سے کم تھا۔ اس لیے اسے پلو سے ستر پوشی کرنا پڑ رہی تھی۔ ادھر ناشتہ کیا اور ادھر نٹی دل جی نازل ہو گیا۔ اس نے آتے ہی ناگواری سے کہا۔ ”بہت دیر کی ہے آپ نے ڈاکٹر انتظار کر رہا ہے۔“

”ذرا سے انتظار سے وہ مرنے لگے گا۔“ میں نے کہا۔ ”رات مجھے یہ لباس دے دیا تھا لیکن بیروں میں

کیا یہی جوتے پہنوں۔“

”ابھی پہن لیں بعد میں.....“

”سوری میں ننگے پاؤں جا سکتا ہوں لیکن اس لباس کے ساتھ یہ جوتے نہیں پہن سکتا۔“

خون کے گھونٹ پی کر نٹی جی نے میرے لیے سلیپر منگوائے۔ یہ معمولی سے استعمال شدہ مگر شاندار قسم کے چری سلیپر تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب میں پھنسا ہوا تھا تو انہیں کیوں چھوڑتا جہاں بھی ممکن تھا میں نے اپنی بات منوانے اور ان کی ناک میں دم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بانو کمرے میں رہی تھی باہر آتے ہی میں نے نٹی جی سے کہا۔ ”آپ کو خیال ہونا چاہیے کہ ہم انسان ہیں۔ اگرچہ آپ ماننے نہیں ہوں گے لیکن فی الحال ماننے پر مجبور ہیں اس لیے ہمارے ساتھ انسانوں والا ٹریٹ کریں۔ ایک تو ہمیں ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کریں۔ بانو کے لیے کسی خادمہ کو بھیجیں جو اس کی ضروریات کے مطابق چیزیں مہیا کرے آپ میری بات سمجھ رہے ہیں خواتین کو کن کن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔“

”جی سمجھ رہا ہوں۔“ نٹی جی نے سر ہلایا۔

”دوسرے کمرے میں ایک ڈبل بیڈ ہے اسے ابھی دو سنگل بیڈز سے تبدیل کر دیں۔ میرا خیال ہے میری واپسی تک یہ سارے کام ہو جائیں گے۔“

”آپ حکم کریں تو ابھی کر دیتے ہیں۔“ اس نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”اتنی جلدی دکھانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ خاص طور سے جب آپ کو مجھ سے کوئی سرٹیفکیٹ بھی نہیں

ملے گا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

پہلے کلینک محل کے قریب ایک الگ عمارت میں تھا لیکن اب اسے محل کے ایک حصے میں بنادیا گیا تھا۔ ایک بڑے ہال نما کمرے میں کلینک کا مکمل سیٹ آپ تھا۔ اس بار ایک خوش شکل نوجوان ڈاکٹر وہاں موجود تھا اور اس کے ساتھ نظر نواز قسم کی نرس تھی۔ نٹی دل جی مجھے وہاں گورکھا گارڈ کی نگرانی میں چھوڑ کر خود چلے گئے تھے۔ نرس نے مجھے شارٹ دیا۔ ”یہ پہن لیں۔“

ایک طرف اسکرین موجود تھی میں نے اس کے پیچھے جا کر کپڑے اتارے اور شارٹ پہن لیا۔ ڈاکٹر نے مجھے چڑے کی کاؤچ پر لٹا کر پہلے میرا معمول کا طبی معائنہ کیا۔ بلڈ پریشر، نمپرچر، زبان اور آنکھوں کا معائنہ کیا اور

پھر اس نے میری جسمانی طاقت جانچنے کے لیے کچھ ٹیسٹ لیے۔ وہاں اس مقصد کے لیے مشینیں موجود تھیں۔ آخر میں اس نے میرے خون، تھوک، ٹشوز اور پورین کے ٹیسٹ لیے۔ میں ایک گھنٹہ وہاں رہا تھا۔ منشی جی آدھے گھنٹے بعد ہی آگئے تھے۔ جب ڈاکٹر نے اپنا کام مکمل کر لیا تو میں نے اپنے کپڑے پہنے اور ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں شعوری طور پر محل کی ساخت سمجھنے اور یاد رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قید خانہ اور کلینک زیادہ دور نہیں تھا اور شاید میری وجہ سے اس حصے کی سیکورٹی بڑھادی گئی تھی۔ مجھے کم سے کم نصف درجن مسلح گورکھے دکھائی دیئے تھے۔ محل میں بیڑے کے قبیلے کا کوئی مرد نظر نہیں آیا تھا۔ یہاں صرف گورکھے تھے۔ ان میں سے دو میرے کمرے کے باہر موجود تھے۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو ٹھنک گیا منشی جی نے سچ مچ پھرتی دکھائی تھی۔ کمرے کا بیڈ تبدیل کر دیا گیا تھا اور اب وہاں دو عدد لکڑی سے بنے سنگل بیڈ تھے لیکن یہ سنگل بیڈ بھی چار بائی سات فٹ کے تھے۔ بانو نے دروازہ بند ہونے کے بعد کہا۔ ”شکر ہے ان لوگوں کو خیال آیا اور اب آپ کو نیچے نہیں سونا پڑے گا۔“

”اتنے اچھے نہیں ہیں ان کو کہنا پڑا ہے تو یہ کام ہوا ہے اور ابھی اور بھی ہوگا۔“

”اور کیا ہوگا؟“

”بس دیکھ لیتا۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں میری حیثیت وہی ہے جو ممتاز ہاؤس میں تھی یعنی ایک دی آئی پی قیدی جس کی ہر بات مانی جاتی ہے بشرطیکہ وہ آزاد ہونے کی بات نہ کرے۔“

”جی ہاں میاں صاحب کا حکم تھا کہ آپ کا ہر ممکن خیال رکھا جائے اور ہر بات مانی جائے۔“

مجھے میاں صاحب سے خیال آیا۔ ”تم نے کہا تھا کہ تم میاں ممتاز کی منہ بولی بیٹی ہو؟“

وہ جھینپ گئی۔ ”میں نے ان لوگوں پر زور ڈالنے کے لیے کہا تھا۔ ویسے میاں صاحب مجھ پر مہربان تھے اور میں نے کبھی ان کے انداز میں اپنے لیے کوئی الگ بات محسوس نہیں کی۔“

میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ عیاش طبع میاں ممتاز میں اتنی انسانیت ضرور تھی کہ اس نے اپنی ایک معمولی پروردہ کو کھلونا بنانے سے گریز کیا تھا۔ بانو تجسس تھی کہ مجھے کہاں لے گئے تھے اور میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟ میں نے اسے اختصار سے کلینک کے بارے میں بتایا۔ یہاں ٹی وی تھا میں نے ریوٹ اٹھا کر اسے آن کیا۔ ٹی وی کے ساتھ لاتعداد چینل والا سیٹلائٹ ریسیور بھی تھا۔ اس سے دنیا اور خاص طور سے اس حصے کا ہر چینل دیکھا جاتا تھا۔ جب ملک میں ہوتے تھے تو عام طور سے بیرون ملک کے چینل دیکھتے تھے لیکن اس وقت وطن سے دور ہوئے تو بے اختیار مقامی چینل کی تلاش ہوئی۔ بڑی دیر بعد جا کر چند پاکستانی نیوز اور انٹرفیمسٹ کے چینل کا ایک گروپ ملا۔ بانو بھی خوش ہو گئی تھی۔ نیوز چینل انتخابات کے بعد کا جوڑ توڑ دکھایا جا رہا تھا۔ سیاسی پارٹیوں کی مفاہمت کی سیاست کا مرکزی نکتہ کھاد اور کھانے دو تھا۔ یہ مفاہمت ان کے ذاتی مفادات کے لیے تھی۔ قطار بنا کر ووٹ ڈالنے والوں کا اس مفاہمت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے بور ہو کر ریوٹ بانو کے حوالے کر دیا اور وہ ایک چینل سے آنے والا مارننگ شو دیکھنے لگی۔ جس میں میزبان خاتون ایک دیہاتی خاندان کو جمع کر کے آنسو بہا رہی تھی۔ خاندان کسی وڈیرے کے ظلم کا شکار ہوا تھا۔ شواہد متاثر کن تھا کہ بانو کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

دروازے پر دستک ہوئی اور پھر ایک خادمہ اندر آئی۔ اس نے لباس خادماؤں والا ہی پہن رکھا تھا۔ پہلے

میں نے توجہ نہیں دی لیکن پھر دیکھا اور چونک گیا۔ وہ اوشا تھی سپرے سندھو کی بیٹی اوشا، جو کسی وقت میری دیوانی ہو گئی تھی اور میری خاطر اپنے باپ سے بغاوت کر کے بھاگنے کو بھی تیار ہو گئی تھی۔ اس پر اسے اپنی پشت کی کھال سے محرومی بھی برداشت کرنا پڑی تھی۔ وہی اوشا میرے سامنے موجود تھی۔ مختصری چولی میں سینے اور پیٹ کا بڑا حصہ نمایاں تھا اور نیچے اس نے تنگ پاجامہ نما کوئی چیز پہن رکھی تھی جو اس کی پنڈلیوں تک آرہی تھی یہ یہاں کی خادماؤں کا مخصوص لباس تھا۔ اس لباس میں اس کا سیاہ سے تانبے جیسا سرخ ہو جانے والا رنگ نمایاں تھا۔ شاید یہ موسم اور ماحول کا اثر تھا ورنہ اس سے پہلے وہ سیاہ رنگ کی تھی۔ یہ تانبے جیسا رنگ اسے مزید پرکشش بنارہا تھا۔ لباس کے علاوہ دیگر سولہ سنگھار بھی کیے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے وہ کنور پیلس کی خادمہ تھی۔ ممتاز ہاؤس میں بانو بھی بہت جگہ جگ کر رہتی تھی۔ بڑے لوگوں کے ملازم بھی الگ سے نظر آنے چاہئیں۔ جیسے میں حیران تھا اسی طرح وہ بھی دنگ رہ گئی تھی جیسے اسے یہاں میری موجودگی کی توقع نہ ہو۔

”شہباز۔“ اوشا نے ہنسنے کا اشارہ کیا اور لپک کر میرے پاس آئی اس نے میرا بازو تھام لیا تھا۔ ”تم پھر ان کے ہاتھ آ گئے۔“

”بد قسمتی سے۔“ میں نے سر آہ بھری۔ ”تم کیسی ہو، سندھو کے بارے میں مجھے معلوم ہو گیا تھا مجھے اس کا افسوس ہے۔“

”اس نے جو بویا وہ کاٹ لیا۔“ اوشا افسردگی سے بولی۔ یہاں رہ کر اس کی زبان بھی خاصی حد تک صاف ہو گئی تھی اور اس نے ابھی تک ایک بار بھی اپنا مخصوص لفظ ”رے“ نہیں بولا تھا۔ ”ہم ٹھیک ہیں تم دیکھ رہے ہو اب ہم یہاں ملاجہ ہوں۔“

”تم یہاں کام کرتی ہو؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہ مسکرائی۔ ”شہباز باپو انجان بن رہے ہو، ہم یہاں بے مول کی ملاجہ ہیں۔ سب کرتے ہیں اور بدلے میں بس تن کا یہ کپڑا اور دو وقت کا کھانا ملتا ہے۔“

”ان جیسے لوگوں سے یہی توقع ہو سکتی ہے۔“ میں نے موضوع کو بڑھانے سے گریز کیا ورنہ اوشا سے کچھ بعید نہیں تھا وہ کچھ ناگفتنی قسم کے انکشافات پر اتر آتی۔ کنور پیلس میں عورت کی اور خاص طور سے جب اس کا کنور خاندان سے تعلق نہ ہو کیا وقعت تھی۔ یہ میں اچھی طرح جان گیا تھا۔ اوشا عرصے سے یہاں تھی اور ظاہر ہے وہ بے بس تھی اس کے ساتھ وہ سب ہوا ہوگا اور ہوتا ہوگا جو کنور پیلس کی دوسری خادماؤں کے ساتھ ہوتا تھا اور ہوتا ہے۔ ”تم یہاں سے نکل کر کہیں جا نہیں سکتی ہو؟“

”ہم کیسے جا سکتے ہیں؟“ وہ حیرت سے بولی۔ ”یہاں سب گلام ہیں کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ جو بھاگتا ہے اس پر کتے چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر باہر ہمارا ہے کون جس کے پاس جائیں۔ یہاں چھت تو ملی ہوئی ہے۔“

اس چھت تلے اس کے ساتھ جو ہوتا تھا وہ واضح تھا۔ اوشا مجھے دیکھ کر دکھی تھی وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کنور میرے خون کے پیا سے تھے۔ حقیقتاً بھی اور محاورہ بھی، ایک بار میں قبائلیوں کی وجہ سے ان کے چنگل سے نکل بھاگا تھا مگر ان کے ہاتھ لے تھے انہوں نے مجھے دوبارہ پکڑ لیا۔ یہ وہ بات تھی جو اوشا کی سادہ سی سمجھ میں آ

سکتی تھی اس لیے میں نے اسے یہی بتایا۔ وہ دھکی ہو گئی۔ ”بھگوان تمہاری رکھشا کرے۔“ اس نے کہا اور پھر چوکی۔ ”لوہم جس کام سے آئے تھے اور بھول گئے فشی جی کھال اتر دیں گے۔“

”فکرت کرو جب تک میں یہاں ہوں کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔“

”جج شہباز باؤ۔“ وہ خوش ہو گئی۔ ”جج کہو ہم یاد آتے تھے؟“

”یاد۔“ میں بوکھلا گیا کیونکہ بانو سب کچھ بغور دیکھ اور سن رہی تھی۔ ”ہاں یاد تو آتی تھی۔“

”تم بھی ہمیں بہت یاد آتے ہو۔“ اس نے حسرت سے کہا۔

”تم کام سے آئی تھیں۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”پر تمہیں دیکھ کر سب بھول گئے اب تو فشی جی کھال بھی اتر دیں تو دکھ نہیں ہوگا۔ تمہاری خاطر ایک بار

پہلے بھی یہ تکلیف بھوگ چکے ہیں۔“ کہتے ہوئے اس کا انداز ماضی کی طرح نشیلا ہو گیا تھا۔ میں نے دل میں

لا حول پڑھی۔ وہ مظلوم سہی لیکن اس میں ایک خاص قسم کی نسوانی بد معاشی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب

میں اس کے اور اس کے باپ کے قابو میں تھا تب اس نے اس بد معاشی کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ مگر ساتھ ہی وہ

میرے کام بھی آتی تھی۔ مگر یہاں اس قسم کی بد معاشی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے میں نے ذرا دو ٹوک انداز

میں کہا۔

”ماضی کی باتیں بھول جاؤ اور ابھی کے مسائل پر توجہ دو یہ بتاؤ کہ فشی جی نے تمہیں کس لیے بھیجا ہے؟“

وہ ذرا بجھ گئی اور آہستہ سے بولی۔ ”آپ کو جو چاہیے وہ لادوں۔“

”ٹھیک مجھے کچھ لباس چاہئیں۔“

”آپ لکھ کر دے دیں۔“ اس نے ایک رف پیڑ اور کاغذ میرے سامنے کیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ بولیں تو

ہماری سمجھ میں نہ آئے۔“

میں نے اپنے لباس اور جو تے چپل کے بارے میں لکھ دیا۔ اس کے علاوہ بھی جو سمجھ میں آیا وہ لکھ دیا۔

کون سا میرے اکاؤنٹ سے کچھ جا رہا تھا۔ اپنا پرچہ پھاڑ کر میں نے رف پیڑ بانو کی طرف بڑھا دیا۔ ”تمہیں

جس چیز کی ضرورت ہو اس پر لکھ دو، سب بلا تکلف لکھ دو۔“

بانو نے سر ہلایا اور اپنے بیڈ پر بیٹھ کر لکھنے لگی۔ میں نے آہستہ سے اوشا سے کہا۔ ”سنو، میں یہاں ایک

معتبہ فرد ہوں، کل میں کہاں ہوں کچھ پتا نہیں، لیکن تمہیں یہیں رہنا ہے اس لیے مجھ سے تعلق ظاہر مت کرنا۔

نہ ہی کسی سے میرے بارے میں بات کرنا۔“

”ہم جانتے ہیں لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے۔“ وہ جذباتی ہو گئی۔ ”چاہے یہ ہمیں کتوں کے آگے کیوں نہ

ڈال دیں۔“

”اوشا سمجھے کی کوشش کرو، ہو سکتا ہے کہ تمہارا اور میرا تعلق ان کے علم میں آجائے تو یہ تمہیں یہاں نہ

بھیجیں۔ محل میں خادماؤں کی کمی تو نہیں ہے۔ ممکن ہے کسی وقت تم میری مدد کر سکو۔“

”ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں۔“ اس نے مایوسی سے کہا۔ ”ہاں یہ تم ٹھیک کہتے ہو، ہم اب کسی کو نہیں

بتائیں گے۔“

بانو نے اپنا پرچہ لکھ کر اسے موڑ کر اوشا کے حوالے کیا اور پھر اس کے ساتھ دروازے تک گئی اور سرگوشی میں اسے کچھ کہنے لگی۔ اس کی آسانی کی خاطر میں داش روم میں چلا گیا۔ ابھی کیونکہ خون لینے کا مرحلہ دور تھا اس لیے فی الحال چائے کافی پر پابندی نہیں تھی۔ باہر موجود گورکھا گارڈز کو کہنا کافی ہوتا تھا کچھ دیر میں چائے کافی آجاتی تھی۔ جب اوشا چلی گئی تو بانو نے اس کے بارے میں سوالات کا آغاز کیا میں جانتا تھا وہ لازمی پوچھے گی اس لیے میں نے مناسب جوابات پہلے ہی سوچ لیے تھے۔ جو مختصر اور پُر اثر تھے۔ بانو کی تسلی نہیں ہوئی تھی لیکن اس سے آگے وہ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ البتہ اس نے یہ ضرور کہا۔ ”آپ سے بہت متاثر لگ رہی ہے۔“

”میرے دوست اور دشمن سب مجھ سے متاثر ہوتے ہیں۔“ میں نے ٹالنے کے انداز میں کہا تو وہ سمجھ گڑھ اور پھر اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ دوپہر کا کھانا دیا ہی تھا جیسا کہ میں کچھ عرصے سے کھاتا آ رہا تھا۔ یعنی سادہ لیکن مزیدار اور غذائیت سے بھرپور۔ بانو کی خوراک محدود سی تھی۔ وہ شاید میری خوراک کا چوتھا حصہ بھی نہیں کھاتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم اپنی خوراک پر توجہ دو، تم بہت کم کھاتی ہو۔“

”میں اتنا ہی کھاتی ہوں۔“

”نہیں اس سے زیادہ کھاؤ، یہ مت بھولو کہ تم دشمن کی قید میں ہو اور کسی وقت بھی تم پر برا وقت آسکتا ہے۔ اگر مضبوط ہوگی تو مشکل وقت گزر اسکو گی اور مضبوط بننے کے لیے خوراک اور ایکسرسائز پر توجہ دو۔“

اس نے بے توجہی سے کہا۔ ”میں لڑکی ہوں کتنی کوشش کر لوں مضبوط نہیں بن سکتی۔“

”یہ سب سوچ ہے اللہ نے مرد اور عورت کو بہت مختلف نہیں بنایا ہے۔ عورت صنف نازک ہے لیکن اسے کمزور سمجھنا درست نہیں ہے نازکی اور کمزوری میں فرق ہوتا ہے۔ عورت بھی چاہے تو خود کو مضبوط بنا سکتی ہے۔ شک مرد جیسی مضبوطی اور طاقت نہیں آسکتی ہے لیکن جس حد تک ممکن ہے اتنا تو مضبوط ہونا چاہیے نا۔“

”آپ کہہ تو ٹھیک رہے ہیں۔“ وہ سوچ کر بولی۔ ”تب میں کیا کروں۔“

”ایکسرسائز کرو اور خوراک بہتر بناؤ۔“

”جو ایکسرسائز آپ کرتے تھے؟“

”نہیں ہلکی پھلکی، جیسے واک کرنا، ہلکی دوڑ لگانا ایسی جسمانی ایکسرسائز جو چھوٹی جگہ بھی کی جاسکتی ہیں۔ یہاں بھی خاصی جگہ ہے۔“ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ”یہ لوگ شاید ممتاز ہاؤس جیسا جم تو نہ دیں اس لیے مجھے اسی کمرے میں کچھ کرنا ہوگا۔“

درحقیقت کمرہ خاصا بڑا تھا یہ شاید پچیس بائی اٹھارہ فٹ کا کمرہ تھا۔ میں نے سوچا کہ نشی جی سے کچھ مشینوں کا کہنا ہوں۔ ورنہ میں خود بھی اچھی خاصی ایکسرسائز کر سکتا تھا۔ کھانے کے دو گھنٹے بعد میں نے ہلکی اسکپنگ شروع کی۔ یعنی پنجوں کے بل اچھلنے لگا۔ جسم گرم کرنے کے لیے یہ اچھی ایکسرسائز ہے۔ بانو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کمرہ اتار دیا کیونکہ پسینہ آنے لگا تھا۔ جب جسم گرم ہو گیا تو نیچے لیٹ کر دونوں ہاتھ گردن پر رکھے اور پاؤں ملا کر انہیں سینے اور کھولنے لگا۔ یہ خاصی سخت ورزش تھی۔ ذرا سی دیر میں پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔ بانو نے کہا۔

”دیکھنے میں تو آسان لگ رہی ہے۔“

”لیکن کرنے میں بہت سخت ہے۔ یہ بیک وقت کمر، پیٹ اور پیروں کی ورزش ہے۔“

”کیا میں بھی کروں؟“

”نہیں تم فی الحال واک کرو۔“

”میں نے ایک دو بار بے بی کے ساتھ جم میں ایکسرسائز کی تھی لیکن میرا دل نہیں لگا۔ اس لیے پھر نہیں۔“

کی۔

ایک گھنٹے بعد اوشا ہمارے لیے کپڑے لے آئی تھی۔ اس نے دو عدد بیک اٹھار کھے تھے۔ میں نے تویہ لے کر دوش روم کا رخ کیا۔ نہا کرو ہی کپڑے پہنے اور باہر آیا تو اوشا بانو کو اس کی چیزیں دے کر بتا کر جا چکی تھی۔ وہ میری موجودگی میں بھی سب بتا اور دے سکتی تھی مگر بانو شرمندہ ہوتی اس لیے میں دوش روم چلا گیا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک ہی کمرے میں رہنا آسان نہیں تھا۔ آدمی کو چاہے وہ مرد یا عورت ہو پرائیویسی درکار ہوتی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ اگر نشی جی ہمیں ایسے کمروں میں منتقل کر دے جو برابر ہوں اور درمیان میں رابطے کا دروازہ ہو تو مجھے اور بانو دونوں کو آسانی رہے گی لیکن ایسے کمرے محل میں میسر ہوتے اور نشی جی وہاں منتقل کرنے پر آمادہ ہو۔ باہر آ کر میں نے دوسرے کپڑے لیے اور پھر دوش روم میں جا کر تبدیلی کیے۔ میرے بعد بانو اندر گئی اس نے دوسرا سوٹ ساتھ لے لیا تھا یہ اس کا پسندیدہ فراک پا جامہ سوٹ تھا۔ کچھ دیر آرام کر کے میں نے نشی جی سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ گور کھے گاڑنے کہا۔

”ان کو بتاتا ہے۔“

گور کھے کی اردو یا ہندی واجبی سی تھی۔ مگر وہ سمجھ لیتا تھا اور اپنی بات سمجھا بھی لیتا تھا۔ بانو نہا کر اور لباس بدل کر آئی تو تازہ دم لگ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”سنو میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔ میں نشی جی سے بات کرتا ہوں وہ ہمیں دو ایسے کمرے دے دے جو درمیان سے ملے ہوں۔“

وہ ڈر گئی۔ ”میں اکیلی رہوں گی۔“

”نہیں تم ایک طرح سے میرے ساتھ ہی ہو گی لیکن تمہاری اپنی پرائیویسی بھی ہو جائے گی۔“

اس نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”اگر ایسا ہو تو ٹھیک ہے لیکن اس صورت میں، ہمیں باہر والا دروازہ اندر سے بند ہی رکھوں گی۔“

”اے بھی دیکھ لیں گے پہلے نشی جی سے بات کر لیں اور کمرے مل جائیں۔“

نشی دل جی کچھ دیر بعد آیا اور کسی قدر طنزیہ انداز میں بولا۔ ”حکم شہباز جی۔“

”نشی جی ایک قیدی آپ کو کیا حکم دے گا۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”گزارش کر سکتا ہے مانتا یا

نہ مانتا آپ کے اختیار میں ہے۔“

”ہم تو خود آپ کے رحم و کرم پر ہیں۔“ وہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔ ”بہر حال حکم کریں۔“

”نشی جی ایک تو ہمیں ایسے دو کمروں میں منتقل کر دیں جو درمیان سے ملے ہوں۔ ایک کمرے میں

پرائیویسی مشکل ہو جاتی ہے۔“

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ہو جائے گا لیکن کل تک ہی ہو سکے گا۔“

”دوسرے مجھے اپنی صحت بہتر بنانے کے لیے کچھ ایکسرسائز ایکوپنٹ درکار ہیں۔“
 ”وہ بھی کل تک مل جائیں گے۔“ اس نے کہا۔ ”آج کسی وقت آپ کے نیشنل کی رپورٹ آجائے گی اور کل صبح سویرے آپ کو ڈاکٹر سے ملنا ہوگا۔“
 ”میں تیار رہوں گا لیکن فٹنی جی کیا میں اس شخص سے مل سکتا ہوں جو بڑے کنور کے لیے میرے خون سے دوا تیار کرے گا۔“

”مجھے بڑے کنور سے اجازت لینا پڑے گی۔“ فٹنی جی نے کہا۔ اس کے جانے کے بعد بانو نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔

”آپ اتنے مطمئن ہیں کہ لگ ہی نہیں رہا ہے کہ آپ دشمن کی قید میں ہیں۔“
 ”حالانکہ تم مجھے پہلے بھی دیکھ چکی ہو۔ ممتاز ہاؤس میں بھی میں قیدی تھا اور وہاں بھی میں اتنے سکون سے رہ رہا تھا۔ البتہ مجھے موقع ملا تو میں نے اس ڈاکٹر کو دنیا سے رخصت کر دیا جو میرا خون نمیڈر رہا تھا۔ موقع ملا راسن بھی مارا جاتا مگر میری کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اس نے مجھ پر قابو پالیا تھا۔ میں ہمیشہ یہ امید رہتا ہوں کہ مجھے موقع ملے گا اور یقین کر دیا کہ بار بھی مجھے مایوسی نہیں ہوئی میں اس مرحلے پر اتنی بار گزر چکا ہوں کہ اب بالکل عام سی بات لگتی ہے اور یہی وجہ ہے میں اتنا سکون رہتا ہوں۔“
 ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مجھے ان معاملات کا کوئی تجربہ نہیں ہے میں تو ممتاز ہاؤس سے بھی کم نکلتی تھی اس لیے یہ سب میرے لیے بہت دہشت ناک ہے یقین کریں آپ نہ ہوتے تو شاید میں اب تک دہشت سے مرچکی ہوتی۔“

رات کے کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر چہل قدمی کی اور پھر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بانو لیٹنا چاہتی تھی لیکن میرے سامنے لیٹتے ہوئے جھک رہی تھی۔ جب میں کبل اور نکیہ لے کر قالین پر دراز ہوا تو وہ بھی لیٹ گئی تھی۔ بانو کے ساتھ ہونے سے مجھے کوفت تو ہوئی تھی لیکن ساتھ ہی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھ میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں لی تھی بلکہ اس کا انداز بدستور پہلے والا تھا اور وہ مجھ سے ادب و آداب سے پیش آرہی تھی۔ میری حالت بہتر ہو رہی تھی۔ آرام اور بہترین خوراک سے میری کمزوری تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ اگلی صبح میری آنکھ جلد کھل گئی۔ بانو سو رہی تھی میں نے پاجامہ پہنا اور ایکسرسائز کی۔ گزشتہ روز کی نسبت صحت کم ہوئی تھی۔ مجھے آخری بار خون دیئے ہوئے چار دن سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا۔ مگر مجھے امید تھی کہ ہفتہ واری خون لینے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

ایکسرسائز سے فارغ ہو کر میں نے غسل کیا اور باہر آیا تو بانو جاگ گئی تھی اس نے کبل تہہ کر کے دکھ دیئے تھے۔ مجھے گڈ مارنگ کہہ کر وہ داش روم چلی گئی۔ ٹھیک آٹھ بجے دل نواز خان ناشتہ لے آیا۔ جب وہ پہلی بار مجھ سے ملا تو خاصانہ جوش تھا لیکن بانو اور مجھے ایک کمرے میں رہنے پر اس کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے کسی قدر معاندانہ انداز میں ناشتہ لگایا۔ اس بار کافی نہیں تھی اور چائے صرف بانو کے لیے تھی۔ ہر بات اس نے واضح کر دی کہ مجھے چائے یا کافی سے منع کر دیا گیا ہے۔ بانو آئی تو ہم نے ناشتہ کیا۔ ناشتے کے فوراً بعد فٹنی جی آ گیا تھا اور مجھے کلیٹک لے گیا۔ جہاں ڈاکٹر میرا منتظر تھا۔ اس نے معمول کا چیک اپ کیا اور بولا۔

”کچھ کمزوری ہے لیکن جسم اور خون میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ میں کچھ دوائیں دے رہا ہوں جو دودن لینی ہیں اس کے بعد دوبارہ چیک آپ ہوگا۔“

”یعنی ابھی میرا خون نہیں لیا جائے گا؟“

”نہیں دوبارہ چیک آپ کے بعد فیصلہ ہوگا۔“ ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے مجھے تین چار طرح کی گولیاں اور کپ لٹس کھانے کے لیے دیں اور بتایا کہ دن میں کتنی بار لینی ہیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ ابھی مجھے خون نہیں دینا ہوگا البتہ نشی جی کا موڈ خراب ہو گیا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”دیکھنے میں تو شہباز جی ٹھیک لگ رہے ہیں۔“

”یہ میرا معاملہ ہے۔“ ڈاکٹر نے خلاف توقع رکھائی سے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ کب ان سے خون لیتا مناسب ہوگا۔“

یہ ڈاکٹر اس قصائی نما ڈاکٹر سے مختلف لگ رہا تھا جو پہلے یہاں میرا خون نکالتا تھا اور بعد میں پتا چلا کہ وہ معتب قبائلیوں اور کور خانہ دان کے دشمنوں کے اعضا بھی نکالتا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ موت کی آغوش میں چلے جاتے تھے۔ مگر کیا کہا جاسکتا تھا۔ میں نے انسانوں کو ایسے ایسے غائبوں کے ساتھ دیکھا تھا کہ ایک بار تو فرشتے بھی دھوکا کھا جائیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا جب مجھے ڈاکٹر توفیق جیسے شیطان سے واسطہ پڑا تھا اور اس نے زرین اور مجھ پر جان لیوا دوائیں کا تجربہ کیا۔ میری موت کا وقت نہیں آیا تھا اس لیے میں محفوظ رہا تھا لیکن زرین اپنی جان سے گئی تھی۔ اگر یہ ڈاکٹر اتنا ہی اچھا ہوتا تو اس وقت یہاں کور ہٹل میں موجود نہ ہوتا۔ واپسی میں نشی جی مجھے اس کمرے کی طرف نہیں لے گیا تھا جہاں میں اور بانو رہ رہے تھے بلکہ اس نے اسی راہداری میں ایک اور کمرے کا دروازہ کھولا۔

”شہباز جی آپ کی خواہش کے مطابق یہ کمرے کھولے گئے ہیں۔ دیوی جی براہِ رواں لے کرے میں ہیں پر درمیان کا دروازہ موجود ہے۔“ کہتے ہوئے اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔ میں نے اسے گھورا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ دیوی جی کی طرف سے مطمئن رہیں گے۔“ نشی جی نے جلدی سے لہجہ بدل دیا۔

”آپ نے جو مشینیں کبھی تھیں وہ بھی آگئی ہیں۔“

ہم اندر آئے۔ یہ کمرہ جدید مگر سادہ انداز کا تھا۔ فرش پر وال ٹوال کھلتے چلے رنگ کا کارپٹ تھا۔ ایک طرف چھوٹی سائڈ دراز کے ساتھ منسلک بیڈ تھا۔ دراز کے ساتھ ٹو سٹر صوف اور اس کے سامنے میز تھی۔ اندر آنے والا دروازہ واش روم کے سامنے کھلتا تھا۔ کمرہ ایل فٹل کا تھا۔ دروازے کے ساتھ اور واش روم کے بالکل سامنے وارڈروپ تھی۔ کمرے میں ایک طرف ایکسٹریکٹر مشینیں لگی تھیں۔ بیڈ کے عین سامنے ایل سی ڈی ٹی وی اور ڈی وی ڈی پلیئر تھا۔ ریک میں بے شمار ڈی وی ڈیز رکھی تھیں۔ کمرے پر میٹ فٹش ہلکا آسمانی رنگ تھا۔ بیڈ کے ساتھ کھڑکی تھی جس پر فیروز کی رنگ کے پردے تھے۔ وارڈروپ اور واش روم کے درمیان براہِ رواں لے کرے کا دروازہ تھا۔ نشی جی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جب میں نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تو اس نے خود پوچھ لیا۔

”کمرہ کیسا لگا؟“

”بچھی کو قید خانے سے کیا فرق پڑتا ہے نشی جی۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”بجھرہ سونے کا بھی ہو تو بجھرہ ہوتا ہے۔“

اگر نشی جی نے مجھ سے اتفاق کیا تھا تو ظاہر نہیں کیا اور رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں مہراب والے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بانو شاید لگی کھڑی تھی کیونکہ دوسرے سیکنڈ میں دروازہ کھل گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر گویا سکون کا سانس لیا۔ ”شکر ہے درنہ میں پریشان ہو گئی تھی۔ آپ کے جاتے ہی وہ لڑکی آئی اور مجھے یہاں لے آئی۔“

”اوشا؟“ میں نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ جھینپ گئی۔ ”بہت بد تمیز ہے مجھ سے ایسے سوال کر رہی تھی کہ مجھے ڈانٹا پڑا۔“
 ”وہ اُن پڑھ اور بہت معمولی طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ تم اسے بہت پالش شدہ شکل میں دیکھ رہی ہو ورنہ وہ اپنے باپ کے سامنے بھی ایسی باتیں اور حرکتیں کر جاتی تھی کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔“
 بانو ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ ”وہ مجھ سے آپ کے بارے میں کیرید کیرید کر پوچھ رہی تھی۔“
 ”کیا پوچھ رہی تھی؟“ میں نے بانو کے کمرے کا جائزہ لیا سوائے ایک سرساز مشینوں کے یہ بالکل میرے کمرے کی طرح فرنش تھا۔ ہمارے کپڑے اور دوسری چیزیں بھی الماریوں میں آگئی تھیں۔

”بہی کہ میرا آپ سے کیا تعلق ہے؟“ بانو جھینپ کر بولی۔ ”اس پر میں نے اسے ڈانٹ دیا۔“
 ”تم نے ٹھیک کیا۔ یہاں ہم اپنی خوشی سے نہیں آئے ہیں جو دوسروں کا خیال رکھیں۔ ابھی ہم حادی ہیں اس لیے جو بات محسوس ہو وہ صاف کہہ دیا کرو۔“

”ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“ اس نے موضوع بدل دیا۔

”فی الحال تو بچت ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے دو دن بعد دوبارہ میٹ لینے کو کہا ہے۔“

”اللہ کرے وہ آپ کو ان فٹ قرار دے دے۔“

میں اس کی دعا پر ہنسا۔ ”بی بی یہ بچ نہیں ہے کہ ان فٹ ہونے کے بعد مجھے بیچ سے نکال دیا جائے۔ اس کے بجائے یہ مجھے دنیا سے رخصت کر دیں گے اور ظاہر ہے پھر تمہارے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا۔“
 وہ سہم گئی۔ ”یہ تو میں نے سوچا نہیں۔“

”دیکھو ابھی وقت ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”خون لینے کا سلسلہ ہی کئی مہینے چلے گا۔ مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے ہمیں کوئی نہ کوئی موقع ملے گا۔ بس ہمیں صبر سے انتظار کرنا ہوگا۔“

”لیکن یہ پھر وہی حرکت نہ کریں۔“ بانو نے خدشہ ظاہر کیا۔ ”نصف لیٹر کا کہہ کر زیادہ خون نکال لیں۔“
 ”نہیں مجھے امید ہے اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں میں کنور خاندان کے پوری طرح قابو میں نہیں تھا اور انہیں یہ خدشہ بھی ہوگا کہ میں فرار نہ ہو جاؤں اس لیے وہ حفظ بالقدم کے طور پر میرا زیادہ خون لے رہے تھے مگر یہاں میں ان کے قابو میں ہوں اور سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کو صرف اتنی لوگ ذبح کرتے ہیں۔“
 ”اگر آ۔۔۔ ان کے ابو میں ہیں تو پھر یہاں سے کیسے نکلیں گے؟“

”اللہ مالک ہے پہلے بھی وہی مدد کرتا آیا ہے آج بھی وہی کرے گا اور اگر اس نے کوئی اور فیصلہ کر لیا ہے تو بھی ہمارے پاس رضا بہ راضی رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے یہ انہوں نے اچھا کیا ہے کہ ہمیں الگ کمرے دے دیئے۔“

وہ مسکرائی۔ ”ہاں، سچ میں مجھے آپ کے سامنے سوتے ہوئے شرم آتی تھی اور بے چینی کی وجہ سے بڑی مشکل سے نیند آتی تھی۔“

”اب تم آرام سے سو سکو گی۔ درمیان والا دروازہ بھی بند کر لیتا۔“

”ایسا نہیں ہے کہ مجھے آپ پر بھروسہ نہیں ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”بات صرف جھجک کی ہے اور یہ دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ البتہ اس دروازے کے اندر کوئی چیز نہیں ہے بند کرنے والی سوائے لاک کے۔“

لاک کو مٹن دبا کر اندر سے بند کیا جا سکتا تھا لیکن اسے چابی کی مدد سے باہر سے کھولا بھی جا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ہم اس معاملے میں مجبور ہیں۔ اگر انہوں نے کچھ کرنا ہوگا تو ہم بند دروازوں کے پیچھے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ اس لیے لاک یا اندر سے بند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ پھر اسے یاد آیا۔ ”اوشا میرے اور آپ کے لیے کچھ اور لباس اور چیزیں لائی ہے۔ میں نے آپ کے کپڑے اور چیزیں آپ کی الماری میں رکھ دی ہیں۔“

میں نے چیک کیا۔ تین مکمل لباس تھے۔ ایک ٹائٹ سوٹ تھا جو آرام دہ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پر مشتمل تھا۔ روشمارش تھے اور ایک واش روم سلپر تھا۔ شیونگ کا مکمل سیٹ۔ نیل کٹر اور کچھ دوسری ضروری اشیاء تھیں جن کی ضرورت آدمی کو پڑتی رہتی ہے۔ یہاں بھی واش روم شاندار اور تمام سہولیات سے آراستہ تھا۔ میں نے ایکسر سائز شروع کی تو کچھ دیر میں بانو بھی آگئی۔ اس نے ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔

”گڈ تم نے میری بات مان لی۔“

”ہاں پھر یہاں کرنے کے لیے اور کچھ ہے نہیں۔ کیوں نہ میں بھی ایکسر سائز کروں۔“

”پہلے تم رنگ مشین پر چلو۔“ میں نے مشورہ دیا اور پھر اسے عملی طور پر کر کے بھی دکھایا۔ معمولی سی کوشش سے وہ خود بھی سیکھ گئی۔ اس نے مشین پر داک کی اور پھر ہلکی رنگ کی اور اس کے بعد سائیکل چلائی۔ ایک گھنٹے کی ایکسر سائز نے اسے پسینے پسینے کر دیا تھا اور سانس بے قابو ہو رہا تھا میں نے افسوس سے کہا۔ ”تم دیکھنے میں صحت مند لگتی ہو لیکن تمہارا اسٹیمنا بہت کم ہے۔ بہر حال ایک ہفتہ لگ کر کرو گی تو اسٹیمنا بہتر ہو جائے گا۔“

جو کھا نا میرے لیے آتا تھا وہی بانو بھی کھاتی تھی۔ اسے سادہ اور غذائیت سے بھرپور خوراک ملی تو سچ جج ندلوں میں اس کا اسٹیمنا اور صحت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ میں دو وقت ایکسر سائز کرتا تھا اور میرا دورانیہ دو گھنٹے دیتا تھا لیکن وہ ایک گھنٹہ کرتی تھی۔ اس کے لیے یہ بھی کافی تھا۔ تین دن بعد میرے ٹیٹ دوبارہ ہوئے تھے اور گلے دن رپورٹ آئی تھی کہ میں اب بالکل فٹ تھا اس لیے مزید تین دن بعد خون نکالنے کا ہفتہ وار پروگرام دوبارہ شروع کیا جا رہا تھا۔ مسلسل بہترین خوراک اور ایکسر سائز کے بعد مجھے فٹ تو ہونا ہی تھا۔ بانو یہ سن کریشان ہوئی تھی کہ میرا خون لیا جائے گا۔

”یہ تو ہونا ہی تھا۔“ میں نے سروا بھر کر کہا۔ ”اسی مقصد کے لیے میری جان کے دشمن میرے لیے اتنی

تک دو کر رہے ہیں لیکن اسی بہانے میری جان بھی بچی ہے۔“

بانو کی فکر کم نہیں ہوئی تھی۔ مجھے راج کنور کی فکر تھی ان دونوں بھائیوں میں میرے خون کا اصل پیاسا دعو تھا بڑے کنور کو میرا خون صرف علاج کے لیے درکار تھا وہ براہ راست میرا دشمن نہیں تھا مگر راج کنور میرا ذاتی دشمن بن گیا تھا۔ ایک تو وہ کینہ پرور شخص تھا اور دوسرے میں نے کئی موقعوں پر اسے منہ توڑ جواب دیئے تھے لیکن جب سے میں یہاں آیا تھا مجھے ایک بار بھی اس کی منحوس صورت نظر نہیں آئی تھی ہاں جب آیا تھا تو اس کا چیلانا نیک ضرور دکھائی دیا تھا اس کے بعد سے وہ بھی غائب تھا۔ یقیناً ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھے بڑے کنور کے حوالے کر کے بھول گیا تھا۔ بلکہ وہ منتظر ہو گا کہ کب بڑے کنور کا کام ختم ہو اور میں اس کے ہاتھ آؤں۔ اس کا ایک اور چیلان یعنی راجن بھی غائب تھا اگر وہ کنور پیلس آیا تھا تب بھی میرا اس سے سامنے نہیں تھا۔ وہ بھی بانو کے ہاتھ سے نکل جانے سے تملارہا ہو گا۔ میں جب ان کے ہاتھ آتا وہ یقیناً اپنے دل کی ہر ممکن بھڑاس نکالتے۔ میرے ساتھ بانو بھی ماری جاتی۔ اگرچہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ ایک حسین اور جوان لڑکی تھی اور اس پر راجن کا دل آ گیا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ میرے ساتھ اغوا ہوئی تھی۔ اگر راجن صرف اسے لے آتا تو یقیناً وہ اب تک اپنی من مانی کر چکا ہوتا۔ میرے خلاف اندر ہی اندر کیا کھجڑی پک رہی تھی میں اس سے فی الحال بے خبر تھا۔

ایک ہفتے بعد بانو نے دوسری ایکس راسائز شروع کر دی تھیں جیسے کمر اور بازوؤں کی۔ وہ بیچ پر لیس بھی کر رہی تھی۔ نوجوان تھی اس لیے اسے بہت تیزی سے اثر ہوا تھا۔ پہلے وہ ذرا بے ڈول تھی۔ پیٹ بڑا تھا اگرچہ یہ بد نما نہیں لگتا تھا۔ ہمارے مشرقی لباس بے ڈول جسم کو بھی خوب صورت بنا کر پیش کرتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں صحت اور جسم کی بہتری کی طرف کم ہی توجہ دی جاتی ہے اور خواتین کا سارا زور اچھے اور خوب صورت لباس پر ہوتا ہے۔ یہی حال بانو کا بھی تھا۔ مگر ایکس راسائز کی تو اس کی ٹھیک بدل گئی۔ پیٹ کم ہو گیا تھا۔ انسانی چربی چھٹ گئی تھی۔ جسم مضبوط اور اسٹیمنا کہیں بہتر ہوا تھا اب وہ بغیر تھکے ایک گھنٹے کی رننگ یا سائیکلنگ کر سکتی تھی۔ اپنی اس پروگریس پر وہ بہت خوش تھی اور اس کا مطالبہ تھا کہ میں اسے سیلف ڈیفنس بھی سکھاؤں۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ایک ہفتہ اور لگ کر ایکس راسائز کرے اور خود کو مزید مضبوط بنائے اس کے بعد میں اسے ضرور سکھاؤں گا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق تین دن بعد میرا خون لیا گیا تھا اور اس بار ڈاکٹر نے مجھے واضح دکھا کر نصف لیٹر خون لیا تھا۔ خون دے کر مجھے کسی قسم کی کمزوری محسوس نہیں تھی۔ اس روز بھی میں نے معمول کے مطابق ایکس راسائز کی تھی۔ اب مجھے ایک ہفتے بعد خون دینا تھا اور جلد ایک ہفتہ گزر گیا۔ مجھے ناشتے کے بعد کلینک لے جایا گیا تھا جب کہ ممتاز ہاؤس میں ناشتے سے پہلے میرا خون لیا جاتا تھا اور وہ طریقہ کار غلط تھا صبح انسان خالی پیٹ ہوتا ہے اور رات بھر میں اس کی توانائی کا بڑا حصہ خرچ ہو چکا ہوتا ہے ایسے میں خود دینے سے جسم مزید کمزور ہو جاتا ہے۔ اب میں ناشتہ کر کے گیا تو مجھے معلوم بھی نہیں ہوا تھا۔ دوسرے ہفتے میں ناشتہ کر کے ناشی جی کے ساتھ روانہ ہوا۔ کمرے سے باہر ناشی جی اور گورکھا گارڈ لازمی میرے سر پر ہوتے تھے اگر ناشی جی کچھ دیر کے لیے کہیں چلے بھی جاتے تب بھی گارڈ لازمی ہوتا تھا۔ اس روز بھی ناشی جی کچھ دیر بعد کلینک سے کہیں چلے گئے تھے۔ میرا خون لیا گیا

اور پھر میں گارڈ کے ساتھ واپس روانہ ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے میرے کمرے کی طرف لے جائے گا لیکن اس کے بجائے اس نے درمیان سے راستہ بدل دیا۔ میں رک گیا۔

”یہ کہاں لے جا رہے ہو؟“

”آپ کو بلایا گیا ہے۔“

”کس نے؟“

”آپ دیکھ لیتا۔“ وہ بولا۔ ”دیر مت کریں مالک ناراض ہوں گے۔“

مجھے خیال آیا کہ کہیں بڑے کنور نے تو نہیں بلایا ہے۔ میں گارڈ کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے ایک دروازے

تک لایا اور بولا۔ ”آپ اندر چلے جائیں۔“

مجھے تعجب ہوا کہ اگر بڑا کنور اندر موجود تھا تو مجھے اس طرح جانے کو کیوں کہا جا رہا تھا جب کہ بڑے کنور سے میری ملاقات کے دوران نہ صرف یہ گارڈ بلکہ منشی دل جی بھی موجود رہا تھا۔ میں ہچکچایا اور دروازہ کھول کر اندر آیا تھا کہ رک گیا۔ سامنے ایک شاہانہ قسم کی کرسی پر راج کنور بیٹھا تھا اور اس کے عقب میں نائیک کھڑا تھا۔ راج کنور سنجیدہ تھا لیکن نائیک دانت پیسنے کے انداز میں مسکرا رہا تھا البتہ ایک چیز مشترک تھی اور وہ ان کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت تھی۔ پیچھے دروازہ بند ہو گیا تھا۔ خطرے کے احساس نے مجھے چوکنا کر دیا تھا۔

”شہباز جی۔“ راج کنور نے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔ ”بہت دنوں بعد ملاقات ہو رہی ہے۔“

”میں بھی سوچ رہا تھا کہ بہت دنوں سے تم نے یاد نہیں کیا۔“

”تمج سے بات کرو۔“ نائیک غرایا۔

میں نے استہزاءیہ نظروں سے نائیک کو دیکھا۔ ”راج کنور تمہارا یہ کتا بھونکتا بہت ہے۔ اسے کاٹنا بھی کھانا۔“

راج کنور کی آنکھوں میں شعلہ سالپکا تھا اسے اس لہجے کی عادت کہاں تھی۔ نائیک کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میری بوئیاں اڑادے۔ راج کنور نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”بہت زبان چل رہی ہے تیری۔“

”یہ بتاؤ مجھے یہاں کیوں بلایا؟“ میں نے اس کی بات نظر انداز کی۔

”تجھے یہ بتانے کے لیے کہ بہت جلد تیری یہ چلنے والی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔“

”بہت جلد کیوں۔“ میں نے تسخرانہ انداز میں کہا۔ ”ابھی کیوں نہیں راج کنور؟“

راج کنور کا چہرہ گڑ گیا تھا۔ ”ابھی سے نہیں آیا ہے۔“

”اب تم جیوتشی بن رہے ہو۔“ میں ہنسا۔ ”صاف کیوں نہیں کہتے کہ اپنے بڑے بھائی کے سامنے مجبور

۔ ویسے ہمارے ہاں ایک کہادت ہے کہ خدا اکتا بنا دے چھوٹا بھائی نہ بنائے کہیں تم.....“

”خاموش۔“ راج کنور دھماڑ کر کھڑا ہوا گیا اور نائیک یوں اس کے پیچھے سے نکلا جیسے مجھ پر پڑھائی کا منہم ادہ کر چکا ہو۔ مگر راج کنور کے اشارے پر سیل ختم ہو جانے والے کھلونے کی طرح رک گیا۔ ”اگر میں نے راج کنور کو وجہ نہ دیا ہوتا تو.....“ وہ خاموش ہو کر ہونٹ کاٹنے لگا۔ میرا دل چاہا کہ بولوں اسے پتا بھی ہے وجہ ہے کس کو ہیں مگر میں نے محسوس کیا کہ ایک حد آگئی تھی اور اگر میں نے اسے مزید چھیڑا تو کچھ نہ کچھ کر گزرے۔

گا۔ مجھے اپنی فکر تو نہیں تھی لیکن میرے ساتھ بانو موجود تھی اور فی الحال وہی میری واحد کمزوری تھی۔ جب مجھے یہ خیال آیا تو اسی وقت راج کنور نے روپ بدلا اور بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تمہارے ساتھ موجود ناری بہت سندر ہے۔“

”اگر تم اس کے حوالے سے دھمکی دے رہے ہو تو بے کار ہے۔ میں نے بڑے کنور سے کہہ دیا ہے کہ اسے میرا تعاون اس وقت تک حاصل رہے گا جب تک اس لڑکی کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہے۔“

”ابھی نہ سبھی بعد میں تو ہو سکتی ہے۔“ راج کنور کا لہجہ معنی خیز ہو گیا میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر ایک خیال کسی الہام کی طرح آیا تھا۔

”راج کنور اس لڑکی کو تم نے رامن سے اغوا کرایا ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے اسے میاں ممتاز کے پاس دیکھا تھا مجھے اچھی لگی تو میں نے میاں جی سے مطالبہ کر دیا تھا مگر وہ بکڑ گیا۔“

”اس کا مطلب ہے اس میں کچھ غیرت باقی ہے۔“

”اب یہ غیرت یہاں ہے۔“ راج کنور شیطانی انداز میں بولا۔ ”میں نے سوچا ہے جب وہ میرے با روم میں چند راتیں گزار لے گی تو میں خود اسے میاں جی کو واپس بھیج دوں گا۔“

میں نے بے ساختہ اس کی طرف قدم بڑھایا تھا کہ عقب سے سرد سالوہا آ کر میری گردن سے لگ گیا اور رامن کی آواز آئی۔ ”بس سو رہا، مزید کوئی قدم مت اٹھانا۔“

میرے قدم بے اختیار رک گئے تھے۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ راج کنور مجھے نقصان پہنچانے کی ہمت نہیں رکھتا ہے لیکن اس وقت رامن کے لہجے میں ایسی کوئی بات تھی جس نے مجھے روک دیا تھا۔ وہ کس وقت اندر آیا مجھے بالکل پتا نہیں چلا تھا۔ شاید جس وقت میں اندر آیا اور گورکھا گارڈ دروازہ بند کر رہا تھا اسی وقت وہ بھی دبے قدموں اندر آ گیا تھا اور عین ممکن ہے دروازہ اسی نے بند کیا ہو جب کہ میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ گارڈ کا کام ہے۔ میں نے چند گہرے سانس لیے اور خود کو پُر سکون کرتے ہوئے راج کنور سے کہا۔ ”راج تمہارے یہ الفاظ مجھ پر ادھار ہیں۔ اگر اللہ نے مجھے موقع دیا تو بہت جلد تمہیں ان کی ادائیگی کروں گا۔“

عقب سے رامن ہنسا۔ ”میں سوچ رہا تھا اتنی دیر سے تم نے اپنے اللہ کا نام نہیں لیا۔“

اب تک کرسی پر بیٹھا راج کنور اٹھ کر اپنے تلے قدموں سے میری طرف آیا اور بالکل میرے چہرے کے سامنے آ کر اس نے سرد تر بنے لہجے میں کہا۔ ”بہت جلد یہ الفاظ حقیقت کا روپ دھار لیں گے اور ممکن ہے یہ سب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو۔“

راج کنور واپس اپنی جگہ بیٹھا تو ٹائیک تڑپ کر بولا۔ ”کنور جی میں آپ کی وجہ سے چپ تھا لیکن اب میں برداشت نہیں کر سکتا مجھے اجابت دیں میں اس کی زبان گدی سے کھینچ لوں۔“

مجھے اپنا موڈ بدلنے کا موقع مل گیا اور میں نے راج کنور سے کہا۔ ”اسے اجابت (اجازت) دے دو یا تو یہ میری زبان کھینچ لے ورنہ میں اس کا کچھ اور کھینچ لوں۔ جس کے بعد یہ نرا کٹی مرحدی نہ رہے۔“ کہتے ہوئے ہمارا لہجہ تحارت آمیز ہو گیا۔ ٹائیک بے تاب ہو کر ایک بار پھر میری طرف لپکا تھا لیکن راج کنور نے پھر اسے روک

دیا۔

”ابھی نہیں۔“

میں نے استہزاءیہ انداز میں پوچھا۔ ”تم پھر کسی مقابلے کی تاریخ کا اعلان کرنے والے ہو؟“
”آج یہ خون دے کر آیا ہے۔“

مگر میرا موڈ مکمل طور پر بدل گیا تھا اور میں ٹائیک کو توڑ پھوڑ کر راج کنور کو پیغام دینے کے لیے جیتاب ہو گیا تھا۔ میں نے اسی لہجے میں کہا۔ ”تم فکر مت کرو کنور ایسوں سے تو میں بغیر خون کے بھی منٹ سکتا ہوں۔“
”ابھی نہیں تمہارا مقابلہ ٹائیک سے ہو گا لیکن پرسوں اور مقابلے کی جگہ بھی دوسری ہوگی یہ مناسب مقام نہیں ہے۔“

راج کنور کے اشارے پر مجھے واپس بھیج دیا گیا۔ گورکھا باہر موجود تھا۔ وہ بہت چوکس شخص تھا اس کی شاٹ گن یوں اس کے ہاتھ میں ہوتی تھی جیسے جسم کا کوئی حصہ ہو اور عقب سے اس کی نگاہیں ہمہ وقت مجھ پر مرکوز رہا کرتی تھیں۔ اسے اچھی طرح جن کر میرے ساتھ لگایا گیا تھا۔ وہ تقریباً دو میٹروں سے میرے ساتھ تھا اور اب تک ایک بار بھی میں نے اسے لمحے بھر کے لیے غافل نہیں پایا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے چوکس رہنے والے کو براسا نپ کی طرح تھا۔ میں واپس آیا تو بانو میرے کمرے میں موجود تھی اور بے چین لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف آئی اور لرزتی آواز میں بولی۔

”آپ کے جانے کے بعد وہ آیا۔“

”وہ کون؟“

”راج کنور۔“ بانو روہانسی نظر آنے لگی۔ ”وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے مجھے اغوا کر لیا اور وہ.....“ وہ چپ ہو کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور اندیشے تیر رہے تھے۔

”بانو تم یہ کیوں بھول گئیں کہ ہم دشمن کی قید میں ہیں اور یہ سکون کا عارضی مرحلہ ہے آنے والے وقت میں ہمارے لیے یقیناً عذاب تیار کیے جا رہے ہوں گے۔ میں خود راج کنور سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس نے خود مجھ سے بکواس کی ہے افسوس کہ میں اس کی زبان بھی کھینچ نہیں سکا۔“

”شہباز صاحب میرا دل کر رہا ہے کہ اس ذلت کے آنے سے پہلے خودکشی کر لوں۔“

”ہرگز نہیں خودکشی ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ کیونکہ خودکشی کرنے والا اللہ سے مایوس ہو جاتا ہے اور ایسی کفر ہوتی ہے۔“

”تب میں کیا کروں؟“

”حوصلہ رکھو اور اللہ پر بھروسہ رکھو، انسانوں کے بس میں کچھ نہیں ہے وہی سب کرنے والا ہے۔ تم خود کو مضبوط کر رہی ہو اس لیے تمہارے منہ سے خودکشی کی بات اچھی نہیں لگتی ہے۔“

بانو نے آنسو صاف کیے۔ ”تب آپ مجھے سیلف ڈیفنس سکھانا شروع کر دیں۔“

میں بھی یہی سوچ رہا تھا اگر بانو پر کوئی افتاد پڑ جاتی تو وہ کسی حد تک اپنا دفاع کرنے کے قابل تو ہوتی۔
میں نے اسی دن سے اسے سکھانا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں نازک تھے۔ ان سے کسی مرد پر وار کیا جاتا

تو وہ اتنا کارگر نہ ہوتا اس لیے ضرورت اس کی تھی کہ پہلے وہ اپنے ہاتھ پاؤں مضبوط کرے۔ میں نے فشی دل جی سے ایک ہینچک بیک منگو لیا تھا اور میں بھی اس پر مشق کرتا تھا۔ میں نے اس کی بلندی کم کی اور بانو کو سکھایا کہ کس طرح بیچ مارتے ہیں اور کس طرح کک چلاتے ہیں۔ شروع میں وہ جلد ہمت ہار جاتی تھی کیونکہ ہینچک بیک پر مارنے سے اسے بھی چوٹ آتی تھی دو دن بعد وہ رواں ہو گئی۔ دو ہفتے کی ایکسر سائز سے اس کا اسٹینا، طاقت اور وزن تینوں میں اضافہ ہوا تھا۔ رنگ مشین میں وزن بتانے والا آلم بھی لگا تھا۔ جب بانو نے ایکسر سائز شروع کی تو اس کا وزن پچپن کلو گرام تھا اور قد پانچ فٹ چار انچ تھا۔ قد کے لحاظ سے وزن کسی قدر کم تھا اور وہ نازک اندام لگتی تھی۔ ایکسر سائز کرنے سے اس کی خوراک بڑھی تھی اور اسی تناسب سے وزن بھی بڑھا تھا۔ اب اس کا وزن انسٹھ کلو گرام ہو گیا تھا۔ اس میں یقیناً چربی کم ہوئی تھی اور پٹھوں کا وزن بڑھا تھا۔ ٹانگیں اور بازو مضبوط ہوئے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ باسٹھ یا تیرہ کلو گرام وزن اسے زیادہ مضبوط بناتا۔

راج کنور نے مجھے دو دن کا وقت دیا تھا۔ تیسرے دن میں نے ناشتہ ہلکا کیا تھا۔ کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کس وقت میرا بلاد آجائے۔ یہاں آنے کے بعد میرے لیے طے شدہ پروگرام میں پہلی تبدیلی کی جارہی تھی اور میں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی جب دشمن نے کسی مقصد کے تحت مجھے قید کیا تو اس نے پہلے سے طے کیے ہوئے پروگرام کے تحت مجھے قید رکھا اور اسی لحاظ سے میرے فرار کی کوشش کو ناکام بنانے کے اقدامات کیے۔ مجھے موقع اس وقت ملا جب پروگرام میں کوئی غیر متوقع تبدیلی آئی۔ یہاں بھی اب تک میں ایک گھے بندھے معمول کے مطابق زندگی گزار رہا تھا اور اس کے لیے کنوروں نے میری نگرانی اور مجھے فرار سے روکنے کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس دوران میں مجھے کئی موقع نہیں ملا تھا۔ اس لیے میں نے کسی حرکت سے گریز کیا لیکن اب یہ غیر متوقع تبدیلی آئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے موقع ملے تو مجھے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے یا نہیں کیونکہ فرار کی راہ میں اور بھی کئی رکاوٹیں حاصل تھیں۔ جیسے کنور بیس کی سیکورٹی، پھر انڈیا سے فرار ہونا۔ پہلے بھی مجھے وطن واپسی میں بہت سی دشواریاں پیش آئی تھیں اور اب بھی ایسا لگ رہا تھا کہ میں آسانی سے واپس نہیں جاسکوں گا۔

مگر مجھے یہاں سے نکلنا تو تھا۔ ملنے والے موقع سے فائدہ اٹھانا ہی اصل کامیابی ہوتی اور میں موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ بارہ بجے میں ہلکی پھلکی ایکسر سائز سے فارغ ہوا تھا کہ دروازہ کھلا اور فشی جی اندر آئے۔ ان کے چہرے پر فکر مند تاثرات تھے۔ انہوں نے آتے ہی بلا تمہید کہا۔ ”کل آپ راج کنور جی سے ملے تھے۔“

”وہ مجھ سے ملا تھا۔“ میں نے تصحیح کی۔

”کیا آج کوئی بات طے ہوئی ہے؟“ انہوں نے غور سے مجھے دیکھا۔

”فشی جی آپ یہ سب راج کنور سے بھی پوچھ سکتے ہیں اور وہ آپ کو بہتر بتا سکتا ہے مجھے صرف اتنا معلوم

ہے کہ آج ٹائیک مجھ سے اپنے ہاتھ پاؤں تروائے گا۔“

”ٹائیک جائے نکھ میں۔“ فشی جی نے صاف کہا۔ ”مجھے اور بڑے کنور کو آپ کی فکر ہے کہ آپ کو کوئی

نقصان نہ ہو۔“

بڑے کنور کو میری نہیں بلکہ میری رگوں میں دوڑتے خون کی فکر تھی۔ ”اگر راج کنور نے کوئی دھوکا نہ کیا تو

امید ہے مجھے خراش بھی نہیں آئے گی۔“

منشی دل جی ہچکچایا۔ ”بڑے کنور کو اسی کی فکر ہے۔ وہ پہلے ہی دیوی جی کی طرف سے دباؤ میں ہیں۔“ بانو اپنے کمرے میں تھی اس لیے منشی جی نے کھل کر بات کی۔ ”آپ کو پتا تو چل گیا ہے کہ دیوی جی کو راج جی نے بلوایا ہے۔“

”انگو اکرایا ہے۔“ میں نے منشی سے کہا۔ ”تم اس کے جرم پر الفاظ کا پردہ مت ڈالو۔“

منشی جی نے میری بات نظر انداز کی۔ ”بڑے کنور چاہتے ہیں کہ آپ کو کوئی نقصان نہ ہو۔“

”ظاہر ہے، اس دنیا میں وہی میرے سب سے بڑے خیر خواہ ہیں لیکن کیا بہتر نہیں ہوگا کہ وہ یہ سب اپنے برادر خود سے کہیں، کیونکہ یہ سب اسی کی فرمائش پر ہو رہا ہے۔ مجھے نمائشی مقابلوں کا کبھی شوق نہیں رہا ہے۔“

منشی جی نے اپنی چند یا سہلائی۔ ”راج جی یہ ضد ہیں کہ یہ مقابلہ ضرور ہوگا۔“

”تب میں کیا کر سکتا ہوں۔“ میں نے شانے اچکا۔ ”بڑے کنور مقابلہ نہیں چاہتے ہیں اور راج کنور چاہتا ہے۔ میں دونوں کے سامنے بے بس ہوں۔“

”بڑے کنور چاہتے ہیں کہ آپ راج جی سے معافی مانگ لیں اس طرح معاملہ منٹ جائے گا۔“ بالآخر منشی جی نے وہ بات اگل دی جو کہنے آئے تھے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”اس بار میں خود اپنے سامنے بے بس ہوں۔ میں راج کنور سے معافی نہیں مانگ سکتا۔ اگر میرا کوئی تصور ہوتا تب بھی نہیں مانگتا۔“

منشی جی پریشان ہو گئے۔ ”تب کیا ہو سکتا ہے؟“

”ٹائیک کا کچھ نہ کچھ ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر بڑے کنور کو میری اتنی ہی فکر ہے تو ان سے کہو کہ یہ مقابلہ اپنی نگرانی میں کرالیں تاکہ راج کنور کو کچھ کرنے کا موقع نہ ملے۔ باقی میں منٹ لوں گا۔“

بات غالباً منشی جی کی سمجھ میں آگئی اور وہ جلالت میں رخصت ہو گئے اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ مقابلے کا وقت قریب تھا اور کچھ ہی دیر میں راج کنور کی طرف سے میرا بلاوا آ سکتا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا جب کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور گارڈ کے ساتھ راج کنور آ دیا۔ اس نے پستول اٹھا رکھا تھا اس کی نال سے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے حرکت نہیں کی۔ اس پردہ فراتا ہوا اندر آیا۔ ”سنا نہیں تونے؟“

”ہاں اب تم نے اصلی آواز نکالی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تو ایسے میں تمہاری طرح اشاروں کا تربیت یافتہ نہیں ہوں اس لیے مجھ سے زبان سے بات کیا کرو۔“

راج کنور کا چہرہ آگ کی طرح دھنکے لگا تھا اور جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی حرارت تھی۔ ”سورما اتنا نچامت اڑو کہ منہ کے بل گرو۔“

”مشورے کا شکریہ، مجھے انپا اڑنے کا شوق نہیں ہے لیکن تم جیسے لوگ مجبور کر ہی دیتے ہیں۔“

”آج تمہیں پتا چل جائے گا۔“ اس نے کہا۔ ”چلو ٹائیک بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

”وہ میرا نہیں اپنی شامت کا انتظار کر رہا ہے۔“

”زبان کے بجائے ہاتھ پاؤں چلانے کی تیاری کرو۔“ راج کنور نے کن اکھیوں سے برابر والے کمرے

کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ”یہاں بھی اسے ساتھ ہی رکھا ہے۔“

”افسوس میں غلط سمجھ رہا تھا کہ بانو پر تمہاری نظر ہے۔ اس پر تو تمہارے آقائے نامدار کی نظر نکلی لیکن تسلی رکھو وہ اسے بھی نہیں ملے گی۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔“ وہ بولا۔ ”وہ راج جی کے بعد مجھے ملے گی۔“

”اچھا تم شروع سے جھوٹا اور بچا کھچا کھانے کے عادی ہو۔“ میں نے اپنا پیش دبانے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

”بس اب چلو۔“ اس نے پستول تان لیا۔ ”کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ۔۔۔“

”تم مجھے شوٹ کر دو گے؟“ میرا انداز طنزیہ ہو گیا۔ ”اگر مجھے مار دیا تو اپنے آقا کو کیا جواب دو گے۔“

”تمہیں مارنے پر پابندی ہے لیکن اگر میں تمہارے گھٹنے پر ایک فائر کر دوں تو باقی عمر کلڑ بھگے کی کی طرح چلو گے۔“

”اوکے۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”چلتا ہوں۔“

راہن مجھے لے کر محل کی عمارت سے باہر آیا۔ موسم مزید خوشگوار ہو گیا تھا کیونکہ مئی کا آغاز تھا۔ میدانوں میں اس وقت یقیناً شدید گرمی پڑ رہی ہوگی لیکن یہاں تقریباً سات ہزار فٹ کی بلندی پر موسم ابھی بھی سرد تھا۔ رات کو اچھا خاصا سرد ہو جاتا تھا اور دن میں خوشگوار ہوتا تھا یوں سمجھ لیں جیسے مری اور بورنن کا موسم ہوتا ہے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر اس میں چھٹی کیفیت نہیں تھی۔ مجھے محل کے مخصوص باغ میں لایا گیا مجھے یاد آیا کہ یہاں میں نے پہلی بار سعدیہ کو دیکھا تھا۔ جب میں گاڑ کی نگرانی میں چہل قدمی کر رہا تھا اور اس نے ایک دیوار کے اوپر سے جھانکا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ میں اس وقت اس کے بھائیوں کے قبضے میں تھا اور وہ ایک بار پھر میرا خون نکال رہے تھے۔ سعدیہ کے ساتھ دوسرے یاد آئے جن کو یاد کرنے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ وہ اپنوں کو یاد کرتا تو اندر سے ایک وحشت ابھرتی تھی اور اس چاہتا کہ تمام زنجیریں توڑ کر ان لوگوں کے پاس نکلی جاؤں۔ اس لیے آج کل میری کوشش ہوتی تھی کہ انہیں نہ نہ کروں۔

محل کا خاندان کے لیے مخصوص باغ کچھ اڑکھا تھا اس میں دائرے میں مختلف سطحوں والے گھاس، پھولدار پودوں اور آرائشی درختوں کے تختے تھے۔ نیم دائرے میں میڑھیاں اور چڑھتی اور نیچے اترتی تھیں۔ تختے کے گرد دو سے تین فٹ اونچی اور فٹ بھر موٹی سفید پتھروں سے دیوار بنائی گئی تھی۔ مقابلے کے لیے اٹھارہ ایک ایسے ہی تختے کو منتخب کیا تھا۔ تقریباً تیس فٹ قطر کے دائرے میں سوائے بہت سبز اور نفیس گھاس کے کچھ نہیں تھا اس کے ایک طرف تقریباً چھ فٹ اونچی دیوار تھی اور دونوں طرف دائرے میں کم ہوتی ہوئی مخالف سمت میں تین فٹ رہ گئی تھی۔ چھ فٹ والی دیوار کے پیچھے ران کنور موجود تھا جب کہ نیچے ٹائیک صرف ایک شارٹ ہنس لٹا تھا اس کا مضبوط جسم شاید کسی تیل کی ماش سے چمک رہا تھا اور پٹھے بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ میں چونکا۔ وہ مہینے پہلے والے ٹائیک کے مقابلے میں وہ بہت مختلف لگ رہا تھا۔ اس کا جسم نہ صرف متناسب اور مضبوط ہوا تھا بلکہ اس کا کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ اس نے فن حرب میں بھی دسترس حاصل کی تھی۔

”شہباز ملک۔“ راج کنور نے گونجتی سی آواز میں کہا۔ ”آج تمہیں پتا چلے گا تمہیں کہ روپ میں غلط

آنے ہوتے ہیں۔“

میں مسکرایا۔ ”تم نے ثابت کیا کہ تم بنیا قوم سے تعلق رکھتے ہو۔ کاش کہ تم خود میرے سامنے آتے لیکن نائیک بھی برائیں ہے اگر یہ ٹوٹ پھوٹ جائے تو برامت ماننا۔“

”یہ زبان بہت اچھی چلاتا ہے۔“ رامن نے گویا شکایت کی۔

”فکر مت کرو آج کے بعد یہ سب چلانا بھول جائے گا۔“ راج کنور نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”شہباز

ملک تم نائیک سے مقابلے کے لیے تیار ہو؟“

”اگرچہ میں ایسی احمقانہ حرکتوں میں نہیں پڑتا ہوں لیکن تم نے مجبور کر ہی دیا ہے تو.....“ میں نے جملہ

ادھورا چھوڑ کر شانے اچکائے۔

”یہ مقابلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک تم دونوں میں سے کوئی ایک ہار نہیں مان لیتا یا پھر مقابلے

کے قابل نہیں رہتا.....“

میں نے ہاتھ اٹھایا۔ ”راج کنور شرائط بیان کرنے کے بجائے اپنے اس پلے سے کہو کہ مجھے قتل کرنے کی

کوشش کرے باقی سب بے کار ہے۔“

راج کنور کا رنگ بدلا تھا کیونکہ میں نے بلا واسطہ اسے کتا قرار دیا تھا مگر اس نے اپنی بے عزتی کو نمایاں

کرنے کے بجائے پی جانے کا فیصلہ کیا اور بولا۔ ”تم خود اجازت دے رہے ہو؟“

”ہاں۔“

راج کنور نے غضب ناک ہو کر نائیک کی طرف دیکھا۔ ”نائیک ٹو نے سن لیا اب اگر یہ مارا بھی گیا تو تجھ

پر کوئی دوش نہیں ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ میرے معاملے میں راج کنور بڑے کنور کو بھی بائی پاس کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ اچھی

طرح جانتا تھا کہ میرا خون اس کے بھائی کے علاج کے لیے لازمی ہے۔ کیا دونوں بھائیوں میں کوئی کھٹ پٹ

ہوئی تھی؟ یا راج کنور کی نیت خراب ہو گئی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ بڑا کنور صحت یاب ہو؟ اپنی بیماری کی وجہ سے

بڑا کنور عملی زندگی سے دور تھا اور جاگیر کا سارا کام راج کنور کے ہاتھ میں تھا ممکن ہے وہ مالک نہ ہو کیونکہ

یہودیوں کی طرح ہندوؤں میں بھی بڑے بیٹے کو ساری دولت اور کاروبار کا وارث بنانے کا رواج ہے تاکہ دولت

ایک ہی جگہ رہے۔ راج کنور اگر مالک نہیں بھی تھا تو عملاً مالک کے اختیارات وہی استعمال کر رہا تھا اور اس کا بھی

امکان تھا کہ بڑا کنور مر جاتا تو وہی مالک ہوتا۔ اس لیے بڑے کنور کا ٹھیک ہونا اس کے مفاد میں نہیں تھا۔

میں سوچ میں تھا اور نائیک نے مجھے غافل سمجھ کر اچانک حملہ کیا۔ وہ میرے نزدیک آیا اور اس نے گھونہ

مارنے کی کوشش کی۔ یہ بڑا جاندار تھا اگر میرے منہ پر لگتا تو یقیناً مجھے دن میں تارے نظر آ جاتے لیکن میں نے

سرا یک طرف کر کے اس کا وارنا کام کیا اور میرا گھٹنا اس کے پیٹ میں لگا۔ میں نے جان بوجھ کر زیر ناف نہیں مارا

تھار نہ شاید مقابلہ اسی وقت ختم ہو جاتا۔ نائیک کراہ کر پیچھے گیا۔ مگر فروانی سنبل گیا تھا۔ اگلے چند واروں سے پتا

چلا کہ اس نے خاصی محنت کی تھی۔ وہ فری اسٹائل لڑ رہا تھا اسے اسٹریٹ فائٹنگ تو نہیں کہہ سکتے مگر کچھ ایسا ہی

انداز تھا۔ خود میں بھی کسی خاص انداز میں لڑنے کے بجائے اسی انداز کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایک مخصوص انداز میں

لڑنے سے مخالف اس انداز کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔

جیسے جوڈو اور کرائے میں حملے سے زیادہ سیلف ڈیفنس کو اہمیت دی جاتی ہے ان میں جارحیت کا عنصر کم ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تائی کوانڈو اور کنگ فو جارح انداز ہیں۔ خاص طور سے کنگ فو مہلک ہے اس کے بیشتر وارموت کے گھاٹ اتارنے والے ہوتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ان میں سیلف ڈیفنس کمزور ہوتا ہے۔ ان کا اصل دفاع ان کی جارحیت ہوتی ہے مخالف ان ہی باتوں کا فائدہ اٹھاتا لیکن فری اسٹائل میں اس کا عنصر کم ہو جاتا ہے۔ اس میں ہر حربہ اور ہر داؤ چلتا ہے۔ بس آدمی کا دماغ اور اس کے ریفلکس بھی تیز ہونے چاہئیں۔ سب سے اہم بات فری اسٹائل میں چوٹوں کی پروا نہیں کی جاتی ہے جب کہ باقی مخصوص انداز میں لڑنے والوں کی زیادہ توجہ خود کو بچانے پر ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن سنا ہے کہ اگر فری اسٹائل لڑنے والا تیز طرار ہو تو وہ کسی بھی انداز کے لڑنے والے ماہر ترین فرد کو بھی شکست دے سکتا ہے۔

ایک وار کے بعد ہی تائیک کا سانس تیز چلنے لگا تھا جو اس بات کی نشانی تھی کہ وہ شراب یا اسی قسم کا کوئی نشہ کرتا تھا۔ پے در پے کئی ناکام واروں کے بعد وہ جھنجھلانے لگا تھا۔ میں نے اب تک خود سے کوئی وار نہیں کیا تھا اسی کے وار ناکام بناتے ہوئے اسے کچھ چوٹیں لگائی تھیں۔ میں راج کونو اور اس کے پیچھے کھڑے رامن پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا ان لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ عقب سے وار کر جاتے۔ اچانک راج کونو نے کہا۔ ”اس طرح ہاتھ پیروں کی لڑائی میں فیصلہ دیر سے ہو گا کیوں نہ لاٹھیوں سے لڑائی کی جائے؟“

میں اور تائیک رک گئے تھے تائیک نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“

یہ پہلے سے طے شدہ پلان تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ انکار کروں مگر تائیک تیار تھا اب میں پیچھے ہٹتا تو یہ بھی ان کی فتح ہوتی اس لیے میں نے شانے اچکائے۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ اچھا ہے اب مجھے اس کے گندے جسم کو ہاتھ نہیں لگانا پڑے گا۔“

رامن نے پاس موجود لاٹھیاں ہماری طرف اچھال دیں میں نے نوٹ کیا کہ اس نے خاص طور سے ہمیں لاٹھیاں دی تھیں یعنی جو تائیک کو دینی تھی وہ اسی کی طرف اچھالی اور دوسری میری طرف پھینکی تھی اور انداز دینے والا نہیں بلکہ پھینک کر مارنے والا تھا۔ گھومتی لاٹھی پکڑنے سے میری ہتھیلی پر چوٹ آئی تھی۔ مجھے اس سے پہلے کبھی لاٹھی سے لڑنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اگر میں نے اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا بھی تھا تو عام سے انداز میں لیکن تائیک نے لاٹھی پکڑتے ہی جس طرح اسے گھما کر اور نچا کر دکھایا تھا اس سے پتا چل گیا کہ وہ لاٹھی کے استعمال کا ماہر تھا۔ یہ مضبوط بانس کی ہلکی اور پانچ فٹ لمبی لاٹھیاں تھیں مگر ان کی چوٹ یقیناً سخت ہوتی۔ البتہ ان سے ہڈی توڑنا مشکل تھا کیونکہ وزن نہیں تھا البتہ گوشت اور پٹھوں کا حشر کیا جا سکتا تھا۔ جیسے ہی تائیک نے لاٹھی گھمائی میں محتاط ہو گیا تھا۔ وہ مسکرایا تو اس کے دانت وحشیانہ انداز میں باہر نکل آئے تھے۔

اس نے اچانک تیزی سے گھما کر لاٹھی ماری تو میں نے بمشکل اس کا وار روکا اور فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کی لاٹھی خاصی وزنی تھی ورنہ اس قوت سے وار نہیں لگتا۔ میری لاٹھی لرز کر رہ گئی تھی۔ اگر میں وار براہ راست رد کرتا تو یہ نوٹ بھی کستی تھی۔ مگر میں نے وار ترچھا کر دیا تھا اس لیے بچت ہو گئی۔ تو ان لوگوں کا اصل پلان یہ تھا راج کونو بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ تائیک دو بدو مقابلے میں میرے سامنے نہیں بٹھ سکتا تھا اور لاٹھی سے لڑائی میں وہ

مجھ پر حاوی ہو جاتا۔ پھر لاشیوں میں بھی فرق تھا۔ ٹائیک کو جو لاشی دی گئی تھی وہ کہیں زیادہ مضبوط اور وزنی تھی۔ جب کہ مجھے دی جانے والی لاشی ہلکی اور کمزور تھی۔ اگرچہ دیکھنے میں دونوں ایک جیسی ہی لگ رہی تھیں۔ پہلے وار کے بعد ٹائیک لاشی اپنے دائیں بائیں گھمانے لگا۔ اس طرح یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ وہ کس طرف سے وار کرے گا۔ میں نے لاشی درمیان سے تھام لی اس طرح میں دونوں طرف سے وار روک سکتا تھا۔

”سنجھل کر میاں۔“ ٹائیک نے کہا اور دائیں طرف سے وار کیا لیکن یہ دھوکا تھا۔ میں نے دفاع کرنا چاہا تو اس نے لاشی کا رخ گھما دیا۔ ہوائی اس نے پیروں پر وار کیا۔ بچاتے ہوئے بھی لاشی کو لمبے سے ذرا اوپر لگی تھی اور درد کی ایک لہریں اٹھی تھی۔ فوراً ہی اس نے پیروں پر وار کیا اور میں بچنے کی کوشش میں نیچے گر اٹھا اس نے ایک لمحہ ضائع بغیر میرے سر پر وار کرنا چاہا حالانکہ گرے فریق پر وار کرنا کسی بھی لڑائی میں بدترین حرکت تصور کی جاتی ہے۔ میں نے سر بچانے کے لیے لاشی سامنے کی تو وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا لاشی درمیان سے دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ ٹائیک نے دوسرا وار کرنا چاہا تو میں نے اس کے پیروں پر ٹھوک ماری۔ ایڑی کا یہ وار کارگر ثابت ہوا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا تھا۔ اس دوران میں مجھے اٹھنے کا موقع مل گیا تھا۔

لاشی ٹوٹ کر دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ میں نے انہیں تولا اور مجھے لگا کہ اب میں انہیں زیادہ بہتر انداز میں استعمال کر سکتا تھا۔ پیچھے ہٹنے کے بعد ٹائیک دوبارہ لاشی گھماتا میری طرف آیا لیکن میں نے لاشی کے بجائے اس کی آنکھوں پر نظر رکھی۔ وہ میرے دائیں پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس نے بائیں کا جھکاوا دے کر لاشی دائیں پاؤں پر مارنا چاہی تھی میں تیار تھا۔ جیسے ہی اس کی لاشی حرکت میں آئی میں اپنی جگہ سے اچھلا اور ساتھ ہی بایاں ہاتھ پوری قوت سے گھمایا۔ ٹائیک لاشی گھما چکا تھا اس وار کے پیچھے اس کی ساری قوت تھی اور پھر لاشی کا وزن بھی تھا۔ یقیناً اس کا مقصد میری پنڈلی توڑنا تھا۔ اس کا وار کارگر ہوتا تو مقابلہ یہیں ختم ہو جاتا۔ لاشی میرے پیروں کے نیچے سے گزری اور زور میں گھومتے ہوئے ٹائیک کا سر میرے سامنے تھا۔ میرے دائیں ہاتھ میں موجود لاشی کا ٹکڑا اسپرنگ سے نکلے ہوئے انداز میں لپکا اور اس کے سر سے نکلایا۔

ٹائیک چیخ مار کر پیچھے ہوا۔ کپٹی سے اس کا سر پھٹ گیا تھا اور یقیناً اسے دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ ممکن ہے کوئی باظرف حریف ہوتا تو میں خود اسے سنبھلنے کا موقع دیتا لیکن ٹائیک جیسے گھٹیا آدمی کو موقع دینا بالکل مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے فوراً ہی اس کے بازو اور پسلیوں پر وار کیے۔ دو لاشیوں کا فائدہ یہ ہوا کہ میں الگ الگ جگہوں پر تیزی سے وار کرنے کے لیے آزاد تھا۔ میرے ہاتھ مشین کی طرف چل رہے تھے۔ لاشی کے دونوں ٹکڑے ٹائیک کے سر، جسم اور ہاتھ پیروں پر اتنے تواتر سے پڑ رہے تھے کہ اسے دفاع کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس کے بجائے ہر ضرب پر اس کی مدافعت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک زخم اس کے جسم اور چہرے پر نمودار ہو رہا تھا۔ میری لاشی کو دو ٹکڑے کر کے اس نے خود یہ آفت مول لی تھی۔ کچھ دیر میں اس کے ہاتھ لاشی سنبھالنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے اور وہ اسے پھینک کر ہاتھوں سے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میرے سامنے یہ بہت مشکل کام تھا۔ اب وہ چیخ و پکار پر اترا آیا تھا اور اپنے مالک کو دہائیاں دے رہا تھا کہ وہ اسے بچائے۔ راج کنور کا چہرہ ساٹھا مگر آنکھوں میں جیسے انگارے دبک رہے تھے ایک بار میں نے ٹائیک کے سر کو نشانہ بنایا تو راج کنوری کی آواز آئی۔

”بس شہباز رک جاؤ۔“

میرادل بھی بھر گیا تھا۔ نائیک کی کوئی ہڈی تو نہیں ٹوٹی تھی لیکن وہ اب کم سے کم ایک ہفتہ بیڈ پر دراز ہی رہتا۔ میں نے آخری بار اس کے گھٹنے پر وار کیا اور مرکز راج کنور کی طرف دیکھا جواب اپنے ہونٹ چبا رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بذات خود میرا خون پی جائے۔ اسے توقع نہیں تھی کہ نائیک ایک بار پھر یوں مجھ سے آسانی سے مار کھا جائے گا۔ نائیک گھاس پر پڑا ہوا کتے کی طرح رونے کے انداز میں کراہ رہا تھا۔ راج کنور نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ رامن کے تاثرات بھی اچھے نہیں تھے اس نے مڑ کر کسی کو اشارہ کیا۔ چند لمحے بعد اوپر سے دو ملازم نیچے آئے اور نائیک کو سہارا دے کر وہاں سے لے گئے انہوں نے اس کی اور میری لاشی کے ٹکڑے بھی اٹھا لیے تھے اس دوران میں رامن پستول لیے چوکننا کھڑا رہا تھا نائیک کے جانے کے بعد وہ نیچے اتر آیا اور میرے قریب آ کر زہر پلے انداز میں بولا۔

”اس کا میا پی پر اکڑنے کی ضرورت نہیں ہے کبھی مجھ سے واسطہ پڑا تو.....“

”تم بھی آ جاؤ۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”میری سمجھ میں تم لوگ نہیں آئے ہو۔ مجھ سے بلا وجہ کی دشمنی پائی ہے۔ خود سے مقابلے کر رہے ہو اور جب تمہارا آدمی چپتا ہے تو روتے بھی ہو۔“

رامن نے میری ہیشکاش کا کوئی جواب نہیں دیا اور بولا۔ ”اب چلو۔“

وہ مجھے واپس کمرے تک لے آیا۔ میری کمر جہاں لاشی لگی تھی دکھ رہی تھی اور چلنے کے دوران اس میں ٹیسس اٹھ رہی تھیں لیکن میں نے رامن کے سامنے ظاہر نہیں کیا تھا۔ کمرے میں بانو میری منتظر تھی۔ اس نے بے قراری سے پوچھا۔ ”یہ لوگ آپ کو بے وقت کہاں لے گئے تھے؟“

میں نے بانو کو مقابلے کے بارے میں نہیں بتایا تھا وہ پریشان ہو جاتی۔ میں نے واش روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”بتاتا ہوں۔“

واش روم میں آ کر میں نے ٹی شرٹ اتاری۔ اور آئینے میں کمر کا معائنہ کیا۔ تقریباً چھ انچ لمبا سیاہ نشان بتا رہا تھا کہ اندر گوشت پھٹ گیا تھا اور خون جم گیا تھا۔ میں نے کپڑے اتار کر ٹب میں کسی قدر تیز گرم پانی بھرا اور اس میں کمر ڈبو کر بیٹھ گیا۔ اس سکائی سے بڑا سکون ملا تھا۔ جب درد کم ہو گیا تو میں نے دوبارہ آئینے میں کمر کا معائنہ کیا نشان ہلکا پڑا تھا مگر موجود تھا اور درد بھی باقی تھا۔ میں باہر آیا تو بانو دل نواز سے کھانا لگوار ہی تھی۔ کھانے کے دوران میں نے اسے نائیک سے مقابلے کی مختصر زوداد سنائی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ ”یہ کیا جہالت ہے..... اس طرح کے مقابلے تو کسی زمانے میں ہوتے تھے۔“

”تم کن خیالوں میں ہو؟“ میں نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔ ”رومن دور گزر گیا ہے لیکن انسانوں کے درمیان خنزیر معرکے آج بھی کرائے جاتے ہیں۔ اب تو باقاعدہ نورمانٹ ہوتے ہیں جن میں آدمی اپنے فریق کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے اور بعض اوقات تو زندہ بچنے والا ہی فاتح ہوتا ہے۔“

بانو کا نپ گئی۔ ”ایسا بھی ہوتا ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ پہلے لوگ زندگی کے لیے لڑتے تھے اور اب پیسے کے لیے لڑتے ہیں۔ جو فاتح ہوتا ہے وہ اتنا حاصل کر لیتا ہے کہ پھر اسے ساری عمر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی

ہے۔

”آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔“

”کمر پر ایک لاٹھی لگی تھی۔ درد تھا مگر رکائی کے بعد بہتر ہے۔“

”مجھے دکھائیے گا۔“ بانو نے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے ایک دودن میں ٹھیک ہو جائے گا۔“

”نہیں اگر چوٹ زیادہ ہے تو میرے واش روم میں میڈیسن ہیں ان میں بام رکھا ہے۔“

”میں نے سر ہلایا۔ کھانے کے بعد بانو نے اصرار کیا تو میں نے اسے کمر دکھائی وہ فکر مند ہو گئی۔“ آپ

”اے معمولی چوٹ کہہ رہے ہیں۔ نیل پڑ گیا ہے اور گوشت ابھر آیا ہے۔“

”دیکھنے میں لگ رہا ہے مگر اتنا خطرناک نہیں ہے۔“

”نہیں آپ لیٹیں میں بام لگاتی ہوں۔“ اس نے اتنے اصرار سے کہا کہ مجھے انکار کرنا مناسب نہیں لگا

تھا۔ میں بستر پر اوندھے منہ لیٹ گیا اور وہ بام لے آئی۔ نہ جانے بام بہت پر اثر تھا یا اس کی نرم انگلیوں میں مسیحا کی تاثیر تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ میرا درد کھنچ کر نکل رہا ہوں۔ وہ گھٹنے ٹیک کر بستر کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا اس لیے چاہنے کے باوجود اسے بس کرنے کو نہ کہہ سکا۔ اس نے خود کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”اب کیسا محسوس کر رہے ہیں۔“

”بہت اچھا۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ابھی لیٹے رہیں۔ اس سے زیادہ فائدہ ہو گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں گرم پانی کی بوتل لاتی

ہوں اس کی رکائی سے درد جلد ختم ہو جائے گا۔“

میں ایک بار پھر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ وہ ربر بوتل میں گرم پانی بھر کر لائی اور اسے میری کمر پر رکھ کر اوپر سے کشن رکھ دیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”میں تو سوچ رہی تھی کہ اب آپ سے دوستانہ مقابلہ کر کے براہ راست سیکھوں گی مگر آپ کو چوٹ لگی ہے۔“

”کوئی بات نہیں تم اپنی مشقیں جاری رکھو۔ میں ایک دودن میں ٹھیک ہوتے ہی تمہاری تربیت شروع کرتا ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”لیکن بانو ایک بات یاد رکھو صرف دفاع ہی سب کچھ نہیں ہوتا ہے آدمی کو حملہ کرنا بھی آنا چاہیے۔ دوسرے کو تکلیف پہنچانا اور ضرورت پڑنے پر قتل کرنا آسان کام نہیں ہے اس میں آدمی کو بڑا دل گردہ چاہیے ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات ایسا کرنا پڑتا ہے۔“

”قتل کرنا پڑتا ہے؟“ وہ گھبرا کر بولی۔

”اگر تمہاری عزت پر بن آئے تو کیا تم قتل نہیں کرو گی؟ تمہارے پاس بچنے کا اور کیا راستہ ہو گا؟“

اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ بے شک وہ سیلف ڈیفنس کی تربیت لے رہی تھی اور خود کو مضبوط بھی بنایا تھا لیکن بنیادی طور پر ایک نرم خور اور نازک لڑکی تھی۔ اپنی فطرت کے خلاف یہ سب کرنا اس کے لیے آسان کام نہیں تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ جلد اس پر وہ وقت آنے والا تھا جب اسے انتخاب کرنا پڑتا۔ اسی لیے میں اس کی جسمانی تربیت کے ساتھ ذہنی تربیت بھی چاہتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ وہ خود اپنی حفاظت کی اہل ہو جائے۔ اگر

کبھی اس کی عزت کے لیے خطرہ پیدا ہو تو وہ اس کا تدارک کر سکے۔ عام بے بس لڑکیوں کی طرح ہتھیار نہ ڈال دے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں ایسا نہیں کر سکتی۔“

”تمہیں یہی کرنا ہوگا۔ دیکھو جسمانی مضبوطی اور سیلف ڈیفنس بھی اہم ہے بالکل کسی جدید پستول یا رائفل کی طرح لیکن جب تک آپ اسے استعمال کرنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں کرو گی یہ بے کار ہوں گے۔ دفاع لا حاصل ہے۔ فرض کرو کوئی تم پر حاوی ہونا چاہتا ہے اور تم صرف دفاع کرتی رہو گی تو اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم جارح کو موقع دو گی کہ وہ مسلسل جارحیت کرتا رہے اسے روکنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے مار دیا جائے۔ اسے ناکارہ کر دیا جائے۔“

”میں.....“ اس نے تھوک نکل کر کہا۔ ”کیسے کر سکوں گی؟“

”سب سے پہلے تو خود کو ذہنی طور پر تیار کرو۔ اس کے بعد کا مرحلہ آسان ہے۔ تمہاری کمزوری کیا ہے تم ایک نازک لڑکی ہو لیکن ساتھ یہی چیز تمہاری طاقت بھی ہے۔ ایک مرد اس سے آسانی سے دھوکا کھا جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ عورت اس پر مہلک وار نہیں کر سکے گی اور جب وہ اس پر وار کرتی ہے تو مرد اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں رہتا ہے۔“

بانو کا تذبذب دور ہو گیا تھا اور اس نے پہلی بار دلچسپی سے پوچھا۔ ”مہلک وار کیسے کرتے ہیں۔“

میں سکاٹی کے بعد بہتر محسوس کر رہا تھا اس لیے اٹھ گیا۔ ”آؤ تمہیں بتاتا ہوں۔“

میں اور بانو آٹنے سامنے آئے۔ میں نے بانو کی گردن پر زرخرے اور پھر بائیں شانے سے نیچے دل سے ذرا اوپر اشارہ کیا۔ ”یہ ڈیٹھ پوائنٹ ہیں ان پر اگر صحیح انداز اور قوت سے وار کیا جائے تو اچھا طاقتور مرد بھی موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ اب دیکھو وار کیسے کرتے ہیں۔ وار ہمیشہ توازن اور قوت کا نام ہے۔ انسان بنیادی طور پر کمزور جسم کا مالک ہے اس لیے اسے جارحیت کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے جسم کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اسے نقصان نہ ہو اور وار بھی مؤثر ہو۔“

میں اسے سکھانے لگا کہ زرخرے اور دل سے اوپر جو شریان دماغ کی طرف خون لے جاتی ہے یہ صرف دماغ ہی نہیں بلکہ جسم کے دوسرے اہم اعضا کو بھی خون فراہم کرتی ہے اور یہ جلد کے پاس ایسی جگہ ہے جہاں اسے پٹھوں اور گوشت کی مناسب آؤ میسر نہیں ہے اس لیے اسی پر قوت سے وار کیا جائے تو یہ پچک جاتی ہے ذمئی ہونے سے اس پر سوجن آتی ہے اور خون کی روانی رک جاتی ہے۔ اسی طرح زرخرہ بہت نازک مقام ہے۔ اس میں سانس کی نالی اور آواز کا تار ہوتا ہے۔ اگر اس پر ٹھیک سے وار کیا جائے تو یہ پچک جاتا ہے۔ آدمی کی سانس رک جاتی ہے اور اگر زرخرہ زیادہ متاثر ہو تو سانس رکنے سے چند منٹ میں موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ میں گل کے ساتھ زبانی بھی بانو کا سمجھا رہا تھا۔

”اگر ایک عورت یہ وار کرے تو اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ مرد کو غافل رکھ کر کرے۔ ورنہ وہ جسم سخت کر لے گا اور وار اتنا مؤثر نہیں رہے گا۔“

لیکچر کے بعد میں نے اسے پرنٹس کے ذریعے سمجھایا۔ ایک کھننے میں وہ خاصی حد تک سمجھ گئی تھی۔ میں

سے ہچک بیک پر دونوں مقامات کا اکتھ بنا کر بانو سے کہا کہ وہ اس پر مشق کرے۔ کھڑے رہنے سے چوٹ والی درد ہونے لگا تھا مگر یہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ بہر حال میں نے اس دن ایکس سائز کے بجائے آرام کرتے ہوئے ٹی وی کے سامنے وقت گزارا تھا۔ میری جگہ بانو نے ایکس سائز اور میری بتائی ہوئی مشقیں کی تھیں۔ وہ کچھ زیادہ ہی فکر مند ہو گئی تھی اور میرے خیال میں یہ بہتر تھا۔ وہ جتنی جلدی سیکھتی اور اپنے دفاع کے قابل ہوتی اس کے لیے اچھا ہوتا۔ ہم دشمن کی قید میں تھا اور کب برا وقت آجائے کچھ پتا نہیں تھا۔ اگرچہ یہ سب اس کے تحفظ کی ضمانت نہیں تھی۔ مرد شہر و ترین عورت کو بھی قابو اور بے بس کر سکتا ہے۔ دس حربے ہیں لیکن کچھ ہونا آپ کے لیے نقصان دہ نہیں ہے جتنا کہ نہ ہونا۔

بانو نے ایکس سائز کے لیے اوٹا سے اپنے لیے ڈھیلا ڈھالا لباس منگو لیا تھا جیسا کہ جوڈو کراٹے کھیلنے والے پہنتے ہیں۔ اس میں وہ آرام سے سب کرتی تھی اور اسے یہ خدشہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ جسم نمایاں ہوگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اس معاملے میں بہت احتیاط کرتی تھی۔ مجھے اس کی یہ بات بہت اچھی لگی تھی۔ اتنے دن سے ساتھ رہنے کے باوجود وہ نہ تو ایک حد سے زیادہ بے تکلف ہوئی تھی۔ بلکہ اس کا انداز ادب آمیز سنجیدہ ہی ہوتا تھا دوسرا وہ اوڑھنے چھپنے کا پورا خیال رکھتی تھی۔ بلا ضرورت میرے کمرے میں نہیں آتی تھی اور نہ بلا وجہ بیٹھتی تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ مجھے ملنے والی دوسری تمام خواتین اور لڑکیوں سے مختلف تھی۔ اس دن اس نے اتنی ایکس سائز اور مشق کی پسینے ہوئی تھی اور اس کا سانس بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے اسے روک دیا کہ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں گئی تھی کہ منشی جی آگئے۔

”آپ کو بڑے کنور یاد کر رہے ہیں۔“

”میں تو سمجھا تھا کہ وہ میرا اور تانیک کا مقابلہ دیکھنے آئیں گے۔“

”انہوں نے اسی سلسلے میں بلایا ہے۔“ منشی جی نے کہا۔

میں نے راستے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے انہوں نے راج کنور سے اس سلسلے میں کوئی بات کی ہوگی۔“

منشی جی چونکے۔ ”آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟“

”کیونکہ راج کنور اور اس کے جیلوں نے کوئی حربہ استعمال نہیں کیا۔ اگرچہ چالاکی سے کام لے کر

لاٹھیوں سے مقابلہ کرایا تھا۔“

منشی جی پھر چونکے۔ ”لاٹھیوں سے۔“ اس نے تشویش سے کہا۔ ”تانیک بنوٹ کا ماہر ہے۔“

”وہ ماہر ہے تو اس کا یہ حال ہے۔“ میں نے افسوس سے کہا۔ ”آپ نے اسے دیکھ تو لیا ہوگا۔“

”شہباز جی آپ بہت ماہر آدمی ہیں اس لیے اس کا یہ حال ہوا ہے ورنہ وہ تین چار سے اکیلا ہی لڑتا ہے

اور کوئی اسے چھو نہیں سکتا ہے۔“

”یہ تین چار بے چارے ملازم ہی ہوں گے۔“ میں نے طنز کیا۔ ”کبھی اس نے آزادانہ مقابلہ کیا ہے

جیسے مجھ سے واسطہ پڑ گیا؟“

”نہیں مقابلہ کرتے تو نہیں دیکھا ہے۔“ منشی جی غمت سے بولے۔

”تب اس سے کہیں کہ اس فن کا نام بدنام نہ کرے۔“

بڑا کنور اپنے کمرے میں پردہ نشین موجود تھا۔ اس دن صرف فشی جی اندر آئے گاڑ باہر ہی رہ گیا تھا۔ آداب تسلیمات کے بعد اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”شہبازیہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو تم نے پہلے نائیک کو چیلنج کیا تھا اور اب راسن کو لٹکا رہا ہے۔“

میں دم بخود رہ گیا تھا۔ ”میں نے.....؟ ارے جناب یہ آپ کے بھائی کا کام ہے۔ وہی چاہتا تھا کہ میں نائیک سے لڑوں اور اس بھانے وہ میرا بھر کس نکلو اسکے لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی الٹا نائیک کا بھر کس نکل گیا۔“

بڑا کنور چونکا اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”تم نے اسے چیلنج نہیں کیا۔“
”صرف اسے ہی نہیں بلکہ میں نے راسن کو بھی نہیں لٹکا رہا ہے۔ مجھے قطعی شوق نہیں ہے لوگوں سے بلا وجہ لڑتا پھروں۔“

”اگر تم نے چیلنج نہیں کیا تو پھر مقابلے پر کیوں گئے؟“ اس نے کہا۔ ”تم انکار کر دیتے کوئی تمہیں مجبور نہیں کر سکتا تھا۔“

”معذرت کے ساتھ، میں بھلا کس طرح انکار کر سکتا ہوں جب کہ میں آپ بھائیوں کا مشترکہ قیدی ہوں۔ دوسرے یہ میری عزت نفس کے خلاف ہوتا۔“
”تم اگر قیدی بھی ہو تو صرف میرے ہو۔“ بڑے کنور نے کہا۔

”ایک بار پھر معذرت کے ساتھ اگر آپ کا قیدی ہوں تو راج کنور کس طرح مجھے طلب کر رہا ہے اور گاڑ اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مجھے اس کے پاس کیوں لے گئے تھے؟“ میرا لہجہ چبھتا ہوا ہو گیا۔
بڑا کنور شاید صورت حال سے بے خبر تھا میرا اندازہ درست تھا سارا انتظام راج کنور کے ہاتھ میں تھا اور بڑا کنور اس کا مختار تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”اب ایسا نہیں ہوگا؟“

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”میں آپ سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“
میری بات پر فشی جی نے برا سامنا نہ بنایا۔ مگر اس وقت اس کا منہ کھلا رہ گیا جب بڑے کنور نے اسے وہاں سے جانے کا حکم دیا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہوگا۔ جب اس نے کچھ دیر حرکت نہیں کی تو بڑے کنور نے کسی قدر حیرت لہجے میں کہا۔ ”تم نے سنا نہیں؟“

”جی سن لیا کنور جی۔“ وہ گھکیا یا۔ ”لیکن کیا یہ مناسب ہوگا کہ آپ اس کے ساتھ یہاں اکیلے.....“
”یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے اب تم جا سکتے ہو۔“

اس بار فشی جی کو حکم کی تعمیل کرنا پڑی تھی اور جب وہ باہر جا رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں مجھے راج کنور اور نائیک جیسی نفرت دکھائی دی تھی۔ اس کا بس چلنا تو اپنی اس بے عزتی پر وہ مجھے قتل کر دیتا۔ جیسے ہی دروازہ بند ہوا میں بڑے کنور کے پاس آیا۔ ”آپ یہ مت سمجھو گا کہ میں آپ کو بھانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن گزشتہ تین ہفتے میں جو دیکھا ہے اس سے میرے ذہن میں ایک خیال جڑ پکڑ چکا ہے۔“
”کیسا خیال؟“

”میں اپنا خیال بتاتا دن لیکن پہلے مجھے اپنے کچھ سوالوں کے جواب چاہئیں اگر آپ انکار کرتے ہیں تو

میں اپنا خیال خود تک رکھوں گا۔“

”پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”پہلی بات یہ کہ سعدو کے بعد دوسرا باہر آدمی کہاں سے آیا؟“

”اسے نائیک تلاش کر کے لایا ہے۔“

”دوسری بات کیا اس نے بھی علاج کے لیے میرے خون کا مطالبہ کیا تھا؟“

”ظاہر ہے ورنہ تم یہاں کیوں ہوتے؟“

”میاں ممتاز سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“

”میں اور میاں ممتاز لندن میں ایک ہی اسکول میں زیر تعلیم تھے اور وہیں میری اس سے دوستی ہوئی تھی پھر جب مجھے سانپ نے کاٹا اور میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو میاں ممتاز سے دوستی بھی ختم ہو گئی۔ چند سال پہلے وہ اچانک ہی مجھ سے ملنے یہاں آیا تھا۔ دراصل وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ یہاں پائے جانے والے بہیروں کے چکر میں آیا تھا۔ وہ تاثر شدہ بہرے خرید کر انہیں باہر سے ترشوانا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہاں کے سارے بہرے بالآخر ہمارے پاس آتے تھے اور ہم آگے سپلائی کرتے تھے اس لیے میاں ممتاز سے ایک کاروباری لنک بن گیا۔“

”میں ان جوابات پر آپ کا شکر گزار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”بس ایک آخری سوال، آپ کے علاج کی دوا تیار کرنے کے لیے میرا کتنا خون درکار ہوگا۔“

”اس آدمی کا کہنا ہے کہ ایک من خون چاہیے ہوگا اس میں اتنی دوا تیار ہو جائے گی جو میرے علاج کے لیے کافی ہوگی۔“

علاج کے لیے ایک من خون درکار تھا جب کہ میرا اب تک کوئی سات لیٹر خون حاصل کیا گیا تھا۔ مجھے صحیح سے نہیں معلوم تھا کہ لیٹر خون کا وزن کیا ہوتا ہے اور یہ کلو گرام میں کتنا ہوتا ہے اور سیر میں کتنا آتا ہے۔ مگر میرا اندازہ تھا کہ وزن کے لحاظ سے یہ آٹھ سیر بھی نہیں ہوگا یعنی درکار خون کا صرف میں فیصد ملا تھا اور باقی خون حاصل کرنے میں سات سے آٹھ مہینے لگ سکتے تھے لیکن پہلے میاں ممتاز کی تحویل میں میرا زیادہ خون لیا گیا یہ سوچے بغیر کہ اس کا مجھ پر کیا اثر ہوگا۔ پھر یہاں راج کنور کھل کر سامنے آ گیا۔ اس نے بغیر پروا کیے کہ میں اس کے بھائی کے لیے کتنا اہم ہوں مجھے ایک بچکانہ مقابلے میں نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ اللہ نے مجھے محفوظ رکھا انہی کا دست نارا ست اس وقت لمبا پڑا ہوا تھا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اور محتاط لہجے میں بڑے کنور کو یہ ساری زوداد سنائی۔

”جناب مجھے نہیں لگ رہا کہ میرے ساتھ کیا جانے والا سلوک آپ کے حق میں ہے۔ اگر مجھے نقصان ہوا۔ میں مر گیا یا خون دینے کے قابل نہیں رہا تو یہ اصل میں آپ کا نقصان ہوگا۔“

بڑا کنور خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں بولتا تھا اور اس کے لہجے میں شاذ ہی جذباتیت کی آمیزش محسوس ہوتی تھی۔ اس وقت بھی وہ بولا تو اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ”ٹھیک ہے میں اس بات پر غور کروں گا۔ تم بے فکر رہو اب تمہیں کوئی نہیں چھیڑے گا اور نہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ کیا

جائے گا۔“

مگر میں بڑے کنور کی یقین دہانی سے زیادہ مطمئن نہیں تھا اس سے پہلے بھی وہ اس قسم کی کئی یقین دہانیاں کراچکا تھا مگر میں نے دیکھا تھا کہ راج کنور کے سامنے وہ بے اثر ثابت ہوتی تھیں۔ میں نے سر ہلایا۔ ”لیکن اگر اس کے برعکس ہوا تو میں خون دینے کے معاملے میں اپنا تعاون واپس لینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ ایک بات اور، آپ نے بانو کے بارے میں کہا تھا کہ آپ اسے واپس بھیج دیں گے کچھ عرصے بعد، اب اس بات کو بیس دن ہو چکے ہیں۔“

”مسئلہ حل نہیں ہوا ہے۔“ بڑے کنور نے کرسی پر پہلو بدل کر کہا۔ ”در اصل اس موقع پر میاں ممتاز سے تعلقات خراب نہیں کیے جاسکتے ہیں اگر بانو واپس گئی تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ تمہیں اور بانو کو صبر سے کام لینا ہوگا۔“

”راج کنور کے عزائم بانو کے بارے میں ٹھیک نہیں ہیں وہ اس حوالے سے مجھے براہ راست دھمکی دے چکا ہے۔“

”میں نے کہا تا تم فکر مت کرد تہاری اور بانو کی پوری حفاظت کی جائے گی۔“ بڑے کنور کا لہجہ ناخوشگوار ہو گیا تھا میں نہیں دیکھ سکا کہ اس نے کیا کیا تھا لیکن دروازہ کھلا اور نشی جی اندر آئے۔ ظاہر ہے وہ اجازت کے بغیر اندر نہیں آسکتے تھے۔ انہیں کوئی اشارہ ملا تھا تبھی وہ اندر آئے تھے۔ بڑے کنور نے حکم دیا۔ ”شہباز ملک کو ان کے کمرے میں پہنچا دو۔“

نشی جی نے راستے میں کہا۔ ”شہباز جی آپ نے میری بے عزتی کر کے اچھا نہیں کیا؟“

”میں نے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”آپ کو بڑے کنور نے کمرے سے جانے کا حکم دیا تھا اور میرا خیال ہے وہ اس کا حق رکھتے ہیں کیونکہ وہ بہر حال مالک ہیں آپ کے، مالک کے حکم میں عزت بے عزتی نہیں ہوتی ہے۔“

نشی جی دانت پیس کر رہ گئے میں نے اسے آئینہ دکھایا تھا کہ نوکر کتنا ہی سر چڑھا کیوں نہ ہو جائے بہر حال وہ نوکر ہی ہوتا ہے۔ وہ چلاک آدمی تھا اس نے جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اسے نکال کر میں نے بڑے کنور سے کیا بات کی تھی۔ اسے معلوم تھا میں نہیں بتاؤں گا اور اس کی مزید بے عزتی ہوگی۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ میں نے اس سپرے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ جو سندھو کی جگہ بڑے کنور کا علاج کرنے آیا تھا اور اس بد بخت نے میرے ایک من خون کی فرمائش کی تھی۔ جیسے خون نہ ہو پانی ہو۔ نشی جی نے پلٹ کر اس کا جواب نہیں دیا تھا اور بڑے کنور سے میں کہنا بھول گیا تھا میں نے نشی جی کو یاد دلایا تو وہ غرایا۔ ”اسے بھول جاؤ اس سے تمہاری ملاقات نہیں ہو سکتی ہے۔“

”کیا اس لیے کہ میں اس کی حقیقت نہ سمجھ جاؤں کہ وہ بڑے کنور کا علاج کر بھی سکتا ہے یا نہیں۔“ میں نے کہا اور نشی جی کے تاثرات دیکھ کر بغیر کمرے میں داخل ہو گیا۔ بانو اپنے کمرے میں تھی۔ میں نے بتایا کہ وہ بلا ضرورت میرے کمرے میں نہیں آتی تھی اکثر کھانا بھی اپنے کمرے میں ہی کھاتی تھی صرف صبح کا ناشتہ میرے ساتھ کر لیتی تھی۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ میں آکر لیٹ گیا تھا۔ چوٹ والی جگہ بچا رہا تھا کیونکہ وہ بستر پر گلتی تو ٹیس سی اٹھتی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”آ جاؤ۔“

آنے والی اوشا تھی۔ جب سے میں نے اسے دیکھا تھا وہ تین چار بار سے زیادہ یہاں نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں وہ خود محتاط ہو گئی تھی یا پھر اسے منع کیا گیا تھا۔ دو تین بار وہ آئی تو اتفاق سے میں کمرے میں نہیں تھا یا نہار ہا تھا۔ وہ بانو سے بات کر کے اور اسے مطلوبہ چیزیں دے کر چلی گئی۔ میں چونکا کیونکہ خادماؤں والے لباس کے بجائے اپنے ماضی کے حلیے میں تھی یعنی اس نے سادہ ریشمی ساڑھی باندھی ہوئی تھی اور اس کے نیچے کچھ بھی نہیں تھا۔ یقیناً اس کا یہ انداز زیادہ ہوش ربا تھا لیکن یہ یہاں کا لباس نہیں تھا۔ اگرچہ جو لباس یہاں خادماؤں پہنتی تھیں وہ بھی کم ہوش ربا نہیں تھا۔ پھر بھی اوشا الگ ہی نظر آ رہی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ ”خیریت آج تم اپنے پرانے انداز میں دکھائی دے رہی ہو۔“

”تجھے پسند جو ہے رے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ابھرے ہوئے تاج نے جیسے سرفی مائل ہونٹ ذرا اٹھائے تو اندر سے بہت سفید دانت جھلکنے لگے تھے۔ اس کا لہجہ اور بولنے کا انداز بھی پرانا تھا۔

”میری پسند کہاں سے آگئی یہ تو تمہارا بچپن کا پہناوا ہے۔“

”ہاں پر ہمیں معلوم ہے تجھے پسند ہے۔“

”ٹھیک ہے بابا مجھے پسند ہے لیکن آگے بھی تو کہو۔“

وہ میرے پاس آئی اور بیڈ کے پاس قالین پر بیٹھ گئی۔ ساڑھی کا پلو بہت زیادہ چوڑا نہیں تھا اور اس کا سرکش شباب جامے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ کچھ اس نے بھی جان کر لا پرواہی برتی ہوئی تھی۔ میں نے لاحول پڑھی اور نظروں کو بھٹکنے سے روکا۔ اس نے بال کھلے چھوڑے ہوئے تھے جو اس کے عریاں شانوں اور کمر کی ہتر پوشی کر رہے تھے۔ اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی پہلے وہ لڑکیوں کی طرح چھریری تھی حالانکہ شاید لڑکی وہ اس وقت بھی نہیں تھی۔ مگر اب جسم کسی قدر بھر گیا تھا۔ بہتر خوراک کے ساتھ یقیناً دوسری سرگرمیاں بھی اس کی وجہ تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ گرم ہو رہا تھا۔

”تمہیں بخار ہے؟“

”نہیں رے میرا بدن اسی طرح گرم رہتا ہے۔ ٹو جانتا تو ہے سیرے کی بیٹی ہوں، بچپن سے سانپوں کے ماتھ رہی ہوں۔“

”اوشا تم یہاں خوش ہو؟“

”ہاں رے۔“ وہ لا پرواہی سے بولی۔ ”کیا برائی ہے، کھانے اور پہننے کو ملتا ہے، تھوڑا کام کرنا پڑتا ہے اور کوئی تنگ بھی نہیں کرتا۔“

”تنگ سے کیا مراد ہے؟“

”وہی جو تیرے ذہن میں ہے۔“ اس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”تو سمجھتا ہے نا ہم یہاں کنوروں مار کھیل ہیں۔“

”اگر میں ایسا سمجھتا ہوں تو کیا غلط ہے؟“

”ہاں غلط ہے۔“ وہ بولی۔ ”کوئی مرد میرے پاس نہیں آ سکتا سوائے تیرے.....“

میں نے پھر لاحول پڑھی اور اس سے ہاتھ چمڑا لیا۔ ”گلتا ہے تمہارے دماغ میں پھر پرانا کیڑا کھلا رہا

ہے۔ مجھے معاف رکھو۔“

”سچ کہہ رہی ہوں رے۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”باپو نے بھی کہا تھا کہ بس تو ہی میرا مرد بن سکتا ہے۔“

”مجھ میں ایسی کیا بات ہے؟“

”تو دوش برداشت کر سکتا ہے۔“ اوشا نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔ میں چونک گیا۔

”کیا مطلب میں زہر برداشت کر سکتا ہوں کیا تم زہریلی ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”بچپن میں ایک بار باپو کے سانپ نے مجھے ڈس لیا تھا۔ باپو نے مجھے بچا لیا لیکن میرا جسم دوش کا عادی ہو گیا۔ چند مہینے میں ایک بار مجھے سانپ نہ کاٹے تو میری حالت خراب ہونے لگی تھی۔ تب باپو اپنے کسی ہلکے دوش والے سانپ سے مجھے ڈسواتا تھا۔ جوان ہونے تک میں دوش کنیا بن گئی تھی۔“

میں دنگ رہ گیا تھا۔ جس زمانے میں زندگی کا مقصد صرف پڑھنا ہوتا تھا تب میں نے بے شمار ایسی کہانیاں پڑھی تھیں جن میں دوش کنیاؤں کا ذکر تھا کہ انہیں بچپن سے زہر دے کر تیار کیا جاتا تھا اور جوان ہونے ہوتے وہ اتنی زہریلی ہو جاتی تھیں کہ کسی کو کاٹ لیں تو وہ مر جاتا تھا اسی طرح ان سے جسمانی تعلق قائم کر لے والا مرد بھی مارا جاتا تھا۔ انہیں خاص طور سے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ میں اسے ایک خیالی چیز سمجھتا تھا۔ مگر آج اوشا نے بتایا کہ یہ سچ تھا۔ وہ اتنی زہریلی تھی کہ کوئی مرد اس کے پاس نہیں آ سکتا تھا۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا میں نے پوچھا۔ ”تم نے مجھے پکڑا ہوا ہے کیا اس سے بھی زہر میرے جسم میں جا سکتا ہے؟“

وہ پھر نیلے انداز میں مسکرائی۔ ”ابھی تو صرف پکڑا ہے رے، پر کبھی تجھ سے سرے پاؤں تک لپٹی بھی تھی۔ تب بھی تجھے کچھ نہیں ہوا تھا۔“

جب میں سندھو کی قید میں تھا اور اس نے جزی بوٹیوں کی مدد سے مجھے بے حس کر دیا تھا تب اوشا نے میری مدد کی تھی اور مجھے جسمانی طور پر متحرک کرنے کے لیے وہ بے لباس ہو کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ میں جھینپ گیا۔ ”میری بات کا جواب نہیں دیا؟“

”ہاں باپو کہتا تھا جسے میں جھوٹوں اسے بھی دوش پہنچے گا پر بہت تھوڑا سا، وہ مرے گا نہیں، ہاں جسے میں کاٹ لوں یا کوئی مرد میرے پاس آئے تو وہ نہیں بچے گا۔“

میں نے جھر جھری لی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیشہ مجھے بھٹکنے سے محفوظ رکھا تھا۔ اگر میں مڑھا کردار نہ ہوتا تو شاید آج زندہ نہ ہوتا۔ میرا اندازہ غلط تھا کہ اوشا یہاں سب کی داشتہ بن کر رہ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کنور جانتے ہیں کہ تم زہریلی ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”جب یہ لوگ دوبارہ یہاں آئے تو ایک رات راج کنور نے مجھے اپنے کمرے میں لایا تھا میں نے اسے بتا دیا کہ میں دوش کنیا ہوں۔ وہ بہت ڈر گیا تھا۔ پھر اس نے مجھے ڈاکٹر کو دکھایا اور اس نے لایا کہ میرے خون میں اتنا زہر ہے جتنا ایک بڑے ناگ میں ہوتا ہے۔“

مجھے خیال آیا کہ کاش اوشا یہ بات راج کنور کو نہ بتاتی تو آج وہ اس دنیا میں نہ ہوتا لیکن میں نے منہ نہیں کہا۔ ”دوسروں کو بھی معلوم ہے؟“

”بڑے کنور اور کچھ اور لوگوں کو معلوم ہے۔ بڑے کنور نے مجھ سے بہت سے سوالات کیے تھے۔“

وہ واقعی حیرت انگیز تھی۔ جہاں تک مجھے علم تھا جدید سائنس اسے ناممکن قرار دیتی ہے کہ ایک انسان اپنے جسم میں زہر رکھ سکے اور اسے کوئی نقصان نہ ہو۔ یا تو انسان کا جسمانی نظام علاج کی مدد سے زہر ختم کر دے گا یا پھر ہر انسان کو ختم کر دے گا۔ عام قسم کے زہروں میں سکھیا سب سے خطرناک اور مؤثر ہوتا ہے اس کی خاص بات یہ ہے کہ اگر اسے تموڑا تھوڑا کر کے بھی دیا جائے تو یہ اثر رکھتا ہے اور انسان بیمار ہو کر مر جاتا ہے۔ اس کے اثرات کا بھی مشکل سے پتا چلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب انگریزوں کو برصغیر میں اس زہر کے اثرات کا پتا چلا تو انہوں نے اسے اپنے سب سے بڑے دشمن نیولین پر آزمایا تھا اور وہ پُر اسرار انداز میں بیمار ہو کر مر گیا۔ صدیوں بعد آج اس کے ناخنوں اور بالوں کا جدید انداز میں تجزیہ کیا گیا تو ان میں سکھیا کی آمیزش معمول سے چودہ گنا زیادہ پائی گئی جو اس کا حتمی ثبوت ہے کہ نیولین کو سکھیا دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔ مفروضہ دش کنیا بھی سکھیا کھلا کر تیار کی جاتی تھیں۔ عین ممکن ہے انہیں سکھیا کے ساتھ ایسی جڑی بوٹیاں دی جاتی ہوں جن کی مدد سے جسم سکھیا کے مضر اثرات پر قابو پا کر اسے اپنے اندر رہنے کی اجازت دے دیتا ہو۔ مگر اس کا کوئی ثبوت یعنی سچ سچ کی دش کنیا سامنے نہیں آئی۔ انہیں نہایت رازداری سے رکھا جاتا تھا اور جس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا تھا وہ پورا ہونے کے بعد یقیناً انہیں مار دیا جاتا ہوگا۔

اوشا بھی روایتی دش کنیا نہیں تھی بلکہ اسے سانپ کا زہر ملا تھا۔ سانپ کا زہر دو طرح سے اثر کرتا ہے ایک یہ دماغ کو بے حس کر دیتا ہے جس سے سانس اور دل کی دھڑکن رک جاتی ہے۔ دوسرے یہ خون کو پانی کی طرح پتلا کر دیتا ہے جس سے جریان خون شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی سنا ہے کہ بعض عادی نشے باز نشے کو دو بالا کرنے کے لیے سانپ سے ڈسواتے ہیں مگر صرف سنا ہی سنا ہے۔ مگر اس کا امکان ہوتا ہے۔ شاید دماغ کو بے حس کر دینے والے سانپ کے زہر کا اثر نشے کی طرح ہوتا ہو کیونکہ کسی بھی قسم کا نشہ بنیادی طور پر دماغ کے فنکشن کو متاثر کرتا ہے۔ دماغ اپنا روایتی کام چھوڑ دیتا ہے۔ شعور متاثر ہوتا ہے اور انسان ہواؤں میں اڑنے لگتا ہے۔ سوچیں منتشر ہونے سے انسان اپنی پریشانیاں اور مسائل عارضی طور پر بھلا دیتا ہے اور اسی کیفیت کو نشہ کہتے ہیں۔ دماغ بہت نازک اور حساس عضو ہے۔ جسم کے دوسرے اعضا کے برعکس یہ خون کو فلٹر کر کے استعمال کرتا ہے اور دماغ میں داخل ہونے والا خون صرف آکسیجن اور گلوکوز لے کر جاسکتا ہے۔ مگر کچھ کمپاؤنڈز ایسے ہوتے ہیں جو ان فلٹرز سے گزر جاتے ہیں اور یہی کمپاؤنڈز نشہ کہلاتے ہیں۔ الکحل، افیم، بھنگ، چرس اور مارفین بنیادی نشے ہیں جو حیاتیاتی نشے بھی کہلاتے ہیں۔ کچھ کیمیکلز کمپاؤنڈز بھی نشے کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

”اس طرح چھوٹے سے جو زہر سہرا بت کرے گا اس کا کیا اثر ہوگا؟“

”تجھ پر کچھ نہیں ہوگا رے، ٹو پہلے ہی دش والا ہے۔ تبھی تو تجھ پر ناگ دیوتا کا دش بھی بے کار رہا تھا۔“

”میں نے کبھی کوئی زہر استعمال نہیں کیا۔“

”میں نہیں جانتی پر باپو کہہ رہا تھا کہ تُو نے کچھ ایسا کھایا ہے جس سے تیرے خون میں دش کی سہارا ہو گئی ہے۔“

میرا خیال فوری طور پر ان دواؤں کی طرف گیا جو حکیم قادس نے مجھے استعمال کرائی تھیں اور جن میں راسرار وادی سے لائے گئے پتھر کا سفوف جزِ اعظم کے طور پر شامل تھا۔ یہ دوائیں زخم بہت تیزی سے بھر دیتی

تھیں۔ بلکہ ان کا اثر اب تک تھا میرا زخم غیر معمولی تیزی سے بھر جاتا تھا اسی طرح مجھے عام بیماریاں بھی کم ہوتی تھیں۔ شاید اسی کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ مجھ پر مہلک ترین سانپ کے بہت زیادہ زہر نے بھی اثر نہیں کیا تھا۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ میں اندر سے زہریلا ہو گیا تھا۔ اس دوران میں کئی بار میرے خون کا مکمل ٹیسٹ ہو چکا تھا اگر اس میں زہر شامل ہوتا تو لازمی رپورٹ میں اس کی نشاندہی ہوتی۔ میں نے اوشا سے کہا۔ ”میرا نہیں خیال کہ ایسا ہی ہے۔“

”یہ بات میں نہیں جانتی پر بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جسے ڈاکٹر نہیں جانتے۔“ وہ بولتے ہوئے جذباتی ہو گئی۔ ”میں تیرے لیے کب سے تڑپ رہی ہوں۔“

میں نے اس سے ہاتھ چھڑا لیا۔ ”تُو جانتی ہے میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔“

”میں بنا دوں گی۔“ اس نے کہا اور ساڑھی کا پلو گر ادیا۔ میں نے جلدی سے نگاہیں پھیر لیں۔ میں نے پارسائی کا دعویٰ کبھی نہیں کیا اور ہمیشہ خود کو کمزور انسان ہی سمجھا۔

”اوشا اسے ٹھیک کر لو۔ تم مجھے نہیں جانتی ہو اس لیے سمجھتی ہو اس طرح خود کو دکھا کر مجھے اپنا بنا لو گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔“

”تب مجھے دیکھتا کیوں نہیں ہے رے۔“ اس نے چیلنج کرنے والا انداز میں کہا اور تن کر کھڑی ہو گئی۔

”کیونکہ ہمیں دیکھنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اوشا تم اچھی لڑکی ہو خود کو اس طرح تماشہ مت بناؤ۔“

اگر میں سخت انداز اختیار کرتا اور اسے درمخکی سے جھٹک دیتا تو اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو نرم لہجے کا ہوا تھا۔

”تب میں کیا کروں، تُو نہیں جانتا دوش نے مجھے کسی کے قابل ہی نہیں چھوڑا ہے اس نے مجھے اندر سے آگ بنا دیا ہے۔“ اس کا لہجہ بھگ رہا تھا۔ ”میں اس آگ کو ٹھنڈا بھی نہیں کر سکتی۔“

وہ کہتے ہوئے قالین پر گر گئی اور اپنے زانوؤں پر جھکتے ہوئے سسک سسک کر رونے لگی تھی۔ بال ہٹ گئے تھے اور اس کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے پہلے میں کچھ کہتا یا کچھ کرتا اچانک بانو کے کمرے کا دروازہ کھلا اور بانو نمودار ہوئی۔ اوشا کو اس حال میں اور روتے دیکھ کر اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے میں اسے کچھ کہتا وہ بٹٹی اور اپنے کمرے میں چلی گئی اس نے دروازہ بھی بہت آہستگی سے بند کیا تھا اوشا کو اس کے آنے یا جانے کا پتا نہیں چلا تھا۔ مجھے اس مظلوم لڑکی پر ترس آنے لگا۔ قدرت نے اسے حسین بنایا تھا بے شک اس کا رنگ پہلے سیاہ اور اب تانبے جیسا گہرا سرخ تھا لیکن اس کے نقوش اور جسمانی پیچ و خم کسی بھی حسین ترین عورت سے کم نہیں تھے۔ مگر اس حسن و سراپے کے ساتھ اسے زہریلا بنا دیا تھا کوئی مرد اس کے پاس نہیں آ سکتا تھا۔ دوسری طرف اس کے وجود میں موجود زہر نے اسے بے پناہ جذباتی بنا دیا تھا میں خود کئی بار اس کے جذبات دیکھ چکا تھا۔ میں نے بانو کے جانے کے بعد جھک کر اسے شانوں سے تھام کر اٹھایا۔ اس کی ساڑھی کا پلو درست کیا اور اسے صوفے پر بٹھا کر پانی دیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور بولی۔

”مجھے جگ دو۔“

میں نے اسے جگ تھما دیا اور وہ اسے بھی پی گئی۔ شاید اس کے اندر لگی آگ اتنی زیادہ تھی کہ اسے بجھانے

تیر ہواں حصہ

کے لیے یہ پانی بھی کم پڑ گیا تھا۔ جب خالی کر کے اسے کچھ سکون ملا تھا اور وہ گہرے سانس لے رہی تھی۔ پھر اس نے سازشی کا پلو ٹھیک سے لیا۔ اس کا چہرہ جو پہلے آگ کی طرح دہکنے لگا تھا اب نارمل ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اچانک آگے جھکتے ہوئے میرے سینے سے لگتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”شہباز ڈو کھترے میں ہے۔“

پہلے میں کچھ اور سمجھا تھا کہ شاید اسے جذبات کا دوسرا دورہ پڑا ہے لیکن اس کے جملے اور سہمے ہوئے انداز نے میری غلط فہمی دور کر دی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے پھر اسی انداز میں سرگوشی کی۔ ”آہستہ بول، یہاں ہونے والی بات سنی جاتی ہے۔“

میرے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے مجھے یہ خیال تو آیا ہی نہیں تھا کہ ان کمروں میں مائیک لگے ہوں گے۔ کنور مجھے قید کر کے آرام سے نہیں بیٹھ گئے تھے وہ مجھ پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے تھے اور ان کو میری ایک ایک حرکت کا علم تھا۔ اوشا کے اس انداز نے میری چمچی حس کو بھی جھنجھوڑ دیا تھا۔ کمرے میں بات کرنا ٹھیک نہیں تھا اب ایک ہی جگہ بچتی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے واش روم میں لے آیا۔ یہاں پہلے میں نے نہانے والا شاور کھول دیا اور پھر اوشا کے کان کے پاس آ کر پوچھا۔ ”تجھے کیسے پتا؟“

”میں نے راج جی سے سنا، وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں تیرے پاس آؤں اور تجھے رہجاؤں۔ میں تو کب سے تیرے لیے تڑپ رہی تھی۔“

”تم نے یہ نہیں سوچا کہ راج کنور کا مقصد مجھے مارنا ہوگا۔“

”مجھے معلوم تھا پر یہ بھی پتا ہے تو مرے گانہیں، باپو نے کہا.....“

”باپو کا کہا آخری نہیں ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”سوچ اگر یہ غلط ہوا تو میں مرجاؤں گا کیا تو مجھے مارنا چاہتی ہے۔“

میرے قریب اس کا جسم کانپ اٹھا تھا۔ ”نہیں رے، میں تو تجھ پر جان واردوں۔“

”اوشا تو نے ٹھیک کہا یہاں میری جان کو خطرہ ہے۔ راج کنور میرا دشمن بن گیا ہے وہ ہر قیمت پر مجھے مارنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے تجھے بھیجا ہے۔ یہ بتا کہ اگر تو ناکام رہی تو وہ کیا کرے گا؟“

”پتا نہیں شاید سزا دے یا مار دے۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”اوشا تو اتنے عرصے سے یہاں ہے تجھے پتا ہوگا کہ باہر جانے کے راستے کہاں ہیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”پتا ہے لیکن سب پر پھرے ہیں۔“

”اوشا مجھ سے ملتی رہنا، راج کنور کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم ناکام رہی ہو لیکن ابھی باہر نکل کر میں کچھ ایسی باتیں کروں گا جن سے راج کنور سمجھے گا کہ میں تم سے متاثر ہوں تب تم اس سے کہو گی کہ تم مجھ سے بار بار ملو گی کبھی نہ کبھی تو کامیابی ملے گی۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”تو نہ کہتا تب بھی میں یہی کہتی تھی تجھ سے بار بار ملنا چاہتی ہوں۔ ایک بات بتا یہ ناری کون ہے؟“

”بانو کی بات کر رہی ہو؟“

”ہاں وہ مجھے اچھی نہیں لگتی ہے۔“

”تمہیں اس سے جلنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم صرف کچھ وقت کے ساتھی ہیں۔“

”پہلے دن رات تیرے ساتھ توچے۔“ اوشا نے حسد سے کہا۔ ”سندر بھی ہے۔“

اوشا بانو کو اپنے پیانے پر تول رہی تھی حالانکہ وہ بالکل مختلف مزاج کی اور اپنی عزت کی حفاظت کرنے والی لڑکی تھی۔ اوشا بھی بری نہیں تھی لیکن اس نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اور جو اسے پیچھے سے ملا تھا اس میں عورت کی عزت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی پھر وہ کنور ہیلز کے ہوسناک ماحول میں رہی تھی اور اس نے یہاں مختصر عرصے میں وہ سب دیکھ لیا تھا جو اپنی بیس سالہ زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ اس میں اس حوالے سے رہی سہی جھگ اور شرم بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود میں اسے قصور دار نہیں سمجھ رہا تھا۔ اصل قصور وار اس کا ماحول اور اس کا پس منظر تھا۔ ہم باہر آئے اور میں نے کچھ ڈائلاگ کہے جن سے سننے والے کو لگتا کہ میں بھی اوشا کے حسن سے متاثر تھا۔ کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔ مجھے بانو کا خیال آیا جو اوشا کو میرے کمرے میں اور میرے بستر کے پاس ناگفتہ بہ حالت میں دیکھ چکی تھی۔ ہم دونوں ہی اس وجہ سے شرمندہ ہوتے۔

مگر بانو سے زیادہ مجھے راج کنور نے فکر مند کر دیا تھا۔ وہ اب کھل کر میری دشمنی پر اتر آیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اسے بڑے کنور کی پروا بھی نہ ہو۔ بلکہ شاید وہ اسے بھی دھوکا دے رہا تھا۔ مجھے تو وہ سپیرا بھی فراڈ لگ رہا تھا جس نے میرے خون سے بڑے کنور کا علاج کرنے کا دعوئی کیا تھا۔ میں نے صرف سنا تھا کہ اس کے علاج سے بڑے کنور کو فائدہ ہوا تھا مگر بڑے کنور کی حالت بدستور پہلے جیسی تھی۔ وہ اتنا ہی کمزور اور بیمار تھا جتنا میں نے اسے پہلے پایا تھا۔ سندھو کی بات اور تھی اس نے کوشش کر کے بڑے کنور کی بیماری کا علاج دریافت کر لیا تھا یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اگر راج کنور کوئی سازش کر رہا تھا تو لازمی بڑے کنور کے ساتھ اس کا نشانہ میں بھی ہوتا۔ وہ مجھے کسی صورت زندہ نہ چھوڑتا۔ ٹائیک سے مقابلہ بھی اس کی ایک کوشش تھی۔ ٹائیک کی لاشی وزنی اور سخت تھی اس کے چند خطرناک وار کسی بھی انسان کو موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے لیکن اس کی یہ کوشش ناکام رہی تھی۔

نہر اس نے اوشا کا حربہ آزمایا اسے امید تھی کہ میں اوشا کے حسن و شہاب کے آگے کھل جاؤں گا اور اس کے وجود میں موجود زہر میرا خاتمہ کر دے گا۔ ابھی تک راج کنور ڈھکے چھپے انداز میں کوشش کر رہا تھا بڑے کنور کی وجہ سے وہ کھل کر میرا خاتمہ کرنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا ورنہ یہ بہت آسان کام تھا۔ اس کے گرمے ایک اشارے پر مجھے گولی مار سکتے تھے اور میری لاش کسی نامعلوم قبر میں چھپائی جاسکتی تھی۔ صرف بڑے کنور کی وجہ سے وہ کھل کر کچھ کرنے سے رکا ہوا تھا مگر راج کنور کی بیٹابی بتا رہی تھی کہ اب وہ کھل کر سامنے آنے میں زیادہ دیر بھی نہیں لگائے گا۔ اس بیٹابی کی ایک وجہ شاید بانو بھی تھی جسے وہ اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں خیالوں سے باہر آیا۔ ”آ جاؤ۔“

دروازہ کھلا اور دل نواز خان کھانے کی ٹرائی لے کر اندر آیا۔ وہ کھانا میز پر سجانے لگا تھا اس کے جانے کے بعد میں نے بانو کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہ جھپنی ہوئی لگ رہی تھی شاید اس منظر کی وجہ سے جو اس نے میرے کمرے میں دیکھا تھا۔ ”کھانا لگ گیا ہے۔“

وہ خاموشی سے آگئی اور ہم نے خاموشی سے ہی کھانا کھایا۔ جب دل نواز خان برتن سمیٹ کر لے گیا تو

بانو جانے کے لیے کھڑی ہوئی پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میں معافی چاہتی ہوں اس طرح اچانک بغیر دستک دیئے آپ کے کمرے میں آگئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا۔

”آئندہ میں خیال رکھوں گی۔“ اس نے کہا پھر جھجک کر بولی۔ ”شہباز صاحب میں اتنے عرصے میں آپ کو اچھی طرح جان گئی ہوں اس لیے کوئی بھی بات اور کوئی بھی منظر میرا آپ کے کردار پر اعتماد متزلزل نہیں کر سکتا ہے۔“

”میں اس اعتماد کے لیے شکر گزار ہوں۔“ میں نے کہا۔ پھر ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے چپ رہنے کو کہا اور اس کا ہاتھ تمام کر دوش روم میں لے آیا۔ اس کے چہرے پر کسی قدر فکر کے تاثرات نظر آئے تھے لیکن اس نے مزاحمت نہیں کی۔ میں نے شاور چلایا اور سرگوشی میں کہا۔ ”بانو ہمارے کمرے بگنڈ ہیں یہاں مائیک لگے ہوئے ہیں اور ہماری آوازیں دوسری جگہ سنی جاتی ہیں۔“

بانو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”لیکن کیوں؟“

”یہ اس طرح ہم پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم فرار کا یا کوئی ایسا منصوبہ بنائیں جو ان کے خلاف ہو تو یہ پہنچی آگاہ ہو جائیں لیکن اوشا سے ایک خطرناک بات کا علم ہوا ہے۔ راج کنور مجھے حیلے بہانوں سے مارنے پر قائل کیا ہے۔“

”اسی لیے اس نے آپ کو زبردستی لڑنے پر مجبور کیا تھا؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”اوشا کو بھی اسی مقصد کے تحت میرے کمرے میں بھیجا ہے۔“

”وہ اوشا سے آپ کو قتل کرنا چاہتا ہے؟“ اس نے تعجب سے کہا۔ ”لیکن کیسے وہ تو کمزوری لڑکی ہے۔“

”وہ کمزور لڑکی بجائے خود ایک خطرناک ترین ہتھیار ہے۔“ میں نے کہا اور پھر اوشا کے زہریلے پن کا انکشاف کرتے ہوئے ڈھکے چھپے انداز میں بتایا کہ وہ کس طرح آدمی کو موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ بانو جھینپ گئی تھی مگر فوراً اتشائش سے بولی۔

”یہ آپ کے لیے بہت خطرناک ہے۔ فرض کریں وہ آپ کو کاٹ لے تب بھی اس کا زہر اثر کرے گا۔“

”وہ مجھ سے قلمس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن کیا کہا جاسکتا ہے کہ آدمی کب کیا کر گزرے۔“

”میرا خیال ہے وہ آپ کو پسند کرتی ہے۔“ بانو نے پہلی بار میرے ذاتی معاملے پر اظہار خیال کیا۔

”لیکن کیا آپ اس پر پورا بھروسہ کر سکتے ہیں؟“

”جی بات ہے سو فیصد نہیں کر سکتا ہوں۔ وہ نفس پرست ہے اور جو اپنے نفس کے پیچھے بھاگتا ہے وہ کبھی بھی سو فیصد اعتماد کے قابل نہیں ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ میں نے بانو کو بڑے کنور سے ہونے والی ملاقات کا نہیں بتایا۔ اگرچہ ہم شاور کے پاس کھڑے ہو کر بات کر رہے تھے اور آواز بھی بس اتنی رکھی تھی جو دوسرے کو سنائی دے۔ مگر امکان تو تھا کہ شاید مائیک اتنے طاقتور ہوں کہ ہماری آواز پھر بھی کیچ کر لیں۔ اس لیے میں بڑے کنور سے ہونے والی گفتگو خود تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”اوشا سے بچانے میں تم اہم کردار ادا کر سکتی ہو۔ جب اوشا آیا کرے تم بھی آجایا کرو۔ اس سے راج کنور کی چال ناکام ہوگی اور وہ اوشا کو مورد الزام بھی

نہیں ٹھہرا سکے گا۔“

اگرچہ بانو کو میرا ادشا کا اتنا خیال رکھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن اس نے مخالفت نہیں کی اور سر ہلایا۔
”ٹھیک ہے لیکن مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ وہ آئی ہے اس وقت بھی میں اتفاق سے آگئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں وہ آپ کے ساتھ ہے۔“

”اس کے لیے تم درمیان کا دروازہ کھول کر کھا کر اس طرح میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوگی تو تمہیں پتا چل جائے گا اور تم فوراً یہاں آ جاؤ۔“
”اگر وہ لیٹ نائٹ آئی۔“

”تب بھی تم آ جانا یہ سوچے بغیر کہ یہاں تمہاری موجودگی کو کیا معنی پہنائے جا رہے ہیں۔“
اس کا چہرہ ذرا سرخ ہوا تھا۔ ہم باہر آئے تو وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے واپس آ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ مائیک کہاں چھپایا گیا ہے۔ کمرے کے وسط میں بڑا سا فانوس لگا ہوا تھا جس میں درجن سے بھی زیادہ کینڈل بلب لگے ہوئے تھے اور شیشے کی بہتات تھی یہاں مائیک آسانی سے چھپایا جاسکتا تھا۔ فانوس تک رسائی ممکن نہیں تھی کیونکہ اس کا نچلا حصہ زمین سے تقریباً پارہ فٹ اونچا تھا اور یہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس پر چڑھ کر میں اتنی بلندی تک پہنچتا۔ میں نے ایل سی ڈی وی کا معائنہ کیا اور اسے دیوار میں فلکسنگ سے نکال کر دیکھا۔ مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ بیڈ اور صوفوں کے پیچھے بھی کچھ نہیں تھا۔ دیواروں پر عام روشنی کے پینٹل انرجی سیور لگے تھے۔ وہ بھی میری رسائی سے باہر تھے۔ ایک گھنٹے بعد میں نے تھک ہار کر کوشش ترک کر دی۔ مائیک بہت مہارت سے چھپائے گئے تھے۔ بستر پر لیٹا تو کمر کی تکلیف یاد آئی لیکن یہ بہت کم رہ گئی تھی۔ مجھے امید تھی کل تک اتنی کم رہ جائے گی کہ میں معمول کی ایکسر سائز کر سکوں گا۔



اگلے دن صبح مچ میری تکلیف خاصی حد تک کم ہو گئی تھی۔ صبح میں نے ہلکی ایکسر سائز کی اور شام کو پورے ردھم سے ایکسر سائز کرنے لگا۔ بانو دونوں وقت آئی تھی لیکن اب ہم گفتگو میں احتیاط کرتے تھے۔ شام کو میں نے بانو کو حملہ کرنے کی اصلی مشق کرائی۔ وہ مجھ پر حملہ کرتی اور میں اپنا دفاع کرتا تھا۔ چند دنوں کی مشق سے اس کے ہاتھ پیروں میں سختی آگئی تھی اور وہ ٹھیک سے وار کرنے لگی تھی۔ مجھے امید تھی کہ اس پر کوئی برا وقت آیا تو وہ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے گی۔ جسم کے ساتھ میں اس کے ذہن کو بھی سخت بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگلے روز میں نے بھی حملے کی مشق کی اور بانو دفاع کرتی رہی۔ دو دن میں اس نے مزید بہتری دکھائی تھی۔ تیسرے ہفتے کے آخر تک اس کا وزن اسٹھ کلو گرام ہو گیا تھا۔ شانوں، بازوؤں اور ٹانگوں کا وزن بڑھنے سے اس کے واری شدت میں اضافہ ہوا تھا۔ تیسری بار خون دینے کے لیے جانے سے پہلے میں نے اس سے آدھے گھنٹہ مقابلہ کیا تھا اور وہ تھکے بغیر لڑتی رہی تھی۔ کوئی بھی خاص گفتگو ہم واش روم میں شاور چلا کر کرتے تھے۔ اس وقت بھی ہم واش روم میں آئے تھے۔ میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

”تم بہت تیزی سے سیکھ رہی ہو۔“

”اس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔“

”بانو تم میں سیکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ صرف تین ہفتے میں ایک نازک اندام لڑکی سے درمیانے درجے کی ماہر لڑکا میں تبدیل ہونا ہر لڑکی کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے تم ذہنی لحاظ سے بھی مضبوط ہو۔ اصل تبدیلی ذہن کی ہی ہوتی ہے۔ تم نے اپنی خوراک اور اپنا وزن بڑھایا ہے۔“

”سچ کہوں تو مجھے لگتا ہے کہ اب راج کنور جیسے شخص کو میں آسانی سے شکست دے سکتی ہوں۔“

”جسمانی شکست ممکن ہے لیکن تم بھول رہی ہو راج کنور کی اصل طاقت اس کی حیثیت اور اس کے آدمی ہیں۔ اس لیے صرف جسمانی شکست کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ جب تک تم اپنا ذہن بھی استعمال نہیں کرو گی اس پر حاوی نہیں آ سکتی ہو۔“

مقررہ وقت پر نشی جی اور ایک نیا گارڈ مجھے لینے آئے۔ کمرے کے باہر اب بھی وہی گورکھا ہوتا تھا لیکن آنے جانے کے لیے یہ نیا گارڈ تھا شاید یہ بڑے کنور کا اعتماد کا آدمی تھا اور وہی کرتا جو بڑا کنور کہتا۔ حسبِ معمول میرا خون نکالا گیا اور پھر مجھے واپس کمرے میں چھوڑ دیا گیا۔ بانو اپنے کمرے میں تھی لیکن دروازہ بند ہوتے ہی وہ آئی۔ اس کا سرخ چہرہ اور تیز سانس بتا رہی تھی کہ وہ بیجان میں تھی اور یقیناً کوئی خاص بات ہوئی تھی۔ اس نے اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ واش روم میں آیا۔ واش روم میں جاتے ہوئے میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیتا تھا تاکہ کوئی اچانک اندر نہ آ سکے۔ شاور چلاتے ہی بانو نے میرے کان میں کہا۔ ”آپ کے جانے کے بعد راج کنور پھر آیا تھا۔“

میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ ”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“

بانو کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ ”وہ ذلیل شخص اس لیے آیا کہ.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ ”آپ جانتے ہیں

ناوہ کیا چاہتا ہے؟“

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ راج کنور کیا چاہتا تھا لیکن مجھے بانو کا انداز اچھا لگا۔ اس نے رونے یا روہانسا ہونے کے بعد بجائے طیش اور تندہی کے ساتھ مجھے بتایا تھا۔ وہ غصے میں تھی اور میں یہی چاہتا تھا۔ وہ اپنی جذباتیت کو کمزوری کے بجائے اپنا ہتھیار بنا لے۔ ”میں سمجھ رہا ہوں وہ کس قسم کا شخص ہے اور کیا کہہ سکتا ہے۔ یہ بتاؤ تم نے کیا جواب دیا؟“

”دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے ہاتھوں سے جواب دوں۔ وہ اکیلا اندر آیا تھا لیکن باہر اس کے چیلے یقیناً موجود تھے۔ اس لیے میں نے صبر سے کام لیا میں نے اسے کہا۔ ”میں اس کے قبضے میں ہوں وہ چاہے تو مجھے زبردستی..... حاصل کر سکتا ہے لیکن اپنی خوشی سے میں مر کر بھی اس کے پاس نہیں آؤں گی۔“

”تم نے بالکل ٹھیک جواب دیا۔ اس کا کیا ردِ عمل تھا۔“

”اس کی صورت بگڑ گئی تھی۔ کہنے لگا کہ میں چاہوں یا نہ چاہوں مجھے اس کی خواہش پوری کرنا ہی پڑے گی۔“

”بانو ابھی وہ اپنے بھائی کی وجہ سے مجبور ہے۔ اس وجہ سے باتوں سے کام نکالنے کی کوشش کر رہا ہے

جب اس پر بھائی کا دباؤ نہیں رہے گا تو وہ طاقت کے استعمال پر اتر آئے گا۔“

”میں کیا کروں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”ڈرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ تمہارے پاس کوئی پنل جیسی لمبی اور نوکیلی چیز ہے۔“

”نہیں ایسی کوئی چیز.....“ وہ کہتے کہتے رکی جیسے اسے کچھ یاد آیا ہو۔ ”ہاں ہوڑے والی سلائی ہے۔ یہ پانچ انچ لمبی اور سخت لکڑی کی بنی ہوئی ہے ایک طرف نوک ہے۔“

”اسے لے کر آؤ۔“

بانو اپنے کمرے سے ہوڑا سلائی لے آئی۔ یہ ایک طرف سے خاصی نوکیلی تھی اگر اسے قوت سے مارا جاتا تو یہ جسم کے نرم حصے میں گھس سکتی تھی۔ جیسے گردن میں۔ اس کے دوسری طرف والا حصہ کسی قدر گول چھوٹے سائز کے اخروٹ جیسا تھا۔ میں نے اخروٹ والا حصہ ہتھیلی میں رکھ کر سلاخ درمیانی انگلی سے نکالی۔ یوں میرے گھونے پر ایک نوکدار ہتھیار کا اضافہ ہو گیا تھا میں نے بانو سے پوچھا۔ ”کیسا ہے۔“

اس نے اشارے سے بتایا کہ بہترین ہے۔ میں نے وار کر کے بتایا کہ اس سے کس طرح کام لیا جاسکتا ہے۔ اسے سمجھایا کہ وہ اسے ہوڑے سے اچانک نکال کر کس طرح سامنے والے کے حلق میں اتار سکتی تھی۔ یہ وار نہ صرف کسی کموت کے گھاٹ اتار سکتا تھا بلکہ اسے مرنے سے پہلے خاموش بھی کر دیتا۔ بانو نے اس کی مشق کی اور خوش نظر آنے لگی اس نے مبہم انداز میں کہا۔ ”یہ بہت زبردست ہے۔“

”بس تو اس کی مشق کرتی رہو۔“

بار بار واداش روم میں جانا راج کنور کو مشکوک کر سکتا تھا اس لیے بانو نے متبادل طریقہ نکالا۔ اس نے اوشا سے رف پیڑ اور پنل حاصل کر لی تھی۔ اب ہم اس سے لکھ کر بات کر سکتے تھے۔ بانو نے مجھ سے اوشا کے بارے میں پوچھا۔ ”وہ کیوں نہیں آرہی ہے؟“

میں نے جواب لکھا۔ ”ممکن ہے راج کنور کے خیال میں وہ ناکام رہی ہو اور اس نے اسے دوبارہ نہ بھیجا ہو۔“

”مجھے گڑبگد رہی ہے۔ راج کنور کا یہاں آنا ٹھیک نہیں ہے۔ فرض کریں وہ کوئی سازش کر جاتا ہے مجھے اور آپ کو نقصان پہنچا دیتا ہے تو اس کا بھائی اسے مار تو نہیں دے گا یا اس سے تعلق ختم نہیں کر لے گا۔“

میں نے تائید کی۔ ”سامنے کی بات ہے بڑے کنور کے لیے بھائی زیادہ اہم ہے۔“

”اس لیے مجھے لگ رہا ہے کوئی گڑبگد ہے ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے۔“

”ہم اس سے زیادہ اور کیا ہوشیار ہو سکتے ہیں؟“

اس نے تجویز دی۔ ”ہمیں اپنے کمروں کے دروازے اندر سے بند رکھنے چاہئیں۔“

”میں ایسا ہی کرتا ہوں۔“

سچی بات ہے میں بھی محسوس کر رہا تھا کہ میرے ارد گرد کچھ زیادہ ہی سناٹا طاری تھا۔ ایسا سناٹا جیسا کہ طوفان آنے سے پہلے ہوتا ہے۔ راج کنور اور اس کے دونوں دست نارا سب یعنی نایک اور رامن میرے حالی دشمن تھے اور وہ بالکل چپ تھے۔ اگر وہ کچھ کر نہیں پارہے تھے تب بھی چھپو تو کر سکتے تھے۔ راج بانو سے باہر کرنے آیا تھا مگر مجھے اس نے نایک سے مقابلے کے بعد بالکل نظر انداز کر رکھا تھا۔ اس بار بھی نصف لیٹر خون

لینے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا تھا میں نے ایکسر سائز معمول کے مطابق کیں اور مجھے کمزوری محسوس نہیں ہوئی تھی۔ البتہ بھوک کچھ زیادہ ہی کل کل کر رہی تھی۔ رات کے کھانے کے لیے ہانوا آئی تو اس نے ریٹیم جیسے کپڑے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ ٹراؤزر نما پا جاے اور کرتے نما شرٹ پر مشتمل تھا لیکن ساتھ میں بڑا سا دوپٹہ تھا۔ وہ رف پیڈ اور پین ساتھ لائی تھی۔ پھلا لکھا ہوا چھادر کرٹلش میں بہاد پتی تھی۔ دل نواز خان کے جانے کے بعد اس نے لکھا۔

”آج آپ کا خون لیا گیا، یہاں کوئی دھوکہ تو نہیں کر رہے ہیں؟“

”بہ ظاہر تو ایسا نہیں لگ رہا ہے کیونکہ میں کمزوری محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ جب کہ ممتاز ہاؤس میں جب میرا کئی گنا زیادہ خون لیا جا رہا تھا تب میں شدت سے کمزوری محسوس کرتا تھا۔“

”پھر بھی آپ حقا طرے گا۔“ اس نے لکھا اور منہ سے بولی۔ ”آج میں نے نیا سوٹ پہنا ہے۔“

”یہ تم پر اچھا بھی لگ رہا ہے۔“ میں نے تعریف کی تو وہ خوش ہو گئی۔ وہ لمبے دیے رہتی تھی لیکن تعریف تو ہر عورت اور لڑکی کو اچھی لگتی ہے۔

”اوشا نہیں آئی کئی دن سے اس سے کچھ کام بھی تھا۔“

”ضروری نہیں ہے وہ آئے اگر تمہیں کام ہو تو گاڑ سے کہہ کر اسے بلا لیا کرو۔“

”کل بلا لوں گی۔ اگر آپ کو کچھ چاہیے تو بتا دیں میں اس سے کہہ دوں گی۔“

”اس سے کہنا کچھ صاف تو لمبے لادے اور ایک ٹائٹ سوٹ مزید منگوا لینا اسی ٹاپ کا ہو۔ یہ میلا ہو گیا ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور ٹائٹ سوٹ نہیں ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں کہہ دوں گی۔“

کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ دل نواز خان برتن لینے آیا تو مجھے نیند آرہی تھی۔ سُستی اور ہلکی سی صحن کا احساس تھا شاید یہ خون دینے کا نتیجہ تھا۔ میں اندر سے دروازہ بند کر کے بستر پر لیٹا اور چند لمبے بعد ہی گہری نیند میں ڈوب گیا تھا۔ مجھے ہلکا سا شبہ بھی نہیں ہوا کہ کھانے میں کوئی چیز شامل تھی جس نے غیر محسوس انداز میں مجھے سونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو ناک میں کسی تیز جیسے والی بو موجود تھی۔ مجھے چھینک آئی اور میں اٹھ بیٹھا۔ فوراً ہی چکر آیا تھا اور کھلی آنکھوں کے سامنے کمرہ ڈولتا ہوا لگا ہوا تھا۔ مگر زور سے سانس لینے پر وہی تیز جھتی بو آئی اور اس نے ایک دم ذہن صاف کر دیا۔ اس بار میں نے واضح انداز میں دیکھا۔ میرے پاس وہی گورکھا گاڑ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی شیشی تھی اور اسی سے وہ جیسے والی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ بو امونیا کی تھی۔ گاڑ میرے ہوش میں آتے ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کے پیچھے اوشا کھڑی تھی۔

”یہ کیا ہے تم اندر کیسے آئے؟“ میں نے سر جھٹک کر کہا۔ مگر گورکھا گاڑ میرے سوال کا جواب دیے بغیر

باہر چلا گیا تھا اور پھر رامن اندر آیا۔

”ہوش آ گیا تمہیں؟“ اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ اب مجھے گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا اتنی رات گئے

گورکھا گاڑ، اوشا اور پھر رامن کا کمرے میں آنا اور مجھے ہوش آنے سے پہلے کانوں کان خبر نہ ہونا کسی بڑی گڑبڑ کی نشاندہی کر رہے تھے۔ یقیناً اس سے پہلے میں بے ہوش تھا۔ میں نے بستر سے اٹھنا چاہا تو رامن نے پستول

نکال لیا اور سخت لہجے میں بولا۔ ”اپنی جگہ بیٹھے رہو۔“

میں واپس بیٹھ گیا اور اوشا کی طرف دیکھا۔ ”اوشا یہ سب کیا ہے؟“

مگر اوشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مخصوص انداز کی ساڑھی میں تھی اور اس کی آنکھیں کسی نامکن کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے جواب نہیں دیا خاموش کھڑی رہی۔ اچانک مجھے بانو کا خیال آیا۔ ”راسن بانو کہاں ہے؟“

”اپنے کمرے میں نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا لہجے میں واضح شرارت تھی۔ اس بار میں اس کی پروا کیے بغیر اٹھا اور بانو کے کمرے تک آیا وہ کمرے میں نہیں تھی میں نے واش روم بھی چیک کر لیا۔ میں واپس کمرے میں آیا تو میری رگوں میں خون کی جگہ کوئی گرم سی چیز دوڑ رہی تھی۔ میں نے راسن سے پوچھا۔

”بانو کہاں ہے؟“

جواب میں اس نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر اسے آن کیا اور پھر ایک چینل لگایا۔ میں اچھل پڑا تھا کیونکہ ایک شاہانہ قسم کے بیڈ روم میں گول جہازی سائز بیڈ پر بانو بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے وہی ریشمی لباس پہنا ہوا تھا جو بغیر دوپٹے کے اس کے جسم کے ساتھ لگ کر اسے نمایاں کر رہا تھا۔ سانسوں کی آمد و رفت کے ساتھ دوپٹا ابھرتا جسم بتا رہا تھا کہ وہ سو رہی ہے یا بے ہوش ہے۔ میری رگوں میں آگ بڑھ رہی تھی۔ میں نے دانت پر دانت جماتے ہوئے پوچھا۔ ”راسن یہ کہاں ہے۔“

”راج جی کے بیڈ روم میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ محفوظ ہے اور صبح تک محفوظ رہے گی اگر تم نے۔۔۔۔۔“

”کیا میں نے۔۔۔۔۔؟“

راسن کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزار لی تو۔۔۔۔۔“



امونیا سو گھنٹے کے باوجود میرے ذہن پر ہلکی سی بے حسی طاری تھی شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے راسن کی بات سمجھنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اوشا کے ساتھ شب باشی کروں۔ میں نے اوشا کی طرف دیکھا وہ بدستور ساکت انداز میں کھڑی تھی۔ تب میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ میں نے اسے آدبزدی۔ ”اوشا یہ سب کیا ہے کیا تم بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو؟“

میرا لہجہ جذباتی تھا مگر اندر سے میں جذباتی نہیں تھا میں صرف اوشا کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا پہلے کی طرح کھڑی رہی۔ اسے کوئی ایسی دوا دی گئی تھی کہ بہ ظاہر جاگ رہی تھی لیکن اس کا ذہن سو رہا تھا۔ راسن نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دے گی۔ ہاں جو تم کہو گے وہ کرے گی۔“

میں نے نظریں جما کر راسن کی طرف دیکھا۔ ”تم اور تمہارا آقا جانتے ہیں کہ وہ مجھ سے کس بات کا مطالبہ کر رہے ہیں؟“

”ہاں جانتے ہیں تب ہی تو کر رہے ہیں۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔ ”راج جی دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم میں زہر برداشت کرنے کی کتنی شکتی ہے۔“

”راج کنور کو اپنے بھائی کا خیال نہیں ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو اس کے علاج کا کیا ہوگا؟“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ ”اپنی اور بانو کی فکر کرو۔ اگر تم نے انکار کیا تو لائیو شو دیکھو گے۔“ اس نے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کر کے شیطانی لہجے میں کہا۔ اس بار بھی میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا تھا۔ ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ پستول کی پروا کیے بغیر اس کا گلا دبا دوں۔ مگر عملی طور پر یہ ممکن نہیں تھا راس کی زہریلے سانپ کی طرح چونکا اور ہوشیار تھا۔ اس کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں۔

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میں راج کنور کی بات مان لوں تو بانو محفوظ رہے گی؟“

”کوئی ضمانت نہیں ہے تمہیں راج جی پر اعتماد کرنا پڑے گا۔“

راج کنور کے بجائے میں کسی زہریلے ناگ پر زیادہ اعتبار کر سکتا تھا۔ مگر میں نے منہ سے نہیں کہا۔ میں نکلتکھ میں پڑ گیا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق راج کنور کھل کر سامنے آ گیا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ میں یوں دنیا سے گزر جاؤں کہ اس کے دامن پر میرے خون کا کوئی داغ نہ آئے۔ اگر میں اوشا کی قربت کی وجہ سے مارا جاتا تو راج کنور آسانی سے اس کا الزام میری ہوس پرستی پر لگا سکتا تھا۔ اوشا اس قابل نہیں تھی کہ حقائق بیان کر سکتی۔ اسے کچھ یا دہی کہاں ہوتا۔ راج کنور بنا کسی الزام کے ایک طرف میرا ہاتھ صاف کر دیتا دوسری طرف بڑا کنور بدستور بیمار رہ کر اس کا محتاج بنا رہتا اور یہی راج کنور کا اصل منصوبہ تھا۔ مجھے مارنا اور اپنی سفاک فطرت کی تسکین ایک ثانوی مقصد تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ آم کے ساتھ ساتھ گھٹلیوں کے دام بھی حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسکرین کی طرف دیکھا۔ بانو کو شاید خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ اگر راج کنور صبح تک اپنا مقصد حاصل کر کے سے واپس کرے میں پہنچا دیتا تو وہ بھی یہی سمجھتی کہ میں نے سفلی جذبات سے مجبور ہو کر اوشا کی قربت اور موت کو قبول کر لیا ہوگا۔

”شبہا ز تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ راس نے کہا۔ ”بس دس منٹ کی مہلت ہے اس کے بعد نوکی عزت نہیں بچے گی۔“

”تم بے غیرت آدمی ہو جس لڑکی پر نظر رکھتے ہو اسے کسی اور کے بستر پر دیکھ سکتے ہو؟“ میں نے اسے لسانے کے انداز میں کہا۔

”میں اس سے کوئی محبت نہیں کرتا ہوں بلکہ نفرت کرتا ہوں۔ ممتاز ہاؤس میں یہ کئی بار میری توہین کر چکی نی وہاں یہ خود کو کچھ سمجھتی تھی لیکن یہاں اسے اپنی اوقات پتا چل جائے گی۔ ہم دیے بھی راج جی کے نوکر ہیں نا کچا کچھا کھاتے ہیں۔“ وہ بے حیائی سے ہنسا۔ ”یہ بھی جھوٹا کھالیں گے۔“

”فرض کرو میں تمہاری بات ماننے سے انکار کرتا ہوں اور بانو کی بے عزتی بھی برداشت کر لیتا ہوں۔“

”تو.....“ وہ گڑبڑا گیا۔ ایسی کسی صورت حال کے بارے میں اس نے سوچا نہیں تھا۔

”اس کے بعد میں بڑے کنور سے تعاون سے بھی انکار کر دوں گا۔ میں بھوک ہڑتال کر دوں گا تو وہ میرا پا کر لے گا۔ اسے میرا خون چاہیے لیکن اس صورت میں اسے میرا چند ہی لیٹر خون ملے گا اور وہ بھی اگر وہ ایک

ساتھ نکلوا لے۔ اس کے علاج کے لیے ایک من خون درکار ہے اور ابھی اس کے پاس مشکل سے اس کا تہائی جمع ہوا ہے۔“

”یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔“ راسن نے سوچ کر کہا۔ ”ابھی تو وہ کرو جو تم سے کہا جا رہا ہے۔“
میں نے اس کی بات اُن سنی کر کے اپنی بات جاری رکھی۔ ”میرا خیال ہے کہ راج اسٹیٹ، اس ہیلز اور تمام کاروبار کا اصل مالک بڑا کنور ہے اور راج کنور صرف بھائی کا طفلیلیہ ہے۔ اگر بڑا کنور غصے میں آگیا تو کیا راج کنور اس کا عتاب برداشت کر سکے گا۔ جب کہ میں اسے بتاؤں گا کہ راج کنور اس کے خلاف سازش کر رہا ہے۔“

”میں یہ سب نہیں جانتا۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ”مجھے جو راج کنور نے کہا ہے میں وہی کروں گا۔“
”ٹھیک ہے میں راضی ہوں۔“ میں نے اوشا کی طرف قدم بڑھایا اور اس سے کہا۔ ”اوشا ساڑھی اتار دو۔“

یہ سنتے ہی وہ مشینی انداز میں حرکت میں آئی تھی اور اس نے ساڑھی کا پلو ہٹا دیا۔ حسب معمول اس نے ساڑھی کے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ پلو گرانے کے بعد پھر کسی ترائے جیسے کی طرح ساکت کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ پوز ایسا نہیں تھا جسے کوئی مرد نظر انداز کر سکتا۔ راسن کی نظر بے ساختہ اس کی طرف گئی تھی اور میں اسی موقع کا فہتر تھا میں نے قالین پر گرتے ہوئے رول کیا اور راسن کے نزدیک آتے ہوئے دایاں پاؤں گھمایا۔ اس نے بچنے کی کوشش کی لیکن میری ٹھوکر اس کی کبھی پر لگ گئی تھی۔ وار زوردار تھا اس کے منہ سے چیخ کے ساتھ گالی نکل۔ مگر پستول نہیں نکلا تھا۔ البتہ تکلیف نے اس کا بازو بے کار کر دیا تھا۔ میں نے قالین پر ہی سیدھا ہوتے ہوئے اس کے گھٹنے پر وار کیا۔ اگر یہ ٹھیک طرح سے لگتا تو اس کا گھٹنا ٹوٹ جاتا۔ مگر اس بار بھی وہ وار بچا گیا۔ میری ایڑی اس کے گھوٹے گھٹنے کے پہلو میں لگی اور پاؤں مڑنے سے وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ اس بار بھی اسے چوٹ آئی تھی۔ پستول والا ہاتھ میری طرف تھا اور اب وہ اپنی تکلیف پر قابو پا چکا تھا اس نے بلا تکلف گولی چلا دی۔

مگر میں اس کا اس کا ارادہ بھانپ کر میں پہلے ہی اٹھ گیا تھا۔ گولی میرے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان بننے والے خلا سے گزری تھی۔ کمرے کی محد و فضا دھماکے سے گونج اٹھی تھی۔ میں اچھلا اور پشت کے بل اس پر گرا تھا۔ وہ اٹھ رہا تھا۔ میرے وزن نے اسے دوبارہ زمین چٹا دی۔ اس کا منہ قالین پر لگا۔ اسی وجہ سے اس کا منہ ناک ایک ہوتے ہوئے رہ گیا تھا لیکن اسے دن میں تارے یقیناً نظر آ گئے ہوں گے لیکن یہ خیال میری غلط فہمی تھی اسے معمولی چوٹ آئی تھی اور اس نے جھٹکا دے کر مجھے اچھالنا چاہا تھا۔ میں اچھلا اور دوبارہ اس پر گرا۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح اس سے پستول حاصل کر لوں۔ دوسری طرف وہ مجھے نشانہ بنانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اس نے جس طرح گولی چلائی تھی۔ صاف لگ رہا تھا وہ ذہنی طور پر مجھے شوٹ کرنے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا اور یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ راج کنور اس کمرے میں ہونے والی مکملش اور ہنگامے سے واقف تھا۔ فائر کی آواز کہاں تک گئی تھی اور جلد کون سی بلا حریہ نازل ہونے والی تھی۔ ان سب باتوں کو ذہن سے نکال کر میں راسن کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

راسن آسان آدو نہیں تھا وہ تربیت یافتہ لڑاکا تھا۔ اوندھے منہ پڑے ہونے کی وجہ سے وہ پستول کو اوپر

کر کے میرے خلاف استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ مجھے اپنے اوپر سے جھکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں کہنی سے اس کے پستول والے بازو پر وار کر رہا تھا۔ ہر وار پر اس کی کراہ نکل رہی تھی لیکن وہ پستول چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پھر میں نے سر اس کے سر پر مارا۔ اس کا سر قالین سے لگا۔ اس بار اس کا جسم ڈھیلا ہوا تھا۔ میں نے دوسری بار وار کرنے کے لیے سراہہ پر کیا تھا۔ میری توجہ اسے دبائے رکھنے سے ذرا چوکی اور اس نے اچانک خود کو پوری قوت سے جھٹکا دیا۔ وہ مجھے دھوکا دینے میں کامیاب رہا تھا۔ میں بے ساختہ اچھلتا ہوا قالین پر گرا اور وہ تڑپ کر مجھ سے دور ہو گیا۔ اس نے اٹھتے ہوئے پستول میری طرف کیا۔ میں قالین سے اٹھتے اٹھتے رک گیا۔

میں نے ایک جوا کھلا تھا۔ اوشا کی مدد سے رامن کی توجہ بھٹکا کر اس پر قابو پانے کی کوشش کی تھی ایک بار میں اس سے پستول حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اسے مجبور کر کے اپنی اور بانو کی آزادی کے لیے مجبور کر سکتا تھا۔ مگر وہ میری توقع سے زیادہ سخت جان ثابت ہوا تھا۔ یہ مختصر بازی جیت لینے پر رامن بھی ایک انداز میں مسکرایا۔ اس کی ہانچوں سے خون برس رہا تھا اور ماتھے پر بھی نیل کا نشان آ گیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں سفاکی اور اس کے اندر کی درندگی نمایاں ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ذرا ہلے اور سر گوشی نما آواز آئی۔ ”گڈ بائی مسٹر شہباز۔“

میرا جسم اکڑ گیا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے سے نشانہ خطا ہونے کا امکان کم تھا لیکن اس سے پہلے وہ گولی چلاتا۔ اچانک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور فشی دل جی نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لیکن مہلک پستول تھا۔ اس نے آتے ہی کڑک کر کہا۔ ”رامن خبردار.....“

رامن رک گیا تھا۔ اس کے پستول کا رخ میری طرف ہی تھا اور اسے گولی چلانے میں سینکڑا دوسواں حصہ لگتا۔ فشی جی نے پستول کی نال اس کے سر سے لگادی اور سر دلچھے میں بولے۔ ”کیا تم مرنا چاہتے ہو؟“

رامن مرنا نہیں چاہتا تھا اس نے پستول والا ہاتھ نیچے کر لیا اور فوراً ہی فشی جی نے اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور غرا کر بولے۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔ ”اس نے مجھے غصہ دلایا اور مجھ پر حملہ کیا میں اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔“

”بکواس کرتا ہے یہ شخص۔“ میں نے ٹی دی اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو پوری بات بتاؤں گا لیکن پہلے آپ بانو کو بچائیں۔ وہ اس وقت راج کنور کے بیڈروم میں ہے اور اس کی عزت اور جان کو خطرہ ہے۔“

فشی جی نے ایک نظری دی اسکرین کی طرف دیکھا اور لباس سے ایک واک ٹاک نکال کر کسی سے جیمی آواز میں بات کرنے لگا۔ رامن مجھے کینہ تو ز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اوشا ویسے ہی کسی حسین مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کی ساڑھی کا پلو بدستور چھلکا ہوا تھا۔ میں نے اس کا لباس ٹھیک کیا تب بھی اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا لیکن وہ کسی قدر ہوش میں تھی تبھی اس نے میرے حکم پر فوری عمل بھی کیا تھا۔ واک ٹاک پر بات کر کے فشی جی نے رامن سے کہا۔ ”یہاں سے چلو۔“

”فشی جی.....“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹی۔

”شہباز جی آپ ذرا صبر سے کام لیں بانو کچھ دیر میں واپس آ جائے گی۔“

”اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔“ میں نے دیوار میں لگنے والی گولی کی طرف اشارہ کیا۔
 ”گولی کا یہ نشان ثبوت ہے اور یہ سازش اصل میں بڑے کنور کے خلاف ہو رہی ہے۔“
 ”ہم سب دیکھ لیں گے، آپ یہیں رہیں۔ اسے بھی یہیں روک کر رکھیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیں
 جب تک میری آواز نہ سنیں دروازہ مت کھولے گا۔“

مجھے ہدایت دے کر نشی جی رامن کو لے کر چلے گئے۔ میں نے گہری سانس لی اور خود کو پُر سکون کرنے کی
 کوشش کرنے لگا۔ پھر میں نے دروازے اندر سے بند کیے۔ اوشا ابھی تک خاموش کھڑی تھی۔ وہ زہریلی لڑکی تھی
 اور نہ جانے اسے کون سی دوا استعمال کرائی گئی تھی جس کے زیر اثر وہ دوسرے کی ہر بات پر عمل کر رہی تھی۔ میں
 نے ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا۔ ابھی تک اس میں بانو کے علاوہ کوئی اور فرد دکھائی نہیں دیا تھا ویسے رامن کی
 دی ہوئی دس منٹ کی مہلت پوری نہیں ہوئی تھی۔ ایک منٹ بعد اچانک اسکرین تاریک ہو گئی۔ میں نے جلدی
 سے ریموٹ اٹھا کر چینل چیک کیے۔ دوسرے چینل آرہے تھے صرف اسی چینل پر اسکرین تاریک ہوئی تھی۔ اس
 کا مطلب تھا کہ دوسری طرف سے کوئی کارروائی ہوئی تھی اور کمرہ جو ویڈیو نشر کر رہا تھا وہ بند کر دیا گیا تھا۔ میں
 مضطرب ہو گیا۔ اگر یہ راج کنور کی کارروائی تھی تو وہ رامن کی ناکامی سے آگاہ ہو گیا تھا اور اب بانو کے خلاف
 کچھ کرنے جا رہا تھا۔ کیونکہ اس کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا اس لیے کمرہ آن رکھنا بھی لازمی نہیں تھا۔

مجھے راج کنور کی جانب سے خطرہ تو تھا لیکن اس کی یہ حرکت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ مجھے
 اس طرح سے مجبور کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کا اصل مقصد بڑے کنور کو علاج سے محروم کرنا تھا اور ثانوی
 مقصد میرا خاتمہ تھا۔ بانو اسے بولس میں ملتی۔ یوں وہ ایک تیر سے کئی شکار کرتا۔ اس نے پہلے اوشا کو بھیج کر اپنا
 مقصد حاصل کرنا چاہا اور اس میں ناکامی کے بعد وہ راست اقدام پر اتر آیا جسے کسی صورت راست قدم نہیں کہا جا
 سکتا تھا۔ اوپری طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود راج کنور ذاتی طور پر گھنیا کردار کا مالک تھا۔ اس سے ایسے ہی کام
 کی توقع کی جاسکتی تھی۔ میں اوشا کے پاس آیا۔ ”اوشا میری بات سن رہی ہو؟“

اس نے جواب میں صرف سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ ”تمہیں یہاں کون لایا ہے؟“

اس سوال پر وہ ساکت رہی۔ صرف اسی سوال پر نہیں بلکہ میری طرف سے پوچھے گئے ہر سوال پر اس کا
 ایک ہی جواب تھا۔ البتہ جب میں اسے کچھ کرنے کو کہتا تو وہ فوری عمل کرتی تھی۔ گویا اس کا ذہن صرف احکامات
 پر عمل کی حد تک فعال تھا ورنہ اس کا شعور گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ یہاں کیسے آئی اور اسے
 کون لایا تھا؟ مجھے یقین تھا کہ جاگنے کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہے گا۔ نشی جی کو گئے ہوئے آدھے گھنٹے سے
 زیادہ کا وقت گزر چکا تھا لیکن ابھی تک بانو کی واپسی کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ بے چین ہو کر میں نے دروازہ
 کھولنا چاہا لیکن وہ باہر سے بند لکھا۔ بانو کے کمرے کا دروازہ بھی باہر سے بند تھا۔ جب کہ پہلے یہ دروازے بند
 نہیں ہوتے تھے۔ یقیناً یہ ابھی بند کیے گئے تھے اور ایسا نشی جی کی ہدایت پر کیا تھا۔ مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ میں باہر
 نہ نکلنے پاؤں۔ میں نے دروازہ بجایا اور چلا کر کہا۔

”کوئی ہے۔“

”آرام سے بیٹھو۔“ باہر سے کوئی بولا۔ یہ گورکھا گارڈ کی آواز نہیں تھی جو ہمارے کمرے کے باہر پہرہ دیتا

تھا۔

”نشی دل جی کہاں ہے؟“

”ہم کو نہیں معلوم آرام سے بیٹھو۔“ اس نے پھر کہا۔

”آرام کے بیچ، جلدی سے نشی جی کو بلاؤ ورنہ میں تمہارا دماغ خراب کر دوں گا۔“

وہ میری دھمکی کو محض دھمکی سمجھا تھا لیکن جب میں نے چار کلو گرام وزنی ڈمبل سے دروازہ بجانا شروع کیا تو وہ بوکھلا گیا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“ اس نے چلا کر کہا۔

”آرام کر رہا ہوں۔“ میں نے ہاتھ روک کر زہریلے لہجے میں کہا۔ ”میں اسی طرح آرام کرتا ہوں۔ اب جب تک نشی جی نہیں آتے میں دروازہ بجاتا رہوں گا ہو سکتا ہے دروازہ ٹوٹ جائے۔“

ٹھیک۔ ہے دروازہ مضبوط تھا لیکن چار کلو گرام وزنی ڈمبل کی مسلسل ضربوں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات باہر موجود آدمی بھی سمجھتا تھا اس لیے اس نے مجبوراً نشی جی سے رابطہ کیا تھا۔ چند منٹ بعد ہی نشی جی کی آواز سنائی دی۔ ”شہباز جی، آپ کیا کر رہے ہیں۔“

”پون گھنٹے کا وقت گزر گیا ہے اور بانو اب تک نہیں آئی ہے۔ نشی جی کیا اسے شملہ سے لانا ہے؟“

”وہ ہمیں موجود ہے۔“ نشی جی نے کہا۔ ”محفوظ ہے بڑے کنور معاملہ سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”وہ جتنی جلدی معاملہ سلجھا لیں اتنا اچھا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تاخیر سے صرف بڑے کنور کو نقصان ہوگا۔ ان کو میرا ایک قطرہ خون نہیں ملے گا۔“

یہ دھمکی نہیں تھی میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر بانو کو ذرا بھی نقصان ہوا تو اب یہ لوگ مجھ سے خون حاصل نہیں کر سکیں گے۔ نشی جی سے بات کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور بانو نشی جی کے ساتھ اندر آئی تھی۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی اور وہ لڑکھڑاہی تھی مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے آگے آئی تو گرنے لگی تھی میں نے بروقت اسے تھام لیا۔ اس نے سسٹ لہجے میں کہا۔ ”شہباز..... آپ..... میں یہاں سے کیسے گئی؟“

”یہ سازش ہے میں تمہیں آرام سے بتاؤں گا یہ بتاؤ کہ اس وقت کیسا محسوس کر رہی ہو؟“

”ٹھیک ہوں، مجھے کوئی بودالی چیز سونگھائی تھی جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی اور کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔“

پھر نشی جی مجھے لے کر یہاں آئے۔

”شہباز جی دیکھ لیں یہ بالکل ٹھیک ہے۔“ نشی جی بولے۔

”میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ اسے لے جائیں اسے بھی کوئی دوا دی گئی ہے۔“ میں نے اوشا کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کا معائنہ کرائیں۔ میں ذرا بانو سے بات کر لوں اس کے بعد میں بڑے کنور سے بات کرنا چاہوں گا۔“

نشی جی نے میری بات پر غور کیا۔ ”کیا یہ ضروری ہے؟“

”سمجھ لیں زندگی اور موت جتنا ضروری ہے۔“

نشی جی نے سر ہلایا اور اوشا کا بازو تھام کر رخصت ہو گئے۔ میں بانو کو سہارا دے کر اس کے کمرے تک لایا۔ پانی پی کر اس کی حالت کسی قدر سنبھل گئی تھی۔ میں نے اسے کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ راج کنور نے میرے خلاف کیا سازش کی تھی اور میں نے کس طرح اسے ناکام بنایا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے بھرائی

آواز میں کہا۔ ”میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ ان لوگوں کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ راج کنور مجھ سے کسی مقصد کے تحت ملا تھا۔“

”بانو ہم ان کے قیدی ہیں۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اب تک بچے ہوئے ہیں۔ میری جان اور تمہاری عزت محفوظ ہے لیکن ہمیں ہر صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“

اس نے بھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”آپ کا مطلب ہے اگلی بار یہ کامیاب بھی ہو سکتے ہیں؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”میں نے کہا تاہم ان کے قبضے میں ہیں۔“

اس کا دہ پتہ یہاں نہیں تھا شاید جب اسے لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں کہیں رہ گیا ہوگا۔ کچھ عرصے میں اس کی جراثمت میں بھی فرق آیا تھا اور پہلے والے لباس اسے تنگ ہونے لگے تھے۔ اسی لیے وہ میرے سامنے جھینپ رہی تھی اس کی کیفیت محسوس کر کے میں اٹھنے لگا تو اس نے سبے انداز میں کہا۔ ”مجھے اکیلے رہنے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔“

”بانو حوصلہ کرو۔ میرے ساتھ ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑے گا۔ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہوگا اس لیے اس سے دعا کرو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ویسے بھی مجھے شاید کچھ دیر میں بڑے کنور کی طرف سے بلاوا آجائے۔“

”آپ اس سے کیا بات کریں گے؟“

”دیکھو آکر بتاؤں گا۔“ میں نے ٹالنے کے انداز میں کہا تو وہ سمجھ گئی کہ میں مائیک کی وجہ سے کھل کر نہیں کہہ سکتا۔ اس نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے میں آرام کرتی ہوں۔ اب بھی میرا سر گھوم رہا ہے پتا نہیں کون سی دوا دی تھی ان لوگوں نے۔“

میں اپنے کمرے میں آیا۔ میری غنودگی غائب ہو گئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو میری جسمانی مضبوطی تھی کوئی دوا مجھ پر زیادہ دیر اثر نہیں کرتی تھی اور دوسری وجہ حالات تھے جنہوں نے نیند آزادی تھی۔ اگر میں راسن پر حاوی نہ ہوتا تو اس سے آگے نہ جانے کیا ہوتا۔ اگر میں راج کنور کا مطالبہ پورا نہ کرتا تو بانو کی عزت نہ بچتی اور اگر پورا کر دیتا تو جان سے جاتا یا نہ جاتا لیکن اس کے بعد ساری عمر خود سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہتا۔ راسن پر حملے کے وقت میرا خیال تھا کہ وہ مجھے قتل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا صرف اپنا بچاؤ کرے گا لیکن اس نے جس طرح مجھ پر گولی چلائی اس سے اس کے عزائم بالکل واضح تھے۔ اگر نشی جی پر دقت نہ آتے تو وہ مجھے شوٹ کر چکا ہوتا۔ اصل بات راج کنور کے میرے بارے میں عزائم نہیں تھے۔ میرے لیے پریشانی کا اصل سبب اس کا بڑے کنور کو نظر انداز کرنا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں بڑے کنور کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہوں۔ میرا خون اس کے علاج کے لیے لازمی ہے اس کے باوجود وہ مجھے جان سے مارنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

مجھے یقین کی حد تک شبہ ہونے لگا تھا کہ راج کنور کا اصل مقصد بڑے کنور کو صحت یابی سے روکنا تھا۔ وہ ٹھیک ہو جاتا تو اسٹیٹ اس کے ہاتھ میں آ جاتی۔ فی الحال سارے معاملات راج کنور دیکھ رہا تھا اور بڑا کنور اس پر انحصار کرنے پر مجبور تھا۔ یہ اقتدار کا کھیل ہے جو ہمیشہ سے کھیلا جاتا رہا ہے اس میں اصل اہمیت اقتدار کی ہوتی

ہے۔ خون کے رشتوں کی اہمیت چالوی ہوتی ہے۔ مجھے بڑے کنور سے کوئی ہوردی نہیں تھی بلکہ دیکھا جائے تو میری اصل دشمنی اسی سے تھی اور وہی مجھ پر آنے والی اس افتاد کی اصل وجہ تھا۔ وہ میرا خون اپنے مقصد کے لیے حاصل کر رہا تھا اور مجھے ایک فیصد بھی شہ نہیں تھا کہ اپنا کام نکلوانے کے بعد وہ اپنے وعدے سے مکر جائے گا۔ یہ لوگ سرے سے اخلاقیات کے قائل ہی نہیں تھے۔ ان کے نزدیک صرف اپنے مفاد کی اہمیت تھی۔ بڑے کنور کا مفاد مجھ سے تھا اس لیے میں بڑا سائل قید خانے میں تھا اور وہ میری ہر بات ماننے پر مجبور تھا۔ اب تک میں اس کے دباؤ میں تھا کیونکہ اس نے وعدہ کیا ہوا تھا کہ میری اور بالو کی حفاظت کرے گا اور پھر بالو کو بحفاظت مہاں ممتاز کے پاس بھجوادے گا لیکن راج کنور کی حرکت نے صورت حال کو بدل دیا تھا۔ اگرچہ یہ اچھا نہیں ہوا تھا لیکن مجھے اس سے ایک خیال سوچا تھا اور میں کوشش کرتا تو اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

میں کمرے میں بیٹھتے ہوئے غور کر رہا تھا کہ مجھے بڑے کنور سے کس طرح بات کرنی چاہیے۔ معاملات پُر سکون چلتے چلتے اچانک اٹھل پھل ہو گئے تھے۔ میں اس اونچ نیچ سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک خیال میرے ذہن میں واضح ہو رہا تھا۔ سات بجے میں نے معمول کی ایکسر سائز کی بالو بھی اٹھ کر آگئی تھی۔ اس نے میرا ساتھ دیا پھر ہم نے لڑائی کی مشق کی۔ نہ جانے حالات کی بات تھی یا بالو میں اس کی فطری صلاحیت تھی وہ دن بدن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ میں جو وار اسے سکھاتا۔ وہ ایک دو دن میں اس میں مہارت حاصل کر لیتی تھی۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو حیدر آبادی فراک پا جامہ میں وہ نازک اندام و شیرہ نظر آئی تھی اور درحقیقت وہ نازک اندام تھی۔ مگر اب اس کی نزاکت مضبوطی میں بدل گئی تھی۔ مگر اس سے اس کی دلکشی میں فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کسی بھی قسم کی لڑائی میں جسمانی قوت اور لڑنے میں مہارت سے پہلے نمبر آپ کی دماغی مضبوطی اور تکلیف برداشت کرنے کی صلاحیت کا آتا ہے۔ بہت سے اچھے لڑنے والے اس لیے مات کھا جاتے ہیں کہ وہ دماغی طور پر مضبوط نہیں ہوتے جلد گھبرا جاتے ہیں اور مشکل کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ دوسرے جب تک آپ زخم اور اس کی تکلیف برداشت کرنا نہیں سیکھ لیتے آپ اچھے لڑنے والے نہیں بن سکتے ہیں۔“

وہ چیخ بیک کے ساتھ کلک اور باکنگ کی مشق کر رہی تھی اس نے ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے مجھے مار کھانے کی عادت بھی ڈالنا ہوگی؟“

”بالکل کوئی اس کے بغیر ماہر نہیں بنتا ہے۔ لڑائی کا اصل فن مار کھا کر بھی کھڑے رہنا ہے۔“

ہمارے پاس باکنگ گلوڑ اور سر پر چوٹ سے بچاؤ کے مخصوص ہیلمٹ بھی تھے۔ بالو اور میں نے گلوڑ و ہیلمٹ پہنے اور مد مقابل آگئے۔ میں نے پنجوں کے بل اچھلتے ہوئے کہا۔ ”مقابلہ کرتے وقت اپنا عورت پن بھول جایا کرو۔ اپنی ساری توجہ صرف ایک چیز پر مرکوز رکھو کہ تمہیں اپنے حریف پر حاوی آنا ہے۔“

”میں سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔

میں نے اچانک اس کے جسم کے ایک نازک مقام پر پھینچ مارا۔ وہ گڑبڑائی تو میں نے بازو سے پکڑ کر اپنی کمرے گھماتے ہوئے زمین پر پھینچ دیا۔ میں نے قوت کم رکھی تھی اس کے باوجود اسے خاصی چوٹ آئی۔ ”تم نہیں سمجھیں۔ میں نے پھینچ مارا تو تم لڑنا بھول گئیں اور میں نے تمہیں با آسانی زیر کر لیا۔“

اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا لیکن وہ پھرتی سے اٹھی اور بچوں کے بل اچھلتے ہوئے دوبارہ لڑنے کے لیے تیار ہو گئی۔ یہ بائسنگ سے زیادہ فری اسٹائل تھائی لگک بائسنگ تھی۔ جو بائسنگ سے کہیں زیادہ مشکل اور خطرناک فن ہے کیونکہ اس میں ہاتھوں سے زیادہ پیر استعمال ہوتے ہیں اور پیروں کی ضرب کہیں زیادہ سخت اور قوت والی ہوتی ہے۔ دس منٹ کی لڑائی میں بانو کا حشر ہو گیا تھا۔ وہ لڑکھڑا رہی تھی اور اس کے لیے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی خاصی مرمت لگا دی تھی لیکن اس کا حوصلہ قابلِ تعریف تھا وہ اب تک ڈٹی ہوئی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر ایسی ضربیں لگانے سے گریز کیا تھا جس سے اسے خون یا نیل والی چوٹ آئے۔ ناک اور منہ کے کھلے حصوں کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ دس منٹ بعد میں نے ہاتھ روک لیے۔

”بس آج کے لیے اتنا کافی ہے۔“

وہ صوفے پر ٹپک کر ہانپنے لگی۔ ”شکر ہے ورنہ مجھے لگ رہا تھا آپ مجھے بے ہوش کر کے چھوڑیں گے۔ قسم سے جسم ٹوٹ رہا ہے۔“

میں نے مشورہ دیا۔ ”جا کر گرم پانی سے غسل کر لو ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے خود واش روم کا رخ کیا۔ نہا کر واپس آیا تو ناشتہ آچکا تھا۔ بانو لگا رہی تھی۔ میں نے اشارے سے بانو سے کہا کہ وہ پہلے کھائے۔ اس نے پہلے کھایا۔ میں اس کا معائنہ کرتا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد بھی جب وہ پوری طرح چاک و چوبند رہی تو میں نے مطمئن ہو کر خود بھی ناشتہ کیا۔ بانو نے تسلیم کیا کہ گرم پانی سے غسل کر کے وہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”درود کو نظر انداز مت کرو اسے اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھ لو کہ اب تمہیں اس کے ساتھ گزارا کرنا ہے۔ شام کو ایک سیشن اور ہوگا۔“

”آپ نے تو مجھے خوفزدہ کر دیا ہے۔“

”ڈرومت اس سے لطف لو۔ دیکھو دنیا میں جب تک کسی کام میں لطف حاصل نہیں کر دو گی تم اس میں کمال حاصل نہیں کر سکتیں۔“

”مار کھانے میں کمال۔“

”ہاں مار کھانے میں کمال ہی انسان کو بچاتا ہے۔ یہ فطرت کا اصول ہے وہی جاندار باقی رہتے ہیں جو نئی برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ہر طرح کے حالات میں گزارا کر لیتے ہیں۔ کروڑوں سال پہلے ڈائنا سوریجس عظیم الجثہ جانور مٹ گئے تھے لیکن لال بیک جیسا کمزور کیڑا ماہرین کے مطابق دو ارب سال سے اس زمین پر موجود ہے۔ کیونکہ اس میں ماساعد حالات برداشت کرنے بے پناہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔“

”آپ مجھے لال بیک بننے کا مشورہ دے رہے ہیں۔“ اس نے شکوہ کیا۔ میں مسکرایا۔

”یہی سمجھ لو کہ اسی میں بقاء ہے۔“

میرا خیال تھا کہ جلد نہ سہی بڑا کنور کچھ دیر سے مجھے طلب کر لے گا کیونکہ میں نے نشی جی سے واضح پیغام بھجوایا تھا لیکن اس سارے دن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا یعنی مجھے طلب نہیں کیا گیا تھا۔ اس شام ہالو سے دوسری باؤٹ ہوئی اس بار بھی میں نے ہاتھ ہلکا رکھا تھا اور اس نے جم کر مقابلہ کیا۔ وہ پوری قوت سے حملے کر رہی تھی کیونکہ میں نے اسے کہا تھا۔ کئی کامیاب وار کیے مگر زیادہ تر مار ہی کھائی۔ میں ہاتھ ہلکا رکھتا تھا مگر جان

بو جھ کر اس کی نوا نیت کو نشانہ بناتا۔ وہ گڑ بڑا جاتی لیکن جلد سنبھل بھی جاتی۔ وہ میرا مقصد جان گئی تھی اس لیے خود کو ذہنی طور پر اس چیز کے لیے تیار کر رہی تھی کہ جب وہ کسی کے مد مقابل آئے گی تو وہ اس کے جسم کے کمزور حصوں کو نشانہ بنانے کی پوری کوشش کرے گا اس لیے اسے پہلے سے تیار رہنا چاہیے۔ اس سے لڑتے ہوئے میں خود دس منٹ میں پسینے پسینے ہو گیا تھا اور سانس بھی کسی قدر پھول گیا تھا۔ ایک سرساز کرنا الگ بات تھی اور کسی سے مقابلہ کرنا الگ۔ گھنوں ایک سرساز سے مجھے اتنی تھکن نہیں ہوتی تھی۔ جتنی اس دس منٹ کے نمائشی مقابلے سے ہو جاتی تھی۔ یہ مشق صرف بانو کے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی مفید ثابت ہو رہی تھی۔ صبح کی مشق کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے تھکایا زیادہ تھا لیکن چونیں کم لگائی تھیں اس کے باوجود اس کا برا حال تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی کے لیے میں نے بھی کچھ ہائے دائے کی اور بولا۔ ”لگتا ہے آج مجھے بھی گرم پانی سے ہاتھ لینا پڑے گا۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”اس کا مطلب ہے اس بار میں نے اچھا مقابلہ کیا ہے۔“

”ہر بار پہلے سے بہتر ہوتی جا رہی ہو۔“ میں نے داش روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ یہ حقیقت بھی تھی۔ اگلے روز جب ناشتہ آیا تو میں نے پوری بھوک کے باوجود اپنی اصل خوراک کا صرف ایک تہائی کھایا تھا۔ بانو حیران ہوئی۔ اس نے تشویش سے پوچھا۔

”بس اتنا سا؟ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔“

”تب اتنا سا کیوں کھایا ہے؟“

”بس آج سے میں اتنا ہی کھاؤں گا۔“ میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”میں اپنا خون اتار رکھوں گا کہ خود زندہ رہ سکوں۔ اب میں کسی اور کو خون نہیں دوں گا۔“

بانو میرا مقصد سمجھ گئی۔ خود اس نے ڈٹ کر کھایا تھا۔ صرف دو بار جسمانی مقابلہ کرنے سے اس کی بھوک بڑھ گئی تھی۔ ماہرین کہتے ہیں جس کام میں انسانی ذہن کا سوچنے والا حصہ شامل نہ ہو وہ کتنی بار اور کتنا زیادہ کیا جائے انسانی جسم جلد اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے معمول کے مطابق لیتا ہے۔ جیسے ایک سرساز کتنی کر لی جائے اس کا فائدہ ایک حد تک ہوتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب زیادہ ورزش کرنے سے بھی آپ کا جسم مزید مضبوط اور طاقتور نہیں ہوتا ہے۔ مگر کسی دوسرے سے مقابلہ مختلف چیز ہوتی ہے اس میں انسان کا ذہن استعمال ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ گھنوں کی ورزش بھی ہم پر وہ اثر نہیں ڈالتی تھی جو دس منٹ کا مقابلہ ڈالتا تھا۔ یہ کلیہ صرف جسمانی کاموں پر ہی نہیں بلکہ ذہنی کاموں پر بھی صادق آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک برس مطالعہ کرنے سے بہتر ہے آدمی ایک گھنہ کسی عالم کی صحبت میں گزارے کیونکہ عالم سے بات کرتے ہوئے انسان کا دماغ استعمال ہوتا ہے اور مطالعے سے صرف معلومات جمع کرنے والا حصہ کام کرتا ہے۔

جیسے کمپیوٹر میں اس کا سب سے چھوٹا پرزہ یعنی پروسیسر سب سے زیادہ توانائی استعمال کرتا ہے کیونکہ وہ اس کا سوچنے والا حصہ ہے اسی طرح انسانی دماغ کا سوچنے والا حصہ سب سے زیادہ توانائی استعمال کرتا ہے۔ دیے بھی عام آدمی کا دماغ کل توانائی کا بیس فیصد استعمال کرتا ہے۔ جو زیادہ دماغ استعمال کرتے ہیں ان کا دماغ اس سے زیادہ ہی توانائی استعمال کرتا ہوگا۔ عام طور سے لوگ دماغی کام کرنے والوں کو سست اور جسمانی

لحاظ سے کمزور سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ جسمانی کام کرنے والوں سے زیادہ توانائی استعمال کرتے ہیں۔ انسانی زندگی اور صحت کا دار و مدار ہی توانائی کے حصول اور اسے سو فیصد خرچ کرنے پر ہے۔ جو لوگ زیادہ کھاتے اور کم توانائی خرچ کرتے ہیں وہ بالآخر بیمار یوں کا شکار ہوتے ہیں اور قبل از وقت دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ بانو نے کہا۔

”آپ نہ کھائیں لیکن مجھے تو آج معمول سے زیادہ بھوک لگ رہی ہے۔“

”تم کھاؤ کیونکہ تمہارے خون سے کسی کو کوئی سروکار نہیں ہے۔“

کچھ دیر میں دل نواز خان آکر برتن لے گیا۔ اب وہ محتاط رہتا تھا اور اپنے تاثرات پر قابو رکھتا تھا۔ اس کے دل میں کیا تھا اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے سمجھا دیا تھا کہ اس کے ذاتی خیالات کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی اور دوسرے وہ مسلمان سہی لیکن میرے بدترین دشمنوں کا نوکر تھا۔ اس لیے وہ ان ہی کی صف میں شامل تھا۔ کم کھانے کے باوجود میں نے معمول کی ورزش کی تھی۔ دوپہر میں بھی اسی طرح کھایا اور نتیجے میں پیٹ فریاد کرتا رہ گیا لیکن میں نے فی الحال اس کی فریاد پر توجہ نہیں دی۔ انسان بہت پیٹ کے کہنے پر چلنا ہے کبھی پیٹ کو بھی انسان کے کہنے پر عمل کرنا چاہیے۔ میرے پیٹ کے ساتھ ساتھ بانو کو بھی تشویش ہو رہی تھی اس نے آہستہ سے کہا۔

”اس طرح آپ کمزور ہو جائیں گے۔“

”ہاں لیکن مروں گا نہیں، البتہ خون دینے کے قابل بھی نہیں رہوں گا۔“

اس نے خدشہ ظاہر کیا۔ ”یہ کوئی دوسرا حربہ استعمال کر سکتے ہیں آپ کا خون لینے کے لیے۔“

”تم فکر مت کرو وہ زبردستی نہیں کر سکتے۔ وہ جانتے ہیں اس کا نتیجہ نہیں نکلے گا۔ انہیں میرا خون مخصوص

مقدار میں میری مرضی سے ہی مل سکتا ہے۔“

شام کی ایکسر سائز اور مقابلے میں ہی مجھے فرق محسوس ہونے لگا تھا۔ میں جلد تھک رہا تھا اور سانس بھی پھول رہی تھی۔ اس بار بانو حاوی رہی تھی میں اسے اتنی ضربیں نہیں لگا سکا تھا جتنی کہ گزشتہ روز مقابلوں میں لگا لی تھیں۔ وہ سیلف ڈیفنس۔ یہ طریقے بھی تیزی سے سیکھ رہی تھی۔ مقابلے کے بعد جب میں ہانپ رہا تھا تو اس نے رف پیڈ پر لکھا۔ ”آپ ٹھیک نہیں کر رہے ہیں اس طرح کمزور ہو کر آپ دشمن کا فائدہ کر رہے ہیں۔“

”یہ ضروری ہے۔ تم فکر مت کرو میں ایک حد سے زیادہ کمزور نہیں ہوں گا اور ابھی تو کم خوراک کا آغاز ہے

اس لیے کمزوری محسوس ہو رہی ہے جلد میرا جسم اس کا عادی ہو جائے گا۔“

”آپ ٹھیک سے کھائیں لیکن ان پر یہی ظاہر کریں کہ آپ کم کھا رہے ہیں۔“

میں نے نفی میں سر ہلا کر لکھا۔ ”وہ اس طرح دھوکا نہیں کھائیں گے۔ بھیجے جانے والے اور بچنے والے

کھانوں کی مقدار کا حساب رکھا جاتا ہوگا اس سے انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں انہیں دھوکا دے رہا ہوں۔“

”پھر بھی آپ کچھ تو خوراک بڑھائیں۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”میں اپنی خوراک کم کر دیتی ہوں۔“

”نہیں میں ایک پلاننگ کے تحت یہ سب کر رہا ہوں۔ اگر میں ٹھیک سے کھاؤں گا تو میرے جسم پر اثر

نہیں ہوگا میں جسمانی طور پر کمزور نظر آنا چاہتا ہوں۔“

بانو مجھ سے متفق نہیں تھی لیکن وہ ایک حد سے زیادہ بحث یا اصرار بھی نہیں کر سکتی تھی اس لیے خاموش ہو گئی۔ رات کا کھانا کم کھانے کے بعد مجھے نیند مشکل سے آئی تھی اور دیر تک میں کروٹیں ہی بدلتا رہا تھا۔ بڑے کنور کے ابتدائی رد عمل کے بعد میں ذہنی طور پر تیار ہو گیا تھا کہ وہ اس معاملے کا بھی تاخیر سے نوٹس لے گا۔ اس دوران میں، میں اپنا وزن خاطر خواہ کم کر سکتا تھا۔ ایک دن پہلے میرا وزن بیاسی کلوگرام تھا اور ایک دن میں یہ کم ہو کر اسی کلوگرام رہ گیا تھا۔ اگلے روز بھی یہ معمول برقرار رہا تھا۔ میں نے خوراک کم رکھی اور ورزش پوری کرتا رہا۔ ورزش سے مجھے اتنا مسئلہ نہیں تھا لیکن جب بانو سے مقابلہ کرتا تو مجھے خاصا فرق محسوس ہوتا تھا۔ اس روز بھی میری کم خوراک کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا تھا۔ رات کے وقت بانو نے میری توجہ دلائی۔ اس نے کاغذ پر لکھا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بڑے کنور کو اس بات کا علم ہی نہ ہو کیونکہ یہاں مائیک راج کنور نے لگوائے ہیں۔“

”مگر کھانا تو منشی جی کی نگرانی میں بناتا اور آتا ہے۔ انہیں معلوم ہو گا کہ میں اتنی خوراک نہیں لے رہا جتنی معمول کے مطابق لیتا ہوں۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دل نواز خان نے اسے بتایا ہی نہ ہو۔ دل نواز کے خیال میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ بانو کی باتوں میں وزن تھا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ بڑے کنور کو صورت حال کا علم تھا اور وہ کسی وجہ سے اب تک خاموش تھا۔ میں نے ٹھوس خوراک کم کی تھی لیکن جو سز لے رہا تھا۔ البتہ دودھ چھوڑ دیا تھا میرے لیے جو سز آتے تھے ان میں اضافی منٹرز اور دنا منز ہوتے تھے۔ ان سے میرا جسم کمزور ہونے کے باوجود منٹرز اور دنا من کی کمی کا شکار نہ ہوتا۔ بہر حال ایک کھیل میں کھیل رہا تھا اور میرے دشمن بھی کوئی چال چل رہے تھے۔ دیکھنا یہ تھا کہ ہم میں سے کامیاب کون ہوتا ہے۔ اس سے اگلے دن سے میں نے ورزش کی تعداد اور دورانیہ بھی گھٹانا شروع کر دیا کیونکہ کم خوراک کے ساتھ میرا وزن تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ تیسرے دن تک میرا وزن اٹھتر کلوگرام ہو گیا تھا اور بہ قول بانو کے میں واضح کم ہو رہا تھا۔ البتہ ابھی مجھے کمزور نہیں کہا جاسکتا تھا۔

ورزش کم کرنے کے باوجود بانو سے مقابلہ جاری رکھا۔ اگرچہ اس نے اصرار کیا تھا کہ اب میں مقابلہ نہ کروں یا دن میں ایک بار کروں لیکن میں نے مقابلہ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا مجھے الگ فائدہ ہو رہا تھا۔ اب ہمارا مقابلہ دوستانہ مقابلے سے ذرا ہٹ کر تنگدستی کی طرف جا رہا تھا۔ بعض اوقات تو ایسا لگتا جیسے ہم سچ سچ دشمن ہیں اور ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ میں نے بانو سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی رعایت نہ کرے اور بالکل یوں مقابلہ کرے جیسے میں اس کا دشمن ہوں۔ مگر اب میں خود بھی اسے کم رعایت دیتا تھا۔ اکثر اسے برابری چوٹ پڑتی تھی۔ کئی بار اسے زخم آئے یا نیل پڑ گئے۔ شروع میں وہ ہائے کرتی تھی لیکن رفتہ رفتہ وہ چوٹوں کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے لڑائی کے بعد دیر تک اس کا سانس قابو نہیں آتا تھا لیکن اب اس کا اسٹیمنا اس لحاظ سے بھی بہت بہتر ہو گیا تھا۔

اس کی صحت بھی اچھی ہوتی جا رہی تھی۔ تین دن میں میرا وزن چار کلوگرام کم ہوا تھا تو اس کے وزن میں مزید ایک کلوگرام کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا وزن باسٹھ کلوگرام سے اوپر چلا گیا تھا۔ اس کے پرانے سوٹ تنگ ہو

گئے تھے۔ مگر اس دن کے بعد سے اوشا بھی نہیں آئی تھی کہ وہ اپنے لیے نئے سائز کے کپڑے منگوائی اس لیے انہی سے گزارا کر رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”اب تم رواجی ملبوسات کے بجائے اپنے سائز کے ٹراؤز اور ٹی شرٹس منگوانا۔ یہ آرام دہ بھی ہوتے ہیں اور ان میں فٹنگ کا اتنا مسئلہ نہیں ہوتا تم نمایاں بھی نہیں ہوگی۔“

وہ جھینپ گئی۔ ”ہاں ان کپڑوں میں اب بہت نمایاں ہونے لگی ہوں۔“
میں بوکھلا گیا۔ ”میرا مطلب ہے کہ تم میں آنے والی تبدیلی دشمن محسوس نہیں کرے گا ورنہ وہ چوکنہ بھی ہو سکتا ہے اور اس کے پاس حربوں کی کمی نہیں ہے۔“

اوشا چوتھے دن آئی تھی۔ اب تک ہمارا کام دل نواز خان کر رہا تھا۔ میرے کپڑے دھونے کے لیے وہی لے جاتا تھا لیکن بانو نے اسے اپنے کپڑے دینے سے انکار کر دیا۔ ”بے شک یہ مسلمان ہے لیکن میرے بارے میں جس طرح سوچتا ہے مجھے گوارا نہیں کہ یہ میرے کپڑوں کو ہاتھ لگائے۔“
وہ اوشا کے آنے سے خوش ہو گئی۔ ”تم کہاں تھیں اتنے دن سے؟“

”ہماری طبیعت خراب ہو گئی تھی ڈاکٹر علاج کر رہا تھا۔“ اوشا نے دُزدیدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”آپ کو کوئی کام تھا۔“

بانو اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ کچھ دیر بعد وہ باسکٹ میں اس کے کپڑے لے کر نکلی اور میرے پاس آئی۔ بانو نہیں آئی تھی اور میں بھی یہی چاہتا تھا۔ میں اوشا سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اسے واش روم میں لے آیا۔ ”اوشا تجھے کیا ہوا تھا؟“
وہ میرے پاس آ کر خوش تھی۔ اس نے مخصوص نشیلا انداز میں کہا۔ ”پتا نہیں رے، چار دن پہلے رات بستر پر لیٹی تو پھر ہوش نہیں رہا۔ ہوش آیا تو محل کے اسپتال میں تھی۔ ایک دن وہیں رہی پھر ڈاکٹر نے جانے دیا۔“
”اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تجھے کیا ہوا ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بس بول رہا تھا ہم بیمار ہو گئے تھے اب ٹھیک ہیں۔“
”اوشا یہ سب جھوٹ ہے۔“ میں نے کہا اور اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور اسے کس مقصد کے لیے میرے کمرے میں لایا گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ اوشا کی بڑی آنکھیں مزید پھیل گئی تھیں۔
”کیا کہہ رہا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہوں میرا خیال ہے تمہیں کھانے یا پینے کی کسی چیز میں دوا دی گئی تھی اس کے اثر سے تم ایسی ہو گئیں جیسے سو گئی ہو لیکن تمہارا جسم جاگ رہا تھا اور دوسرے جو کہہ رہے تھے تم اس پر عمل کر رہی تھیں۔“

اس نے سادگی سے پوچھا۔ ”پھر ٹوٹنے کیا کیا ہمارے ساتھ رات بتائی؟“

”لاحول ولا.....“ میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ”ایسا ہوتا تو آج میں زندہ ہوتا۔“

”تجھے کچھ نہیں ہو گا رے، باپو کا کبھی گھٹ نہیں ہوتا تھا۔“

میں نے دل ہی دل میں اس کے باپو کو سنائیں اور منہ سے بولا۔ ”راج کنور بہر صورت مجھے قتل کرنا چاہتا ہے اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو آج تم بھی زندہ نہ ہوتیں۔“

اس کے چہرے پر خوف نمودار ہوا۔ ”ہمیں بھی مار دیتا وہ؟“

”ہاں قتل کے بعد آلہ قتل کون رکھتا ہے اسے سب سے پہلے ٹھکانے لگاتے ہیں۔“

”تب تو نے اسے ناکام کیسے کیا؟“

میں نے کہانی کا آخری حصہ سنایا کہ کیسے میں نے رامن پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس نے جبر جبری لی۔

”تو نے اچھا نہیں کیا رے اگر وہ گولی مار دیتا تو.....“

”تو میں مرجاتا لیکن: ہوا نہیں اس کا کیا رونا۔“

اوشا پریشان ہو گئی تھی۔ ”نہیں تو سوچ یہ کھل کر تیرے خلاف ہو گئے ہیں۔ میں تیرے لیے کیا کر سکتی ہوں۔“

”تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتی ہو میں تمہیں ہوشیار کر رہا ہوں یہ پھر تمہیں میرے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہاں محل میں کوئی چکر چل رہا ہے۔ راج کنور اور بڑے کنور میں میری وجہ سے کشیدگی پیدا ہوئی ہے مجھے نہیں معلوم یہاں کیا ہو رہا ہے۔ تم باہر ہوتی ہو اور جاننے کی کوشش کر سکتی ہو۔“

”ہم سمجھ گئے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”تیرے لیے راز کھوجنا ہے۔“

”اسے آسان زبان میں جاسوسی کہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بہت ہوشیاری سے اور کسی کو شک کا موقع دیے بغیر اپنا کام کرنا اگر کسی کو شک ہو گیا تو تم جانتی ہو تمہارے ساتھ کیا ہو گا۔“

اس نے جبر جبری لی۔ ”یہ بہت جالہ لوگ ہیں جس نوکر سے ناراج ہوں اسے کتوں کے آگے ڈلوادیتے ہیں۔“

پتا نہیں صاحبان اقتدار اپنے معتبوں کو کتوں کے آگے کیوں ڈلواتے ہیں؟ میں نے سوچا اور اوشا سے

کہا۔ ”باہر چلو اب ہم کھل کر بات کریں گے۔“

”اتنی جلدی کیا ہے رے۔“ اس نے شغفی سے کہا اور میرے گلے میں ہانپیں ڈال دیں۔ آج وہ

خادماؤں والے لباس میں تھی۔ اس کے دودھ سے کشش انگیز حرارت اٹھ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کی ہانپیں گلے سے نکالیں۔

”جلدی ہے یہ لوگ اب زیادہ نظر رکھتے ہیں اور شک ہو گیا تو ہم اس طرح بات کرنے سے بھی رہ جائیں گے۔“

بادل ناخواستہ وہ میرے ساتھ باہر آئی۔ اس نے کچھ کہا نہیں لیکن جب میں نے بتایا کہ بانو کو بچانے کے

لیے میں رامن سے بھڑ گیا تھا تو اس کا منہ بند گیا تھا اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ میں بانو کے لیے اس حد تک

جاؤں۔ ساتھ ہی وہ جانتی تھی کہ مجھے نوکے کی تب بھی میں منع نہیں ہوں گا اس لیے اس نے کچھ کہا نہیں۔

”صاحب جی تمہارے لیے کیا لائیں؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہو سکے تو نشی جی کو کہہ دینا میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

وہ سر ہلا کر چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ بانو کے لیے کپڑے اور دوسری چیزیں لے آئی تھی۔ بانو کی چیزیں

سے دے کر اوشا نے مجھے کہا۔ ”نشی جی کہہ رہے ہیں وہ مصروف ہیں پر جلد آپ کے پاس آئیں گے۔“

اوشا کی بات سن کر میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا تھا۔ ابتدائی تین دن کم خوراک کی نے مجھے پریشان کیا تھا کھانے کے کچھ دیر بعد بھوک اندر سے پیٹ میں پنچ مارنا شروع کرتی تھی لیکن اب میں عادی ہو رہا تھا۔ پیٹ نے سمجھ لیا تھا کہ اسے اس سے زیادہ خوراک نہیں ملے گی۔ اس لیے وہ شور نہیں کر رہا تھا۔ ورزش بھی خوراک کے تناسب سے کم کر دی تھی اور بس اتنی کر رہا تھا جس سے میں فٹ رہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ وزن کم ہونے سے میرے ریٹیکلکمز تیز ہو گئے تھے اور بانو سے مقابلے میں یہ کام آتے تھے۔ اوشا غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”صاحب ٹوکڑو ہو گیا ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“

”اور وہ بڑی بھاری ہو رہی ہے۔“ اوشا نے معنی خیز انداز میں بانو کے کمرے کی طرف دیکھا۔ ”پرانے کپڑے نہیں آ رہے ہیں۔ نئے منگوائے ہیں۔ اندر والے کپڑے کا سائز بھی بدل رہا ہے۔“

میں نے اسے ٹوکا۔ ”تو اس جگر میں نہ پڑ۔ بیٹھ کر کھا رہی ہے اس لیے وزن تو بڑھے گا۔“

اس شام بانو سے مقابلہ کیا تو مجھے اوشا کی بات ٹھیک لگی تھی۔ اس کا وزن واقعی نمایاں طور پر بڑھا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے گھونسلوں اور پاؤں کے دار میں قوت آ گئی تھی۔ پہلے اس کا بیچ لگتا تو مجھے پتا بھی نہیں چلتا تھا لیکن اب بیچ لگتا تو اس کے پیچھے موجود قوت کا واضح احساس ہوتا تھا۔ اس کے لڑنے کے انداز میں جارحیت آ گئی تھی۔ پہلے وہ جسم سمیٹ کر اور جھجک کر لڑتی تھی لیکن اب وہ بے فکری سے حملے کرتی تھی۔ اس نے اچانک ایک اپرکٹ مارا۔ میں بروقت دفاع نہ کر سکا اور گھونسنہ میری تھوڑی پر لگا۔ ایک لمحے کو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا تھا اور جب یہ اندھیرا چھٹا تو میں قالین پر پڑا ہوا تھا۔ دبیز قالین کی وجہ سے چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن اس دار نے مجھے ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ بانو پریشانی میرے پاس بیٹھی۔

”کیا ہوا آپ ٹھیک ہیں۔“

جواب میں، میں نے ٹانگیں ہوا میں گھمائیں اور ایک ٹھوکرا اس کی پشت پر رسید کی۔ وہ لڑھک گئی اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”مگرے ہوئے دشمن کی خیریت دریافت نہیں کرتے ہیں۔“

اس نے منہ بسورا۔ ”آپ میرے دشمن نہیں ہیں۔“

”چلو دشمن نہ سہی حریف تو ہوں ابھی۔“ میں نے تھوڑی سہلائی۔ ”تمہارے دار میں بہت قوت تھی ایک لمحے کو میرے حواس ہی گم ہو گئے تھے۔“

وہ شرمندہ ہو گئی۔ ”آپ ہی نے کہا ہے کہ میں پوری قوت سے لڑا کروں۔“

”تم نے بالکل ٹھیک کیا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی کرنا ہے۔ میں نے بالکل بھی برائیاں مانا بلکہ خوش ہوں کہ تم میری ہدایت پر عمل کر رہی ہو۔“ میں نے دوبارہ لڑائی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

اس دن مقابلے کے بعد میں ہانپ رہا تھا اور بانو کا سانس ہموار تھا۔ یہ یقیناً خوراک میں کمی کا نتیجہ تھا۔ اس سے پہلے بھی بار بار دور ایسے گزرے جب عملاً فائدہ کشی سے واسطہ پڑا تھا لیکن اس وقت کوئی میرا خون نمڈ لے کے درپے نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے اتنی کوشش نہیں کرنا پڑتی تھی۔ حالات بالکل بدلے ہوئے تھے۔ ایک بھائی ڈر کیولا بنا ہوا تھا اور مجھے میرے خون کی خاطر زندہ رکھے ہوئے تھا تو دوسرا بھائی بھیل رہا

کی طرح مجھے ایک ہی بار میں چیر بھاڑ دینا چاہتا تھا۔ بانو نے پھر اصرار کیا۔ ”اب آپ ورزش نہ کریں صرف مجھ سے مقابلہ کیا کریں اگر آپ اسی رفتار سے کمزور ہوتے رہے تو پھر میں ٹھیک سے نہیں سیکھ سکوں گی۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مگر میں اپنا وزن مزید کم کرنا چاہتا تھا اور یہ خوراک میں کمی کے ساتھ ورزش سے ہی ہو سکتا تھا اگر میں ورزش چھوڑ دیتا تو وزن میں اتنی تیزی سے کمی نہیں آ سکتی تھی۔ میں اپنی قوت بھی جانچ رہا تھا۔ وزن میں کمی اصل میں گوشت اور چربی میں کمی تھی۔ میرے مسلز پہلے کی طرح مضبوط اور بڑے تھے۔ جسم سے چربی چھٹی تو یہ زیادہ نمایاں ہونے لگے تھے۔ میری قوت میں بھی خاص کمی نہیں آئی تھی۔ تین دن بعد میں سنبھل گیا تھا۔ چھ دن تک میرا وزن کم ہو کر چوتھو گرام رہ گیا تھا اور اب وزن میں کمی کے اثرات چہرے اور جسم پر واضح محسوس کیے جاسکتے تھے۔ اگلا دن خون لینے کا تھا۔ میں اسی مرحلے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا اور میں اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ جب اوشا نے بانو کے بھاری ہوتے جسم کی طرف اشارہ کیا تو میں فکر مند ہو گیا تھا جو بات اوشا محسوس کر سکتی تھی وہ دوسرے بھی کر سکتے تھے میں نے بانو کو یہ بات بتائی اور مشورہ دیا۔

”اب تم اپنی خوراک پر قابو پانے کی کوشش کرو تا کہ وزن مزید نہ بڑھے اور جسمانی چستی میں اضافہ ہو۔“ میرے مشورے کے بعد وہ بھی خوراک کم لینے لگی تھی۔ ورزش اتنی ہی کرتی تھی اور مجھ سے مقابلے کا دورانیہ اب بیس منٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے چند دن میں اس پر بھی فرق نظر آنے لگا خاص طور سے چہرہ جو بھر کر موٹاپے کا اشارہ کر رہا تھا پھر سے دبلا ہو گیا۔ چہرے سے بھی انسان کی صحت جھلکتی ہے۔ بعض لوگ اتنے صحت مند نہیں ہوتے ہیں لیکن ان کا چہرہ بھرا ہوتا ہے اس لیے لوگ انہیں صحت مند یا اور ویٹ سمجھتے ہیں۔ جب کہ بعض اچھے خاصے صحت مند لوگ صرف دبے چہرے کی وجہ سے کمزور سمجھے جاتے ہیں۔ ساتویں دن صبح ناشتے کے بعد منشی جی نازل ہو گئے۔ پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر چوہے۔ ”شہباز جی آپ کو کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں نے خوراک کم کر دی ہے اور ورزش چھوڑ دی ہے۔“

”لیکن کیوں؟“

”منشی جی، آپ انجان نہ بنیں، میں نے آپ سے براہ راست کہا اور پھر ملازموں سے کہلوایا کہ میں آپ سے اور بڑے کنور سے ملنا چاہتا ہوں لیکن آپ مسلسل ٹالتے رہے۔ اس لیے میں نے خون نہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔“

منشی جی فکر مند ہو گئے۔ ”مگر کیوں، جب مسئلہ حل ہو گیا تھا۔“

”یہ مسئلہ کا عارضی حل تھا۔ راج کنور پھر شرارت کرنے کے لیے آزاد ہے۔ میں نے بڑے کنور سے مشروط تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ وہ میری اور بانو کی حفاظت نہیں کر سکے اس لیے میں نے بھی اپنا تعاون واپس لے لیا ہے۔ آئندہ تعاون صرف اسی صورت میں ہوگا جب وہ مجھ سے ملاقات کریں گے۔“

منشی جی کچھ دیر خاموش رہے پھر بد لے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی سزا ملے گی لیکن میں اپنے فیصلے پر قائم ہوں۔ جب تک میری بڑے کنور سے ملاقات نہیں ہوتی اور وہ میرے کچھ مطالبات نہیں مانتے میں خون نہیں دوں گا۔ ویسے

آپ کے قبضے میں ہوں چاہیں تو ایک ہی بار میں سارا خون نکال لیں میرے جسم سے۔“
 دھمکی کو رائیگاں جاتے دیکھ کر منشی جی نے دوبارہ پینٹر بدلا۔ ”شہباز جی آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ بڑے کنور چپک آپ کے لیے دلی گئے ہوئے تھے آج کسی وقت واپس آئیں گے تب آپ کی ان سے ملاقات ہو سکے گی۔“

میں نے عیاری کا جواب چالاکی سے دیا۔ ”ٹھیک ہے مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ان سے ملاقات ہو جائے تب میں آپ کے ساتھ کلینک چلوں گا۔“

منشی جی پریشان ہو گئے۔ ”لیکن خون نکالنے کے انتظامات ہو گئے ہیں۔“
 میں ہنسا۔ ”منشی جی، یہ کسی بڑے آپریشن کے انتظامات نہیں ہیں خون نکالنا معمولی سائل ہے۔ یہ پانچ منٹ کے نوٹس پر دوبارہ انتظام کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے میں فی الحال خون دینے کے قابل نہیں ہوں آپ میری صحت دیکھ رہے ہیں۔ ابھی میں معمول کا کھانا کھا رہا ہوں۔ اگر میں کھانا چھوڑ دوں تو ایک ہفتے بعد خون نکالنے کے لیے ڈاکٹر کو میری نس بھی نہیں ملے گی۔ اس لیے بڑے کنور سے جتنی جلد میری ملاقات ہو جائے۔ میرے اور ان کے لیے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ جب تک بڑے کنور سے ملاقات نہیں ہوگی اور میرے مطالبات نہیں مانے جائیں گے میں معمول کا کھانا پینا اور ورزش نہیں کروں گا۔“

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ایسا کر رہے ہیں ورنہ میں پہلے ہی بات کرتا۔“ منشی جی نے مکاری سے کہا۔
 حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

”کیا دل نواز خان نے بتایا نہیں کہ میں نے خوراک کم کر دی ہے کھانا بچ کر واپس جاتا ہے۔“
 ”اس حرام خور نے ایک بار بھی نہیں بتایا۔“ منشی جی غیض و غضب سے بولے۔ ”میں ابھی اس سے پوچھتا ہوں۔“

”آپ اس سے پوچھیں اور مجھے یقین ہے بڑے کنور بھی کچھ حرام خوروں سے پوچھ کچھ کریں گے جو کھانا ان کا رہے ہیں لیکن کام کسی اور کے لیے کر رہے ہیں۔“

منشی جی کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ ”شہباز جی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“
 ”کچھ نہیں۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔ ”ویسے منشی جی جو شخص بڑے کنور کا علاج کر رہا ہے اسے آپ ہی تلاش کر کے لائے تھے؟“

”ہاں اسے میں نے تلاش کیا ہے۔“ وہ فخر سے بولے۔ ”سندھو جیسا ماہر تو نہیں ہے لیکن اس کا دعویٰ ہے وہ بڑے کنور کا علاج کر سکتا ہے۔“

”کتنا عرصہ ہو گیا اسے بڑے کنور کا علاج کرتے ہوئے؟“
 ”چار مہینے سے کر رہا ہے۔“

”یقیناً بڑے کنور کو فائدہ ہوا ہوگا۔“
 ”ہاں فائدہ تو ہوا ہے۔“ منشی جی یک دم محتاط ہو گئے۔ ”شہباز جی اگر آپ تعاون جاری رکھیں تو بڑے کنور جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔“

”میری طرف سے تو پورا تعاون تھا لیکن اس محل کے کچھ لوگ شاید بڑے کنور کو صحت یاب دیکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ اس لیے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔“

”ایسی کوشش نہیں کی گئی۔“ منشی جی نے جلدی سے تردید کی۔ ”آپ جانتے ہیں راج جی کی خواہش کیا ہے۔“

”اس کی خواہشات بہت زیادہ ہیں اور بعض اوقات انسان جسے خواہش سمجھ رہا ہوتا ہے وہی اس کی موت ٹھہرتی ہوتی ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”منشی جی، ادشا کو میرے پاس بھیجنے کا کیا مقصد تھا۔ وہ سندھو کی بیٹی ہے اور آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں وہ وٹس کنیا ہے۔ جو مرد اس کے پاس آئے گا وہ زندہ نہیں رہے گا۔ آپ خود اسے یہاں سے لے کر گئے تھے اور وہ اپنے حواسوں نہیں تھی۔ اب بھی آپ کہتے ہیں کہ وہ مجھے قتل کرنے کی کوشش نہیں تھی۔“

”اگر ایسا بھی تھا تو میں یقین دلاتا ہوں آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ منشی جی نے صلح کن انداز میں کہا۔ ان کی کوشش تھی کہ مجھے خون دینے پر آمادہ کر لیں لیکن جب میں ٹس سے مس نہیں ہوا تو وہ مایوس لوٹ گئے۔ بانو وہاں موجود تھی اور خاموشی سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔ منشی جی کے جاتے ہی وہ رف پیڈ اور ہنسل لے آئی۔ ”آپ نے اس سے بہت کھل کر بات کی ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟“

”دشمن سے رازداری اچھی چیز ہے لیکن بعض اوقات کھل کر بات کرنا بھی مفید ہوتا ہے۔“ میں نے جواباً لکھا۔ ”دیکھو دشمن ہمیں بے وقوف سمجھ رہا ہے تو ہم یہ تاثر کیوں نہ دیں کہ ہم بے وقوف بن رہے ہیں۔ اس طرح ہم اس کے عزائم بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ بڑا کنور اس کھیل میں شامل ہے لیکن اب مجھے لگ رہا ہے مجھے جان بوجھ کر بڑے کنور تک رسائی کا موقع نہیں دیا جا رہا ہے دوسری طرف اسے شاید یہ بتایا جا رہا ہے کہ سب ٹھیک ہے میں خوش و خرم ہوں اور پوری طرح تعاون کر رہا ہوں۔“

”لیکن جب خون نہیں ملے گا تو یہ بڑے کنور کو کیا کہیں گے؟“

”یہی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ اپنی حکمت عملی چلاتے ہیں یا پھر کوئی پینتربا بدلتے ہیں۔ بڑے کنور کے گرد تفریباً تمام افراد اس سے غلط نہیں ہیں شاید ایک دو ہوں۔ اسے خبردار کر سکتے ہوں تو ان کو اس کے پاس سے ہٹایا جاسکتا ہے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے کیا منشی جی بھی راج کنور سے ملا ہوا ہے؟“

”اگر وہ ملا ہوا نہیں ہے تب بھی وہ بعض معاملات میں اس کی حمایت کر رہا ہے۔ جیسے اس نے بردقت آ کر مجھے رامن سے بچایا لیکن اب وہ اس معاملے کو بڑے کنور تک جانے سے روک رہا ہے۔ مجھے یقین ہے تمہاری رہائی میں بڑے کنور کا ہاتھ نہیں ہوگا بلکہ اسے شاید خبر بھی نہیں ہوگی کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔“

”تب راج کنور نے مجھے کیسے چھوڑ دیا؟“

”وہ منشی جی کے سامنے مجبور ہوا ہوگا شاید منشی جی نے معاملے کو دبانے کے لیے یہی شرط رکھی ہوگی کہ وہ تمہیں واپس کر دے اور پھر ہم سے کوئی تعرض نہ کرے۔“

”سوال یہ ہے کہ منشی جی نے بڑے کنور کو کیوں بے خبر رکھا۔ اگر وہ راج کنور کے ساتھ نہیں ملا ہے تو ایسا

کیوں کر رہا ہے؟

”میرا اندازہ ہے خشی جی کے خیال میں بڑے کنور کی کہانی جلد یا بدیر ختم ہونے والی ہے اور راج کنور ہی اگلا حکمران ہوگا۔ اس لیے وہ ابھی سے اس کے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اسے یہ خیال بھی ہے کہ ابھی بڑا کنور زندہ ہے اور وہی ہر چیز کا مالک ہے۔ یہ سارا مفادات کا کھیل ہے اس میں سب طلیف ہیں اور سب حریف ہیں۔“

بانو نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”آپ نے بہت گہرائی سے ان کا تجزیہ کیا ہے۔“

”دشمن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش ہی مفید ثابت ہوتی ہے۔ اگر آپ دشمن کے بارے میں جانتے ہیں تو بہت کم قوت سے بھی اسے انجام تک پہنچا سکتے ہیں ورنہ بہت زیادہ طاقت بھی آپ کے کام نہیں آتی ہے۔ یہ اصول بڑی سلطنتوں سے لے کر عام آدمی تک یکساں لاگو ہوتا۔“

لکھ لکھ کر میرا ہاتھ تھک گیا تھا۔ اتنا زیادہ میں صرف امتحان میں لکھتا تھا اور اس سے بھی میری جان جاتی تھی۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ بی کاپی لینے کی نوبت نہ آئے جب کہ میرے آس پاس کے لڑکے دھڑا دھڑبی کاپیاں لے رہے ہوتے تھے لیکن میرے مارکس ہمیشہ ان سب سے زیادہ ہی آتے تھے۔ بانو جتنی تیزی سے لکھ رہی تھی گلتا تھا وہ بھی امتحان میں کئی بی کاپیاں لیتی تھی۔ اس نے لکھا۔ ”اگر آپ بڑے کنور سے ملتے ہیں تو اس سے کیا مطالبہ کریں گے؟“

”میں تمہیں اٹھیا سے باہر بھجوانے کا مطالبہ کروں گا۔“

اس نے خشی میں سر ہلا کر لکھا۔ ”وہ مجھے واپس نہیں بھیجے گا۔“

”میں متاثر ہوس کی بات نہیں کر رہا میں تمہیں اپنے ساتھیوں کے پاس بھجواؤں گا وہاں سے تم اپنے طور پر کہیں جانے یا اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”میں بھی اب ممتاز ہاؤس واپس نہیں جانا چاہتی۔ میں اپنی زندگی آپ جینا چاہتی ہوں۔“

”مجھے امید ہے بڑا کنور مان جائے گا۔ اسے صرف میاں ممتاز کی فکر ہے کیونکہ اس سے اس کے کاروباری

تعلقات ہیں۔ وہ ان تعلقات کو خراب نہیں کرنا چاہتا ہے۔ اگر میاں ممتاز کو کوٹلم نہ ہو تو اسے اعتراض نہیں ہوگا۔“

”لیکن اسے یہ پگڑ ہوگی کہ آپ کے ساتھیوں کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کہاں ہیں اور آپ کے ساتھ کیا

ہو رہا ہے۔“

”کچھ خاصاں یہاں کا حکمران ہے اور یہاں ان کی ذاتی طاقت بھی ہے اور ان کو ریاست کی پشت پناہی

بھی حاصل ہے۔ میرے ساتھی پاکستان سے آکر یہاں ان کے خلاف کیا کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ

اس بارے میں فکر مند ہوں گے۔“

”وہ کوشش تو کر سکتے ہیں۔“ بانو بولی۔ ”اگر وہ آپ کی طرح ہیں تو مجھے یقین ہے وہ آپ کو آزاد کرانے

کے لیے لڑائیاں تو کیونہی لڑیں گے آخری سرے تک بھی جاسکتے ہیں۔“

وہ تھک کر رہی تھی میرے ساتھی ایسے ہی تھے۔ وسم، سفیر، بیتو، عبداللہ اور ایاز کو پتا چلتا تو وہ یہاں بھی

آجاتے مگر شاید بڑا کنور اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ چانس لے کر

دیکھوں گا ہو سکتا ہے وہ بانو کو یہاں سے بھیجنے پر آمادہ ہو جائے اس کے بعد میں اکیلے بہتر طور پر حالات کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے مہینہ ہونے لگا تھا اور اب تک میں نے آزاد ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اتنے عرصے دشمن کی قید میں رہا تھا اور خود کو آزاد نہیں کر سکا تھا۔ بانو میرے پاؤں میں ایک زنجیر کی طرح تھی۔ میں اسے کھولے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنا ملک ہوتا تو شاید میں اتنی پروا نہ کرتا لیکن میری پاکستانیت کو یہ گوارا نہیں تھا کہ ایک پاکستانی لڑکی کو ان دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤں۔ جن کے عزائم بانو کے لیے واضح تھے وہ بھیڑیوں کی طرح اس پر رال پکاتے ہوئے دانت تیز کر رہے تھے اور بے تابانی سے اس وقت کے خطر تھے جب انہیں اس پر تصرف حاصل ہو جاتا۔ راج کنوری ایک سازش میں نے ناکام بنادی تھی۔ مگر ضروری نہیں تھا کہ میں اس کی ہر سازش ناکام بنادیتا۔

جب میں بانو سے لکھ کر بات کر رہا تھا تو اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ میں اوشا کی مدد سے بڑے کنور کو پیغام بھجوا سکتا تھا۔ اگر وہ بے خبر تھا تو خبردار ہو جاتا۔ اوشا ملازمہ تھی لیکن اسے محل میں حرکت کرنے کی آزادی حاصل تھی۔ اگر بڑے کنور کے حصے کی طرف جانے پر کچھ پابندی تھی تو وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں جا سکتی تھی اور بڑے کنور کو میرا پیغام دے سکتی تھی۔ میں نے بانو کو اپنے خیال کے بارے میں بتایا وہ پُر جوش ہو گئی۔ ”واقعی، یہ تو آسان ہے۔ وہ بڑے کنور تک جا سکتی ہے۔“

”کوشش کر سکتی ہے۔“

بانو معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ”آپ کے لیے وہ سب کر سکتی ہے۔“

میں جھینپ گیا۔ پھر میں نے رف پیڑ سے ایک کاغذ الگ کیا اور اس پر بڑے کنور کے لیے انگریزی میں پیغام لکھا۔ ”بعد آداب عرض ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو ان حالات کا علم ہے۔ راج کنور نے میرے اور بانو کے خلاف سازش کی ہے ہمیں کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی اور بانو کو راج کنور کے بیڈروم میں پہنچا دیا گیا۔ پھر ٹی وی پر دکھا کر مجھے دھمکی دی گئی کہ اگر میں نے اوشا کے ساتھ رات نہیں گزاری تو بانو کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ میں نے جان پر کھیل کر راج کنور کی یہ کوشش ناکام بنادی اور فحشی جی بانو کو واپس لے آئے لیکن اس دوران میں راسن نے مجھے مارنے کی نیت سے گولی چلائی۔ ویسے بھی یہ میرے قتل کا منصوبہ تھا کیونکہ اوشا کے ساتھ رات گزارنے کا مطلب اس دنیا سے انتقال کر جانا ہے۔ میں نہیں سمجھ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں لیکن میرے مطالبے کا کوئی جواب نہیں دیا جا رہا ہے۔ میں نے گزشتہ ایک ہفتے سے جب سے یہ واقعہ ہوا ہے۔ کھانا پینا کم کر دیا ہے اور میں خون دینے کی حالت میں نہیں ہوں اور نہ ہی میں خون دوں گا جب تک میرے کچھ مطالبات مان نہیں لیے جاتے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

مخلص

دشمن

کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں کسی موقع پر یہ برآمد نہ ہو جائے اس لیے اسے صوفے کی گدی کے غلام میں ڈال دیا کہ ضرورت پڑنے پر میں آرام سے واپس نکال سکتا تھا۔ بانو دیکھ رہی تھی اس نے تعریفی انداز میں سر ہلایا اور رف پیڑ پر لکھا۔ ”شہباز صاحب اگر ایسا ہو گیا تو میں ساری عمر آپ کا احسان نہیں

بولوں گی۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اس کے باوجود یہاں کا ایک ایک لمحہ مجھ پر بھاری ہے۔“
 ”احسان فیروں پر ہوتا ہے اور اب میں تمہیں اپنا ساتھی سمجھنے لگا ہوں۔ میرے اکثر ساتھی میری طرح ہیں۔ وہ اتنے غلط اور بے غرض لوگ ہیں کہ اس جنگ میں جو ان کی نہیں ہے بے لوث میرا ساتھ دے رہے ہیں۔“

”لیکن میں ان کی طرح نہیں ہوں میں تو خود آپ پر بوجھ ہوں۔“ اس نے افسردگی سے کہا تو میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟“
 ”میرا اندازہ ہے آپ آرام سے بیٹھنے والے شخص نہیں ہیں۔ اب تک اس قید سے آزاد ہو گئے ہوتے یا کم سے کم کوشش ضرور کرتے لیکن آپ کوشش بھی نہیں کر رہے ہیں اور اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ آپ میری وجہ سے صبر کر رہے ہیں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”ہاں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اسی لیے میں تمہیں جلد از جلد یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔ اللہ مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے۔“

بانورف پیڑ لے کر چلی گئی تھی۔ یہ خاصا موٹا ف پیڑ تھا جو صغیر لکھ لیے جاتے تھے۔ بانو انہیں اپنے داش روم میں جلا کر ان کی راکھ داش بین میں بہا دیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کاغذ بہائے تو ممکن ہے یہ آگے کہیں نظروں میں آجائیں اس لیے جلا کر راکھ بہانا ہی زیادہ مناسب تھا۔ مسلسل لکھ کر بات کرنے سے رف پیڑ سوکھ کر آدھا رہ گیا تھا۔ ادھر دوسرے تیسرے دن چکر لگاتی تھی اور وہ دو دن پہلے آخری بار آئی تھی میرا اندازہ تھا کہ وہ آج یا اگلے روز چکر لگاتی تب میں اس کے ہاتھ رقعہ بڑے کنور کو بھیج سکتا تھا۔ اگرچہ اس میں رسک تھا۔ عین ممکن تھا کہ اب بڑے کنور کے حصے کی طرف کسی کو جانے کی اجازت نہ ہو اور راج کنور کے اعتماد کے لوگ ہی اس طرف جا سکتے ہوں گے۔ اس صورت میں اوشا کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہوتے۔

اوشا شام کو آئی اور بڑے غلط موقع پر آئی۔ میں نے ہلکی پھلکی ورزش کی تھی اور پھر حسب معمول بانو سے مقابلہ ہو رہا تھا۔ اس دن وہ بڑے جارحانہ موڈ تھی۔ ایک موقع پر میرا پاؤں پھسلا اور میں نیچے گر ا تو وہ مجھے سوار ہو کر گھونے برسانے لگی۔ میں اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور اوشا باسٹ اٹھائے اندر آئی۔ بانو کو یوں مجھ پر سوار گھونے برساتے دیکھ کر اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ اسے بلکہ شاید ہی کسی کو معلوم تھا کہ میں اور بانو لڑائی کی مشق کرتے تھے۔ اس لیے وہ اسے اصل لڑائی سمجھی۔ بانو کو مجھ پر حاوی دیکھ کر اس کا غصہ فطری تھا۔ اس نے باسٹ ایک طرف پھینکی اور جی مار کر جھپٹی۔ بانو کا منہ نیچے تھا اس لیے وہ اسے نہیں دیکھ سکی لیکن میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اوشا کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس کے سفید دانت جھلک رہے تھے۔ یہ بڑا خطرناک انداز تھا وہ بانو کو کاٹنے آ رہی تھی۔ میں نے بانو کو دوسری طرف اچھال دیا اور اس دوران میں اس کے دو تین گھونے بھی کھائے۔ بانو گری اور اٹھ رہی تھی کہ اوشا رخ بدل کر اس کی طرف لپکی۔ اسے آواز سے روکنے میں رسک تھا اگر وہ نہ سستی اور بانو کو دانت مار دیتی تو اس کا زہر بانو کو منٹوں میں موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ میں نے اوشا کے پیروں پر ٹھوکر ماری وہ لڑکھڑا کر گری لیکن بانو اس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس نے بانو کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اس پر منہ مارنے کی کوشش کی

لیکن میں نے بروقت اس کی ٹانگ پکڑ کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔

ہلکے پھلکے بدن سے قطع نظر اس کا وزن خاصا تھا کیونکہ مجھے پورا زور لگا کر کھینچنا پڑا تھا۔ دوسری طرف بانو نے اس سے ہاتھ جھڑا لیا۔ اوشا نے پھر کوشش کی لیکن وہ بانو کا ہاتھ نہیں پکڑ سکی تھی۔ اسے پیچھے کھینچ کر میں نے اٹھتے ہوئے اس کی کمر کھینے سے دبائی۔ وہ تڑپی۔ ”چھوڑ رے..... مارے گا کیا؟“

”یہ کیا کر رہی تھیں؟“ میں نے برہمی سے کہا اور بانو کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن بادل نا خواستہ چلی گئی۔ اوشا جواب تک تڑپ اور اینٹھ رہی تھی اس کے جاتے ہی ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اٹھ گئی اور ہانپتے ہوئے بولی۔

”میں اسے مار ڈالوں گی۔“

”تمہارا دماغ درست ہے۔ ہم آپس میں مقابلہ کر رہے تھے۔“

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ”وہ تجھے مار نہیں رہی تھی؟“

”نہیں یہ مشق تھی۔“ میں نے اس بار نرمی سے کہا۔ ”تُو نے بلاوجہ دخل دیا۔ جا کر اس سے معافی

مانگ، اگر میں بروقت تجھے نہ روکتا تو تُو نے اسے مار ہی دیا تھا۔“

”معافی تو میں مانگ لوں گی رے، پر یہ کیسا مقابلہ تھا وہ تو لگا تجھے جان سے مار رہی تھی۔“

”مقابلے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ دیکھو ہم دونوں نے دستانے اور ہیلٹ پہن رکھے ہیں۔“

اس بار اوشا شرمندہ ہو گئی۔ ”تب تو مجھ سے بڑی غلطی ہوئی رے، اب میں کیا کروں؟“

”اس سے معافی مانگ لو۔ بات ختم ہو جائے گی۔“

میں اسے بانو کے کمر سے میس لایا میں اسے اکیلے بھیجے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا ممکن تھا بانو غصے میں اسے کچھ کہہ دیتی اور وہ بھر بھر جاتی۔ بے شک بانو جسمانی لحاظ سے اس سے کہیں مضبوط ہو گئی تھی اور لڑائی میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اوشا جیسی چار بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں لیکن اوشا کا واحد ہتھیار یعنی اس کا زہر سب پر بھاری ہوتا۔ اس کے دانتوں کی ایک کاٹ بانو کو مارنے کے لیے کافی تھی۔ بانو سچ بچہ برہم تھی اور اس نے بڑی مشکل سے اوشا کی معافی قبول کی۔ بہر حال یہ معاملہ نمٹ گیا اور میں اوشا کو لے کر اپنے والے روش روم میں آیا شاور چلا کر میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اوشا تجھے میرا ایک کام کرنا ہو گا پر کام بہت مشکل اور احتیاط والا ہے۔“

”تُو اوشا کی جان مانگ لے رے۔“

”جان لینا اور دینا دونوں بہت آسان کام ہیں لیکن زندہ رہتے ہوئے دشمن کے عزائم نا کام بنانا اصل کام ہے۔ تجھے میری ایک چشمی بڑے کنور تک اس طرح پہنچانی ہے کہ کسی کو بھی پتا نہ چلے۔ نہ تیرے جانے کا اور نہ تیرے چشمی پہنچانے کا۔ بول یہ کام کر لے گی۔“

وہ فکر مند ہو گئی۔ ”ادھر بڑے کنور کے حصے پر پابندی ہے ہر کوئی نہیں جاسکتا۔ میں بھی نہیں جاسکتی پر تیرے لیے کوشش کروں گی۔“

اس نے میرے خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔ بڑا کنور اپنے ہی محل میں قید کر دیا گیا تھا۔ ”اوشا کامیابی

سے زیادہ اہم راز داری ہے اگر ٹومسوس کرے کہ پکڑی جائے گی تو جو کاغذ تجھے دوں وہ کھا لینا۔ کسی اور کے ہاتھ نہ آئے میری بات سمجھ رہی ہے نا؟“

”ہم سب سمجھتے ہیں۔“ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پاس ہونے کی کوشش کی۔ ”ٹو جانتا ہی نہیں ہے اوشا کے لیے ٹو کیا ہے رے۔“

”میں جانتا ہوں اور تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن ابھی میں زندہ رہتا چاہتا ہوں۔“

وہ سمجھ گئی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”بھگوان نے کیا انیائے کیا ہے ہمارے ساتھ۔“

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کے ساتھ بالکل ٹھیک ہوا تھا اور نہ وہ میرے لیے مسلسل خطرے کی گھنٹی بنی رہتی۔ میں اسے کمرے میں لایا اور صوفے کی گدی میں دبا کاغذ نکال کر اسے دیا جو تعویذ کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ لے کر اسے اپنی نہ ہونے کے برابر بلاؤز کے گریبان میں غائب کر دیا۔ پھر مسکرا کر مجھے دیکھا تو میں جھینپ گیا کیونکہ میں خاصے غور سے یہ سارا عمل دیکھ رہا تھا۔ اس نے شوفی سے کہا۔ ”ایسے کیا دیکھتا ہے تجھ سے تو کچھ چھپا نہیں ہے رے۔“

میں نے موضوع بدلنا مناسب سمجھا۔ ”میری چیزیں لائی ہو؟“

اس نے گری ہوئی باسکٹ اٹھائی۔ اس میں سے بانو کے لیے لائی ہوئی اشیا نکالیں تو میں نے اسے ٹوکا۔ ”ایسے نہیں سب پہلے کی طرح رکھو اور پہلے بانو کو دے آؤ۔ پھر میری چیزیں مجھے دینا۔“

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”شہباز ٹو اس کا کچھ زیادہ ہی کھیاں نہیں رکھتا ہے۔“

”ہاں کیونکہ یہاں وہ میری ذمہ داری ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم اسے کسی اور معنوں میں مت لیا کرو۔ وہ خود بھی ایسی لڑکی نہیں ہے۔ اس کا اور میرا تعلق مرد و عورت والا نہیں ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے بے دلی سے کہا اور باسکٹ اٹھا کر بانو کے کمرے میں چلی گئی۔ اگر اس وقت کوئی مائیک پر کان لگائے بیٹھا ہو گا تو اسے یہاں ہونے والے ہنگامے کی سن گن مل گئی ہوگی۔ بہر حال اس سے اتنا فرق نہیں پڑتا کیونکہ راج اینڈ کمپنی اتنا تو جانتی تھی کہ بانو بھی ورزش کرتی ہے اور مجھ سے لڑائی کی تربیت بھی حاصل کر رہی تھی لیکن وہ اس کے مقاصد سے لاعلم تھے اور میں انہیں زیادہ سے زیادہ لاعلم رکھنا چاہتا تھا۔ اوشا چند منٹ بعد آئی اور میرا سامان نکال کر میز پر رکھا اور پھر لہراتی بل کھاتی چلی گئی۔ بعض خواتین مردوں کے معاملے میں ہار کی قائل ہی نہیں ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں ان کا کوہا ہمیشہ سفید ہوتا ہے اوشا بھی ان میں سے ایک تھی۔ میرا رویہ اس پر بالکل واضح تھا لیکن وہ ہمیشہ نئے سرے سے حملہ کرتی تھی اور نا کا می سے بد دل نہیں ہوتی تھی۔ اس کا یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی میں اس کے سامنے مجبور ہو جاؤں گا۔

اس کے جاتے ہی بانو آگئی۔ اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ روایتی مشرقی لمبوس کے بجائے اس نے مستقل ٹراؤزر اور شرٹ یا کرت پہننا شروع کر دیا تھا۔ یہ تمام کپڑے ڈھیلے اور اسٹریچ ایبل تھے۔ ان کے ساتھ وہ دوپٹے لے لیتی تھی۔ توقع کے عین مطابق اس کا مزاج برہم تھا۔ ”شہباز صاحب میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ نہ جانے کیا سمجھتی ہے اور بلاوجہ میرے پیچھے پڑی ہے۔“

”وہ نادان ہے اور تم سمجھ دار ہو اس لیے اس کی سطح پر مت آؤ۔ وہ جو سمجھتی ہے اسے سمجھنے دو اس سے تمہیں ہا

مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

وہ کچھ ٹھنڈی ہوئی۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اگر وہ کامیاب ہو جاتی مجھے کاٹ لیتی تو اب تک میں مر چکی ہوتی۔“ اس نے کہتے ہوئے جبر جبری لی۔

”وہ جذباتی ہو گئی تھی لیکن میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ اب وہ محتاط رہے گی۔“ میں نے کہا اور اشارے سے اسے منع کیا کہ اب اس موضوع پر مزید بات نہ کرے۔ اس نے سر ہلایا اور بولی۔

”ٹھیک ہے ویسے وہ بری لڑکی نہیں ہے۔“

”ٹھیک کہا اصل میں وہ ماحول برا ہے جس میں وہ رہ رہی ہے۔ بہر حال وہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔“

بانو نے سر ہلایا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”آئندہ اسے اندر سے بند رکھیے گا۔“

”تم فکر مت کرو میں خیال رکھوں گا۔“

اوشا کی بات سے تصدیق ہو گئی تھی کہ بڑے کنور کے خلاف سازش کا جال مضبوط ہو رہا تھا اسے مجھ سے بے خبر کر دیا تھا اور اس بے خبری میں اس کا معتمد خاص منشی جی بھی شامل تھا۔ اگر سازش کا آغاز تھا تو اس کی تکمیل میں زیادہ دیر باقی نہیں رہی تھی کیونکہ بڑا کنور جس درجے کا آدمی تھا وہ زیادہ دیر بے خبر نہیں رہ سکتا تھا اور ایک بار وہ خبردار ہو جاتا تو اسے شکار کرنا یا اپنے راستے سے ہٹانا آسان نہ رہتا۔ یہ اصل میں ہاتھی کا شکار تھا۔ ہاتھی ایک بار خبردار ہو جائے تو الٹا شکاری کو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ راج کنور اینڈ پارٹی اپنے منصوبے کو آخری مرحلے میں لے آئی تھی۔ اگر بڑا کنور مارا جاتا یا بے بس کر دیا جاتا تو اس کے فوری بعد میرا نمبر آتا۔ جیسے جیسے میں غور کر رہا تھا میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ راج کنور کی اصل کامیابی بڑے کنور کو راستے سے ہٹانا تھا لیکن وہ اس کامیابی کا جشن مجھے ملے اور بانو کو بے آبرو کر کے مناتا۔

اس سے پہلے وہ اپنی سازش میں کامیاب ہوتا میرا بڑے کنور سے رابطہ لازمی تھا۔ میری ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی اب آخری امید اوشا سے باقی رہ گئی تھی۔ اگر وہ اس تک پہنچ جاتی تب کچھ ہو سکتا تھا۔ مگر میں نے حریف غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ بڑا کنور اس وقت نہایت نازک پوزیشن میں تھا۔ وہ بیمار تھا اور اس کے آس پاس تمام ہی لوگ راج کنور کے وفادار یا زرخرید تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس کے ایک اشارے پر بڑے کنور کے تمام مرد وجود کو مکمل طور پر موت کی وادی میں دھکیل سکتے تھے۔ میں نے بانو کو اشارہ کیا کہ وہ رف پیڈ اور چٹل لائے۔ وہ جلدی سے لے آئی اور میں لکھ کر اسے اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ وہ بھی پریشان ہو گئی۔ ”تب ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

”بانو تیار رہو کسی وقت بھی مشکل آ سکتی ہے۔ ذہنی اور جسمانی طور پر نمنے کے لیے تیار ہو۔“

”لیکن ہم خالی ہاتھ کیا کر سکتے ہیں۔“

بانو کے پاس اس کی بوڑے والی سلاح تھی۔ وہ اسے مہلک ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتی تھی لیکن اس کے لیے دشمن کا غافل اور نزدیک ہونا لازمی تھا۔ ہمیں اس سے بہتر ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ مجھے کمرے میں موجود ورزش کی مشینوں کا خیال آیا۔ ان میں راڈز، تاریں اور رسیاں تھیں۔ میں نے ایک مشین سے دو عدد راڈز کالیں۔ یہ دو فٹ لمبی اور تقریباً تین کلو گرام وزنی ٹھوس اسٹیل پائپ سے بنی تھیں۔ نزدیک سے حملے یا دفاع کے

لیے یہ بہترین ہتھیار ثابت ہوتا لیکن آٹھویں ہتھیاروں کے سامنے بے کار تھا۔ ان میں کہیں سوراخ نہیں تھا جس سے رسی باندھ کر انہیں دور مار ہتھیار بنایا جاسکتا بہر حال کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ میں نے راڈز مشین میں یوں لگا دیئے کہ ضرورت پڑنے پر انہیں فوری نکالا جاسکتا۔ یہ پائپ دیسے بھی کاپس سے لگے ہوئے تھے۔ وزن کھینچنے والی مشین میں بہت مضبوط نائلون کی رسیاں تھیں مگر اتنی مضبوط نہ تھیں کہ ساتھ بندھی تھیں کہ انہیں صرف کاٹ کر نکالا جاسکتا تھا اور ہمارے پاس کاٹنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس موقع پر بانو کے پاس موجود لائٹر کام آیا اور اس سے جلا کر رسی مشین سے الگ کر لی تھی۔ رسی مشین کے پیچھے تھی۔ اس لیے جب تک کوئی مشین استعمال کرنے کی کوشش نہ کرتا اسے پتا نہیں چلتا کہ رسی ہے ہی نہیں۔ گلا کھونٹنے کے لیے رسی ہاتھوں سے کہیں زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ رسی کے دو ٹکڑے کر کے ان کے سروں پر موٹی گرہ لگا کر میں نے بانو کو طریقہ سمجھایا کہ کس طرح شکار کے گلے میں رسی ڈال کر اسے کھینچتا ہوگا جس سے وہ بے بس ہو جائے اور زیادہ مزاحمت نہ کر سکے۔ رات سونے سے پہلے ہم نے راڈز سے حملے کی مشق کی۔ اصل میں مشق بانو نے کی۔ میں نے اسے متواتر وار کرنا سکھایا۔ جس میں فریق کو سنہلنے کا موقع نہ ملے۔ بانو نے پوچھا۔

”اگر فرض کریں یہ ہمیں الگ کر دیں۔ مجھے آپ کی مدد حاصل نہ ہو تو اس میں صورت میں کیا کروں۔“

”جس وقت یہ تمہیں قابو کر کے الگ کر رہے ہوں اس وقت مزاحمت مت کرنا کیونکہ وہ پوری طرح ہوشیار اور تعداد میں زیادہ بھر مسلح بھی ہوں گے۔ جب کوئی اکیلے تمہارے پاس آئے تب تم اس پر قابو پاسکوگی۔ تمہیں پستول یا اس جیسا کوئی ہتھیار حاصل کرنا ہوگا۔“

”مجھے چلانا نہیں آتا ہے۔“

”بہت آسان ہے اور اسے درست طریقے سے پکڑنا تو آتا ہوگا۔ اس کے بعد کام آسان ہو جائے گا۔ تم اگر راج کنور کو پرغمال بنا لو تو ان سے اپنی بات منوا سکتی ہو لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ موقع ملنے پر تم اسے قتل کرنے کے بجائے ناکارہ کر دو۔ کامیابی کی صورت میں تم مجھے بلواؤ گی اور اس کے بعد ہم مل کر ملے کریں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔“

اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں سے نکلنے کا ایک یہی طریقہ ہے۔ اچھا ہوا میں نے آپ سے بات کر لی اب واضح ہے کہ ہنگامی صورت حال میں مجھے کیا کرنا ہے۔“

”ممکن ہے راج کنور ہاتھ نہ آئے تو اس صورت میں تم کسی اور کو قابو کر سکتی ہو لیکن راجس سے الجھنے سے گریز کرنا مجھے وہ بہت خطرناک اور ماہر آدمی لگتا ہے۔ النام پر قابو پالے گا اور پلان ناکام ہو جائے گا۔ تمہارا بہترین ہتھیار عورت اور بے ظاہر کمزور ہونا ہے۔ اس لیے تم اسے استعمال کرنا اور انہیں کمزور ہونے کا تاثر دینا جب دھوکے میں آجائیں تب وار کرنا۔ ایک بار پھر کہہ دوں کچا وار کرنے کے بجائے صبر سے کام لینا بے شک تمہیں تھوڑا بہت برداشت بھی کرنا پڑے تو کر لینا میری بات سمجھ رہی ہونا؟“

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا وہ مجھ گئی کہ میں اس کی نسوانیت کے حوالے سے بات کر رہا ہوں کہ اس حوالے سے ان لوگوں کی حرکتیں بھی برداشت کرے۔ اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں آپ کی ہدایات پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔“

”سو تے وقت اپنے ہتھیا را اپنے پاس رکھا۔“ میں نے کہا۔ ”جوڑے کی سلاخ اور چھوٹی سی رسی تم اپنے لباس میں چھپا سکتی ہو۔“

یہ ساری گفتگو حسب معمول لکھ کر کی جا رہی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ پہلی کی طرح ہمیں کھانے میں نیند کی دوا دی جائے گی۔ اس لیے ہم یہ کرتے تھے کہ پہلے بانو کھانا کھاتی اور اس کے نصف گھنٹے بعد میں کھاتا جب مجھے اطمینان ہو جاتا کہ کھانے میں کوئی خواب آور شے شامل نہیں ہے۔ خاص طور سے رات کے کھانے میں احتیاط کرتے تھے۔ میں نے بانو سے کہہ رکھا تھا کہ اگر وہ محسوس کرے کہ کھانے کے بعد اسے خلاف معمول غنودگی محسوس ہو رہی ہے تو تے کر کے پیٹ خالی کر لے۔ یہ ساری احتیاطیں اس لیے کی جا رہی تھیں کہ ہم بے خبری میں ان لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔ بلکہ یہ ہمارے لیے ایک چانس بھی تھا اگر ہمیں کھانے میں خواب آور دوا دی جاتی اور ہم اسے ناکام بنا دیتے تو راج کنور اینڈ پارٹی پر قابو پا سکتے تھے۔ راج کنور اصل آدمی تھا وہ ہمارے ہاتھ آ جاتا تو ہم اس کے آدمیوں سے کچھ بھی منوا سکتے تھے۔

منشی جی دوبارہ نہیں آئے اور نہ ہی خون لینے پر اصرار کیا اس کا مطلب تھا کہ اب انہیں میرے خون کی ضرورت نہیں تھی۔ خون کی ضرورت بڑے کنور کو تھی اور اس کے خلاف سازش کی جا رہی تھی جو یقیناً اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ فی الحال سازشیوں کی ساری توجہ اس طرف تھی اس لیے ہم محفوظ تھے لیکن جیسے ہی وہ بڑے کنور پر غلبہ حاصل کرتے یقیناً اس کے بعد ہماری باری آتی۔ یہ آریا پار والا معاملہ ہوتا۔ اس میں یا تو دشمن کامیاب ہو جاتا یا پھر ہم اس کے جنگل سے آزاد ہو جاتے۔ میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ہم نے راج کنور پر قابو پالیا اور اس کی مدد سے یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہے تو محفوظ جگہ پہنچتے ہی میں اس سانپ کا سر پکچل دوں گا۔ وہ ایسا دشمن تھا جو کبھی دشمنی ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوتا اور اسے چھوڑ دیتا تب بھی وہ میرا پیچھا نہ چھوڑتا۔ اسی طرح مجھے موقع ملتا تو تائیک اور رامن دونوں کو زکھ کا نکت تھاتا۔ مگر یہ سب موقع ملنے پر تھا۔

اگلے دن اوشا غیر متوقع آئی۔ بہ ظاہر وہ نئے تو لیے لے کر آئی تھی۔ شاید راج کنور کی طرف سے اس پر پابندی عائد نہیں کی گئی تھی وہ اسی کا فائدہ اٹھا رہی تھی لیکن اس نے آتے ہی اشارہ کیا کہ اس کے پاس وقت کم ہے اور میں اس سے داش روم میں بات کروں۔ ہم داش روم میں آئے تو اس نے جان بوجھ کر میرے گلے سے لگ کر کان میں سرگوشی کی۔ ”شہباز یہاں گڑ بڑ ہے۔ محل میں نوکر کہہ رہے ہیں کہ بڑے کنور کو اس کے کمرے میں قید کر دیا ہے اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے دروازے پر راج کنور کے گور کھے نوکر ہیں۔ میں نے ایک بار جانا چاہا پر انہوں نے روک دیا میں نے صفائی کا بہانہ کیا تھا۔“

”اوشا راج کنور سازش کر رہا ہے اور وہ کامیاب رہا تو جانتی ہو کیا ہوگا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”وہ تجھے مار دے گا اور اسے اپنی رکھیل بنا لے گا۔“ اس کا اشارہ بانو کی طرف تھا۔ میں نے سوچ کر کہا۔

”سن اب تو بڑے کنور کی طرف نہیں جائے گی۔ وہ کاغذ کہاں ہے؟“

وہ ذرا پیچھے ہٹی اور اپنے بلاؤز سے کاغذ نکالا وہ اس کے بدن کی گری اور نمی سے پسچا ہوا تھا۔ میں نے اسے جیب میں ڈال لیا۔ ”اوشا اب تو ایک کام اور کرے گی۔ کیا تو بارہو جی خانے میں جا سکتی ہے؟“

”ہاں جاسکتی ہوں۔“

”وہاں ایک پٹھان دل نواز خان ہے وہی ہمارے لیے کھانا تیار کرتا ہے۔“

”جانتی ہوں رے آگے بول۔“

”تمہیں اس پر نظر رکھنی ہوگی۔ ہمیں پہلے بھی کھانے میں کوئی دوا دی گئی تھی جس سے ہم بے ہوش ہو گئے

تھے۔ اب بھی شاید ایسا ہو۔“

”اگر ہمیں پتا چل جائے تو ہم کیا کریں؟“

”تم کسی بھی طرح مجھے خبردار کرو گی۔“ میں نے کہا۔ ”اوشا مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اگر میں یہاں

سے نکلنے میں کامیاب رہا تو تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”سچ؟“

”ہاں کیونکہ تمہیں یہاں چھوڑا تو یہ سفاک لوگ تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ تم میرا ساتھ دو گی تو میں تمہیں

مرنے کے لیے چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں۔“

وہ مزید خوش ہو کر مجھ سے مزید چپک گئی تھی۔ ”اگر میں جان دے کر تجھے بچا سکتی ہوں تو جرور بچاؤں

گی۔“

”اب تم جاؤ اگر زیادہ دیر یہاں رہیں تو ان لوگوں کو شک ہو سکتا ہے اور وہ تم پر پابندی لگا سکتے ہیں یا تم کو

جی نہیں تیر کر دیں گے اور تم کچھ نہیں کر سکو گی۔“

”یہ تو ہے رے۔“ اس نے بے دلی سے کہا اور بادل ناخواستہ مجھ سے الگ ہوئی۔ مجھے خیال آیا اور میں

نے پوچھا۔

”باہر پہرے پر کون ہے؟“

”رامن ہے۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”اس کے ساتھ ایک گورکھا ہوتا ہے۔“

”رامن دن رات تو نگرانی نہیں کر سکتا ہے رات کے وقت کون ہوتا ہے۔“

”پتا نہیں رات کو ہم ادھر آئے نہیں۔“

”آج رات آنے کی کوشش کرنا اور پھر دیکھنا کہ یہاں کون ہوتا ہے؟“

بانوا اپنے کمرے میں تھی۔ دو پہر کے کھانے کے بعد میں نے اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔

”ایسا لگ رہا ہے وہ وقت قریب ہے جب راج کنور ہمارے خلاف حرکت میں آئے گا۔ بڑا کنور تقریباً قید تھا لی

میں ہے۔“

”اگر یہ اس پر قابو پا چکے ہیں تو ہمارے خلاف اتنے سکون سے کیوں بیٹھے ہیں؟“

”میرا خیال ہے کچھ معاملات ہیں جو ابھی راج کنور دیکھ رہا ہوگا۔ جاگیر اور دوسرے کئی معاملات ہو سکتے

ہیں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ بڑے کنور سے ملکیت منتقل کرانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ بڑے کنور کو راستے سے

ہٹانے سے پہلے یہ ضروری ہوگا۔ بہر حال راج کنور ہمیں بھولا نہیں ہوگا وہ بے تابی سے ہمارے خلاف کچھ کرنا چاہ

رہا ہوگا۔“

”تب ہمیں بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ میں نے تائید کی اور بڑے کنور کے لیے لکھا ہوا کاغذ بھی اس کے حوالے کر دیا کہ وہ دوسرے کاغذات کے ساتھ اسے بھی جلا دے۔ میرے اندر ایک مسلسل بے چین کرنے والی کیفیت موجود تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ جلد کچھ وقوع پذیر ہونے والا ہے۔ رات کا کھانا خلاف توقع دل نواز خان کے بجائے ایک اور ملازم لایا۔ وہ شکل و صورت سے بیٹو کا ہم قبیلہ لگ رہا تھا۔ اس نے طریقے سلیقے سے کھانا میز پر لگایا اور چلا گیا۔ حسب معمول پہلے بانو نے کھایا۔ میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے بیس منٹ میں کھانا ختم کر لیا تھا اور سر کے اشارے سے اُسے کہا لیکن میں نے کچھ دیر اور انتظار کرنے کا سوچا۔ بعض خواب آور دوائیں دیر سے اثر کرتی ہیں۔ بانو اٹھی تھی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھی کہ رک گئی اس نے سر ہٹا لیا اور پریشان نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں تیزی سے اسے کے پاس آیا۔

”کیا ہوا؟“

”سر چکر رہا ہے اور دل گھٹ رہا ہے۔“

میں اسے بازو سے تھام کر واش روم میں لایا اور شاور چلا دیا۔ ”الٹی کر دو، جلدی.....“ اس نے کموڈ پر جھکتے ہوئے کوشش کی۔ پھر بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ”نہیں ہو رہی ہے۔“

”پلیز کوشش کر دو رنڈو! تمہیں بے ہوش کر دے گی۔“

اس نے حلق میں انگلیاں ڈالیں اور بھر کوشش کی اس بار اسے ابکائی آگئی۔ کوشش کر کے اس نے کھایا پیا نکال دیا تھا۔ اگرچہ وہ ساری خوراک نکال نہیں سکی تھی، لیکن کھانے کا بڑا حصہ باہر آ گیا اور اس کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی تھی۔ پھر اس نے منہ دھویا۔ وقت کم تھا ہم باہر آئے۔ میں نے دل پر جبر کر کے کھانے کا اتنا حصہ ضائع کیا جتنا میں کھاتا تھا تاکہ آنے والوں کو شک نہ ہو۔ ہمارے برتنوں میں کچھ کچھ کھانا موجود تھا۔ پھر میں اور بانو اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے اشارے سے کہا کہ وہ یوں ظاہر کرے جیسے نیند آ رہی ہے۔ اس نے بلند آواز سے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ”آج اتنی جلدی نیند آنے لگی ہے۔“

”ہاں مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔“ میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ”کہیں ان لوگوں نے پھر کھانے میں کچھ ملا تو نہیں دیا ہے۔“

”ہاں شاید.....“ بانو بولی۔ میں نے اشارے سے اسے ساکت ہو جانے کو کہا۔ اس کی آنکھیں سچ سچ بوجھل ہو رہی تھیں اور مجھے خدشہ تھا کہ وہ سوئی نہ جائے۔ وہ خود بھی یہ بات محسوس کر رہی تھی اس لیے جاگنے کی کوشش کرتے ہوئے بار بار اپنی انگلی انگلیوں سے کاٹ رہی تھی۔ خود کو تکلیف دے کر ذہن پر چھاتی غنودگی کو بھگا رہی تھی۔ کھانے سے پہلے مجھے بھوک لگ رہی تھی لیکن یہ جان کر بھوک اڑ گئی کہ کھانے میں خواب آور دوا موجود ہے۔ میں نے اٹھ کر دروازے سے کان لگا کر سن گئی لیکن باہر مکمل سناٹا تھا۔ بانو نے میری طرف دیکھا اور اشارے سے کہا کہ وہ نیند بھگانے کے لیے درزش کرنا چاہتی ہے۔ میں نے سر ہلا کر اجازت دی تو اس نے اٹھ کر اسکیپنگ شروع کر دی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ جیسے ہی باہر کوئی آہٹ ہو وہ واپس اپنی نشست پر آکر سوتی بن جائے۔ میں جسم ڈھیلا چھوڑ کر صوفے پر ذرا پھیل کر بیٹھ گیا۔ تقریباً نصف گھنٹہ گزر گیا۔ میرے حساب سے اب تک انہیں آجانا چاہیے تھا۔ مگر کوئی نہیں آیا تھا۔ بانو نیند بھگانے کے لیے وقفے وقفے سے درزش کر رہی تھی۔

اچانک دروازے پر کھٹکا ہوا۔ بانو صوفے سے دوڑ تھی اور اس کے پاس موقع نہیں تھا۔ اس نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا اور نیچے قالین پر گر گئی اور وہیں ساکت ہو گئی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور نیند کے انداز میں گہرے لیکن سُست سانس لینے لگا۔ آنے والے دو تھے اور میں نے رامن کی منحوس آواز سنی۔

”گئے دونوں؟“

”ہائے کیا سندر تار ہی ہے۔“ ٹائیک نے لپٹائے انداز میں کہا۔ ”کیسی بھری بھری ہو رہی ہے۔“

رامن کو اس کا تبصرہ ناگوار گزرا۔ ”زیادہ قوی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے راج جی کے بیڈ روم میں پہنچانا ہے۔“

”جرور۔“ ٹائیک ہنسا۔ ”اس کے بعد تو ہمیں ہی ملے گی۔“

ان دونوں کی بکواس سن کر میرا خون کھولنے لگا تھا نہ جانے بانو کا کیا حال تھا لیکن غنیمت رہا کہ اس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ ٹائیک میری طرف آیا۔ اس نے بکواس جاری رکھی تھی لیکن اس کا رخ بدل گیا تھا اب وہ مجھے گالیاں دیتے ہوئے بڑکیں مار رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ رامن نے پھر ٹوکا۔ ”جب موقع تھا تب تو کچھ کر نہیں سکے۔“

ٹائیک کھسیا گیا۔ ”اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”ٹھیک نہیں تھی یا اس نے ٹھیک کر دی تھی۔“ رامن نے طنز کیا۔

”اب میں اسے بتاؤں گا۔“ ٹائیک نے مشتعل ہو کر میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ میں ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھا اس لیے بے ہوش آدمی کا سارِ عمل دیا۔ میرا سر بے جان انداز میں گھوم گیا۔ ان دونوں کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ رامن اب ٹائیک سے برتر حیثیت رکھتا تھا کیونکہ ٹائیک اس سے دب کر بات کر رہا تھا اور وہ اسے ذلیل کیے جا رہا تھا اگر وہ اس کے مساوی ہوتا تو ٹائیک یقیناً اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ وہ بات برداشت کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ رامن نے پھر اسے ٹوکا۔

”زور بعد میں دکھانا ابھی تو اسے اس کے اصل ٹھکانے پر لے جاؤ۔“

”میں اسے راج جی کے کتوں کو کھلاؤں گا۔“ ٹائیک کتے کی طرح بھونکا اور اس نے مجھے کھینچ کر صوفے سے نیچے گرادیا۔ ”اس وزنی لاش کو میں اکیلے کیسے لے جاؤں گا۔“

”تب کسی کو بلاؤ۔“ رامن نے لا پرواہی سے کہا اور بانو کو اٹھا کر شانے پر ڈال لیا۔ کروٹ کے بل گرنے سے مجھے یہ فائدہ ہوا تھا کہ میں آنکھوں میں جھری پیدا کر کے دیکھ سکتا تھا۔ رامن بانو کو لے کر چلا گیا اور ٹائیک میرے ساتھ وہاں رہ گیا تھا۔ رامن کے حکم کے باوجود اس کے دماغ سے کیڑا نکلا نہیں تھا اور جیسے ہی رامن بانو کو لے کر وہاں سے نکلا اس نے جلدی سے اندر سے دروازہ بند کیا اور تیزی سے میری طرف آیا۔ اس کے عزائم خطرناک لگ رہے تھے اس نے اپنے کرتے کی جیب سے ایک چھوٹا کھل جانے والا چاقو نکالا اور میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ابھی تجھے مجا آئے گا.....“ جملے کے آخر میں اس نے ایک گندی گالی دی اور میرے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پکڑی تھی کہ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور اس سے پہلے کہ ہوشیار ہوتا میں نے سر ایک

سے بھر پور نگر اس کی ناک پر رسید کیا۔ وہ یقیناً حلق پھاڑ کر چلانا چاہتا تھا لیکن گردن میری گرفت میں تھی اس کے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہیں نکل سکی تھی۔ دوسری ٹکڑ پر وہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ دروازہ وہ پہلے ہی اندر سے بند کر چکا تھا اس لیے اس کی فکر نہیں تھی کہ کوئی اندر آجائے گا۔ میں نے چھوٹی رسی نکالتے ہوئے اس کے گلے میں ڈالی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی تلاشی لیتا رہا لیکن اس بد بخت کے پاس سوائے اس چاقو کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے رسی اس طرح کھینچی ہوئی تھی کہ وہ سانس لیتا رہے لیکن اگر آواز نکالنے کی کوشش کرے تو وہ اس کمرے سے باہر نہ جائے۔ اس لحاظ سے میں بے ڈر تھا کہ جب تک نائیک خود کسی کو نہ بلاتا کوئی یہاں نہیں آتا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ ان دونوں کے ساتھ ہی آتا۔ اس کی تلاشی لے کر میں نے اسے جھکا دے کر قالین پر چرت لٹایا اور اسی چاقو اس کی گردن سے لگایا تو اس کی گھگی بندھ گئی تھی۔ وہ سمجھا میں اس کا گلا کاٹنے والا ہوں۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”شہباز جی مجھے نہ مارو۔“

”کیوں؟“ میں نے خونخوار سرگوشی کے ساتھ پوچھا۔ ”تم اس قابل ہو کہ تمہیں معاف کیا جائے؟“

اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ ”میں نوکر ہوں جو مالک کہتے ہیں کرتا ہوں۔“

”اگر تم مالک کے کہنے پر عمل نہ کرو تو.....؟“

”تو وہ مالک ہیں مار ڈالیں گے۔“

”اب تمہارا آقا میں ہوں۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو زندہ نہیں رہو گے۔“ میں نے اسے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔

وہ کھڑے ہوتے ہوئے خوشامد انداز میں بولا۔ ”مانوں گا جو تم کہو گے مانوں گا۔“

”باہر کون کون ہے؟“

”صرف ایک گور کھا ہے۔“

”اسے اندر بلاؤ۔“ میں نے اس کی گردن پر چاقو رکھتے ہوئے کہا۔ پھر مشین سے لوہے کا پائپ نکالا اور دروازے کے پاس نائیک کے ساتھ یوں کھڑا ہو گیا کہ آنے والا گور کھا مجھے فوراً نہ دیکھ سکے۔ صرف بے ہوش ہونے سے پہلے دیکھ سکے۔ نائیک نے آدھا دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کو کہا۔ عقب سے چاقو کی نوک نائیک کی گردن سے لگی تھی اور میں پوری طرح تیار تھا اگر وہ کوئی اشارہ کرتا یا آواز نکالتا تو میں بلا تکلف اس کی گردن کاٹ دیتا اور اس کے حکم پر اندر آیا۔ میں نے دروازہ بند کیا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اس کا ہاتھ اپنے شانے پر موجود رائل کی طرف گیا لیکن اس سے پہلے لوہے کا وزنی پائپ اس کے سر پر لگا دیا چکر اکر نیچے گرا تھا۔ اس موقع پر نائیک نے چالاکی کی وہ گور کھے کے زیادہ نزدیک تھا اس نے گور کھے کی گن اتارنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا کرتہ پکڑ کر اسے پیچھے کھینچا اور قالین پر پھینک دیا۔ گور کھے کے سر پر ایک اور ضرب لگا کر اس کی بے ہوشی کو پکا کیا اور پھر اس کے شانے سے لٹکی خود کار رائل اتار لی۔ یہ شاید بھارتی ساختہ جی ٹورائل کا کوئی ورژن تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے میں نے کبھی یہ گن نہیں دیکھی تھی لیکن اس کے فنکشن تقریباً دوسری سروسج خود کار

رائفوں جیسے تھے۔ میرے ہاتھ میں رائفل آتے ہی ٹائیک پھر شریف بن گیا تھا۔ گورکھے کے پاس اس کا ایک اضافی میگزین بھی تھا۔ اس کی بعض دیکھی۔ بعض سسٹ تھی اور دو تین گھنٹے سے پہلے اس کے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

میں نے ٹائیک کی طرف دیکھا جو خوف زدہ لگ رہا تھا اس نے رعایت حاصل کرنے کا موقع گنوا دیا تھا۔
”اب بتاؤ یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”تم بے ہوش نہیں ہوئے؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہم نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ بانو کو کہاں لے گئے ہیں۔“

”راج جی کے بیڈروم میں۔“

”راج کا بیڈروم کہاں ہے؟“ میں نے اپنے اندر ابھرتے اشتعال کو باتے ہوئے بولا۔

”اسی محل میں ہے۔“

میری ٹکڑوں نے ٹائیک کی ناک کو افسوسناک بنا دیا تھا لیکن وہ کتے کی دم اتنی آسانی سے سمجھنے والا شخص نہیں تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر اچانک اس کے سر پر گھونہ مارا۔ وہ کراہ کر زمین پر دراز ہوا تو میں نے اسے اونٹ سے منہ لٹا کر ری سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور منہ میں ایک چھوٹا تولیہ ٹھونس دیا۔ پھر میں نے چاقو کی نوک اس کی کلائی پر آزمائی تو وہ تڑپ گیا لیکن میں نے پروا کیے بغیر پہلے ایک ہاتھ اور پھر دوسرے ہاتھ پر چار پانچ انچ لمبے اور کوئی نصف انچ گہرے کٹ لگائے۔ میرا گھٹنا اس کی پشت سے لگا ہوا تھا اس لیے وہ بل بھی نہیں سکھتا تھا۔ بس تڑپ رہا تھا۔ میں نے جھک کر کہا۔ ”ٹائیک..... تم میرے کچھ سوالوں کا جواب دو گے۔ ہر غلط بیانی اور جواب سے انکار پر ایسے ہی ایک زخم کا اضافہ ہوتا رہے گا۔“

اس نے سر زمین پر بیٹھ کر اقرار کیا۔ میں نے اسے آواز کے معاملے میں خبردار کرتے ہوئے کہہ دیا کہ اس کے منہ سے نکال دیا۔ اس نے ناک سے رونے جیسی آواز نکالتے ہوئے کہا۔ ”بھگوان کے لیے اب کچھ مت کرنا میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔“

”راج کا بیڈروم کہاں ہے؟“

”یہاں ہے کچھ دور ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں تمہیں لے چلتا ہوں۔“

”کتنی دور ہے اور کہاں کہاں سے گزرتا پڑے گا تفصیل سے بتاؤ۔ راستے میں دوسرے گارڈز اور کیمرے بھی ہوں گے۔“

”میں تمہیں ایسے راستے سے لے جاؤں گا جہاں کیمرے اور گارڈز نہیں ہوں گے۔“ وہ سکتے ہوئے بولا۔ وہ چھوٹے دل کا آدمی تھا لیکن اس وقت تو بچوں سے بھی گیا گزرا ہو رہا تھا۔

”ٹائیک تم مجھے جانتے ہو اور میری پوزیشن بھی سمجھ رہے ہو۔ میرے لیے یہ آریا پار والا معاملہ ہے یا تو میں بچ نکلوں گا یا یہیں مارا جاؤں گا لیکن ایک بات یقینی ہے یہاں مارے جانے کی صورت میں مرنے والا میں کیلا نہیں ہوں گا اس میں اور بھی لوگ شامل ہوں گے۔ ان میں سے ایک فرد کے بارے میں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے لہجہ کو خوفناک بناتے ہوئے کہا۔

”کک..... کس کے بارے میں؟“ وہ ہکلا یا۔

میں نے اسے گردن سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ ”تمہارے بارے میں..... تم مرنے والوں میں شامل ہو گے۔ اس لیے زندہ رہنا چاہے ہو تو کوشش کرو کہ مرنے مارنے کی نوبت نہ آئے۔ میرا پلان بہت سادہ اور بڑا امن ہے میں راج کنور کو بریغمال بنا کر اپنی ساتھی سمیت بحفاظت یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں جب کسی محفوظ جگہ پہنچ جاؤں گا تو راج کنور کو بھی چھوڑ دوں گا تم نے تعاون کیا تو ظاہر ہے تم زندہ رہو گے۔“

میں اسے امید دل رہا تھا ورنہ اسے اپنی زندگی کے بارے میں زیادہ خدشات لاحق ہوتے تو وہ جان بچانے کی کوشش ضرور کرتا۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”تم مجھے چھوڑ دو گے؟“

”کیوں نہیں کیا مجھے تمہارا چارڈالنا ہے اور دوسرے میں تم لوگوں کی طرح نفسیاتی مریض نہیں ہوں جو بلا وجہ دوسروں سے ہیر پال لوں۔ ٹھیک ہے تم لوگوں نے میرے خلاف سازش کی اور مجھے مارنے کی کوشش کی لیکن اگر تم اور راج کنور مجھ سے تعاون کریں تو میں دشمنی بھول جاؤں گا۔ اس صورت میں تمہیں مار کر میں بھارتی پولیس کو اپنے پیچھے لگانا پسند نہیں کروں گا۔“

اس نے رون ا اور کراہنا بند کر دیا تھا۔ اس نے میری بات پر غور کیا اور سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں تمہیں لے جاؤں گا لیکن ایک بات یاد رکھنا اگر یہاں گولی چلی، مجھے یا راج جی کو نقصان ہوا تو پھر تم لوگوں کا نکلنا ناممکن ہو گا۔“

”فکر نہ کرو مجھے اپنی زندگی پیاری ہے لیکن میں کوئی چکر بازی برداشت نہیں کروں گا۔ اس لیے شرافت سے چلتا۔“

”اس حصے میں کسرے اور گارڈز نہیں ہیں پر راج جی کی کھاس کھاو مائیں ہیں۔“

میں سمجھ گیا وہ راج کنور کی حرم سرا کی بات کر رہا تھا وہیں کسروں اور مرد گارڈز کی موجودگی ممکن نہیں تھی لیکن وہاں تک جانے کے لیے بھی تو ہمیں محل کے دوسرے حصوں سے گزرنا پڑتا۔ یہ بات میں نے ٹائیک سے کہی۔ ”تم فکر مت کرو ہمیں کوئی نہیں ملے گا۔“

ٹائیک کی کلائیوں اور آستین لہولہان : رہی تھیں پہلے اس نے واش روم میں سرد پانی سے اپنے زخم دھوئے اس سے خون رک گیا تھا۔ آستینیں خود دھل گئی تھیں۔ تکلیف سے اس کی کراہیں نکل رہی تھیں۔ میں نے لوہے کے دونوں پائپ ساتھ لے لیے تھے۔ انہیں عقب میں ٹراڈز میں اڑس لیا۔ پہلے ٹائیک باہر نکلا اور میں اس کے بالکل پیچھے تھا۔ رائفل کی نال اس کی پشت سے لگی تھی اور میں نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ میری انگلی ٹریگر پر ہے اور کسی بھی غیر متوقع صورت حال میں اسے زکھ رسید ہونے میں ایک لمحہ لگے گا۔ میں اس سے یوں لگ کر چل رہا تھا کہ کوئی دیکھتا تو اسے رائفل نظر نہ آتی۔ ویسے بھی یہ چھوٹے دستے والی گن تھی۔ کمرے کا دروازہ میں نے اندر سے لاک کر کے بند کیا تھا اب باہر سے کوئی اسے بغیر چابی کے نہیں کھول سکتا تھا۔ پہلے چابی گور کھے کے پاس تھی اور اب میری جیب میں تھی۔ پہلی راہداری میں ٹائیک بائیں طرف مڑ گیا۔ جب مجھے کلینک لے باتے تھے تو دائیں طرف جاتے تھے۔ بڑے کنور کی رہائش گاہ بھی اسی سمت میں آتی تھی میں پہلی بار محل کے اس حصے میں جا رہا تھا اور یہ میرے لیے مکمل اجنبی تھا۔

مجھے اوشا کا خیال بھی آیا تھا میں نے اسے دل نواز خان کی نگرانی کرنے کو کہا تھا کہ وہ کھانے میں کچھ شامل کرے تو مجھے خبردار کر دے۔ شاید اسے موقع نہیں ملا تھا۔ پھر کھانا بھی کوئی اور لایا تھا اس لیے اوشا کو خبر بھی نہیں ہوئی ہوگی۔ ورنہ وہ لازمی مجھے خبردار کرتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود کسی مشکل میں پڑ گئی ہو۔ مگر فی الوقت میں اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اس جگہ پہلا موقع ملا تھا اور میں اسے ذرا سی غفلت سے گنوا تا نہیں چاہتا تھا۔ تانیک کو قبضے میں کر کے میں نے کوئی بہت بڑا کام نہیں کیا تھا۔ تانیک راج کنور کے کتنا ہی قریب سہی لیکن تھا تو ایک ملازم اور وہ اپنا مفاد و جان خطرے میں دیکھ کر بے دریغ اسے قربان کر دیتا۔ یہ بات تانیک بھی سمجھتا تھا اس لیے وہ پوری احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ کوئی موڑ مڑنے سے پہلے وہ جھانک کر دیکھتا تھا۔ ہم دو راہداریاں عبور کر چکے تھے اور اب تک کوئی فرد نظر نہیں آیا تھا جہاں تک میں نے دیکھا تھا کوئی کیسرہ بھی نظر نہیں آیا تھا ہاں کوئی پوشیدہ کیسرہ لگا ہو تو مجھے خبر نہیں تھی۔ تانیک ایک بڑے سے دروازے کے سامنے رکا۔ اس پر لکڑی کے کام سے فاشی کے ایسے نمونے تیار کیے گئے تھے کہ بیان سے باہر تھے۔

”یہاں کیوں رکے ہو؟“ میں نے ممکنہ حد تک دھیمی آواز میں پوچھا۔

”یہی راج جی کا حصہ ہے۔“

جب دروازہ ایسا رنگین تھا تو اندر کا تصور کیا جاسکتا تھا۔ میں نے سرگوشی کی۔ ”راج جی کی اولاد، اندر کیسے جائیں گے؟“

”میں کھلواتا ہوں میں یہاں جاسکتا ہوں۔“ اس نے کہا اور ہاتھ بڑھایا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔

”ایک منٹ ذرا ادھر آؤ۔“ میں اسے کھینچ کر راہداری کے ایک ایسے گوشے میں لے گیا جہاں نسبتاً تاریکی تھی۔ ”تم دروازہ کھلاؤ گے تو کھولے گا کون؟“

”چنبیلی کھولے گی۔“

”یہ چنبیلی کون ہے؟“

راج جی کی کھاس ملاجمہ ہے۔ وہ یہاں کی نگران بھی ہے۔“

”اور کتنی عورتیں ہیں۔“

آٹھ ہیں۔“ تانیک نے ہونٹوں پر زبان بھیری۔ ”راج جی نے پورے ہندوستان سے جن کرہیرے جمع کیے ہیں۔“

میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ اگر آٹھ مرد ہوتے تو مجھے اتنا خطرہ نہ ہوتا لیکن آٹھ عورتوں کو خاموش کرانا دنیا کا دشوار ترین کام ہے ان میں سے کسی ایک پر بھی ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا۔ تو میں ناکام ہو سکتا تھا۔ میرے لیے اہم ترین امر راج کنور پر قابو پانا تھا۔ وہ عیار آدمی اگر خطرہ بھانپ کر غائب ہو جاتا تو میں اور بانو یہاں پھنس کر رہ جاتے۔ پھر آزادی کے لیے ہمیں اپنی جان پر کھیلنا پڑتا۔ میں نے پوچھا۔ ”چنبیلی کے پاس اسلحہ ہوتا ہے؟“

”میں نے تو نہیں دیکھا۔“

”وہ لباس میں چھپا سکتی ہے۔“

تانیک ہبلی بار مسکرایا۔ ”وہ اور دوسری عورتیں جو پہنتی ہیں اسے لباس نہیں کہا جاسکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے دروازہ کھلواؤ اور یہ تمہارا کام ہو گا کہ چنبیلی کو قابو کرو۔“
”میں کیسے؟“ وہ بدکا۔

”مرد ہو ایک نازک عورت کو قابو نہیں کر سکتے۔“ میں نے اسے جھاڑا۔ ”گلاز دینا لیکن مارنا مت بے ہوش کرنا۔“

اس نے بادلپا نا خواستہ سر ہلایا۔ راج کنور کی خاص خادمہ پر ہاتھ اٹھانے کے خیال سے وہ ڈر رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے سمجھایا کہ کام پوری طرح سے کرنا۔ کوئی کسر رہ گئی اور ہنگامہ ہوا تو سب سے پہلے وہ مارا جائے گا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔ انداز مخصوص تھا فوراً ہی اندر سے ایک لوچ دار آواز آئی۔ ”کیا ہے نائیک؟“

”دروازہ کھول چنبیلی، راج جی سے ملنا ہے۔“

”راج جی تو اس وقت یم دود سے بھی نہ ملیں۔“ چنبیلی معنی خیز انداز میں بولی۔ ”آج تو ان کی دل پسند ناری آئی ہے بیڈروم میں۔“

”چنبیلی وقت ضائع مت کر، معاملہ بہت اہم ہے راج جی کو فوراً بتانا ہے۔“ اس بار نائیک نے سخت لہجے میں کہا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اندر سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے نائیک کو آگے دھکیلا اور وہ چنبیلی کو عملدرمژتا ہوا اندر گیا تھا۔ چنبیلی نے ہلکی سی برہم آواز نکالی۔

”یوں کیوں گھسا آ رہا ہے۔“

مگر مجھے دیکھتے ہی اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی تھی۔ میں نے رائفل کا رخ ان دونوں کی طرف کیا اور نائیک سے بولا۔ ”اپنا کام کرو۔“

جواب میں نائیک نے لپک کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ میں نے دروازہ بند کیا۔ یہ راہداری تھی جس کے دونوں طرف چار چار دروازے تھے اور ان میں یقیناً راج کا حرم مقیم تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا کہ وہاں اور کوئی عورت نہیں تھی۔ وہ یقیناً اپنے کمروں میں تھیں۔ آخری حصے میں ایک بند دروازہ تھا اور وہ شاید راج کنور کے بیڈروم میں کھلتا تھا۔ چنبیلی کی زبانی سن کر کہ بانو راج کے بیڈروم میں پہنچ گئی تھی میرے اندر پھر وہی آگ سرسرا نے لگی تھی جو مجھے نتائج کی پروا کیے بغیر مرنے مارنے پر مجبور کرتی تھی۔ بانو کو مجھ سے جدا ہوئے آدھے گھنٹہ ہونے کو آیا تھا اور یہ وقت کافی سے زیادہ تھا۔ میں دعا ہی کر سکتا تھا کہ اللہ نے اسے اور اس کی عزت کو محفوظ رکھا ہو۔ دروازہ بند کر کے میں نے نائیک اور چنبیلی کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ نائیک با آسانی اس حسین عورت پر قابو پالے گا۔

وہ کسی قدر طویل قامت تھی اور نہایت متناسب جسم تھا۔ وہ عمر کے اس دور میں تھی جب عورت پر شباب اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ یعنی تیس بتیس سال کی تھی۔ اس نے ریٹیم جیسے کسی کپڑے کا ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ کپڑا اتنا ہلکا تھا کہ اس کی ٹانگیں جھلک رہی تھیں۔ اوپر اس سے بھی ہلکے کپڑے کا جھونسا کرتہ پہن رکھا تھا جس کا گریبان بلا ضرورت تا حد نگاہ کشادہ تھا۔ بلا ضرورت یوں کہ اگر کرتہ میں گریبان نہ ہوتا تب بھی سب نظر آ رہا تھا۔ مجھے نائیک سے اتفاق کرنا پڑا کہ اس ٹرانسپیرنٹ لباس میں اسلحہ چھپانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کی ذہنی حشر

سامانیاں کم نہیں تھیں مگر یہ اسلحہ موجودہ صورت حال میں بے کار تھا۔

لیکن اس وقت جو ہوا وہ میرے لیے غیر متوقع تھا۔ ٹائیک نے اس کا گلا دو جا تھا۔ جواب میں اس نے اپنا گھٹنا ٹائیک کے زیر ناف پر سید کیا۔ اس بد بخت نے فوراً اس کا گلا چھوڑ دیا۔ آزاد ہوتے ہی وہ سر جھکاتے ہوئے گھومی اور نیچے سے سراو پر لاتے ہوئے ٹائیک کے پہلے سے زخمی منہ پر مارا۔ ایک گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ ٹائیک اچھل کر پیچھے آیا اور اس کا ارادہ واویلا مچانے کا تھا۔ میں اس کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے میں نے عقب سے اپنے بائیں بازو کی کہنی اس کی گردن پر ماری اور وہ بنا کوئی آواز نکالے بغیر نیچے ڈھیر ہو گیا۔ دیز قالین کی وجہ سے کوئی آواز نہیں آئی۔ اس ایک وار نے بتا دیا تھا کہ چینیلی لڑنے بھڑنے میں مہارت رکھتی تھی۔ حالانکہ دیکھنے میں وہ قطعی بے ضرر اور عام سی عورت نظر آتی تھی۔ میں نے رائفل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ”کوئی آواز نہ نکالنا اور نہ حرکت کرنا ورنہ یہ تم سے زیادہ شور کر سکتی ہے۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟“ اس نے سکون سے پوچھا۔ وہ بالکل بھی ہراساں نہیں لگ رہی تھی۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ ٹائیک جیسے نامردوں کے مقابلے وہ کہیں زیادہ حوصلے والی تھی۔

”میری ساتھی راج کنور کے بیڈروم میں ہے۔ میں اس کی واپسی چاہتا ہوں۔“

”اب تو دیر ہو گئی ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ ”راج جی اپنا کام کر چکے ہوں گے۔“

”اس صورت میں مجھے راج سمیت تم سب کی جان چاہیے۔“ میں نے رائفل بلند کی۔ ”آگے چلو اور دونوں ہاتھ اوپر کرلو۔“

اس نے ہاتھ اوپر کیے اور بولی۔ ”لو کر لیے۔“

”تم راج کنور کی خاص خادمہ ہو اور پھر عورت ہو کسی بھی وقت اس کے بیڈروم میں جا سکتی ہو۔“

”ہاں میں کسی وقت بھی جا سکتی ہوں۔“

”تب چلو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”راج جی بعد میں مجھے معاف نہیں کریں گے۔“

”کسی کو معاف کرنے یا نہ کرنے کا مرحلہ بعد میں آئے گا۔ ابھی تو یہ فیصلہ ہونا ہے کہ میں اسے معاف کروں گا یا اس نے اپنے لیے معافی کا ہر دروازہ بند کر لیا ہے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ فکر مند نظر آنے لگی۔ میں نے پھر کہا۔ ”میں تین تک گنوں گا اور اس کے بعد تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ یہ دروازہ کھولنا کوئی مسئلہ نہیں ہے ایک برسٹ اسے کھولنے کو کافی ہوگا۔ ایک..... دو..... تین۔“

”اوکے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”میں تیار ہوں لیکن دروازہ کھلے گا یا نہیں میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ راج جی انکار کر دیں گے تو میں مجبور نہیں کر سکیں گی۔“

”تم فکر مت کرو پہلے دستک تو دو۔ دروازہ کھولنے کے اور بھی طریقے مجھے آتے ہیں۔“

وہ متوالی چال چلتے ہوئے دروازے تک پہنچی۔ اس نے مخصوص انداز میں دستک دی لیکن کچھ کہانی نہیں۔ اندر سے جواب نہیں ملا تھا۔ ایک منٹ بعد اس نے پھر دستک دی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”اگر تم کوئی غلط اشارہ دے رہی ہو تو یہ اصل میں یم دود (موت کے فرشتے) کے لیے ہوگا۔“

دوسری بار جواب نہ ملنے پر اس کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی۔ ”ایسا کبھی نہیں ہوا راج جی جواب ضرور دیتے ہیں۔“

”فرض کر دوہ جواب دینے کے قابل نہ ہوں۔“

”وہ چونگی۔“ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ جس ناری کو تو نوالہ سمجھ کر یہاں بلوایا ہے وہ تم سے کم نہیں ہے۔“

”کیا اس نے راج جی کے ساتھ کچھ کیا ہے؟“

میں چنبیلی کی طرف سے ہوشیار تھا اور ایک فاصلہ رکھے ہوئے تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ”بالکل اب تم عام انداز میں دستک دو اور آواز سے بولو کہ اندر جو ہے وہ دروازہ کھول دے۔“

چنبیلی ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن جب میں نے رائفل کی ٹال اس کی طرف کی تو مجبوراً اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے زور سے دروازہ بھجایا اور بلند آواز سے بولی۔ ”اندر جو ہے دروازہ کھول دے۔“

اس کے فوراً بعد میں نے کسی قدر اونچی آواز میں کہا۔ ”بانو یہ میں ہوں۔ کیا تم اندر ہو؟“

میری آواز پر رد عمل ہوا اور اندر سے ایک ہلکی سی آواز آئی۔ ”شہباز یہ آپ ہیں؟“

”ہاں میں ہوں۔“ میں نے زیادہ بلند آواز سے کہا۔

یقیناً کمرہ ساؤنڈ پروف نوعیت کا تھا اور دروازے کے پاس پہنچ کر بلند آواز سے بولنے سے بھی شکل سے اندر سنائی دے رہی تھی۔ بانو کی آواز سن کر میں نے نہ جانے کتنی دیر بعد سکون کا سانس لیا تھا۔ یہ ظاہر میں اوپر سے پُر سکون تھا لیکن اندر سے تشویش سے برا حال تھا۔ بانو کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ آزاد ہے۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی صورت نظر آئی اور مجھے دیکھتے ہی وہ لپک کر آنے لگی۔ چنبیلی اسی لمحے کی منتظر تھی اس کے قریب آتے ہی اس نے بلا تکلف بانو کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ بانو کی رفتار کی وجہ سے قوت دوہری ہو گئی تھی۔ بانو کے لیے یہ وار غیر متوقع تھا وہ کراہ کر بھی تو چنبیلی نے مہارت سے اس کے بال پکڑے تو بے اسے گھمایا اور اپنے سامنے کر لیا۔ اس نے بانو کی گردن دائیں بازو سے کس لی اور بایاں ہاتھ اس کی دائیں کنٹھی پر جمادیا۔ ساتھ ہی اپنے پاؤں بانو کے پیروں میں اس طرح پھنسنائے کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ اس نے اتنی تیزی سے کیا کہ میں کچھ کر ہی نہیں سکا تھا۔ وہ طنز یہ انداز میں بولی۔

”بس اتنی سوراہے یہ؟“

”چھوڑ دو اسے ورنہ میں گولی مار دوں گا۔“

”مار دو پہلے یہ مرے گی۔“

وہ دھمکی نہیں دے رہی تھی چنبیلی نے بانو کو اس طرح جکڑا تھا کہ وہ اس کی گردن توڑ سکتی تھی اور یہ پیشہ ور اک تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ راج کنور کے حرم سرا کی نگران اتنی ماہر لڑاکا لگے گی۔ بانو خود کو چھڑانے کے لیے زور لگاری تھی مگر یہ طاقت کا نہیں بلکہ مہارت کا کھیل تھا اور مہارت میں وہ چنبیلی سے کمزور نہیں نظر آ رہی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اتنی کوشش کے بعد میں ہتھیار نہیں ڈال سکتا۔ تم بانو کو چھوڑ دو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“ میں کہتے ہوئے ایک قدم آگے آیا تو وہ بانو کو لیے ایک قدم پیچھے ہٹی اور دروازے میں داخل ہو گئی

لیکن وہ اسے بند نہیں کر سکتی تھی اس کے لیے اسے بانو کو چھوڑنا۔ میں مزید آگے بڑھا اور وہ اسی طرح پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ کمرے میں آتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا۔

یہ شاہانہ قسم کا کمرہ تھا۔ جس میں نہ صرف عیش و عشرت کے تمام لوازمات فراہم کیے گئے تھے بلکہ رنگین لٹوں کو دو بالا کرنے کے لیے تمام انتظامات بھی موجود تھے۔ کوئی شریف عورت اس کمرے میں ایک لمحے کے لیے بھی سر اٹھا کر نہیں رہ سکتی تھی۔ بانو اس حالت میں بھی گھبرائی ہوئی تھی اور چنبیلی بالکل ہر سکون تھی۔ راج کنور جہازی ساز گول بیڈ پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ یہ بیڈ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا جب بانو کو بے ہوش کر کے اس پر ڈالا گیا تھا اور ایک کمرہ یہ منظر دکھا رہا تھا۔ چنبیلی نے ایک نظر اسے دیکھا۔ ”کیا یہ مر گیا ہے؟“

”نہیں زندہ ہے حرکت تو کر رہا ہے۔“

ایک لمحے کو چنبیلی کی توجہ بیڈ کی طرف گئی اس کی گرفت بانو پر ڈراڈھیلی پڑی تھی۔ بانو بھی صبر سے انتظار کر رہی تھی اور اب تک اس نے معمولی سی مزاحمت نہیں کی تھی اسی وجہ سے چنبیلی اس کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوئی۔ بانو نے اس کا سر تھامتے ہوئے خود کو پوری قوت سے آگے جھکایا۔ چنبیلی عملاً اس سے چٹنی ہوئی تھی مگر اس کا جسم اوپر اور آزاد تھا نتیجے میں وہ گھوم کر سامنے قالین پر آگری اور بانو اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی لیکن جب بانو نے اسے گھومنے مارنے کی کوشش کی تو اس نے نیچے پڑے پڑے دونوں پاؤں جوڑ کر بانو کے سینے پر مارے اور وہ اچھل کر پیچھے جا گری۔ اسی لمحے میرے پاؤں کی ٹھوک چنبیلی کے سر پر لگی۔ اس نے آخری لمحے میں بچنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ وہ گھوم کر گری دوبارہ اٹھ رہی تھی کہ میں نے فولادی پائپ سے اس کا سر بجایا اور اس بار وہ سکون سے لیٹ گئی۔ میں نے بغیر کسی رعایت کے وار کیا تھا وہ نہایت خطرناک ثابت ہو رہی تھی اور اسے عورت ہونے کی رعایت دینا آخری غلطی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی پھر بھی میں نے نبض دیکھی۔ اس کی طرف سے اطمینان کر کے بانو کے پاس آیا وہ اٹھ گئی تھی۔

”کیسی ہوتی؟“ اسے تم نے قابو کیا ہے؟“ میں نے راج کی طرف دیکھا۔ وہ تکلیف میں تھی لیکن میرے سوال پر فخر سے مسکرائی۔

”ایک منٹ لگ تھا، میں نے اسے آواز نکالنے کا یا کسی کو مدد کے لیے بلانے کا موقع نہیں دیا۔“

بانو یہاں پہنچائی گئی راستے میں رامن نے کئی بار اس کے صبر کا امتحان لیا لیکن وہ خود پر ضبط کر کے بے ہوش بنی رہی۔ رامن اسے یہاں ڈال کر چلا گیا اور اس کے جاتے ہی راج کنور آ گیا۔ جیسے ہی نزدیک آیا۔ بانو نے لینے لینے اس کے حلق پر لات ماری۔ وار کی شدت بلکی رکھی تھی کہ گردن نہ ٹوٹ جائے مگر اس کی آواز بند ہو جائے۔ وہ کامیاب رہی۔ راج کنور نیچے جا کر اور سانس لینے کی کوشش کرنے لگا۔ بانو نے اٹھ کر اس کی گردن پر ہاتھ مارا۔ تیسرے وار پر وہ بے ہوش ہو گیا تھا اس کی بیہوشی کو یقینی بنانے کے لیے بانو نے اس کے کنبی پر کئی گھونے بھی رسید کیے تھے۔ پھر اسے کھینچ کر بیڈ پر ڈال دیا۔ اس نے جوش و خروش سے یہ سارا منظر نامہ بیان کیا۔

میں اسے داد دیتا رہا پھر میں نے بے اختیار اس کا شانہ چھپھپھایا۔

”تم نے کمال کر دیا۔“

”اس کے بعد میں انتظار کرنے لگی آپ نے کہا تھا کہ آپ آئیں گے۔“

”فرض کرو میں نہ آتا؟“

”تب میں راج کنور کے ہوش میں آنے کے بعد اس کی مدد سے آپ کو تلاش کرا کے یہاں بلوالیتی۔ میں اس کا دم خم دیکھ چکی ہوں اسے آسانی سے قابو کر سکتی ہوں لیکن یہ کیا بلا ہے؟“

”یہ راج کنور کے حرم سرا کی انچارج ہے اور میرا خیال ہے یہ مارشل آرٹ کی ماہر ہے اس نے ٹائیکو بھی مارا تھا۔“

بانو نے غور سے اسے دیکھا۔ ”دیکھنے میں تو عام سی لگتی ہے۔“

”مارشل آرٹ کے ماہر عام طور سے ہلکے اور عام سے جسم کے مالک ہوتے ہیں۔“

”آپ یہاں کیسے آئے؟“ بانو نے اس پاس کے ماحول کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”ایک منٹ تم یہاں رکو میں ذرا ٹائیکو کو لے آؤں وہ باہر پڑا ہوا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو شور مچ جائے گا۔“

لیکن جب میں باہر آیا تو ٹائیک اپنی جگہ سے غائب تھا اور یہاں سے نکلنے والا دروازہ جسے میں نے اندر سے بند کیا ہوا تھا اب کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے واپس آیا۔ ”وہ غیبیٹ غائب ہے اس کا مطلب ہے سارے محل کو علم ہو جائے گا۔“

ہم نے اندر سے دروازے بند کیے اور پورے کمرے کا معائنہ کیا کہ اس میں آمد و رفت کا کوئی اور راستہ تو نہیں ہے لیکن وہاں کوئی اور راستہ نہیں تھا ایک شاہانہ قسم کا داش روم تھا جس میں جہازی ساز ہاتھ نب بھی تھا لیکن اس سے بھی نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”یہ بات یقینی ہے کہ راج کنور کے محافظ اس کمرے کے باہر جمع ہو رہے ہوں گے۔ انہیں اندر آنے سے روکنا ہوگا۔“

”دروازے اندر سے بند ہیں۔“

”انہیں کھولا جاسکتا ہے گولی مار کر یا کسی اور طریقے سے، وہ اندر گیس بھی چھوڑ سکتے ہیں۔“

”گیس۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”راج کو چھڑانے کے لیے وہ سارے حربے استعمال کریں گے۔ اس لیے اس کا جلد ہوش میں آنا ضروری ہے۔“ میں نے راج کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی کنپٹی پر ہلکی سی سوجن آگئی اور نبض سُست تھی۔ میرا خیال تھا کہ راج کے اس عشرت کدے میں کہیں ہتھیار بھی چھپے ہوں گے لیکن تلاش بسیار کے بعد ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ یہاں عورتیں اور لڑکیاں زبردستی بھی لائی جاتی ہوں۔ اگر ان کے ہاتھ ہتھیار لگ جاتا تو راج کنور مارا جاتا۔ اس لیے یہاں کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ بانو نے دیواروں پر لگی تمام وہابیات تصاویر اتار کر ایک طرف ڈھیر کرنا شروع کر دیں۔ ایک تصویر اتاری تو اس کے پیچھے چھپا ہوا سیف سامنے آ گیا۔ اس دوران میں ہمیں نے ایک دروازے میں رکھی سوتی ری برآمد کی اور اس سے چنبیلی کے ہاتھ پشت پر کر کے باندھ دیئے۔ دونوں پاؤں باندھے اور پھر ان کو کھینچ کر ہاتھوں کی ری سے ملا دیا۔ اب اس کے پاؤں پیچھے کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور کمر کمان ہو رہی تھی۔ بانو نے دلچسپی سے دیکھا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں؟“

”اسے بے بس کر رہا ہوں۔“

ان سب کاموں سے فارغ ہو کر میں نے سیف کا معائنہ کیا۔ یہ جدید ترین سیف تھا جو بیک وقت نبروں اور فٹنر پرنٹ کی مدد سے کھلتا تھا۔ ایک چیز بھی کم ہو تو سیف نہ کھلتا۔ سیف میں کیا تھا یہ تو راج کے ہوش میں آنے کے بعد پتا چلتا۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے ایک گھنٹہ ہونے کو آیا تھا۔ میں نے چنبیلی کو جس طرح باندھا تھا وہ تکلیف سے جلد ہوش میں آگئی۔ اس نے کسماتے ہوئے کہا۔ ”کھولو مجھے۔“

”آرام سے لیٹی رہو اور اوپر والے کا شکرا ادا کر دو کہ ابھی تک زندہ ہو۔“

”تم لوگ بے کار کوشش کر رہے ہو یہاں سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔“

”جلد تم اس ناممکن کو ممکن ہوتے دیکھو گی۔“

بانو نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا اس نے تصادیر اتار دی تھیں اور مجھے گرا دیئے تھے۔ اب ماحول کسی قدر بہتر لگ رہا تھا۔ چنبیلی نے سر گھما کر دیکھا اور تسخرا نہ انداز میں بولی۔ ”یہ کیا کر رہی ہے؟“

”وہی جو ہر شریف لڑکی کو کرتا ہے۔ تم شریف نہیں ہو اس لیے یہ بات نہیں سمجھو گی۔“

”راج بے ہوش ہے؟“

”ہاں لیکن بے ہوش ہونے سے اس کی عزت میں کوئی کمی آئی ہے جو تم اسے اس طرح پکار رہی ہو۔“

”میں نے کبھی اس کی عزت نہیں کی۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”میں ہمیشہ اس سے نفرت کرتی رہی ہوں۔“

”اور اس کی نوکری بھی کرتی رہی ہو۔“ میں ہنسا۔ ”ویسے میرا اندازہ ہے تم نے اپنی نوکری کا آغاز اسی بیڈ روم سے کیا ہوگا۔“

”ہاں۔“ وہ لڑھک کر پہلو کے بل لیٹ گئی اس کے موجود لباس میں یہ پوز نہایت سنسنی خیز تھا اور وہ عملاً جاے سے باہر ہو رہی تھی۔

”اس لیے تم اس سے نفرت کرتی ہو؟“

”نہیں۔“ وہ بولی۔ ”نفرت کی وجہ کچھ اور ہے وہ میں تمہیں یا کسی کو نہیں بتا سکتی۔“

”ٹھیک ہے میں مان لیتا ہوں تم اس سے نفرت کرتی ہو۔ تب یہاں کیوں ہو چلی جاتیں کہیں اور یا راج کنور کا کام تمام کر دیتیں۔“

”یہ دونوں کام ممکن نہیں ہیں۔“

”تب بہتر ہوگا اپنی بکواس بند کرو۔“

”مجھے کھولو مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“

”تھوڑی تکلیف برداشت کر لو۔“

”مجھے کھولو ورنہ میں چیخنے لگوں گی۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔ اس شاطر عورت نے بھانپ لیا تھا کہ میں عورت سے بلاوجہ سخت سلوک نہیں کر سکتا تھا اس لیے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”شوق سے۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا اور راج کنور کی طرف بڑھا۔ بیڈ کی تلاشی لیتے ہوئے ہم نے

اسے الٹ پلٹ دیا تھا۔ چنبیلی سچ سچ چلانے لگی۔ میں نے ریشمی بیڈ شیٹ کا ایک ٹکڑا چاقو سے کاٹا اور واپس آ کر اسے چنبیلی کے منہ میں غلوس دیا۔ بانو خوش ہو کر بولی۔

”یہ ٹھیک کیا اس کے ساتھ۔“

میں نے کھانا نہیں کھایا تھا اور اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ وہاں ایک طرف میز پر بے شمار پھل سجے ہوئے تھے۔ انہیں واش روم میں دھویا اور ان سے پیٹ پوجا کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد بانو بھی میرا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے جو کھایا تھا وہ اپنی کر کے نکال دیا تھا۔ اسے بھی بھوک لگ رہی تھی۔ اس دوران میں، میں نے اسے اپنی زوداد سنائی۔ اس نے کہا۔ ”ٹائیک نے سب کو خبردار کر دیا ہوگا۔“

”لازمی بات ہے۔ ویسے یہ کام تو بعد میں بھی ہوتا۔ اگر راج سے بات کرنے کا موقع مل جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ بہر حال اب بھی بازی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ شاہ ہمارے زرنے میں ہے۔“

گفتگو کے دوران میں راج پر نظر رکھے ہوئے تھا اور وقفہ وقفہ سے چنبیلی کو بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ حیرت انگیز عورت ثابت ہوئی تھی اور کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ خود کو آزاد کرالیتی۔ ایک بار اس نے کوشش کر کے ایسی طرح کروٹ لی کہ اس کا رخ ہماری طرف ہو گیا تھا۔ اس سے ایک تو اس کے ہاتھ پاؤں چھپ گئے تھے اور دوسرے سامنے سے اس کا جسم بہت نمایاں ہو رہا تھا اس لیے بانو نے دوبارہ اسے الٹ دیا۔ وہ ناک سے غول غاں کر کے اسے برا بھلا کہتی رہی تھی۔ جواب میں بانو نے آہستہ سے اس کے کان میں کچھ کہا۔ ظاہر ہے اس نے بھی ہلکتی سنائی ہوگی۔ جب سے اس نے بانو پر ہاتھ اٹھایا تھا وہ اس سے قہقہے ہوتی تھی۔ پیٹ بھر کر میں نے خود کو آسودہ محسوس کیا تھا اور میرے خیال میں اب حرکت میں آ جانا چاہیے تھا۔ البتہ مجھے باہر والوں کی خاموشی پر حیرت تھی۔

”راج کو ہوش میں لانا ہوگا۔“ میں نے کہا اور وہاں موجود فریج سے بخ بستہ پانی کی بوتل نکالی اور راج کے منہ پر انڈیلنے لگا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ بوتل ختم ہونے سے پہلے کسمانے لگا تھا۔ پھر اس نے زیر لب گالی دی اور بڑبڑایا۔

”کیا بد تمیزی ہے..... ٹائیک کہاں مر گیا ہے؟“

”اٹھ جاؤ بیٹے ورنہ ٹائیک سے پہلے تم جہنم رسید ہو جاؤ گے۔“ میں نے اسے تھپڑ مارا۔ دوسرے تھپڑ پر اس نے آنکھیں کھول دیں اور تیسرے تھپڑ پر اس کے حواس بحال ہو گئے تھے۔ اصل میں اس کے ہوش مجھے دیکھ کر ٹھکانے آئے تھے۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”شہباز تم.....“

”نہیں یہ میرا بھوت ہے۔“ میں نے استہزائیہ لہجہ میں کہا۔ ”بہتر ہوگا جلدی سے اپنے حواس بحال کر لو کیونکہ میں اور تم دونوں نہایت سنگین صورت حال سے دوچار ہیں۔“

وہ بھیکے بستر پر اٹھ بیٹھا اور اپنا منہ صاف کیا۔ بانو کو دیکھ کر وہ چونکا اور پھر اس کی آنکھوں میں سفلی جذبات آئے تھے کہ میں نے گھما کر اس کے شانے پر لات رسید کی اور وہ بستر سے نیچے لڑھک گیا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور دوبارہ بیڈ پر دھکیل دیا۔ ”اب تم نے بانو کو اس طرح دیکھا تو آنکھیں نکال دوں گا۔“

میرے لہجے پر وہ لرز اٹھا۔ شاطر آدمی تھا اس نے فوراً پینٹر بدلا۔ ”ٹھیک ہے اب میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا لیکن تم میرے ساتھ ایسا سلوک مت کرو۔“

”تم اس سے بھی برے سلوک کے مستحق ہو لیکن فی الحال تمہیں کچھ نہیں کہوں گا ہاں تم خود بھی کوئی بے عزتی والا کام یا بات مت کرنا۔“

اس نے اس بار شرافت سے بانو کی طرف دیکھا۔ ”میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ چند دنوں میں اتنی تیز ہو جائے گی۔ یہ تو بالکل بدل گئی ہے۔“

”راج کنور یہ تمہیں موت کے گھاٹ بھی اتار سکتی ہے لیکن شکر کرو صرف بے ہوش کیا۔ کیونکہ ابھی ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔“

راج کنور کی نظر چنبیلی پر گئی پہلے وہ چونکا اور پھر اس کے چہرے پر مایوسی آ گئی تھی۔ ”تم لوگوں نے اسے بھی قابو کر لیا ہے۔“

”ہاں، البتہ نائیک نکل گیا اور اس نے یقیناً تمہارے سارے کمانڈرز کو اس کمرے کے باہر جمع کر لیا ہو گا۔“

”نائیک بچ گیا۔“ مایوسی کی جگہ فوراً امید نے لے لی۔

”ہاں، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ کسی بھی احتقانہ حرکت کی صورت میں وہ صرف تمہاری لاش حاصل کر سکتے ہیں۔ انہیں کسی احتقانہ حرکت سے باز رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس لیے انہیں حکم دو کہ اس کمرے سے دور رہیں اور کسی حرکت سے گریز کریں۔“

”میں کہہ سکتا ہوں لیکن اس کے لیے مجھے باہر جانا ہو گا۔“ اس نے چالاکی سے کہا لیکن میں ایک طرف موجود جدید قسم کے انٹر کام کو دیکھ چکا تھا اس کی مدد سے راج کنور پورے محل میں کسی سے بھی رابطہ کر سکتا تھا میں نے اس کا کورڈ لیس اٹھا کر اسے تھمایا۔

”اس کے ہوتے ہوئے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے آدمیوں سے رابطہ کرو اور جو کہا ہے وہی کرو۔“

اس نے مایوسی سے کورڈ لیس لیا اور اس پر ایک نمبر دبایا۔ میں نے رائفل کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ بادل نا خواستہ اس نے دوسری طرف کال ریسیو کرنے والے کو حکم دیا۔ ”رامن سے بات کراؤ..... رامن سب میرے کمرے سے دور چلے جائیں اور میرے حکم کے بغیر کوئی حرکت نہ کریں۔“

جیسے ہی اس نے جملہ مکمل کیا میں نے اس سے کورڈ لیس لے کر اسے آف کر دیا۔ ”امید ہے اب تمہارے ساتھی کچھ دیر سکون سے بیٹھیں گے۔“

”تم یہاں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ تمہیں کنور پیلس کی سیکورٹی کا اندازہ نہیں ہے۔“

”مجھے اندازہ ہے یا نہیں لیکن تمہیں ایک چیز کا اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے کہ تمہاری سیکورٹی مجھ سے نملک ہے۔ اگر مجھے کوئی خطرہ ہوا تو وہ تم سے گزر کر مجھ تک آئے گا۔ اگر دنیا سے رخصتی کا وقت آیا تو امید یہی ہے تم مجھ سے پہلے وفات پاؤ گے۔“

بانو ذرا دور صوفے پر بیٹھی چنبیلی کی مگرانی کر رہی تھی۔ وہ میرے پاس آئی۔ ”اس سے دوسری عورتوں کا پوچھیں وہ کہاں ہیں اور چپ کیوں ہیں؟“

یہ سوال میرے ذہن میں بھی تھا لیکن دوسری چیزوں میں الجھ کر ذہن سے نکل گیا تھا۔ میں نے چنبیلی کے بجائے راج کنور سے پوچھ لیا۔ ”یہاں آٹھ عورتیں اور ہیں لیکن اس ہنگامے کے دوران کسی نے اپنے کمرے سے جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔“

اس نے بانو کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”انہیں سخت حکم ہے جب ان کی ڈیوٹی نہیں ہوگی وہ اپنے کمرے تک محدود رہیں گی اور باہر کچھ بھی ہو جائے وہ باہر نہیں آئیں گی۔“

میں نے تجسس سے پوچھا۔ ”یہ تمہاری ملازم ہیں یا تم نے انہیں زبردستی رکھا ہوا ہے؟“

”یہ چھ مہینے کے کنٹریکٹ پر آئی ہیں۔ چھ مہینے بعد ان کا معاوضہ دے کر واپس بھیج دیا جائے گا۔“

”سب واپس چلی جاتی ہیں؟“

”نہیں جو مجھے اچھی لگتی ہیں ان کو میں دوبارہ پیشکش کرتا ہوں۔“

اس عشرت کدے میں داخل ہونے کے دو دروازے تھے اور دونوں اندر سے بند تھے۔ کوئی کھڑکی نہیں تھی اور نہ ہی روشن دان دکھائی دے رہا تھا مگر یہاں گھٹن کے بجائے ایسی تازگی تھی جیسے ہم کھلی فضا میں سانس لے رہے ہوں۔ یقیناً یہاں دہشتی لیشن سسٹم کام کر رہا تھا۔ میں اور بانو ہر ممکن تلاشی لے چکے تھے لیکن ہمیں یہاں کوئی ہتھیار نہیں ملا تھا۔ مگر مجھے یقین تھا راج کنور نے کسی خفیہ جگہ ہتھیار چھپایا ہوگا۔ ”راج کنور یہاں تمہارے پاس جو ہتھیار ہے میرے حوالے کر دو۔“

”یہاں کوئی ہتھیار نہیں ہے۔“ اس نے فوراً انکار کیا۔

”سوچ لو بعد میں کوئی ہتھیار نکل آیا تو تمہیں اس جھوٹ کی سزا ملے گی۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں بلاوجہ اسے نہیں مار سکتا اور نہ تشدد کر سکتا ہوں وہ میری اس مجبوری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اوکے فی الحال میں مان لیتا ہوں اگرچہ مجھے یقین نہیں ہے تمہاری بات کا۔ اس سیف میں کیا ہے؟“ میں نے دیوار میں لگے سیف کی طرف اشارہ کیا۔

”سیف میں کیا ہوتا ہے؟“ اس نے التماس کیا۔

”دولت، قیمتی اشیاء اور قیمتی راز و دستاویزات۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اے کھولو۔“

”کیوں؟“ وہ بدکا۔

”میں دیکھنا چاہتا ہوں اس میں کیا ہے؟“

”اس سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔“

”تم شاید میرے شریفانہ رویے سے دھوکا کھا رہے ہو۔ اگر تم نے ایک منٹ کے اندر سیف نہیں کھولا تو تمہاری دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کاٹ دوں گا۔“

اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا میں نے نائیک کا چاقو نکال کر اسے کھولا۔ اس کا بلیڈ چھوٹا لیکن نہایت تیز دھار

تھا۔ ایک منٹ پورا ہونے پر میں نے اسے بیڈ پر اوندھے منہ گرایا اور اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اس نے مدافعت کی کوشش کی لیکن اس کا بہ ظاہر صحت مند مگر عیاشی سے کھوکھلا ہو جانے والا جسم میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ گھما کر پشت پر کیا اور چاقو اس کی چھوٹی انگلی سے لگایا تھا کہ وہ تڑپ کر بولا۔ ”اچھا..... اچھا کھوتا ہوں، پلیز ایسا مت کرو۔“

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پشت سے اتر آیا۔ پھر اسے کھینچ کر بیڈ سے نیچے اتارا اور سیف کی طرف دھکا دیا۔ ”کھولو اسے لیکن کوئی چالاکی مت دکھانا جو تمہیں قبل از وقت مرحوم کر دے۔“

اس کی حالت بری ہو رہی تھی اور وہ کانپ رہا تھا۔ دوسروں کی زندگیوں اور جسموں سے خدا بن کر کھیلنے والوں کو میں نے اپنے حوالے سے اسی طرح بزدل پایا تھا۔ اس نے سیف کے سامنے پہنچ کر میری طرف دیکھا اور التجا آمیز لہجے میں بولا۔ ”شہباز اس میں تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔“

”یہ فیصلہ سیف کھلنے کے بعد میں خود کروں گا۔“ میں نے کہا اور اس سے دو قدم پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میرا زاویہ ایسا تھا کہ سیف کھلتے ہی اندر موجود چیزیں میری نظر میں آتیں۔ اس کا پورا امکان تھا کہ اندر کوئی ہتھیار ہوتا اور راج کنور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ بادل نا خواستہ اس نے پہلے سیف کے ٹنگر پرنٹ چیک کرنے والے حصے پر یکے بعد دیگرے اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے لگائے اور پھر نرک بیڈ پر ایک طویل نمبر ملایا۔ اسے زبانی یاد تھا اور ملانے کی ایسی مشق تھی کہ اس کی انگلیاں رقص کے انداز میں چل رہی تھیں۔ میں کوشش کے باوجود نمبر یاد نہ رکھ سکا۔ آخری نمبر ملتے ہی کلک کی آواز آئی۔ میں نے بانو کو سانس روکنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی سانس روک لی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایک خاص انداز سے سیف کھولنے پر اندر موجود بے ہوش کر دینے والی گیس آزاد ہو جاتی اور مجھے پتا ہی نہ چلتا۔ خود راج خاموشی سے سانس روک لیتا اور گیس سے محفوظ ہو جاتا لیکن ایسی کوئی حفاظتی تدبیر اس سیف کے ساتھ منسلک نہیں تھی۔ راج بدستور گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس نے ہینڈل گھما کر سیف کا بھاری بھر کم دروازہ کھولا۔ میں نے گن تان لی تھی اور اسے حکم دیا۔

”راج بہت آہستہ سے حرکت کرنا۔“

سیف کا دروازہ کھلا اور اندر موجود چیزیں نظر آنے لگیں۔ اندر کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ البتہ دو الگ الگ خانوں میں تیرہ کرنی نوٹوں کی گڈیاں اور سونے کی اینٹیں رکھی تھیں۔ یہ بہت بڑی دولت تھی۔ صرف نوٹوں کی گڈیاں ہی کئی سو کی تعداد میں تھیں۔ پورے سیف میں بس یہی دو چیزیں تھیں۔ کرنی کی گڈیاں اس طرح رکھی تھیں کہ ان کی مالیت اور ملک سے تعلق کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ میں نے اسے حکم دیا۔

”اسے پورا کھولو۔“

اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔ مگر اندر اور کچھ نہیں تھا۔ ”کرنی کس ملک کی ہے۔“

”انڈین، ڈالرز اور یورو ہیں۔“ اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اب اس کا یہ سوچ کر دم نکل رہا تھا کہ میں اس کی یہ دولت نہ ہتھیالوں۔ حالانکہ اسے اپنی جان کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ میرا نکتہ نظر اس سے بالکل الگ تھا۔ میں نے اگلا حکم دیا۔

”کرنی اور سونا باہر نکالو۔“

اس نے احتجاج کرنا چاہا لیکن میرے تاثرات دیکھ کر اس کی ہمت نہ کر سکا تھا۔ وہ کرنسی نکال کر نیچے قالین پر ڈھیر کرنے لگا۔ بانو میرے پاس آئی۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں یہاں سے نکلنے کی سوچیں۔“

”تم پریشان مت ہو جلد یہاں سے نکلیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم اپنا کام کرو چنبیلی پر نظر رکھو اور اگر یہ آزاد ہونے کی کوشش کرے تو بے دریغ اس پر پاپ استعمال کرنا۔“

میں نے دونوں پائپ بانو کے حوالے کر دیئے تھے۔ اس سے بات کرتے ہوئے میں راج پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا کہ وہ کہیں چھپا ہوا ہتھیار نہ نکال لے۔ مگر اس سیف میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ کرنسی کے بعد اس نے اندر سے سونے کی اینٹیں نکال کر قالین پر رکھنا شروع کیں۔ یہ خاصی بڑے سائز کی اینٹ تھی میں نے راج سے ایک اینٹ لے کر دیکھا اس پر ٹوکے جی لکھا تھا۔ اندر ایسی پچاس سے زائد اینٹیں تھیں یعنی یہ سو کلو گرام سے زیادہ سونا تھا۔ جس کی مالیت کروڑوں میں تھی۔ کرنسی اس سے کہیں زیادہ مالیت کی تھی کیونکہ نصف رقم ڈالر زور پورہ میں تھی۔ اب سیف خالی تھا اور اس میں کچھ نہیں رہا تھا۔ راج کنور نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور ڈوبتے لہجے میں بولا۔

”تم اس کا کیا کرو گے؟“

میں نے افسوس سے اسے دیکھا۔ ”تم نے احقنا نہ سوال کیا ہے تمہیں اصل میں یہ پوچھنا چاہیے کہ میں تمہارا کیا کروں گا۔“

مگر وہ مخصوص بنیاد نہایت رکھتا تھا اور صدمے سے اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ کرنسی اور سونے کو اسی طرح پڑے چھوڑ کر میں راج کنور کو ایک طرف لایا۔ اس نے التجا کی۔ ”مجھے کچھ پینے دو ورنہ شاید میرا ہارٹ فیل ہو جائے۔“

مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔ صدمے سے اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ”ٹھیک ہے پی لو لیکن ایک حد تک، مجھے تم سے بات کرنی ہے اور اس کے لیے تمہارا ہوش میں رہنا نہایت ضروری ہے۔“

اس نے براڈٹی کی ایک بوتل سے اپنے لیے گلاس میں کچھ مقدار نکالی اور اسے ایک ہی سانس میں پی گیا۔ وہ بلا نوش تھا ورنہ تقریباً چوتھائی گلاس یوں نہ پی جاتا۔ دوسری بار گلاس خالی کر کے اس کی حالت بہتر ہوئی تھی اور اس نے تیسری بار گلاس میں اٹھٹھٹھ چاہا تو میں نے اسے روک دیا۔ ”بس اتنا کافی ہے۔“

مجبوراً اس نے بوتل اور گلاس ریک پر رکھ کر حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور میری طرف متوجہ ہوا۔ ”شہباز کیا چاہتے ہو تم؟“

”آسان الفاظ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ بڑے کنور کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہ مت سمجھنا مجھے

اس سے کوئی ہمدردی ہے۔ بلکہ ایک طرح سے میری جان چھوٹ رہی ہے۔“

”ان کی طبیعت خراب ہے اس لیے وہ ابھی کسی سے مل نہیں رہے۔“

”تم نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑا کنور تمہاری قید میں ہے اور اس کا علاج روک دیا

گیا ہے کیونکہ میرا خون نہیں لیا گیا اور نہ ہی مجھے اس سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ تم نے اپنے بھائی کے خلاف

بغاوت کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس جاگیر اور تمام دولت کا مالک بڑا کنور ہے؟“

اس سوال پر راج کنور کا چہرہ بگڑ گیا تھا اس نے نفرت سے کہا۔ ”یہ سچ ہے۔“
 ”اور تم اس کے دست نگر تھے۔ مگر تم اب سے نہیں بہت عرصے سے اپنے بھائی کے دست نگر تھے اور اس نے سب تم پر چھوڑ رکھا ہے۔ تو اب ایسا کیا ہوا کہ تم بغاوت پر اتر آئے؟“
 ”ایسی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔“

”اوکے نہ بتاؤ۔۔۔۔۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔ ”میں بڑے کنور سے معلوم کر لوں گا۔“
 وہ چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ بڑا کنور ہمیں موجود ہے اور اب میں چاہو تو اس سے یا کسی سے بھی مل سکتا ہوں۔“
 اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اس نے جلدی سے کہا۔ ”سنو شہباز میں تمہیں اور اس لڑکی کو بحفاظت پاکستان واپس بھیج سکتا ہوں۔“
 ”وہ کیسے؟“

”میرے پاس سرحد تک پرواز کا لائسنس اور ہیلی کاپٹر ہے۔ میرا پائلٹ ایک سابق انڈین ایئر فورس آفیسر ہے وہ سرحد بعض ایسی جگہوں سے واقف ہے جہاں رہنا ارکام نہیں کرتا ہے۔ وہ وہاں سے ہیلی کاپٹر لے جاتا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں ممتاز ہاؤس آیا تھا۔“
 ”بالکل یاد ہے۔“

”بس اسی طرح میں تمہیں بھی وہاں لے جا سکتا ہوں۔ اس میں صرف ایک گھنٹہ لگے گا۔“
 راج کنور کی پیشکش پر کوشش تھی۔ ہیلی کاپٹر کی مدد سے ہم بہت کم وقت میں پاکستان جاسکتے تھے لیکن راج کنور نے اچانک ہی مفاہمت کی بات کی تھی یہ میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی آخر وہ کس لیے یوں تعاون پر اتر آیا تھا؟ میں نے محسوس کیا کہ جب میں نے بڑے کنور سے ملنے کی بات کی تو وہ کچھ بدحواس ہوا اور پھر جلدی سے یہ پیشکش کی۔ تو کیا وہ چاہتا تھا کہ میں بڑے کنور سے نہ ملوں۔ اس میں اس کا کوئی مفاد پوشیدہ تھا۔ حالانکہ ان بھائیوں کی آپس کی لڑائی سے میرا کیا مفاد وابستہ ہو سکتا تھا۔ مگر کچھ نہ کچھ گڑبضرور تھی۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے اس معاملے میں دلچسپی اپنی چاہیے یا نہیں۔ جیسے میرے حالات تھے اور میں بہ ظاہر آزاد ہونے کے باوجود مشکل حالات سے دوچار تھا۔ ذرا سی دیر میں بازی پلٹ سکتی تھی اور میں ایک بار پھر راج کنور جیسے شیطان صفت آدمی کا قیدی بن جاتا۔ میری تو خیر تھی کہ اس معاملے میں وسیع تجربہ رکھتا تھا لیکن بانو کے ساتھ کچھ غلط ہو اور میرے سامنے ہو یہ میری برداشت سے باہر ہوتا۔ اس صورت میں راج کنور کی پیشکش مان لینا ہی مناسب تھا۔ مگر میں جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس کی پیشکش پر کوئی رد عمل ظاہر کیے بغیر مطالبہ کیا۔

”راج کنور مجھے دو عدد پستول اور ایک شاٹ گن چاہیے۔“

”کیوں تمہارے پاس یہ رائفل ہے تو۔“

”بحث مت کر دو جب میں نے کہا ہے تو فوراً منگو آؤ۔“

اس نے ایک بار پھر انٹرکام سے رابطہ کیا اور پھر میری طرف دیکھا۔ ”کس قسم کے ہتھیار چاہیں؟“
 ”پستول غیر ملکی ہوں، بریٹیا یا ولسن اینڈ اسمتھ اور شاٹ گن ری پٹر ہو، ان سب کی اضافی گولیاں اور ہاں

اس راقفل کے دو میگزین اور منگو آؤ۔“

راج کنور نے یہ تمام چیزیں نوٹ کر ادیں تو میں نے اس سے انٹر کام لے کر دوسری طرف موجود فرد سے کہا۔ ”یہ سب سامان اوشا کے ہاتھ بھجوا دو۔“

”شہباز۔“ دوسری طرف سے رامن کی آواز آئی۔ ”بہتر ہو گا راج جی کو چھوڑ دو تمہیں یہاں سے نکلنے دیا جائے گا۔“

”مشورے دینے کے بجائے اپنی فکر کرو۔ اگر میں نے راج سے تمہاری جان مانگ لی تو یہ اپنی جان بچانے کے لیے میری بات مان لے گا۔ تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔ جب اوشا آئے تو سب دروازے سے دور ہٹ جائیں۔ کوئی بھی شہادت کرتے ہوئے سوچ لینا کہ راج جی کو مرنے میں بس ایک سیکنڈ لگے گا۔“ میں نے بات مکمل کر کے انٹر کام بند کر دیا۔ مگر اسے رکھنے لگا تو اس کی مٹر نم بیل بجی۔ میں نے بٹن دبایا۔ ”اب کیا ہے؟“

”شہباز جی میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ اس بار منشی دل جی کہ مکار آواز آئی۔

”کریں منشی جی، سنا ہے آپ نے بھی پٹری بدل لی ہے۔“

”نہیں جی، ہم تو پشتوں سے کنور پر یوار کے نمک خوار ہیں۔“ اس نے کمال صفائی سے الزام جھٹلایا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی وفاداریاں بڑے کنور یا راج کنور نہیں بلکہ کنور خاندان کے ساتھ تھیں۔

”تب فرمائیے کیا کہنا چاہتے ہیں۔“

”آپ راج جی کو چھوڑ دیں۔ اس کے بدلے آپ جہاں کہیں گے آپ کو پہنچا دیا جائے گا۔“

”جیسے دوسری دنیا۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”منشی جی کیا ایسا ہی ہو گا۔“

”میں آپ کو یقین.....“

”منشی جی اس یقین کی ضرورت آپ کو ہونی چاہیے اور آپ کو میری اس بات پر ذرا بھی شک نہیں ہونا چاہیے کہ راج کو چھڑانے کی کسی کوشش کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ کے ہاتھ چند لاشیں آئیں گی اور ان میں سے ایک لاش یقینی طور پر راج کنور کی ہوگی۔ اس لیے فی الحال جیسا میں کہہ رہا ہوں دیا کریں اور ہاں اب میں بڑے کنور سے ملنا چاہوں تو میرا خیال ہے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔“

منشی جی کو ایک لمحے کے لیے چپ لگی تھی پھر انہوں نے کہا۔ ”بڑے کنور کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”جب ایک بیمار آدمی کا علاج ہی بند کر دیا جائے گا تو اس کی طبیعت کیسے ٹھیک ہوگی لیکن مجھے امید ہے مجھے دیکھ کر ان کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”نہیں جی مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ اس نے بادل نا خواستہ کہا۔

میں نے انٹر کام رکھ کر راج کنور سے کہا۔ ”یہاں سب ایک سے بڑھ کر ایک مکار ہیں۔ تم سب آپس میں ملے ہوئے ہو اس بیمار اور بے بس شخص کے خلاف۔“

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں بڑے کنور سے کوئی ہمدردی نہیں ہے؟“ راج کنور نے طنز یہ لہجہ میں ہا۔ ”اب تم اس معاملے میں پڑ رہے ہو۔ شہباز تم یہاں جتنا الجھو گے اتنا ہی تمہاری بحفاظت واپسی کے

امکانات کم ہو جائیں گے۔“

”مجھے اس سے ہمدردی نہیں ہے لیکن تم لوگ مکاری دکھا رہے ہو اور مجھے یقین ہے اتنی آسانی سے یہاں سے جانے نہیں دو گے۔“

”میں ضمانت دیتا ہوں۔“

”تم کیسے ضمانت دو گے؟“

”میرا پائلٹ تمہیں ہیلی کاپٹر میں لے جائے گا اور ایک گھنٹے بعد تم سرحد کے پاس ہو گے۔“

”ایک گھنٹے میں انڈین ایئر فورس کا کوئی معمولی جیٹ طیارہ اس ہیلی کاپٹر کو بارگرائے گا۔ اگر تم ضمانت دے رہے ہو تو ٹھیک طرح سے دو۔“

”کیا مطلب؟“

”تم بھی اس ہیلی کاپٹر میں ہو گے اور ہمیں سرحد پار چھوڑ کر واپس آ جاؤ گے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ اس نے انکار کیا۔

”تم انکار کی پوزیشن میں نہیں ہو۔“ میں نے کہا اسی لمحے اندر کی طرف کھلنے والے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بانو کو اشارہ کیا اور اس نے نزدیک جا کر پوچھا۔

”کون ہے۔“

”ہم اوشا ہیں۔“ باہر سے اوشا کی آواز آئی۔

”تمہارے ساتھ اور کون ہے؟“ بانو نے پھر سوال کیا۔

”کوئی نہیں۔“ اوشا نے کسی قدر ہچکچا کر جواب دیا۔

”تمہارے ساتھ کوئی ہے۔“ بانو سخت لہجے میں بولی۔ ”اس سے کہو ایک منٹ کے اندر دور چلا جائے ورنہ

راج کنور کا ایک کان کاٹ دیا جائے گا۔“

میں بانو کی چالاکی پر مسکرایا۔ اب وہ ان معاملات کو سمجھنے لگی تھی۔ ایک منٹ بعد اوشا نے اطلاع دی کہ

اب کوئی نہیں ہے۔ بانو نے سائیڈ پر ہوتے ہوئے ذرا سا دروازہ کھولا اور جیسے ہی اوشا اندر آئی دروازہ بند کر دیا۔

اوشا نے ایک چھوٹا سا بیگ اٹھا رکھا تھا۔ وہ اس نے قالین پر رکھ دیا اور تیزی سے میری طرف آئی۔ اس نے میرا

بازو تھام لیا۔

”شکر ہے بھگوان، ورنہ ہم تو مرنے والے ہو گئے تھے۔“

”تم نے اپنا کام ٹھیک سے نہیں کیا۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”ہمارے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی

تھی۔“

”بھول ہو گئی ہم سے۔“ وہ شرمندگی سے بولی۔ ”ہم اس پٹھان کو دیکھ رہے تھے اور بھوجن کوئی اور لے

گیا۔“

”اس بیک میں کیا ہے؟“

”پتا نہیں ہمیں منشی جی نے دیا تھا۔“ وہ سادگی سے بولی۔

میں نے راج کنور کو بیک کی طرف دھکیلا۔ ”اسے کھولو اگر اس کے ساتھ کوئی ٹریپ ہو تو تم اس کا شکار ہو گے۔“

”نن..... نہیں۔“ وہ بھلا یا۔

”کھولو اسے۔“ اس باریمرے دھکے سے وہ بیک کے پاس جا کر اور جلدی سے یوں اس سے دور ہو گیا جیسے اس میں کوئی زہریلا سانپ ہو۔

”اس کا مطلب ہے تمہیں یقین ہے اس میں کچھ ہے۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور انٹرکام پر فشی جی سے رابطہ کیا۔ ”فشی جی میں نے کہا تھا چالاکی مت کرنا۔“

وہ انجان بن گیا۔ ”میں نے کیا کیا ہے جی؟“

”تم نے ایک ٹریپ والا بیک بھیجا ہے اور اسے تمہارا آقا کھولے گا۔ اب تم بتاؤ اس میں کیا ہے۔“ فشی جی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”بیک کو نیچے کی طرف مگی زپ سے کھولیں تو کچھ نہیں ہوگا۔“

”اگر اسے اوپر سے کھولا جائے تو کیا ہوگا؟“

”اس میں بے ہوشی کی گیس بھری ہے وہ آزاد ہو جائے گی۔“

”یہ خدشہ تو نیچے سے کھولنے میں بھی ہے۔“

”نہیں نیچے سے کھولنے کی صورت میں گیس نہیں نکلے گی۔“

”اچھا دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا اور راج کنور کو حکم دیا۔ ”بیک۔ اٹھاؤ اور واش روم چلو۔“

وہ تیار نہیں تھا لیکن جب میں نے چاقو سے اس کی گردن پر ہلکا سا جھکا لگایا تو وہ بان گیا اور کراہتے ہوئے بیک اٹھا لیا۔ ”شبہا زتم اچھا نہیں کر رہے ہو۔“

”مجھے تسلیم ہے کہ میں اچھا نہیں کر رہا ہوں لیکن میں بہت برا بھی نہیں کر رہا ہوں اور تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں اس سے زیادہ برا سلوک کروں۔“

اوشا اور بانو باہر رہ گئے تھے میں نے واش روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور رائفل کا رخ راج کی طرف کرتے ہوئے اسے بیک کھولنے کو کہا۔ اس نے لرزے ہاتھوں سے بیک کو الٹا۔ اس کے نیچے بھی ایک زپ کمال صفائی سے لگی تھی۔ جیسے ہی وہ زپ کھولنے لگا میں نے سانس روک لی۔ راج نے بھی سانس روک لی تھی۔ میں نے اسے حکم دیا۔ ”سانس لو۔“

جب اس نے سانس نہیں لی تو میں نے عقب سے اس کی کمر پر عین گردے کے مقام پر ٹھوکر رسید کی۔ مارے تکلیف کے اس کا منہ کھل گیا اور اس نے بے ساختہ سانس لی۔ پھر جلدی سے سانس روک لی لیکن میرا مقصد پورا ہو گیا تھا اگر بیک سے کوئی بس نکلی تھی تو راج کنور نے سانس لے کر اسے اپنے جسم میں اتار لیا تھا۔ راج کنور بدحواس ہو کر پیچھے ہٹا تھا اور اس نے اپنے گلے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید اس پر گیس اثر کر رہی ہے مگر اس کے چہرے پر صرف بے پناہ خوف کے آثار تھے۔ ایسا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس پر کسی گیس نے اثر کیا ہے۔ جب کچھ لمبے تک کچھ نہیں ہوا تو اس نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ سانس لی۔ اس کا خوف اور احتیاط دیکھ کر

مجھے وال میں کالا محسوس ہونے لگا۔ اس نے چند گہرے سانس لیے اور ٹھیک رہا تو میں نے بھی سانس لی۔ میرا دم کھٹنے لگا تھا۔ چند گہرے سانس لے کر دوبارہ سانس روکی اور اسے بیک سے اسلحہ نکالنے کا حکم دیا۔ اس بار بھی اس کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے پستول، شاٹ گن اور ایمونیشن نکالا۔ بیک خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ میں نے شاٹ گن شانے پر ٹانگی اور دونوں پستول اٹھا لیے۔

”اب یہ سب سمیٹ کر باہر چلو۔“

”بیک بھی؟“

”ہاں بیک بھی۔“

مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ منشی جی نے ایک بار پھر چالاکی دکھائی تھی بیک میں بے ہوش کرنے والی گیس ہوتی تو راج کنور کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی۔ شاید بیک میں کوئی مہلک قاتل گیس تھی۔ راج نے میگزین اور شاٹ گن کے بلیٹ کا ڈبا اٹھالیا تھا۔ ہم باہر آئے۔ بانو اور اوشا ایک طرف بیٹھے آپس میں سر جوڑے محو گفتگو تھے۔ میں نے چاقو سے چینیلی کے ہاتھ پیروں کی رسیاں کاٹیں اور اسے کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ اتنی دیر سے اس مشکل پوز میں بندھے بندھے اس کی حالت غیر ہو گئی تھی اور منہ میں کپڑا ہونے کی وجہ سے وہ آواز بھی نہیں نکال سکتی تھی۔ میں اسے بازو سے تھام کر دروازے تک لایا۔ میرے اشارے پر بانو نے دروازہ کھولا اور میں نے چینیلی کو باہر دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گری۔ بانو نے دروازہ اندر سے بند کر کے لاک کر دیا اور آہستہ سے بولی۔ ”شہباز صاحب ہمیں راج کی ہیکش قبول کر لینی چاہیے۔ ورنہ کسی اور طریقے سے یہاں سے نکلنا مشکل ہوگا۔“

”اتنی عجلت کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”ہم بہت مشکل صورت حال سے دوچار ہیں باہر موجود لوگ حد درجے سفاک اور سازشی ہیں۔ ایسے لوگوں کے سامنے بہت محتاط رہنا ہوگا مجھے شبہ ہے اس بیک میں کوئی زہریلی گیس پوشیدہ ہے جو انسان کا کام تمام کر سکتی ہے۔“

”زہریلی گیس۔“ بانو نے خوفزدہ نظروں سے بیک کی طرف دیکھا۔ ”اسے بھی باہر پھینک دیں۔“

”نہیں یہ ایک اچھا ہتھیار ہے۔“

”تب آپ نے چینیلی کو کیوں باہر نکالا؟“

”وہ بے کار تھی اس کی جان کی کسی کے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہے اور وہ خطرناک ہو سکتی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ رات ہمیں یہیں گزارنا ہوگی اور پوری طرح ہوشیار رہنا ہوگا۔ چینیلی کے ہوتے ہوئے دو آدمیوں پر نظر رکھنا پڑتی اب صرف راج کی نگرانی کرنا ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔“ بانو نے بے دلی سے کہا۔

”آج رات تمہیں اور کچھ سیکھنے کو ملے گا۔“

”وہ کیا؟“

میں نے ایک پستول کا میگزین نکالا اور پھر ایک طرف کر کے اس کا ٹریگر دبایا۔ بعض اوقات چہر میں گولی ہوتی ہے اور لوگ میگزین نکال کر سمجھتے ہیں کہ پستول خالی ہے۔ آئے دن لوگ اسی غلط فہمی میں خود مارتے ہیں یا کسی اور کو مار دیتے ہیں۔ کلک کی آواز آئی۔ میں نے پستول بانو کو تھمایا۔ ”پہلے اس کے فنکشن سمجھو۔“

یہ بریٹا تھا اور اصلی تھا۔ استعمال کے لحاظ سے یہ آسان اور مہلک پستول ہے اس کی ریج اور درنگی اپنے ساز کے دوسرے ہتھیاروں سے بہتر ہے۔ بانو دلچسپی لے رہی تھی۔ اسے پستول کے فنکشن سمجھنے میں چند منٹ لگے۔ اس کے بعد میں نے اسے میگزین لوڈ اور ان لوڈ کرنے کی پریکٹس کرائی۔ بھرے پستول سے وہ کسی قدر خوفزدہ دکھائی دی تھی لیکن اس نے ہمت کر کے یہ کام کر لیا۔ آدھے گھنٹے تک میں اسے آتشیں اسلحے کے بارے میں بریف کرتا رہا ایک بات درجن بار دہرائی تاکہ اس کے ذہن نشین ہو جائے۔ اس آدھے گھنٹے میں وہ تیزی اور مہارت سے پستول کو لوڈ ان لوڈ، لاک آن لاک کرنا سیکھ گئی تھی۔ دوسرا اعشاریہ اڑتیس وین اینڈ اسمتھ تھا یہ استعمال میں ذرا مشکل تھا کیونکہ نال بہت چھوٹی ہوتی ہے اور صرف ماہر لوگ ہی اس سے اچھا نشانہ لگا سکتے ہیں۔ میں نے بریٹا بانو کے سپرد کر دیا۔

”اب تم نشانے بازی کی مشق کرو گی۔“

”میں پستول چلاؤں گی؟“ وہ گھبرا کر بولی۔

”ہاں تو یہ سب کس لیے سکھار ہا ہوں؟“ میں نے ملائمت سے کہا۔

میں نے راج سے کہا۔ ”فشی جی کو اطلاع کر دو کہ ہم کچھ شوٹنگ پریکٹس کر رہے ہیں اس لیے فائرنگ کی آواز سن کر بھڑکنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ کمرے میں جو عریاں مجھے موجود تھے ان کو نارگٹ کے طور پر استعمال کیا۔ بانو نے پہلا فائر بہت ڈرتے ڈرتے کیا اور جھٹکے سے پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا اس نے چیخ بھی ماری تھی۔ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”یہ کیا حرکت ہے۔ پستول مضبوطی سے پکڑو اور دھیان سے فائر کرو ڈرو مت یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔“

دو تین فائر کر کے بانو کا خوف کم ہوا اور ایک میگزین ختم کرتے کرتے اس کا نشانہ بھی اتنا بہتر ہو گیا کہ وہ دس گز کے فاصلے سے مجھے کے سینے کا نشانہ لیتی تو گولی کہیں نہ کہیں ضرور لگتی تھی۔ اتنے فاصلے سے نشانہ لینے کے لیے اسے واٹس روم کے پاس جانا پڑتا تھا اور ہم سب احتیاطاً کمرے کے ایسے حصوں میں چلے جاتے کہ گولی کسی صورت ہمیں نہ لگے۔ اب بانو اتنی پرجوش ہو گئی کہ وہ مزید فائر کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے روک دیا۔ ”اتنا کافی ہے دوسرے میگزین کم ہیں۔ اب بریٹا کے تین میگزین فالتو ہیں۔“

اوشا یہ سب دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اس نے مجھ سے کہا۔ ”مجھے بھی سکھارے۔“

”ابھی نہیں گولیاں کم ہیں ہاں یہاں سے نکلے تو تم کو سکھاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں یہ دیکھو کہ اسے پکڑتے کیسے ہیں اور چلاتے کیسے ہیں۔“

میں نے اسے دوسرے پستول سے تربیت دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ نہیں سمجھ سکے گی لیکن اس نے بانو سے بھی زیادہ تیزی سے پستول کو استعمال کرنا سیکھ لیا تھا اب اب عملی مشق کی ضرورت تھی۔ ضرورت پڑنے پر وہ کچھ نہ کچھ کر سکتی تھی اور کچھ نہیں تو ٹریگر دبا سکتی تھی۔ راج کنور بیڈ پر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے اٹھنے کو کہا ایک طرف شاہانہ قسم کے صوفے رکھے تھے۔ میں نے بانو اور اوشا سے کہا۔ ”تم دونوں یہاں لیٹ کر آرام کر لو تاکہ کل صبح کے لیے پوری طرح چاک و چوبند ہو۔“

”اور آپ؟“

”میں تین چار گھنٹے جاگتا رہوں گا پھر تمہیں اٹھا دوں گا اور تم راج کی نگرانی کرو گی اس دوران میں میں نیند پوری کر لوں گا۔“

وہ بستر پر لیٹ گئیں۔ میں راج کنور کے سامنے آ بیٹھا۔ وقت گزاری کے لیے اس سے سوال کرنے لگا۔

”تم دوبھائی ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”دو بہنیں بھی ہیں۔ ایک کی شادی کر دی تھی اور دوسری قبائلیوں کے حملے میں غائب ہو گئی۔“

”تم لوگوں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”بہت کوشش کی بڑے بھیا تو پاگل ہو گئے تھے ان کی بہت لاڈلی تھی۔ ہمارے آدمی آپریشن کے بعد بھی مہینوں قبائلیوں کے علاقے میں اسے تلاش کرتے رہے لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔ شاید وہ آپریشن کے دوران ماری گئی یا اسے لے جانے والے قبائلیوں نے انٹانامار دیا ہو۔“

میں نے اسے یاد دلایا۔ ”تم نے ان کے ساتھ کچھ کم کیا تھا۔ ہزاروں لوگ تو میری آنکھوں کے سامنے مارے گئے تھے اور وادی میں جو تھے وہ بھی کہاں بچے ہوں گے، بعد میں سنا تھا کہ زیر زمین بہتی کوہم سے دھماکہ کر کے بٹھا دیا گیا تھا؟“

راج کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”پانچ ہزار سے زیادہ قبائلی بچے تھے۔ جو ان کم تھے زیادہ عورتیں اور بچے بوڑھے تھے۔ انہیں ریاست کے شمال مشرق میں ایک جگہ دی ہے۔“

”جنگل جہاں وہ اپنی بٹا کی جدوجہد کر رہے ہوں گے یا بھوک اور موسم کے ہاتھوں فنا ہو چکے ہوں گے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”کیا وہ تمہاری اور میری طرح انسان نہیں تھے۔“

راج کنور خاموش رہا۔ وہ شرمندہ ہونا جانتا ہی نہیں تھا بس میرے سامنے اس وقت اکڑ نہیں سکتا تھا۔ انسان کے حق میں جتنا سفاک خود انسان ہے اتنے سفاک تو درندے بھی نہیں ہوتے ہیں۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ”تم نے دو بار مجھے مروانے کی کوشش کی۔ ایک بار ٹائیک کے ہاتھوں اور دوسری بار اوشا کی مدد سے، دونوں بار تمہیں ناکامی ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ تم میری موت کیوں چاہتے ہو اور وہ بھی اس طرح کہ تمہارے دامن پر داغ نہ آئے۔“

”مجھے تسلیم ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”وہ تم جو چاہے سمجھتے رہو۔“

”میں چاہوں تو تم اپنی زبان سے بھی بتا سکتے ہو لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے میں جانتا ہوں۔ البتہ بڑے کنور سے تمہارا اختلاف کس بات پر ہوا ہے اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔“

”وہ کوئی نہیں ہے میں اس کی غلامی کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔ سب کچھ میں کرتا ہوں اور میرے نام پر کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے لہجے میں یہی بچوں کو بھی سمجھ نہیں ملے گا۔“

”میں چونکا۔“ تمہارے بیوی بچے ہیں؟“

”ہاں لیکن وہ یہاں نہیں ہیں میں نے ان کو شہر میں رکھا ہے۔“

”دوسرے لفظوں میں تم نے جاگیر کی آمدنی سے ہیر پھیر کر کے خاصا کچھ بنا لیا ہے اور وہ سب شہر میں ہے جہاں تمہارے بیوی بچے ہیں۔ پائی دی دے کتنے بچے ہیں؟“

”دولہ کے اور دولہا کیوں ہیں۔“

”بڑے کنور نے شادی نہیں کی؟“

”وہ چاہتا تو اسے لڑکی مل سکتی تھی۔ اسے بیماری ہے لیکن وہ ناکار نہیں ہے اس نے خود شادی نہیں کی۔“

”شاید اسے خوف ہوگا کہ کہیں اس کی اولاد میں بھی یہ بیماری نہ منتقل ہو جائے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”اگر بڑے کنور کا انتقال ہو جائے تو یہ جاگیر اور سب کچھ تمہارے نام ہوگا؟“

”لازمی بات ہے اس کا میرے سوا کوئی وارث نہیں ہے۔“

”تمہاری دو بہنیں بھی تو ہیں؟“

”ایک غائب ہے اور دوسری میرے حق میں دستبردار ہو گئی ہے۔“

”گویا تم نے پورا بندوبست کر رکھا ہے۔ کیا تمہاری بہن اپنی خوشی سے دستبردار ہوئی یا تم نے اس کے

ساتھ زبردستی کی ہے؟“

اس سوال پر وہ خاموش رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر سادھنا یہاں ہوتی تو وہ بھی جاگیر کی وارث ہوتی۔

راج کنور اس کا بھی دشمن بن جاتا اس لحاظ سے یہ اچھا ہوا کہ وہ یہاں نہیں تھی ہمارے ساتھ محفوظ اور وسیم کے

ساتھ خوش و خرم تھی۔ بانو اور اوشا بارہ بجے قریب لپٹی تھیں۔ میں نے چار بجے ان دونوں کو اٹھا دیا۔ واداش روم

سے منہ ہاتھ دھو کر آئیں تو میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ بانو کے پاس بریٹا تھا اور وہ راج کنور کی نگرانی کر سکتی

تھی۔ میں نے اسے خبردار کیا۔ ”مجھے سوتا پا کر کسی شرارت کا خیال ذہن میں مت لانا میں تمہیں گولی مارتے

ہوئے ایک بار سوچوں گا لیکن یہ تمہیں شوٹ کر کے بہت خوش ہوگی۔ اس لیے صبح تک زندہ رہنے کی کوشش کرنا۔“

میں بستر پر دراز ہوا اور چند منٹ میں گہری نیند سو گیا تھا۔ میں نے آٹھ بجے اٹھانے کو کہا تھا لیکن اوشا نے

مجھے ساڑھے سات بجے ہی جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ ”شہباز دروازے پر کوئی ہے۔“

میں جاگ گیا تھا اور دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک سن سکتا تھا۔ بانو مستعدی سے راج کنور کی

نگرانی کر رہی تھی جو صوفے پر دراز سو رہا تھا۔ میں اٹھ کر دروازے تک آیا اور سائیز پر ہو کر بلند آواز سے پوچھا۔

”کون ہے؟“

”شہباز دروازہ کھولو۔“ ایک دھیمی آواز نے کہا تو میں چونک گیا۔

”بڑے کنور؟“ میں نے شک سے پوچھا۔

”ہاں میں ہوں دروازہ کھولو تم سے بات کرنے آیا ہوں۔“

بڑے کنور کا وہاں آنا میرے لیے غیر متوقع تھا کیونکہ مٹی جی کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ بڑے کنور تک

رسائی میں ہر ممکن رکاوٹ ڈالنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ مگر بڑا کنور خود کمرے کے باہر موجود تھا۔ میں بلند آواز سے

بات کر رہا تھا اور راج کنور بیدار ہو گیا تھا۔ بڑے کنور کا نام سن کر وہ بھی چونکا تھا میں اس کے پاس آیا اور اسے

بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ ”باہر بڑا کنور آیا ہے وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

”بڑا کنور۔“ اس نے ناقابل یقین لہجے میں کہا۔ ”وہ یہاں کیسے آ سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں آ سکتا کیا اس لیے کہ وہ تمہاری قید میں تھا۔“ میرا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ اس نے اقرار کر لیا۔

”ہاں اسے کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔“

”تب اس کی باہر موجودگی بتا رہی ہے کہ باہر کوئی بڑی تبدیلی آ چکی ہے جس کے نتیجے میں بڑا کنور یہاں

تک آیا ہے۔“

میری چھٹی حس اشارہ دے رہی تھی کہ گزربڑ ہو گئی تھی۔ راج کنور بھی سخت تشویش زدہ ہو رہا تھا میں اسے

دروازے تک لایا۔ پستول اس کی پشت سے لگا کر اوشا کو دروازہ کھولنے کو کہا۔ اس نے دروازہ کھولا تو عین سامنے

بڑا کنور اپنے مخصوص چننے میں روپوش کھڑا تھا اس کے دائیں طرف فشی جی اور بائیں طرف رامن تھا۔ ٹائیک ان

کے پیچھے تھا ان کے علاوہ چھ مسلح گورکھے بھی کھڑے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بڑا کنور اب آقا تھا اور وہ سب

اسے کی آقا کی تسلیم کر چکے تھے۔ پانسہ پلٹ گیا تھا صرف میرے لیے نہیں بلکہ راج کنور کے لیے بھی۔ بڑے کنور

نے پہلی بار بلند اور تیز آواز میں کہا۔ ”شہباز ملک ہتھیار ڈال دو اور باہر آ جاؤ۔“



میں نے اطمینان سے کہا۔ ”اگر میں ایسا نہ کروں تو.....؟“

”تب مجبوراً مجھے اپنے آدمیوں سے کہنا پڑے گا۔“ بڑے کنور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تمہارے آدمی؟“ میں نے استہزائیہ انداز میں مٹھی جی، رامن اور ٹائیک کو دیکھا۔ ”کل تک یہ راج کنور کے جوتے چاٹ رہے تھے اور تمہیں معزول بادشاہ کی طرح قید کر رکھا تھا۔“
 ”وہ کل کی بات تھی اب صورت حال بدل گئی ہے۔“

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”تم ان لوگوں پر بھروسہ کر رہے ہو جو ہمارے سیاست دانوں کی طرح پٹری بدلنے کے ماہر ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر راج کنور میرے قبضے سے نکل جائے گا تو یہ دوبارہ تمہیں قید نہیں کرے گا؟“

”یہ بعد کی بات ہے۔“ اس نے معمول کے مطابق سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”بہتر ہو گا تم ہتھیار ڈال کر خود کو راج سمیت میرے حوالے کر دو، میں وعدہ کرتا ہوں چند مہینے بعد تمہیں اس لڑکی سے سمیت واپس پاکستان بھیج دوں گا۔“

”ہتھیار ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں ایک کام ہو سکتا ہے تم ہمیں یہاں سے جانے سے دو۔ ہم نیلی کا پٹر میں یہاں سے نکل جاتے ہیں اور ہمیں سرحد پار چھوڑ کر راج کنور واپس آ جائے گا اور پھر تم دونوں بھائی آپس میں اپنے معاملات نمٹاتے رہنا۔ جہاں تک میرے خون کا تعلق ہے تو اب اسے بھول جاؤ۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

”سب ممکن ہے۔“ میں نے اوشا کو دروازہ بند کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس پر غور کرو، یقین کرو اس مسئلے کا سب سے بہتر حل یہی ہے دوسری صورت میں بہت خون خرابا ہوگا۔“

رامن، مٹھی جی اور ٹائیک ہیچ دو تباہ کھارہے تھے ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے چر بھڑ کر رکھ دیں۔ دروازہ بند ہونے سے پہلے میں نے مشورہ دیا۔ ”بڑے کنور جی، ایک مخلصانہ مشورہ ہے۔ ان تین افراد سے فوری چھٹکارا حاصل کر لیں۔ یہ آستین کے سانپ ہیں اور آپ پہلے ہی سانپ کے ڈسے ہوئے ہیں۔“

اوشا نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ اور بانو ہتھیار بدست پوری طرح تیار تھے۔ خاص طور سے بانو پُر عمر مٹی

کہ وہ کسی صورت زندہ ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ میں راج کنور کو واپس صوفے تک لایا اور اس پر دھکیل کر کہا۔ ”تم نے دیکھا راج کنور بازی کیسے پلٹتی ہے۔ کل تک تمہارے پیچھے ڈم ہلانے والے آج بڑے کنور کے ساتھ کھڑے ہیں۔ کیا خیال ہے اگر میں تمہیں بڑے کنور کے حوالے کر دوں؟“

”نہیں۔“ وہ کانپ اٹھا تھا اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ”وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔“

”مطلب کہ وہ بھول گیا ہے کہ تم اس کے بھائی ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے اس کا علاج بند کیا اور اسے قید رکھا وہ اس پر مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

”کیا کرے گا قتل کر دے گا؟“

”اس سے بھی زیادہ۔“ راج کنور نے سہمہ انداز میں کہا۔ ”وہ مجھے اپنے کتوں کے آگے ڈلوادے گا۔ تم اس کے نرم لہجے پر مت جاؤ وہ مجھ سے بھی زیادہ سفاک ہے۔“

”اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”مجھے یقین ہے وہ ایسا ہی کرے گا لیکن کیا اس صورت میں، میں اور تم ایک ہی لیول پر نہیں آگئے ہیں۔ بلکہ میں اس کے لیے ضروری ہوں اور تمہارا کاناوہ جلد از جلد نکال دینا مناسب سمجھے گا۔“

راج کنور نے جواب نہیں دیا لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے وہ بھی یہی سوچ رہا ہے۔ بانو بھی فکر مند ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”اس صورت میں بڑا کنور اس کی پروا کیے بغیر کوئی کارروائی کر سکتا ہے۔“

”وہ نہیں کرے گا۔“ اوشا بولی۔ ”اُسے شہباز کا کھون چاہیے۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے میں اس کے لیے ضروری ہوں اور اگر مجھے کوئی نقصان ہوا تو اس کے علاج کا امکان ختم ہو جائے گا۔“

”لیکن وہ آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے گا۔“ بانو نے کہا۔ ”اس صورت میں وہ اس کی پروا بھی نہیں کرے گا کہ آپ کو نقصان ہوتا ہے یا نہیں۔“

”تمہاری بات بھی قابل غور ہے۔“ میں نے کہا۔

”کاش کے ہم رات کو ہی نکل جاتے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ راج کنور بولا۔ ”میرے پاس صرف دن میں پرواز کا لائسنس ہے اور دوسرے یہ پہلی کا پٹر رات میں پرواز کے قابل بھی نہیں ہے صرف دن میں اڑ سکتا ہے۔“

میں ظاہر نہیں کر رہا تھا لیکن اندر سے میں تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ بڑے کنور نے اچانک راج پاٹ دوبارہ حاصل کر کے میرے ہوتے کام میں رکاوٹ ڈال دی تھی۔ راج کنور پر میں نے اسی لیے قبضہ کیا تھا کہ وہ شاہ تھا مگر دشمن کی قید میں جاتے ہی رعایا نے اسے معزول کر کے معزول شاہ کو قید خانے سے نکال کر دوبارہ تخت پر لا بٹھایا تھا۔ بادشاہ مر گیا..... نیا بادشاہ آ گیا..... بادشاہ زندہ ہے..... تاج و تخت زندہ باد۔ یہ کہانی اس چھوٹی سی ریاست میں بھی دہرائی گئی تھی۔ راج کنور کی حیثیت ختم ہو گئی تھی اس لیے اب یہاں سے بہ حفاظت نکلنے کے لیے اس کا سہارا نہیں لیا جاسکتا تھا۔ اس میں بہت رسک آ جاتا۔ بڑا کنور جس طرح لاؤ لٹکر کے ساتھ آیا تھا اس نے واضح پیغام دیا تھا کہ میں راج کنور یا طاقت کے بل پر یہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ صرف ایک چیز نے بڑے کنور

کوفری ایکشن سے روک دیا تھا کہ میں اس کے علاج کی واحد امید تھا۔ اگر مجھے کوئی نقصان ہوتا تو اسے علاج کے لیے میرا خون نہ ملتا۔

میں سوچنے لگا کہ راج کنور کا ٹرمپ کارڈ اب اتنا کارآمد نہیں رہا تھا لیکن میرے ہاتھ میں یہ ایک چیز تو تھی۔ میں اس سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتا تھا اس کا انحصار آنے والے حالات پر تھا۔ راج کنور کا یہ عشرت کدہ کنورہ ہیلز کے عین وسط میں تھا گویا میں اور میرے ساتھی چاروں طرف سے دشمن کی کچھار میں تھے۔ یہاں سے ٹکلتا آسان نہیں تھا۔ ہیلز کے دوڑھائی سو مچھلیوں کے ساتھ راج کنور کے پالے بد معاشوں سے بھی مقابلہ تھا اور ان سب سے لڑ بھڑ کر صرف سپر مین یا کوئی فلمی ہیرو ہی یہاں سے نکل سکتا تھا۔ ایک عام کیا میرے جیسے خاص انسان کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ میری طرح راج کنور بھی حالات پر غور کر رہا تھا اور جیسے جیسے غور کر رہا تھا اس کی حالت بھی خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا اگر بڑے کنور نے اسے قبضے میں کر لیا تو اس کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی محفوظ تھا۔

غیب بات تھی کچھ عرصے پہلے میں بڑے کنور کی زندگی کا باعث بن رہا تھا اور یہ راج کنور کو گوارہ نہیں تھا اور اب راج کنور میرے پاس تھا اور بڑا کنور اس کے خون کا پیسا ہورہا تھا۔ اسے بچانا مجھ پر فرض نہیں تھا لیکن اس پر قید خانے سے نکلنے کے لیے راج کنور یا بڑے کنور میں سے کسی کا میرے قبضے میں ہونا ضروری تھا۔ کچھ دیر بعد راج کنور نے زبان کھولی۔ ”شہباز یہاں میری زندگی کو خطرہ ہے اگر تم مجھے یہاں سے نکال لے جاؤ تو میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں سرحد پار پہنچا دوں گا۔“

”غالباً موت کی سرحد کے پار۔“ میں نے نیم سنجیدہ انداز میں کہا لیکن میں اس کی بات پر غور کر رہا تھا۔ ”تم دونوں بھائی ایک نمبر کے مکار ہو۔“

”نہیں میں سوگند کھاتا ہوں اپنے بچوں کی۔“ وہ یقین دلانے لگا۔ ”پھر میں تمہارے قبضے میں ہوں گا اگر میں ذرا بھی وعدہ خلافی کروں تو تم مجھے گولی مار دینا۔“

وہ اسی قابل تھا کہ اسے گولی ماردی جائے لیکن فی الحال اس کی زندگی میرے لیے ضروری تھی۔ صبح کے چھ بج رہے تھے اور باہر یقیناً روشنی نمودار ہوگئی ہوگی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ناشتہ کر لیا جائے کیونکہ اس کے بعد پھر نہ جانے کب ملے یا نہ ملے۔ کھانے کے لیے وہاں پھل تھے اور فروتج میں فلیور ملکہ موجود تھا۔ ہم نے اس سے ناشتہ کیا۔ راج کنور نے برائے نام کھایا۔ اپنا اقتدار جاتا دیکھ کر اس کی بھوک مرگئی تھی اور اپنی موت کے خوف سے وہ ادھ مو ا ہوا جا رہا تھا۔ اس دوران میں اس نے مجھے دو تین بار پیشکش کر دی تھی کہ وہ میری مدد کر سکتا ہے۔ کھانے کے بعد میں نے کہا۔ ”راج کنور تم فضول کی پیشکش کر رہے ہو یہاں سے نکلنے کے بعد تو میں خود بھی پاکستان جاسکتا ہوں۔ اصل کام اس ہیلز سے نکلتا ہے۔ یہاں سے نکلنے میں تم کیا مدد کر سکتے ہو۔“

راج کنور کے چہرے پر تفکر آمیز تاثرات آگئے تھے اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے یقیناً وہ یہاں سے نکلنے کے کسی راستے سے واقف تھا یا تو وہ اسے استعمال کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا یا پھر اس فکر میں تھا کہ مجھے بتائے یا نہیں۔ اسے مصروف دیکھ کر میں نے مناسب سمجھا کہ اسلحہ کا جائزہ لے لوں۔ ایک عدد خود کار رائفل اور اس کے جوا اضافی میگزین، جدید ساخت کی چھوٹی شاٹ گن اور اس کے

تقریباً سو کاروس تھے۔ اسی طرح بریٹا اور اعشاریہ اڑتیس کے تین تین اضافی میگزین تھے۔ یوں دیکھا جائے تو اسلحے کے لحاظ سے پوزیشن بری نہیں تھی لیکن اگر ہمیں محدود پیمانے پر اپنا دفاع کرنا پڑتا۔ یہ اسلحہ ایک دو درجن مسلح ترین افراد کی فوج سے مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ مگر جس وقت میں نے یہ اسلحہ منگوایا تھا اس وقت یہی خیال تھا کہ بس راج کنور کو قابو کرنا ہے اور باقی سب خود قابو رہیں گے۔ پھر ہم تینوں میں صرف میں ہی اسلحہ ڈھنگ سے استعمال کر سکتا تھا۔ بانو اناڑی تھی اور اوشا سے کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے راج کنور کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال نے تم نے کافی سوچ لیا ہے اب فیصلہ کر لو کہ ہمیں اس خفیہ راستے سے باہر لے جاؤ گے یا نہیں۔“

وہ حیران ہوا۔ ”تم کیسے جانتے ہو؟“

”یہ کوئی مشکل سوال نہیں ہے۔ اس قسم کے محلات میں جہاں دنیا کی آسائشیں ہوں وہاں برا وقت آتے بھی دیر نہیں لگتی ہے اور اسی برے وقت سے بچنے کے لیے یہاں فرار کا خفیہ راستہ رکھا جاتا تھا۔ جب قبائلیوں نے حملہ کیا ہو گا تب بھی تم لوگ اسی راستے سے نکلے ہو گے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”لیکن یہ پیلس کے اہم ترین رازوں میں سے ہے اس سے صرف میں اور بڑا کنور واقف ہیں۔“

”کوئی بات نہیں اگر ہم بھی واقف ہو جائیں ویسے بھی اب تمہارا اور بڑے کنور کا راستہ الگ ہے اور اگر قسمت نے یادری کی اور تم دوبارہ یہاں کے حکمران بن گئے تو خفیہ راستہ پھر سے بنو لینا۔ تمہارے لیے کیا مشکل ہو گی؟“

”خفیہ راستے کے بجائے اپنی فکر کرو۔“ بانو نے کہا۔ ”اگر بڑے کنور نے ہمارے خلاف طاقت کا استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تو پھر بھاگ بھی نہیں سکتے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”اگر اس نے حملے کے بجائے کوئی اور حربہ استعمال کیا جیسے گیس چھوڑ دی۔ یا وہ سکون سے بیٹھ کر انتظار بھی کر سکتا ہے۔ یہاں ہمارے پاس کھانے کو کیا ہے دو تین دن بعد بھوک خود ہمیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے گی۔“

راج کنور بریشان ہو گیا۔ ”دیکھو یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“

”خفیہ راستے تک پہنچنا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”وہ یہاں سے کچھ دور ہے اول تو ہمیں وہاں تک کوئی جانے نہیں دے گا اور ہم اس تک پہنچ گئے تب بھی ہمارا اچھا کیا جائے گا اور اگر باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تب بھی یہ لوگ وہاں پہنچ کر ہمیں روک سکتے ہیں۔“

”تمام مفروضات ٹھیک ہیں لیکن ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ اب بولو اگر تم راضی نہیں ہو تو۔۔۔۔۔“

”تو تمہارا کیا فائدہ۔“ بانو نے اس کے سر سے پستول لگا دیا۔ ”کیوں نہ یہاں تمہاری ایش چھوڑ

جائیں۔“

راج کنور لرز گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں انکار نہیں کر رہا لیکن اس میں بہت زیادہ خطرہ ہے۔“
”تم اس کی پروا مت کرو۔“

”کیسے نہ کروں مجھے بھی تو تمہارے ساتھ جانا ہوگا میری جان کو بھی خطرہ ہوگا۔“ اس نے بلبل کر کہا۔
”جان کا خطرہ تو یہاں بھی ہے۔“ بانو نے کہا۔ ”ہم تمہیں زندہ چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ دشمن جتنے کم ہوں اتنا اچھا ہوتا ہے۔“

”تب تم باہر جا کر بھی مجھے مار دو گے۔“

”دشمن تم اس وقت بنو گے جب آزاد ہو گے اور ہمارے ساتھ تم قیدی ہو گے اس لیے دشمن نہیں رہو گے۔ جب آزاد کرنے کا وقت آئے گا تو ہم اپنی حفاظت کا بندوبست کر لیں گے۔“

بانو بڑی ہوشیاری سے اسے قائل کر رہی تھی۔ میں نے بھی زور دیا۔ ”راج کنور سوچ میں وقت ضائع مت کرو بعض اوقات وقت کا ضیاع ہی ناکامی کا سبب بن جاتا ہے۔“

اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ”ٹھیک ہے میں تیار ہوں آگے جو بھگو ان کی مرضی۔“

جیسے ہم کہتے ہیں کہ سب کر کے دیکھ لیا آگے اللہ کی مرضی۔ یعنی پہلے ہم اپنی مرضی کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اسے اللہ پر چھوڑتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ جو ہوتا ہے وہ ہمیشہ ہی اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ وہاں کاغذ کے نام پر چھوٹا نوٹ پیڑ تھا اس لیے ایک صاف سفید کپڑے کا سہارا لیا گیا اور راج کنور نے اس پر پیلس کے اس حصے کا ایک تفصیلی نقشہ بنایا۔ اس نقشے کی مدد سے اس نے سمجھایا کہ ہمیں کہاں جانا تھا۔ یہ جگہ اس عشرت کدے سے کوئی چالیس میٹر شمال میں تھی۔ اس تک جانے کے لیے ہمیں پہلے ایک ایل شکل کی راہداری سے گزرتا تھا اور جہاں یہ راہداری ختم ہو رہی تھی وہاں سے دائیں طرف مڑنے کے بعد ہم اس جگہ پہنچ سکتے تھے۔ دونوں راہداریاں مکلی تھیں اور ان میں کہیں کوئی آڑ نہیں تھی۔ یہ فاصلہ اصل میں اتنی میٹر تھا اور اگر ہم پوری رفتار سے کام لیتے تو ایک منٹ سے کم وقت میں وہاں پہنچ سکتے تھے۔

لیکن اس میں سب سے بڑی رکاوٹ ٹائیک اینڈ رامن اینڈ کمپنی کی صورت میں موجود ہوتی۔ ان کا ہونا اتنا ہی یقینی تھا جتنا اس کمرے کے باہر کنور پیلس کا ہونا۔ وہ بھرپور مزاحمت کرتے۔ دونوں جانب سے گولیوں کا تبادلہ ہوتا۔ ہماری طرف سے اس تبادلے کے لیے صرف تین عدد افراد تھے اور خود کار رائفل صرف ایک تھی جب کہ دوسری طرف تمام ہی افراد خود کار رائفلوں سے مسلح ہوتے۔ یہ ایک یک طرفہ جنگ ہو سکتی تھی۔ جس میں ہمارے بچنے اور بچ کر نکلنے کی گنجائش بہت کم ہوتی۔ راج کنور بھی یہ بات سمجھ رہا تھا اور اسی لیے ہماری مخالفت کر رہا تھا۔ مگر وہ ہمارے آگے بے بس تھا۔ مجھے غور و فکر کرتے پا کر اس نے کہا۔ ”شہباز ایک بار پھر سوچ لو یہ بہت رکی ہے۔ وہ ہمیں اس دروازے سے زیادہ دور جانے نہیں دیں گے۔ ہم مارے جائیں گے۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”اس صورت میں ان کو دھوکا دے کر کام نکالا جاسکتا ہے۔“
”کیسا دھوکا؟“

”اس بارے میں غور کرنا پڑے گا۔ یہ بتاؤ کہ یہاں ہونے والے گفتگو کہیں اور تو نہیں سنی جا رہی ہے؟“
”نہیں یہاں سب میرے کنٹرول میں ہے اور کوئی دوسرا فرد گفتگو نہیں سن سکتا ہے جب تک میں نہ

چاہوں۔“

”اس کی مدد سے؟“ میں نے واکی ٹاکی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ مسکرایا۔ ”نہیں وہ سسٹم ایسا ہے کہ تم اسے پکڑ بھی نہیں سکتے۔ وہ میری آواز سے کام کرتا ہے اگر میں

ایک خاص لفظ ادا کروں گا تو سسٹم کام کرنے لگے گا اور یہاں کی آوازیں باہر سنائی دیں گی۔“

”جب ہم نے تمہیں قابو کیا تو کیا تم نے ہوش میں آنے کے بعد وہ لفظ ادا کیا تھا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کی ضرورت نہیں تھی تاہم اسے ان کو پہلے ہی پتا چل گیا تھا۔“

”ممکن ہے تمہارے علاوہ بھی کسی کو اس سسٹم کا علم ہو۔“

”جب بھی وہ بغیر بولے اسے الیکٹریسیٹی نہیں کر سکتا ہے۔“ راج کنور نے کہا تو میں قائل ہو گیا۔ اگرچہ

اس کا رویہ پہلے بھی تابعدار نہ تھا لیکن جب سے اس نے بڑے کنور کو آزاد دیکھا تھا نہایت شرافت سے پیش آ رہا

تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی سرشت ہی بدل گئی ہے لیکن بین کی حرکت کے ساتھ سانپ کے جھومنے سے اس

کی زہرناکی پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اور نہ اس کی ڈسنے کی جہلت میں تبدیلی آتی ہے۔ میں راج کنور کی طرف

سے ہوشیار تھا۔ میں نے اس سے ان راہداریوں کے اطراف میں موجود کمروں اور پیلس کے حصوں کے بارے

میں پوچھا۔ راج کنور نے وضاحت کی کہ ان میں سے بیشتر کمرے پیلس والوں کے لیے مخصوص ہیں یعنی وہ

چاہیں تو نہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ ان میں بیدرومز اور نشست گاہیں شامل تھیں۔ ایک کمرہ چھوٹا ڈاننگ روم

تھا۔ جیسے جیسے راج بتا رہا تھا میں کپڑے کے نقشے پر اضافہ کر رہا تھا۔ کمروں کے مزید دروازے کہاں کہاں کھلتے

تھے یہ معلومات بھی اہم تھیں۔ اس سے پتا چلتا کہ کہاں سے دشمنوں کو مزید کمک مل سکتی تھی۔ میرے ذہن میں

ایک ممکنہ پلان واضح ہوتا جا رہا تھا لیکن اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت تھی۔ جب میں نے راج کنور سے تمام

ممکنہ معلومات حاصل کر لیں۔ تو اوشا کو پاس بلایا۔

”تم پیلس کے تمام حصوں سے واقف ہو؟“

”ہاں رہے۔“

میں نے اسے نقشہ دکھایا اور پھر سمجھایا کہ ہم کہاں تھے؟ جب وہ سمجھ گئی تو میں نے راج کنور کی دی ہوئی

معلومات کا موازنہ اس کی معلومات سے شروع کیا۔ کچھ دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ راج کنور نے کہیں غلط بیانی

نہیں کی تھی۔ اوشا نے میری طرف دیکھا۔ ”تو یہ کیوں پوچھ رہا ہے؟“

”ہمیں یہاں جانا ہے؟“ میں نے اوشا کو خفیہ راستے والے کمرے کے خانے پر انگلی رکھ کر کہا۔

”پر کیوں یہاں تو کچھ نہیں ہے رہے۔“

”یہاں پیلس سے باہر جانے کا راستہ ہے۔“

اوشا فکر مند ہو گئی۔ ”پر وہ جانے کہاں دیں گے؟“

”ہمیں راستہ بنانا ہوگا اور اس کے لیے خطرہ مول لینا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے ہمارے پاس ایک

ڈھال تو ہے۔“

راج کنور کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ تمہاری غلط فہمی ہے وہ سب سے

پہلے مجھے ماریں گے۔ اس کے بعد تم بھی نہیں بچو گے۔“

”میں مذاق کر رہا ہوں مجھے بھی معلوم ہے بڑا کنور اور اس کے آدمی تمہارے دشمن ہیں اور دوسرے خفیہ راستہ تم ہی کو لو گے اس لیے ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔“

”جب تک تم ہمیں دھوکا نہیں دیتے زندہ رہو گے۔“ بانو بولی۔

راج کنور نے رشک سے مجھے دیکھا۔ ”شہباز تم نے ایک سادہ سی ماری کو کیا بنا دیا ہے۔ میں نے آج تک کسی کو اتنی تیزی سے بدلے نہیں دیکھا ہے۔“

”اس میں میرا نہیں بانو کا کمال ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے خود بھی آج تک کسی کو اتنی جلدی خود کو بدلے نہیں دیکھا۔ کبھی میں بھی ایک عام آدمی تھا اور جب حالات نے مجھے اس ڈگر پر ڈالا تو مجھے خود کو بدلنے میں اس سے کہیں زیادہ وقت لگا تھا۔“

بانو جھینپ گئی۔ ”آپ لوگ میری تعریف ہی کرتے رہیں گے یا یہاں سے نکلنے کا کوئی طریقہ سوچیں گے۔“

”طریقہ تو ہے۔“ میں نے کہا اور بانو کو ایک کونے میں لایا۔ ”ہمیں حکمتِ عملی سے کام لینا ہوگا۔ مار دھاڑ کر کے اس جگہ تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہوگا۔“

”کیسی حکمتِ عملی؟“

”پلان یہ ہے کہ میں بڑے کنور سے بات کھاتا ہوں میں اس سے کہوں گا کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہم یہاں سے نکلیں گے اور جب خفیہ راستے والے کمرے کے پاس پہنچیں گے تو اپنا راستہ بدل لیں گے۔ اس وقت ہمیں روکنا ذرا مشکل ہو جائے گا۔“

بانو نے نکتہ اٹھایا۔ ”اس میں ایک رسک ہے کہ باہر نکلتے ہی ہم پر حملہ نہ ہو جائے۔“

”اس کا امکان ہے لیکن مجھے امید ہے کہ جب میں بڑے کنور کو مذاکرات کی بنیاد پر ہتھیار ڈالنے کا چارہ دوں گا تو وہ اس پر ضرور منہ بارے گا۔ اس کی بھی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میں صبح سالم اس کے ہاتھ آ جاؤں۔“

”ٹھیک ہے جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”تمہارا کردار اہم ہے۔ جیسے ہی ہنگامہ شروع ہو گا تم اور اوشا راج کنور کو لے کر اس کمرے تک جاؤ گی اور خفیہ راستہ کھلو آؤ گی۔ اس دوران میں، میں بڑے کنور کے لوگوں کو روکوں گا۔“

بانو فکر مند ہو گئی۔ ”لیکن اگر آپ کہیں بھٹس گئے یا راج کنور نے کوئی چالاکی دکھائی.....؟“

میں اس کے خدشات سمجھ رہا تھا درحقیقت مجھے خود بھی پوری طرح یقین نہیں تھا کہ میں کامیابی سے اس پلان پر عمل کر سکوں گا۔ مشکلات بہت زیادہ تھیں اور کامیابی کا امکان کم تھا۔ ایک دوسرا پلان بھی تھا اس میں بانو اور اوشا یہاں سے نکل جاتیں اور میں خود کو بڑے کنور کے حوالے کر دیتا۔ اس کی کامیابی کا امکان تھا لیکن میں پھر بڑے کنور کے چنگل میں بھٹس جاتا اور نہ جانے پھر گلو خلاصی ہوتی بھی یا نہیں۔ میں نے بانو کے سامنے یہ پلان بھی رکھا تو اس نے اسے فوری مسترد کر دیا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے ہم سب ساتھ یہاں سے نکلیں گے ورنہ نہیں.....“

”یہ بھی ایک آپشن ہے اگر ہم ناکام رہے اور پکڑے گئے تو پھر اسے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔“
 ”پہلے میں شاید یہ بات مان بھی جاتی لیکن اب میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“ اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

میں نے بحث نہیں کی اور موضوع بدل دیا۔ ”ٹھیک ہے میں بڑے کنور سے بات کر رہا ہوں لیکن اس سے پہلے ہمیں پوری طرح پلان سمجھ لینا چاہیے۔“

راج کنور غور سے ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا اور شاید باتیں سننے کی کوشش بھی کر رہا تھا لیکن میں اور بانو بہت دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اب جو پلان تھا اس سے راج کنور کو بے خبر رکھنا ضروری تھا کیونکہ وہ درمیان میں گڑبڑ کر سکتا تھا۔ ویسے بھی عمل ہم تین افراد نے کرنا تھا اس لیے اس کا بے خبر رہنا ضروری تھا۔ میں نے اسے واش روم کے دروازے کے پاس جانے اور منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑے ہونے کا حکم دیا تو اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”یہ کیوں؟“

میں غرایا۔ ”سوال مت کرو جو کہا جا رہا ہے ہو کر دو۔“

”اور اچھے بچوں کی طرح دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“ بانو ملی۔ ”سمجھ لو آج تمہیں ہوم ورک نہ کرنے پر سزا دی جا رہی ہے۔“

راج کنور خون کے گھونٹ پی کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ ہم سے کوئی چھ سات گز کی دوری پر تھا۔ میں نے اوشا، بانو اور اپنے درمیان نقشہ بچھایا اور سرگوشی میں ان کو سمجھانے لگا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اوشا بھی یہ سن کر پریشان ہو گئی تھی کہ میں پیچھے رہ کر آنے والوں سے نمٹوں گا اور وہ راج کنور کے ہمراہ خفیہ راستہ کھولنے جائیں گی۔ اوشا نے کہا۔ ”شہباز ٹو ساتھ رہ۔“

”میں بھی یہی کہہ رہی ہوں۔“ بانو نے اس کی تائید کی۔

”تم دونوں عقل سے سوچو اگر ہم تینوں ہی اس کمرے میں پہنچ گئے تو دشمن باہر تک آجائے گا اور ممکن ہے وہ ہمیں فرار ہونے ہی نہ دے اس لیے راستہ کھٹلنے تک ان لوگوں کو دور رکھنا ضروری ہے۔“

ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ میری رائے سے متفق نہیں تھیں۔ بانو اب کمزور نہیں تھی اور اوشا تو بذات خود ہلاکت خیز ہتھیار تھی اس کے باوجود وہ میرے بغیر خود کو کمزور اور اکیلا محسوس کر رہی تھیں اور خوفزدہ تھیں۔ میں نے اعشاریہ اڑتیس اوشا کے سپرد کیا۔ یہ استعمال میں آسان تھا اور اس جھکا بھی ہلکا ہوتا ہے۔ وہ اسے آسانی سے استعمال کر سکتی تھی۔ بریٹا سے بانو نے فائزنگ کی مشق بھی کر لی تھی اور وہ اس کا تیز جھکا برداشت کر سکتی تھی۔ پھر خالی ہاتھوں سے بھی راج کنور کو قابو کر سکتی تھی۔ میں نے ان سے کہا۔ ”باہر نکلتے ہی تم دونوں راج کنور کے ساتھ رہو گی بلکہ ہو سکتے تو اس سے چٹ جانا۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ بانو نے فوراً انکار کر دیا۔ ”اس سے بہتر ہے میں گندے جانور کے ساتھ چٹ

جاؤں۔“

اوشا ملی۔ ”میں چٹ جاؤں گی۔ اس کا آکھری سے اچھا بیٹے گا۔“
 ”خدا کے لیے آہستہ بولو۔“ میں نے راج کنور کی طرف دیکھا۔ ”ابھی سے مرنے مارنے کی باتیں کر دو گی

تو وہ بدک جائے گا۔“

”آپ فکر نہ کریں ہم یہ کام کر لیں گے۔“ بانو نے اس بار حوصلے سے کہا۔

”ایک اہم بات ذہن نشین کر لو۔ راج کنور ہمارا ڈھال ہے اس لیے اس کی آڑ میں رہنا لیکن اگر تم لوگ کسی مرحلے پر محسوس کرو کہ پکڑی جاؤ گی تو اسے شوٹ کر دینا۔ اسے زندہ نہیں چھوڑنا ہے۔“

وہ دونوں فکر مند نظر آنے لگیں بانو نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوگا؟“

”یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”بس ایک بات طے ہے ہم زندہ نہ رہیں یا پکڑے جائیں تو اس صورت میں راج کنور کو زندہ نہیں بچنا چاہیے۔ اس جگہ وہی ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے وہ آزاد ہو گیا اور اس نے دوبارہ اختیار حاصل کر لیا تو ہمارے ساتھ بد سے بدتر کرنے کی کوشش کرے گا۔“

بانو نے جھرمیر لی۔ ”آپ کی بات سن کر میرا دل چاہ رہا ہے کہ اسے ابھی شوٹ کر دوں۔“

”بی بی اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو گی تو ہم یہاں سے سلامتی کے ساتھ نکل سکتے ہیں۔“

اس نے سعادت مندی سے کہا۔ ”میں کوشش کروں گی جیسا آپ نے کہا ہے ویسا ہی کروں۔“

”میں بھی۔“ اوشا نے جذباتی انداز میں میرا بازو تھام لیا۔ ”شہباز اگر میں جیتی رہی تو تیرے نام سے جیوں گی اور مرگئی تو تیرے نام سے مروں گی۔“

”ابھی مرنے کی نہیں جینے کی بات کرو۔“ میں نے جھینپ کر کہا۔ اس کا انداز اتنا جذباتی تھا کہ بانو بھی کھسیا مٹی لیکن اوشا کو ایسی باتوں کی پروا کبھی نہیں رہی تھی جذبات کے اظہار میں وہ اتنی کھلی ڈھلی تھی کہ اپنے باپ کی پروا بھی نہیں کرتی تھی۔ اوشا دکھی ہو گئی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں رے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”لیکن میں تم سب سمیت جینا چاہتا ہوں۔ ہم خودکشی کرنے نہیں جا رہے ہیں۔ اگر موقع آئے کہ ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو ہتھیار ڈال دینا جیسے ابھی ہمیں موقع ملا ہے اس طرح بعد میں بھی طے اصل بات زندہ رہنا ہے۔ بس یہ چیز طے ہے کہ راج کنور نہ بچے۔“

انہوں نے سر ہلایا تو میں نے ایک بار پھر انہیں ذہن نشین کرایا کہ کس موقع پر کیا کرتا ہے۔ پلان سادہ تھا۔ میں بڑے کنور سے بات کرتا اور اس کے پاس جانے کی اجازت طلب کرتا۔ وجہ یہ ہوتی کہ میں اس سے مذاکرات کرنا چاہتا تھا اور اس کے سامنے کچھ شرائط رکھنا چاہتا تھا۔ وہ مان جاتا تو ہم یہاں سے نکلنے میں بڑے کنور سے کہہ دیتا کہ راستے میں اس کے آدمی نہ آئیں اس لیے امکان تھا کہ اس کا لشکر دور ہٹ جائے گا۔ ایل فیل کی راہداری سے نکلنے کے بعد بڑے کنور کے حصے کی طرف جانے کے لیے ہمیں بائیں طرف مڑنا ہوتا لیکن ہم دائیں طرف مڑ جاتے اور یہاں سے اصل مرحلہ شروع ہوتا۔ امکان تھا کہ بڑے کنور کے آدمی بائیں طرف ہی ہوں گے اور دائیں طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا یا اس طرف ہوئے بھی تو زیادہ نہیں ہوں گے اور ان سے نمٹنا جا سکتا تھا۔ میں نے باری باری اوشا اور بانو سے پوچھا کہ انہیں کیا کرنا ہے اور ان کے جوابات سے مطمئن ہو کر میں نے انٹر کام اٹھایا۔ دوسری طرف فکشی جی تھے۔

”منشی جی، میں بڑے کنور سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ مجھے حکم کریں؟“ اس نے چالپوسی سے کہا۔ ”ہم بھی آپ کے خدمت گار ہیں۔“

”منشی جی میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں آپ اس کا بندوبست کر دیں۔“ میں نے کہا تو اسے سانپ سونگھ

گیا۔ پھر اس نے کہا۔

”یہ ممکن نہیں ہے شہباز جی۔“

”میں جانتا ہوں اسی لیے بڑے کنور سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں بات کراتا ہوں۔“

کچھ دیر بعد بڑا کنور لاکن پر آگیا۔ ”شہباز تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”میں نے محسوس کیا ہے کہ میرا اور میرے ساتھیوں کا یہاں سے زندہ نکلنا کن نہیں ہے اس لیے میں خود کو

آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں آپ سے مل کر کچھ شرائط پر بات کر دوں گا۔ کیا مجھے آپ

کے پاس آنے کی اجازت ہے۔“

ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں بڑا کنور خود یہاں آنے کی بات نہ کرے اس صورت میں پلان ٹیل ہو جاتا۔

بڑا کنور کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم آ جاؤ۔“

”میں راج کنور اور اپنے ساتھیوں سمیت آؤں گا۔“ میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے شرط رکھی۔

”کوئی ہم سے ہتھیار نہ مانگے اور نہ راستے میں آئے۔“

”سب کیوں بس تم آ جاؤ۔“

”گستاخی معاف بڑے کنور صاحب، میں چالاک نہیں ہوں لیکن بے وقوف بھی نہیں ہوں۔ میں آپ

سے ملنے آؤں اور پیچھے آپ کے کماؤں و میرے ساتھیوں پر قابو پالیں۔ یہ دو صورتیں بے چاری کیا کر لیں گی۔

اس لیے سب ساتھ آئیں گے راج کنور بھی ہمارے ساتھ ہوگا اور اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو اس کا پہلا نشانہ یہی بنے

گا۔“

”کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی لیکن میرے محافظ تمہیں ہتھیار بدست میرے پاس نہیں آنے دیں گے۔“

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھ سے آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا اور آپ سوچیں کہ اس جگہ سوائے

آپ کے سب میرے خون کے پیاسے ہیں اگر میں نے آپ کو کوئی نقصان پہنچایا تو مجھے ان لوگوں سے کون

بچائے گا۔ میں نے بہت غور کرنے کے بعد آپ پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ آپ سے میری جان کو کوئی

فوری خطرہ نہیں ہے۔ اگر آپ نے میری شرائط مان لیں تو سب پہلے کی طرح ہو جائے گا۔“

بڑا کنور خاموش ہو گیا غالباً وہ اس معاملے پر غور کر رہا تھا وہ اپنے بھائی راج کنور کے مقابلے میں کہیں

زیادہ ذہین تھا۔ اس نے اپنا وقت تعلیم حاصل کرنے اور مطالعے میں گزارا تھا جب کہ راج کنور نے جوان ہوتے

ہی عیاشی شروع کر دی تھی۔ مجھے خدشہ ہونے لگا کہ کہیں وہ اصل بات نہ بھانپ جائے۔ اتحادہ بھی سمجھتا تھا کہ

راج کنور جان بچانے کے لیے خفیہ راستے کو استعمال کر سکتا ہے لیکن یہ دور کا خیال تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ ہم راج

کنور کے کہیں زیادہ دشمن تھے اور وہ ہمیں اس خفیہ راستے کے بارے میں بتانے کی حماقت نہیں کرے گا کیونکہ ہم

اسے ساتھ لے جائیں گے اور خطرے سے نکلنے ہی اس کا کام تمام کر دیں گے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے جواب کا منتظر تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم لوگ آ سکتے ہو۔“

پہلا مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ ”میں ایک بار پھر خبردار کر رہا ہوں اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو آپ کو صرف چند لاشیں ملیں گی۔ اپنے آدمیوں سے کہیں کہ وہ بے شک آپ کے کمرے کے باہر مورچے بنائیں لیکن کوئی راستے میں نہ آئے۔“

”کوئی راستے میں نہیں آئے گا۔“ بڑے کنور نے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ ”میں تم سے ایک بار پھر کہہ رہا ہوں خود کو میرے حوالے کر دو۔ ایسا نہ ہو کہ تم یہاں سے نکل جاؤ اور پھر خود پلٹ کر میرے پاس آؤ۔“

”ایسا کبھی نہیں ہو گا بڑے کنور۔“ میں نے کہا اور انٹرکام رکھ دیا۔ میں نے غور نہیں کیا کہ بڑے کنور نے یہ بات کیوں کہی تھی۔ راج کنور بدستور دیواری کی طرف منہ کیے غالباً نوشتہ دیوار پڑھ رہا تھا۔ میں نے اسلمہ تقسیم کر دیا۔ بانو اور اوشا کا لباس ایسا نہیں تھا کہ وہ اضافی میگزین آرام سے رکھ سکیں۔ بانو نے مونے سوتی کرتے کے ساتھ جرسی کا ٹراؤزر پہنا ہوا تھا۔ اس کی جیبوں میں میگزین آگئے لیکن وہ بوجھ سے نکلنے لگی تھیں۔ اوشا کے مختصر لباس میں جیب نام کی کوئی چیز نہیں تھی لیکن اس نے پستول کے میگزین اپنی دھوتی نما چست ساڑھی میں سامنے کی طرف اڑس لیے تھے۔ یہ خاصا مشکل کام تھا کیونکہ ساڑھی پہلے ہی خاصی نیچے بندھی تھی اگر اوشا مخصوص جسمانی ساخت کی حامل نہ ہوتی تو میگزین کیا ساڑھی کا بھی اپنی جگہ رہنا محال ہوتا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تمہیں مشکل ہوگی ایسا کر دے یہ بانو کو دے دو۔ اگر ضرورت پڑی تو بانو سے ملے لیٹا۔“

اس نے میگزین نکال کر بانو کے حوالے کر دیئے۔ وہ نرم ٹراؤزر کے نکلنے سے پہلے ہی پریشان تھی۔ اس نے واش روم کا رخ کیا تاکہ اس کی ڈوری مضبوطی سے باندھ کر آئے۔ سونا اور کرنسی بدستور قالین پر ڈھیر تھے۔ میرے اور بانو کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ البتہ اوشا شروع میں دلچسپی سے اسے دیکھتی رہی لیکن اب وہ بھی اس دولت سے بے نیاز لگ رہی تھی۔ میں نے راج کنور کو پریشان بناتے ہوئے کچھ اور سوچا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جب یہاں سے نکلنے لگیں گے تو کنور پیلس کے ملازموں اور گارڈز کو بلا کر یہ سونا اور کرنسی ان میں تقسیم کر دوں گا۔ میرا سلطانہ ڈاکو بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ان غریب لوگوں کے ہاتھ جب اتنی بڑی دولت آتی اور میں اس دولت سمیت انہیں فرار کا مشورہ دیتا تو یقیناً بہت سے اس پر عمل کرتے اور کنوروں کی غلامی پر لعنت بھیج کر یہاں سے نکل بھاگتے۔ کنور خاندان ان ہی لوگوں کے مل بوتے پر اپنی بادشاہت قائم رکھے ہوئے تھا۔ اس لیے وہ پھر کس سے ہمارا راستہ رکھاتا۔ چند ایک وفادار یا کم ہمت ساتھ رہ جاتے تو ان سے نمٹا جاسکتا تھا۔

مگر راج کنور کی اہمیت ختم ہونے کے بعد یہ پلان بھی اپنی موت آپ مر گیا تھا۔ اس لیے میں نے جن کر کرنسی کے ڈھیر سے پورہ اور انٹرین کرنسی کی کچھ گڈیاں نکالیں۔ انٹرین کرنسی پانچ سو اور ہزار کے نوٹوں پر مشتمل تھی۔ جب کہ پورہ ہزار کے نوٹ والے تھے۔ میں نے تین گڈیاں اوشا کے سپرد کیں۔ اس نے پوچھا۔ ”ان کا کیا کرنا ہے رے؟“

”رکھو راستے میں کام آئیں گی۔ ان سے ہی بہت سے راستے کھلیں گے۔“

میں نے خود پورہ کی تین اور انٹرین کرنسی کی دو گڈیاں رکھی تھیں اور اتنی ہی بانو کے سپرد کیں۔ اس نے بے

”میرا راز ر پھٹ جائے گا۔ پہلے ہی اٹا بوجھ ہے۔“

”ان کا وزن زیادہ نہیں ہے۔“ میں نے تسلی دی تو اس نے بادل نا خواستہ انہیں بھی راز ر میں رکھ لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ واقعی مشکل میں تھی۔ اس کا راز ر نرم جرسی کے کپڑے کا تھا اور یہ بوجھ سے لٹک رہا تھا۔ چھ عدد میگزینز اور پھر رقم کا بھی بوجھ تھا اگر کہیں ہاتھ پائی کی نوبت آتی تو بانو آزادی سے نہیں لڑ سکتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”ایک منٹ ایک کام ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

گیس والے بیگ پر شانے سے لٹکانے والا الگ سے اسٹریپ لگا ہوا تھا۔ میں اسے اٹھا کر واش روم کی طرف بڑھا تو بانو نے اضطراب سے کہا۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور واش روم میں آ کر دروازہ بند کر لیا پھر چند گہرے سانس لے کر میں نے سانس روک لی اور احتیاط سے شولڈر اسٹریپ بیگ سے الگ کرنے لگا۔ اس کام میں ایک منٹ لگا تھا۔ میں سانس روکے روکے باہر آیا اور واش روم کا دروازہ بند کر کے سانس لی تھی۔ بیگ بھی ساتھ لے آیا تھا۔ میں نے اسٹریپ بانو کے حوالے کی۔ ”اسے شرٹ کے نیچے باندھ لو۔ تمام میگزینز اس میں آسانی سے آجائیں گے اور تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولی پھر فوراً فکر مندی سے کہا۔ ”لیکن میں واش روم نہیں جاؤں گی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

میں خود بھی اس کے یا کسی کے واش روم جانے کے حق میں نہیں تھا۔ ”ایسا کرتے ہیں میں اور راج کنور دوسری طرف منہ کرتے ہیں تم اوشا کی مدد سے یہ کام کر لو۔“

راج کنور ابھی تک دیوار کے پاس کھڑا تھا میں بھی اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اس نے شکوہ کناں لہجہ میں کہا۔ ”میں نے آج تک ایسی ذلت برداشت نہیں کی۔“

”درست کیونکہ تم دوسروں کو ذلیل کرنے کے عادی ہو۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”آج کے دن تم نے بہت کچھ دیکھا ہوگا اور ابھی مزید دیکھو گے۔“

”تم بہت خطرناک کام کرنے جارہے ہو۔“ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اگر بڑے کنور نے تمہیں کوئی گارنٹی دی ہے تو اس کے پیچھے کوئی دھوکا ہی ہوگا۔“

”میں نے کبھی کسی کی گارنٹی پر اعتماد نہیں کیا ہے اور نہ ہی اب کروں گا۔ مجھے صرف اللہ اور اپنے زور بازو اعتماد ہے۔ باقی جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔“

”تمہارا کیا پلان ہے؟“

”جلد تمہارے سامنے آجائے گا لیکن راج کنور ایک بات یاد رکھنا یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا مرحلہ ہوگا۔ اس میں یا تو سب پار ہوں گے یا سب ڈوب جائیں گے۔ اس لیے دل میں شرارت کا کوئی خیال ہے تو نکال دو۔ ورنہ سب سے پہلے تم فوت ہو گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں میں کچھ نہیں کر دوں گا۔“ اس نے گھبرا کر کہا۔

”مجھے تمہارے وعدے کی ضرورت نہیں ہے میں صرف تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔“

بانو اور اوشا نے مل جل کر یہ مشکل کام نٹایا۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے ہنسی آگئی تھی۔ بانو اب درمیان سے ذرا پھولی سی ہو رہی تھی۔ وہ کھسیا گئی۔ ”ہنس کیوں رہے ہیں کیا میں بری لگ رہی ہوں۔“

”نہیں بی بی میں نے آج تک کسی خاتون کو برا لگتے نہیں دیکھا۔“

اتنی لمبے دیئے رہنے والی بانو کو اس سنگین صورت حال میں بھی اس بات کی فکر تھی کہ وہ بری تو نہیں لگ رہی تھی۔ بھاری میگزینز سے نجات ملی تو اس نے اوشا کی رقم بھی اپنے ٹراڈز کی جیبوں میں رکھ لی تھی۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”میں اسے سزا دینا چاہتی ہوں۔“ اس کا اشارہ راج کنور کی طرف تھا۔ راج کا چہرہ حسب معمول خوف سے سفید پڑ گیا۔ وہ میرے اندازے سے زیادہ بزدل ثابت ہو رہا تھا۔

”کیوں؟“ اس نے بلبل کر کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ تعاون کر رہا ہوں۔“

”فکر مت کرو میں تمہیں کوئی جسمانی سزا نہیں دے رہی ہوں۔“ بانو نے کہا اور شراب کی ایک بوتل اٹھا کر کرنسی نوٹوں کے ڈھیر پر اٹھنے لگی۔

”یہ کیا کر رہی ہو یہاں آگ لگ جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”اچھا ہے اس سے ذرا انفرانفری پھیلے گی اور ان لوگوں کی توجہ ادھر بھی ہوگی تو ہمیں اس کا فائدہ ہوگا۔“ بانو بولی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ راج کنور مزید گھبرا گیا۔ ”بھگوان کے لیے یہ بہت بڑی دولت ہے۔“

”اسی لیے تو آگ لگا رہی ہوں۔“ بانو نے کہا اور لائٹر جلاتے ہوئے ایک گڈی کو آگ دکھا کر اسے نوٹوں کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ اس نے بمک سے آگ پکڑ لی تھی۔ بانو کی اس حرکت سے مجھے خیال آیا کہ جب آگ لگانی ہے تو صحیح سے کیوں نہ لگائیں۔ میں نے شراب کی مزید بوتلیں بستر اور پردوں پر خالی کرنا شروع کر دیں۔ راج کنور گھٹکیا رہا تھا کہ اس طرح پورے پتیل میں آگ لگ جائے گی۔ بانو نے اسے ڈانٹا۔ ”تم اس دولت یا پتیل کی نہیں اپنی فکر کرو۔“

”بالکل تم زندہ رہو گے تو ہر چیز کی اہمیت ہوگی تم مر گئے تو سب بے کار ہے۔“

وہ روہانسا ہو گیا۔ ”نہیں اس کی سزا میرے بیوی بچوں کو ملے گی۔“

”جو جرم تم نے کیا ہی نہیں ہے اس کی سزا تمہارے بیوی بچوں کو کیسے ملے گی؟“

”تم جانتے نہیں ہو اس دنیا میں ہزار صرف کمزور کو ملتی ہے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ”اب میں کمزور

ہوں۔“

”کوئی بات نہیں کل تک تم بھی دوسرے کے ناکردہ گناہوں کی سزا ان کے بیوی بچوں کو دیتے آئے ہو گے آج سمجھ لو پھیا لٹا ہو گیا ہے اور اب تمہاری باری ہے۔“ میں نے کہا اور انٹرکام اٹھا کر بڑے کنور سے رابطہ کرنے کو کہا۔ ابھی نوٹ جل رہے تھے اس لیے زیادہ دھواں نہیں ہوا تھا اور نہ آگ کا شور سنائی دے رہا تھا بڑا کنور لائن پر آیا تو میں نے کہا۔ ”ہم باہر آ رہے ہیں دو منٹ کے اندر تمہارے تمام آدمی راستے سے ہٹ

جائیں۔“

”چلے آؤ تمہارا راستہ کوئی نہیں روکے گا۔“

میں نے انظر کام رکھ دیا۔ اس دوران میں بانو اور اوشا شراب چمڑے کے کام کر رہی تھیں۔ راج کنور بت بنا پچھتر کدے کی آنے والے تاجی کا سوچ رہا تھا۔ اس کا دکھا اس کے چہرے پر عیاں تھا۔ اس کا رویہ فطری تھا اس نے صرف چیزوں سے محبت کی تھی اور انسان جن سے محبت کرتا ان ہی پر بادی اسے رلاتی ہے۔ اس نے منہ بند رکھا تھا اسے معلوم تھا کہ احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا ہم وہی کریں گے جو ہمارا دل کہے گا۔ آخر میں بانو ایک بوتل کو اٹھ بیٹھ ہوئے جلتے نوٹوں کے ڈھیر تک لائی اور جیسے ہی شراب نے آگ تک رسائی حاصل کی وہ اس کے سہارے کمرے کی باقی چیزوں کی طرف لپکی تھی۔ نوٹوں سے شعلہ بلند ہو رہے تھے۔ اب کمرے میں گرمی، دھوئیں اور جس کی صورت میں آگ کے اثرات محسوس ہونے لگے تھے۔

”بس اب نکل چلو۔“ میں نے کہا تو اوشا اور بانو نے لپک کر راج کنور کو اپنے زرنے میں لے لیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور باہر آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ اچھی بات تھی ورنہ وہ میرے ساتھ نکلنے والا ہلکا سا دھواں بھی دیکھ لیتا۔ وہ تینوں میرے پیچھے آئے اور اوشا نے دروازہ بند کر دیا۔ اب آگ کے اثرات اس وقت دوسروں تک پہنچنے جب یہ بہت بڑھ چکی ہوتی۔ مجھے تعجب ہوا کہ دنیا جہاں کی آسائشیں جمع کرنے والوں نے فائر الارم لگانے کی زحمت نہیں کی تھی حالانکہ یہ خوب صورت بیلز ایک بار پہلے بھی آگ کی تباہ کاریوں سے گزر چکا تھا۔ میں آگ تھا۔ میرے ہاتھ میں خود کار رائفل تھی اور شاٹ گن شانے سے لٹک رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگا چل رہا تھا اور وہ عین میرے پیچھے تھے۔

راہداری کے اس سرے پر ایک گورکھا گاڑ موجود تھا لیکن اس کی رائفل اس کے شانے سے لٹک رہی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے وہاں سے جانے کو کہا تو اس نے سعادت مندی سے حکم کی تعمیل کی تھی۔ ایل شکل کی راہداری کے دوسرے حصے میں بھی کوئی نہیں تھا لیکن جب ہم اس راہداری تک پہنچے جس کے بائیں طرف جانے کی صورت میں ہم بڑے کنور کے حضور پہنچ جاتے اور دائیں طرف آزادی کا راستہ تھا۔ تو وہاں رامن تین مسلح گاڑوں کے ساتھ موجود تھا۔ اس کی موجودگی میں اگر ہم دائیں طرف جاتے تو وہ یقیناً مزاحمت کرتا۔ میں رک گیا۔ رامن مجھے گھور رہا تھا۔ اس نے اپنے سابق آقائے ولی نعمت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جو ہمارے گھیرے میں تھا۔ ”رامن بڑے کنور نے کہا تھا کہ کوئی ہمارے راستے میں نہیں آئے گا پھر تمہاری موجودگی کا کیا مطلب ہے؟“

وہ مسکرایا۔ ”میں تمہارا راستہ نہیں روک رہا ہوں لیکن یہاں سے تمہیں ہماری نگرانی میں چلنا ہوگا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ طے نہیں ہوا تھا۔ تم لوگ پیچھے ہٹ جاؤ۔“

”اگر میں ایسا نہ کروں تو؟“ رامن نے شرارت سے کہا۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ میرا ایک ہاتھ عقب میں تھا میں نے اشارے سے بانو کو پیچھے ہونے کو کہا۔

”تو پھر میں واپس چلا جاؤں گا۔“

”اب واپس کا کوئی راستہ نہیں ہے۔“ رامن کے لہجے کی شرارت بڑھ گئی۔ ”اگر یقین نہیں آ رہا تو واپس جا

اس کا مطلب تھا کہ بڑے کنور کے آدمیوں نے راج کنور کے عشرت کدے پر قبضہ کر لیا ہوگا لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ وہاں پہلے ہی آگ کا قبضہ تھا۔ البتہ راجن کو ابھی اس کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ ہاں اس کا امکان تھا کہ درمیان میں آنے والے کمرؤں میں اس کے آدمی چھپے ہوں۔ بانو میرے اشارے کو سمجھتے ہوئے راج کنور سمیت پیچھے ہٹ گئی تھی اور اب وہ راجن اور اس کے آدمیوں کی زد سے باہر تھی۔ میں نے لہجہ بدل کر کہا۔

”راجن میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ پیچھے ہٹ جاؤ۔“

وہ میرے لہجے سے چونکا ہو گیا۔ ”تم لڑائی کے موڈ میں لگ رہے ہو۔“

میں نے محسوس کیا کہ جتنی دیر ہوگی ہمارے بھنسنے کا امکان اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ خفیہ راستے والا کمرہ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ یہ ناؤ اور نیور والا معاملہ تھا۔ میں نے جسم کو حرکت دینے بغیر اچانک راجن اور اس کے ساتھیوں کی طرف برسٹ مارا۔ میں نے جسم کا نشانہ لیا تھا اور بغیر کسی رعایت کے فائر کیا تھا۔ اس وقت دشمن کو رعایت دینا خودکشی کے برابر ہو سکتا تھا۔ وہ تیار تھے بوکھلا کر بچنے کی کوشش کی لیکن گولیوں سے زیادہ تیز نہیں ہو سکتے تھے۔ راجن کے سینے پر کم سے کم دو گولیاں لگی تھیں وہ پلٹ کر گرا۔ اس کے ایک ساتھی کی گردن سے گولی پار ہو گئی تھی اور باقی دو بھی نشانہ بنے تھے مگر وہ جوابی کارروائی کے قابل تھے اور انہوں نے کارروائی کی بھی۔ فائرنگ کا شور بے پناہ تھا اس میں کان جھنجھٹا گئے تھے۔ میں بروقت پیچھے آیا فوراً ہی کئی گولیوں نے اس کنارے کو ادھیر دیا جس کے پیچھے میں روپوش تھا۔ عقب سے اوشا اور بانو نے ہلکی سی چیخیں ماری تھیں۔ اوشا چلائی۔

”شبہاز پیچھے آؤ۔“

”اپنے پیچھے نظر رکھو۔“ میں نے دھاڑ کر کہا۔ ”راج کنور کے پیچھے ہو جاؤ۔“

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ دوسری طرف سے فائرنگ کا سلسلہ تھمے تو میں آگے کارروائی کروں۔ مگر دونوں بچ جانے والے گاؤں زورہ رہ کر برسٹ مار رہے تھے۔ ان کا مقصد مجھے جوابی کارروائی کا موقع نہ دینا تھا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر نیچے بیٹھتے ہوئے صرف رائفل دیوار سے نکال کر ایک برسٹ مارا۔ ایک چیخ سنائی دی اور فائرنگ رک گئی۔ میں نے سماعت پر زور دیا کیونکہ مسلسل گونجتی آوازوں نے کانوں کو وقتی طور پر ناکارہ کر دیا تھا۔ چند لمحوں بعد مجھے ایسی آہٹ سنائی دی جیسے کوئی گھسٹ کر فرار ہو رہا ہو۔ میں نے خطرہ مول لے کر جھانکا تو فوج جانے والا گاؤں ایک کمرے میں گھسٹا دکھائی دیا۔ دو گاؤں کی لاشیں پڑی تھیں لیکن راجن غائب تھا وہ زخمی ہوا تھا اور بھاگ نکلا تھا۔

راہداری خالی تھی۔ بانو نے اوشا کو راج کنور کی نگرانی پر لگا دیا تھا اور خود عقب کی طرف نگرانی کر رہی تھی مگر ابھی تک اس طرح سے کوئی نہیں آیا تھا۔ جیسے ہی میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک شخص اچانک ایک کمرے سے نکلا اور اس کے ساتھ دھویں کا ریلہ آیا تھا۔ بانو نے اسے دیکھتے ہی فائر کیا اور وہ سینہ تمام کر دیا پس کمرے میں جا گرا۔ وہ ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ میں آگے آیا اور کمرے میں جھانکا۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا مگر دھویں کی موجودگی بتا

رہی تھی کہ آگ راج کنور کے عشرت کدے سے خاصی آگے تک پھیل چکی تھی۔ اب اس طرف کسی کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بانو کے شکار کو واپس کمرے میں دھکیل کر دروازہ بند کر لیا لیکن اتنی سی دیر میں راہداری میں خاصا دھواں آچکا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے باوجود دھواں کی مقدار میں کمی نہیں آئی تھی بلکہ یہ چند سیکنڈ میں اور بھی بڑھ گیا تھا تب مجھے پتا چلا کہ دھواں اصل میں عشرت کدے کی طرف سے آرہا تھا۔ اس کی آگ بے قابو ہو گئی تھی اور آس پاس کے کمروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ شاید دروازہ بھی آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا اس لیے دھواں پھیل رہا تھا۔

ایک لمحے کو مجھے ان اٹھ حسین عورتوں کا خیال آیا جو راج کنور کا دل بہلانے کے لیے پورے انڈیا سے منتخب ہو کر آئی تھیں۔ وہ اس عشرت کدے کے بالکل برابر میں تھیں اور آگ نے یقیناً ان کے کمروں کو بھی متاثر کیا ہو گا مگر دوسرے لمحے یہ خیال جھٹک کر میں بانو کی طرف واپس آیا جو اب راہداری کے دوسری طرف کی نگرانی کر رہی تھی۔ اوشا ہیشیاری سے راج کنور کے ساتھ لگی کڑی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ وہ اتنی تجربے کا نہیں تھی اور لڑنا بھڑنا بھی نہیں جانتی تھی راج کنور اس سے پستول چھین لیتا تو بازی پلٹ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے پلٹ کر راج کنور کا بازو اپنی گرفت میں لیا اور راہداری کے سرے تک آیا میں نے پوچھا۔ ”خفیہ راستے والا کمرہ کون سا ہے؟“

اس نے دائیں طرف دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس میں ہے۔“
 ”رانا اسے لے کر چلو۔“ میں نے بانو سے کہا۔ ”اوشا تم اس کے پیچھے رہو گی اور میں تمہارے پیچھے۔“
 بانو نے راج کنور کی پشت سے پستول نکال دیا۔ ”آگے چلو۔“

پہلے مارے جانے کے خیال سے راج کنور پر لرزہ طاری تھا اور اس کے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ بانو نے اس کے ساتھ بالکل مناسب سلوک کیا۔ ذرا پیچھے ہٹ کر اس نے راج کنور کو لات ماری۔ وہ اس سلوک کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اس لیے بے ساختہ آگے جا گرا۔ بانو کے وار میں اتنی قوت تھی کہ وہ تقریباً پہلے دروازے کے پاس جا کر گر رہا تھا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا بانو نے اس کے پاس جاتے ہوئے کہا۔ ”آگے چلو ورنہ اسی طرح لاتیں کھاتے رہو گے۔“

مجبوراً وہ آگے بڑھا تھا۔ بانو کے پیچھے اوشا آگئی تھی اس نے دہشت زدہ نظروں سے لاشوں کی طرف دیکھا اور جلدی سے منہ پھیر لیا۔ اب دھواں اس طرف راہداری میں آنے لگا تھا۔ منظر ہلکا سا دھندلا رہا تھا اور اسی دھندلاہٹ کے پار ایک ہیولا نمودار ہوا میں نے بے دریغ فائر کیا اور ہیولا اچھل کر واپس جا گیا تھا۔ دوسری طرف کھلی جی اور کم سے کم دو خود کار رائفلوں سے فائرنگ ہوئی تھی۔ گولیاں اندھا دھند چلائی گئی تھیں مگر ہم بالکل کھلی جگہ تھے جہاں سوائے ایک دوسرے کے کوئی آڑ نہیں تھی۔ گولیاں دیواروں سے لگیں اور کچھ آس پاس سے گزریں مجوزانہ طور پر ہم سب ہی بچ گئے تھے۔ بانو اور راج کنور اس کمرے کے دروازے کے سامنے تھے اور اسے کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اس طرف جھپٹا۔ ”دیر کیوں کر رہے ہو؟“

”دروازہ لاک ہے۔“ راج کنور نے کانپتی آواز میں کہا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان دونوں کو پیچھے ہٹایا اور لاک والی جگہ ہلکا سا برسٹ مارا۔ لاک ٹوٹ گیا اور دروازہ کھل گیا۔ میں نے بانو کو اندر جانے کو کہا۔

وہ اندر ہوئی۔ پھر میں نے اوشا کو دھکیل دیا اور راج کنور کو روکے رکھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ اندر جا کر کوئی حیران کن کام نہ کر جائے اس لیے میں اسے اس عالم میں بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا جب رابھاری کے سرے پر مسلح افراد موجود تھے۔ ان کی طرف سے دوسری بار فائرنگ کی گئی گولیاں ہمارے آس پاس سے گزری تھیں اب یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے راج کنور کو دھکا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ وہ کراہتے ہوئے فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید اسے گرنے سے چوٹ آئی ہے لیکن اسی لمحے اوشا چلائی۔ ”کھون..... اس کا کھون نکل رہا ہے۔“

تب میں نے دیکھا کہ اٹھنے کی کوشش کرتے راج کنور کے پہلو سے خون پھوٹ رہا تھا۔ میں نے دردازہ بند کرتے ہوئے اسے سیدھا کیا۔ گولی اس کے دائیں پہلو میں ٹپکی پٹیلیوں میں لگی تھی اور میں اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے کتنا نقصان کیا ہوگا۔ اگر گولی سیدھی گئی تھی تو دل تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ مگر وہ ہوش میں تھا اور خون بھی اب رک رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ کسی اہم عضو یا رگ کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ میں نے اسی کی شرٹ کی آستین پھاڑ کر اس کی پٹی بٹائی اور زخم پر رکھ کر دوسری آستین سے اس پر پٹی باندھ دی تھی۔ بانو دروازے کے پاس تھی اور وقفے وقفے سے جھری سے باہر جھانک رہی تھی۔ یہ کمرہ فرنیچر کے لحاظ سے خالی تھا اور فرش پر دبیز قالین تھا۔ میں نے راج کنور سے کہا۔ ”گولی لگی ہے لیکن خاص نقصان نہیں ہوا ہے۔“

وہ بلبلاتا رہا۔ ”مجھے گولی لگی ہے اور تم کہہ رہے ہو خاص نقصان نہیں ہوا ہے۔“

”مطلب یہ کہ تم مردے نہیں۔ اب جلدی سے خفیہ راستہ کھولو اس سے پہلے کہ بڑے کنور کے ہرکارے آکر تمہیں بچ بچ فوت کر دیں۔“

”جلدی کرو۔“ بانو بولی۔ ”وہ آگے آرہے ہیں۔“

میں جھپٹ کر دروازے کے پاس آیا اور راج کنور کو اٹھلے باہر نکالتے ہوئے ایک برسٹ مارا۔ یہاں فائرنگ کا شور بے پناہ تھا کیونکہ جگہ بند تھی اور کان جھنجھٹا جاتے تھے۔ برسٹ کا شور ختم ہوا تو کسی کے چلانے کی آواز آئی شاید کوئی زخمی ہوا تھا پھر منشی جی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”شہباز جی یہ کیا کر رہے ہیں۔ فائرنگ بند کریں اور آپ باہر آجائیں۔“

”تاکہ تمہارے آدمی مجھے آرام سے شکار کر لیں۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ یہ راسن کی شرارت تھی۔ وہ اب قید خانے میں ہے۔“

”تو کیا تم راسن سے الگ ہو۔“ میں نے کہا اور راج کنور کو اشارہ کیا کہ اب وہ کارروائی شروع کرے۔

وہ اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف بڑھا۔ بانو اس کے ساتھ تھی اور اوشا میرے ساتھ کھڑی تھی۔ ”منشی جی تم لوگوں کی بدینتی شروع سے ظاہر ہو گئی ہے۔ بڑا کنور بھی اپنے بھائی سے مختلف نہیں ہے۔“

”شہباز جی میں نے کہا تا یہ سب راسن کا حرامی پن تھا۔ اسے سزا ملے گی۔ آپ خود سوچیں بڑے کنور کو آپ کے خون کی ضرورت ہے وہ آپ کو کیسے نقصان پہنچانے کا کہہ سکتے ہیں۔“

”تمہارے بڑے کنور کی ایسی کم تھیں۔“ میں نے دل میں سوچا اور بلند آواز سے کہا۔ ”منشی جی حالات آپ کی بات کی گواہی نہیں دے رہے ہیں۔ صرف راسن ہی نہیں اس کے ساتھ تین مسلح گارڈز نے بھی ہم پر

فائرنگ کی ہے۔ ان میں سے دو میرے ہاتھ سے مارے گئے۔ پھر ایک آدمی کمرے میں چھپا ہوا تھا۔
 ”آپ نے راج جی کے حصے میں آگ لگا دی۔“ منشی جی نے کہا۔ ”لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ
 سامنے آجائیں اور بڑے کنوڑی سے بات کر لیں۔“
 ”اس دھوکا دہی کے بعد یہ ممکن نہیں ہے۔“

منشی جی نے مجھے یاد دلانے کے انداز میں کہا۔ ”شہباز جی آپ اس کمرے میں محصور ہیں اور یہاں سے
 نکل کر نہیں جاسکتے۔ اس لیے آپ کے لیے بہتر یہی ہے کہ ہتھیار ڈال دیں۔“
 ”منشی جی اس واقعے کے بعد میں آپ لوگوں پر کیسے اعتماد کروں۔“
 ”آپ ایک بار کر کے تو دیکھیں۔ کیا پہلے بھی آپ کی ہر بات نہیں مانی گئی۔“ اس نے مکارانہ عاجزی
 سے کہا۔

راج کنوڑ بانو کی مدد سے قالین ہٹا رہا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکتا تھا کہ اس طرف کیا ہے۔ راج کنوڑ نے بانو
 سے کہا۔ ”اے کھولنا ہوگا۔“
 بانو جھک کر کسی چیز کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی لیکن یہ شاید اس اکیلے کے بس کی بات نہیں تھی اس نے
 میری طرف دیکھا اور دے لےجے میں بولی۔ ”آپ آئیں مجھ اکیلے سے نہیں اٹھ رہا ہے۔“
 میں نے اوشا کی نگرانی پر لگایا اور ان دونوں کے پاس آیا۔ قالین کے نیچے فرش پر فولادی چادر بچھی تھی۔ یہ
 دو بائی دو کے سائز کی تھی اور یقیناً خاصی موٹی اور وزنی تھی ورنہ بانو اسے اٹھا سکتی تھی۔ ایک طرف دو ہینڈل لگے
 ہوئے تھے لیکن یہ اس طرح چادر کے اندر تھے کہ اوپر ذرا بھی ابھار نہیں تھا۔ راج کنوڑ اپنے زخم کی طرف سے جھکا
 ہوا کھڑا تھا۔ اس سے مدد کی توقع محال تھی۔ میں نے جھک کر دونوں ہینڈل اٹھاتے ہوئے اسے اٹھانے کی کوشش
 کی وہ ذرا اٹھا تھا مگر مجھ سے بھی پورا نہیں اٹھ رہا تھا۔ راج کنوڑ نے کہا۔ ”یہ بہت وزنی ہے دو بہت طاقتور آدمی مل
 کر اسے اٹھاتے ہیں۔“

میں نے رائفل اور شاٹ گن اتار کر پاس رکھ لی اور پھر کوشش کی، مگر اس بار بھی تختہ پورا نہیں اٹھا تھا۔ یہ
 دیکھ کر بانو آگے آئی اور اس نے اٹھے تختے میں ہاتھ پھنسائے۔ جگہ مختصر تھی اس لیے اسے مجھ سے لگ کر ہی یہ کام
 کرنا پڑ رہا تھا مگر یہ شرمانے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے بھی پورا زور لگایا اور ہم نے تختہ الٹ دیا۔ خوش قسمتی سے
 دوسری طرف دینر قالین تھا ورنہ اس کے گرنے کا بہت زور دار دھماکہ ہوا تھا۔ پھر بھی دھک ہوتی تھی اور میں فکر
 مند ہو گیا کہ یہ دھک باہر تک نہ گئی ہو۔ تختے کے نیچے ایک دروازہ تھا جس پر نمبروں والا تالہ لگا ہوا تھا۔ راج کنوڑ
 نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا نمبر ملایا۔ میں اس کی طرف دھیان دیئے بغیر رائفل اور شاٹ گن اٹھا کر
 دروازے تک آیا۔ باہر راہداری دور تک سنسان تھی۔ اب دھواں کم ہو گیا تھا اس کا مطلب تھا وہ لوگ آگ پر قابو
 پا رہے تھے۔ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے منشی جی میں آپ کی بات مان لیتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”کیسی شرط؟“ اس نے پیتابی سے پوچھا۔

”راہن کو یہاں لایا جائے اور میرے سامنے گولی ماری جائے تب مجھے یقین آجائے گا کہ بڑے کنوڑ اس

سازش میں شامل نہیں تھے۔“

یہ شرط سن کر منشی جی کو سانپ سوگھ گیا انہوں نے کچھ دیر بعد ممنعتی آواز میں کہا۔ ”شہباز جی یہ تو بہت کڑی سزا ہے۔“

”کڑی سزا۔“ میں نے طنز کیا۔ ”تم لوگ تو اس سے معمولی باتوں پر اپنے ملازموں کو کتوں کے آگے ڈلوادیتے ہو اور وہ انہیں چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ رامن کا جرم اتنا معمولی ہے کیا اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ راج کنور کو گولی لگی ہے اور وہ بے ہوش ہے۔ اگر جلد اس کا علاج نہ کیا گیا تو اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ منشی جی اب فیصلہ کر لو اگر تم نے یا بڑے کنور نے کرنا ہے اس کے لیے تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔“

میں منشی جی سے وقت لے رہا تھا۔ محرم راز ہونے کے ناطے اتنا تو وہ جانتے ہوں گے کہ اس کمرے میں پیلس سے باہر جانے والا خفیہ راستہ تھا۔ اس لیے میں اس کی تسلی کے لیے جھوٹ بول رہا تھا۔ دوسرے میں اس طرح وقت لے رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جتنی دیر میں، میں منشی جی سے بات کروں گا راج کنور تالا کھول لے گا۔ مگر جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پریشان دکھائی دیا تالا نہیں کھلا تھا۔ میں اس کے پاس آیا۔ ”کیا بات ہے تالا کیوں نہیں کھولا اب تک؟“

”پتا نہیں کیا بات ہے میں نمبر ملارہا ہوں لیکن یہ کھل نہیں رہا۔“ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں نے رائفل کی نال اس کے سر پر رکھ دی۔ ”راج کنور لگتا ہے تمہارے دماغ میں کوئی میڑھ آگئی ہے اور مجھے تمہارا دماغ باہر نکالنا پڑے گا۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں اس کا نمبر ڈبل فائیو ڈبل سیون نائن فور نائن تھا۔ تم خود دیکھو میں ملارہا ہوں لیکن یہ کھل نہیں رہا ہے۔“

اس نے ملا کر دکھایا مگر تالا کھلا نہیں تھا۔ یہ عام قسم کا تالا نہیں تھا۔ بلکہ بہت موٹی اسٹیل سے بنا ہوا مضبوط ترین تالا تھا۔ اس کا حلقہ ہی کوئی پون انچ موٹا تھا اور باقی تالا بھی خاصی موٹی چادر سے بنا ہوا تھا بلکہ اسے شاید ایک پیس کی صورت میں ڈھالا گیا تھا۔ ہم اسے گولی مار بھی توڑ سکتے تھے۔ اس پر تو شاید بم کا اثر بھی نہ ہوتا۔ ”تم جھوٹ بول رہے ہو؟“ میں نے غرا کر کہا اور نال تختی سے اس کے سر سے لگا دی۔ اس کا چہرہ لحوں میں پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔

”شہباز مجھے میرے بچوں کی سوگند..... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم خود سوچو یہاں سب سے زیادہ خطرہ مجھے ہے اور میں کیوں جھوٹ بولوں گا۔“

اگرچہ وہ نہایت مکار دشمن تھا لیکن اس وقت مجھے لگا وہ سچ کہہ رہا ہے۔ البتہ میں نے مزید دھمکانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ ”تمہارے پاس دس منٹ ہیں اس کے بعد میں تمہارے زخم پر پستول رکھ کر ایک گولی اور ماروں گا۔ باہر والوں کو پتا چل گیا ہے کہ تم زخمی ہو اس لیے کسی کا شک مجھ پر نہیں جائے گا۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے فائر کی آواز ان کے کانوں تک جائے گی۔“

”نہیں، ہم اس کے ساتھ ہی باہر کی طرف بھی فائر کریں گے اس لیے کسی کو شک نہیں ہوگا اور اگر ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔ جب ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے تو ہمارے پاس لڑکر مرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں رہے گا اس

لیے تم اپنی فکر کرو۔“

اس نے عاجزی سے کہا۔ ”سنو کسی نے لاک نمبر بدل دیا ہے اور ایسا صرف بڑا کنور کر سکتا ہے۔“
 ”یہ میں نہیں جانتا۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔ ”دس منٹ بعد تمہاری زندگی کا چراغ لازمی گل ہو جائے گا۔“

”میں..... میں کوشش کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اس وقت وہ اپنا زخم بھی بھول گیا تھا۔

”اسی میں تمہاری عافیت ہے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا اور پلٹ کر دروازے کی طرف آیا۔ راہداری میں جہاں تک نظر جا رہی تھی کوئی نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ راسن کے سینے پر دو گولیاں لگی تھیں لیکن منشی نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے پتا چلتا کہ وہ شدید زخمی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے لباس کے نیچے بلیٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ بلیٹ پروف جیکٹ بہت خاص چیز سمجھی جاتی تھی اور اہم ترین افراد کے لیے مخصوص تھی یا دولت مند ممالک نے خاص مجرموں سے نمٹنے کے لیے جو ناسک فورس بنا رکھی تھیں ان کے ارکان کو بلیٹ پروف جیکٹ فراہم کی جاتی تھی لیکن افغان جنگ کے بعد بہت ساری ایسی چیزیں، آلات اور ہتھیار اب عام لوگوں تک بھی پہنچ گئے ہیں جو پہلے مخصوص سمجھے جاتے تھے۔ اب نجی ادارے بھی بلیٹ پروف جیکٹس اور دوسرا سامان تیار کر رہے ہیں اور جب سے دہشت گردی کا مسئلہ اٹھا ہے اس نے سیکورٹی کو باقاعدہ ایک انڈسٹری بنا دیا ہے۔ اب بھی یہ چیزیں مہنگی ہیں لیکن ناقابل حصول نہیں رہی ہیں۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی اور یہاں کسی کے پاس گھڑی نہیں تھی راج کنوری شاید اس کے عشرت کدے میں رہ گئی تھی۔ وہاں وال کاک تھی اس لیے گھڑی کا خیال نہیں آیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ منشی جی کو دی گئی مہلت میں سے پانچ چھ منٹ گزر چکے تھے۔ اوشا سبھی ہوئی تھی اس نے آہستہ سے کہا۔

”شہباز یہ منخوس تالانہ کھلاتو ہمارا کیا ہوگا؟“

”وہی جو منظور خدا ہوگا۔“ میں نے سرد آہ بھری۔

وہ روہانسی ہونے لگی۔ ”تجھے تو کچھ نہیں کہیں گے اور تیری وجہ سے بانو کو بھی چھوڑ دیں گے پر میں ماری جاؤں گی۔“

”اوشا یہاں جو ہوگا سب کے ساتھ ہوگا۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”اگر بچے تو سب بچیں گے ورنہ کوئی نہیں۔“

اس کے چہرے پر ذرا رونق آئی۔ ”سچ کہہ رہا ہے نارے، ٹو ہمیں مرنے کے لیے تو نہیں چھوڑے گا۔“
 ”تم نے مجھے بہت عرصے سے دیکھا ہوا ہے تم ایسا سمجھتی ہو کہ میں کسی سے کام نکل جانے کے بعد آنکھیں پھیر لینے والا شخص ہوں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ٹو ایسا نہیں ہے پر ٹو انسان ہے حالات کے آگے بے بس ہو سکتا ہے بس اس سے ڈر لگتا ہے۔“

میں نے سرد آہ بھری۔ ”تب مجھے معاف کر دینا۔“

مجھے اور اوشا کو آہستہ آہستہ بات کرتے دیکھ کر بانو ہماری طرف آئی۔ اس نے بھی وہی سوال کیا۔ ”کیا

اس تالے کو توڑ انہیں جاسکتا ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کی ساخت بتا رہی ہے کہ یہ بہت مضبوط ہے۔ گولی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہے دوسرے اگر ہم نے فائرنگ کر کے اسے توڑنے کی کوشش تو باہر موجود لوگوں کا اس کا علم ہو جائے گا اور وہ پھر ہمیں روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔“

”یہ نہیں کھول پارہا ہے۔“ بانو نے راج کنیر کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت خراب ہو رہی تھی اور وہ سہارا لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ سے وہ مسلسل تالے پر مختلف نمبر ملا کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں پلٹ کر اس کے پاس آیا۔

”راج کنور آرام سے..... آرام سے۔“

اس نے وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کیسے آرام سے..... دس منٹ پورے ہوتے ہی تم مجھے گولی مار دو گے۔“

وہ سچ بچہ دہشت زدہ تھا اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے نرمی سے کہا۔ ”اس بات کو بھول جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تالے کا نمبر بڑے کنور نے تبدیل کر دیا ہے۔ اب تم سوچو کہ بڑا کنور کیا نمبر رکھ سکتا ہے۔ وہ تمہارا بھائی ہے تم اس کے مزاج کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ عام طور سے انسان پاس ورڈ ٹائپ کی چیز خود سے متعلق رکھتا ہے۔ تاکہ وہ اسے بھول نہ جائے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

اس نے سر ہلایا اور اس کا چہرہ ذرا نازل ہوا۔ ”سچ کہہ رہے ہو مجھے نہیں مارو گے؟“

”ہاں کم سے کم اس وجہ سے نہیں ماروں گا کہ تم تالا کھولنے میں کیوں ناکام رہے لیکن اب تم پوری کوشش کرتے رہے۔ تم جانتے ہو بڑا کنور شاید مجھے اور میرے ساتھیوں کو چھوڑ دے لیکن تمہارے ساتھ وہ اچھا نہیں کرے گا۔“

وہ دیوار سے ٹک گیا۔ ”میں سمجھتا ہوں..... پانی مجھے پانی مل سکتا ہے؟“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور پلٹ کر دروازے تک آیا۔ میں نے فٹنی جی کو آواز دی۔ ”آپ نے کیا سوچا؟“

”میں نے بڑے کنور جی سے کہہ دیا ہے اب وہ فیصلہ کریں گے۔“

”ہمیں پانی اور مرہم پٹی کا سامان چاہیے تم کسی ملازمہ کے ہاتھ بھجوادو۔“

”ابھی بھجواتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ہو سکے تو درکش اور اینٹی بائیوٹک گولیاں بھی بھیج دو۔“

چند منٹ بعد ایک نیپالی نقوش والی خادمہ منرل واٹر کی پانچ لیٹر والی بوتل بڑے میں مرہم پٹی کا سامان اور ادویات بھی لے کر آئی تھی۔ میں نے اسے آگے آنے سے روک دیا میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ راج کنور کو تالا کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھے۔ ”بس یہ یہیں رکھ دو اور واپس جاؤ۔“

اس نے جلدی سے حکم کی تعمیل کی۔ بوتل اور بڑے نیچے رکھی اور واپس چلی گئی۔ میں نے اوشا سے کہا۔ ”تم اٹھا کر اندر لاؤ۔“

اوشا ڈرتے ڈرتے گئی اور جلدی سے دونوں چیزیں اٹھا کر واپس لے آئی۔ ٹرے میں ایک عدد گلاس بھی تھا۔ میں نے پہلے منرل واٹر کی بوتل کا معائنہ کیا۔ اس میں پانی کا رنگ ویسا ہی نیلگوں شفاف تھا جیسا کہ ہوتا ہے اور بوتل بھی سیل تھی۔ غور سے دیکھنے پر بھی اس میں کہیں کوئی سوراخ بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ حفظ مائع قدم میں نے پانی کو منہ میں لے کر محسوس کیا لیکن اس میں کسی قسم کا کوئی الگ ذائقہ نہیں تھا یہ صاف ستھرا پانی ہی تھا۔ یہ گھونٹ حلق سے اتار کر میں نے راج کنور کو بوتل تھما دی اور وہ بیتابی سے دو گلاس پی گیا۔ میں نے اسے روکا۔ ”آرام سے آرام سے..... ابھی اخراج کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ یہاں کوئی واش روم نہیں ہے۔“

”یہ تو بڑی مصیبت ہے۔“ بانو بولی۔ ”اگر ہم یہاں زیادہ دیر رہے تو مسئلہ ہو سکتا ہے۔“

”اس کا طریقہ ہے کہ کم سے کم پانی پیو جب تک پیاس شدت نہ اختیار کر جائے۔“ میں نے جواب دیا اور ٹرے میں موجود ادویات کا جائزہ لیا۔ ان میں ایک پتا نارل چین کلر کا تھا اور ایک ہائی پونسی چین کلر تھی۔ اس کے ساتھ ایم فینلین کے اینٹی بائیونک کپسول تھے۔ یہ بھی پیک تھے۔ زخم صاف کرنے والا محلول، روئی، زخم پر چھڑکنے والا پاؤڈر، چکنی پٹی، لپیشے والی پٹی کا رول اور میڈیکو شیپ بھی تھا۔ جب تک گولی زخم میں تھی اسے اینٹی بائیونک کپسول دینا بے کار تھا۔ میں نے راج کنور کو ہائی پونسی چین کلر دیں۔ ”یہ کھا لو اس سے درد کم ہوگا۔“

اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگائی اور پانی سے دونوں گولیاں نگل لیں۔ ”پتا نہیں یہ دوا ہے یا زہر ہے۔“

”یہ پیک گولیاں ہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

وہ تلخ انداز میں مسکرایا۔ ”یہ انڈیا ہے، یہاں سب ممکن ہے دوا کی پیکنگ میں زہر بھی ملتا ہے۔“

میں ہنسا۔ ”یہ تو ہم پاکستانی بھی اپنے ملک کے بارے میں کہتے ہیں۔“

”دونوں ملکوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔“ راج کنور نے کہا اور پھر جلدی سے بولا۔ ”میرا اشارہ مذہب اور سماج کی طرف نہیں ہے اس میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”پلیز کیا یہ بات تم ہمارے روشن خیال طبقے کو سمجھا سکتے ہو جسے دونوں ملکوں کے سماج اور شاید مذہب میں بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے۔“

راج کنور ہنسا۔ ”انہیں چند مہینے کے لیے انڈیا بھیج دو فرق خود سمجھ میں آ جائے گا۔ میرا اشارہ اس بدعنوان نظام کی طرف ہے جو انگریزوں نے تیار کیا تھا اور ہم جیسے لوگ اسے سنبھال کر بیٹھے ہیں۔ کیونکہ اسی میں ہمارا اعتماد ہے۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم بھی اس قسم کی باتیں سوچ سکتے ہو۔“

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”سوچتے سب ہیں لیکن ہم جیسے لوگ سوچوں کو نظر انداز کرتے ہیں جب تک کوئی مصیبت نہ پڑ جائے جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرے۔“

”اب سوچنے کے بجائے ذرا کام کرو اور جلد از جلد اس تالے کو کھولو۔“ میں نے کہا تو راج کنور کھسک کر تالے کے پاس آ گیا اور پھر سے نمبر ملانا شروع کر دیئے تھے۔ آرام اور چین کلر لینے سے چند منٹ میں اس کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ گولی جسم کے اندر نہیں اتری تھی بلکہ شاید ہسٹیلو میں ہی پھنسی ہوئی

تھی۔ میں نے اسے دوبارہ کام کرنے کو کہا۔ اس دوران میں میری نظر پہلی بار اس بیک پر گئی جس میں زہریلی گیس تھی اور مجھے یاد تھا کہ اسے ہم راج کنور کے عشرت کدے میں چھوڑ آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ یہاں کیسے آیا؟“

”میں لائی ہوں۔“ بانو نے کہا۔ ”مجھے خیال آیا کہ یہ بھی اچھا ہتھیار ہو سکتا ہے۔“

”ہاں ہو تو سکتا ہے لیکن تمہیں ڈر نہیں لگا اس سے؟“

”شہباز صاحب، میں نے کچھ عرصے میں دیکھا ہے کہ انسان کتنا ہی ڈرے اور احتیاط کرے موت اپنے وقت پر آتی ہے۔ اس لیے ملنے والے موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہوگی۔“

”گنڈ، اس کا مطلب ہے اب تم زندگی اور موت کی حقیقت سمجھنے لگی ہو۔“

”میں نے ٹھیک کیا تا؟“ وہ خوش ہو گئی شاید اس کا خیال تھا میں اس طرح پوچھے بغیر بیک لانے پر سرزنش کروں گا۔

”کام کرنے کے بعد کبھی مت سوچا کرو کہ اچھا کیا ہے یا برا کیا ہے یہ بات آنے والا وقت تمہیں خود بتا دے گا۔“ میں نے کہا اور دروازے کی طرف آیا۔ اس کی لاک والا حصہ بے کار ہو گیا تھا لیکن اوپر مضبوط قسم کی چٹنی لگی تھی کسی ہنگامی موقع پر ہم کچھ دیر کے لیے دروازہ بند کر سکتے تھے۔ میں نے منشی جی کو آواز دی۔ ”دس منٹ کی مہلت کب کی ختم ہو چکی ہے۔“

”ذرا صبر کریں۔“ منشی جی نے کہا۔ ”معاملہ بڑے کنور کے پاس ہے۔ انہیں فیصلہ کرنے میں دیر لگ سکتی ہے۔“

”لگتا ہے تم لوگ پھر کوئی چکر چلا رہے ہو، منشی جی یہ آخری موقع ہو گا میں اس قید سے نکل آ گیا ہوں اپنے ساتھیوں سمیت نکل نہ سکا تو ماروں گا اور مر جاؤں گا لیکن اب تم لوگوں کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔“

”میرا نہیں خیال کہ آپ اس قسم کا کوئی کام کریں گے آپ صبر سے کام لیں۔“

میں صبر سے ہی کام لے رہا تھا اور میرا ارادہ مرنے مارنے کا ہرگز نہیں تھا لیکن دشمن کو دھمکانے میں کیا حرج تھا۔ ”منشی جی صبر بہت ہو گیا اور مجھے لگ رہا ہے کہ تم لوگوں کو اب راج کنور کی زندگی سے زیادہ اس کی موت سے دلچسپی ہے۔“

”ایسا نہیں جی ہمیں ان کی فکر ہے۔“

”تمہی اس کے زخمی اور بے ہوش ہونے کا سن کر تم نے ایک بار بھی اس کی خیریت کا نہیں پوچھا اور نہ اسے طبی مدد دینے کی بات کی۔“

منشی جی کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ذرا بد لے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”شہباز جی مجھے شبہ ہے کہ راج جی زخمی ہیں۔ وہ ٹھیک ہیں اور کسی خاص مقصد کے تحت آپ کو یہاں لائے ہیں اگر وہ میری بات سن رہے ہیں تو میں بتا دوں کہ اب اس بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ اس کا اشارہ خفیہ راستے سے فرار کی طرف تھا اور یہ بری خبر تھی کہ اب اسے بھی آگے سے بند کر دیا گیا تھا۔ یقیناً جہاں یہ راستہ نکلتا ہو گا وہاں بڑے کنور نے اپنے آدمی بھیج دیئے ہوں گے لیکن بہر حال اس

مفروضے پر ہم اپنی جدوجہد ترک نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے انجان بن کر کہا۔ ”منشی جی آپ کس مفروضے کی بات کر رہے ہیں اور اگر آپ کو یقین نہیں ہے کہ راج کنور زخمی اور بے ہوش ہے تو آپ خود یہاں آ کر دیکھ سکتے ہیں۔“

منشی جی ایک بار پھر خاموش ہوئے اور کچھ دیر بعد کہا۔ ”شہباز جی معافی چاہتا ہوں میں نہیں آ سکتا ہوں لیکن میں کسی اور کو بھیج دیتا ہوں وہ آ کر راج جی کو دیکھ لے۔“

”کوئی اور نہیں صرف آپ۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ ”اگر آپ راضی ہیں تو آ جائیں۔“ مجھے امید تھی کہ منشی جی کو اپنی جان پیاری ہوگی اور وہ کسی صورت یہاں نہیں آئیں گے۔ میری امید پوری ہوئی اور انہوں نے جواب میں چپ سادہ لی۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”منشی جی اگر راج کنور مر گیا تو اس کی تمام تر ذمے داری بڑے کنور پر ہوگی۔ رامن کو سزا دینے کے معاملے میں جتنی دیر ہوگی میرا شہد اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ اگر رامن نے یہ سب اپنی مرضی سے کیا ہے تو بڑے کنور کو اسے فوری مزا دے کر دوسرے نمک خواروں کے لیے ایک مثال بنا دینی چاہیے کہ نمک حرامی کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔“

”بس زیادہ دیر نہیں گلے گی۔“ منشی جی نے کہا۔

اس سے بات کرتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا کہ بڑے کنور کی جی حضوری کرنے والے یہ لوگ کہیں چالاک سے کام تو نہیں لے رہے ہیں۔ پہلے رامن نے بڑے کنور کی ہدایات کے برخلاف کارروائی کی اور اب منشی جی بھی اس کی پیروی کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑا کنور راج کنور کی طرح تمام معاملات اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا اور وہ اکثر ان ملازموں کا محتاج ہوتا۔ اپنی من مانی کے لیے بڑا کنور ایک آئیڈیل آقا تھا اور وہ فطرت میں بھی راج کنور سے مختلف تھا۔ راج کنور سے غداری کر کے اب وہ کسی صورت اسے زندہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں بجا طور پر خوف تھا کہ راج کنور نے کسی طرح پھر سے راج پاٹ حاصل کر لیا تو سب سے پہلے ان کی شامت آئے گی اور انہیں اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اس لیے رامن اور منشی جی کی پوری کوشش تھی کہ راج کنور کا پتا صاف کر دیا جائے۔ وہ مرجاتا تو اس کا الزام بعد میں با آسانی مجھ پر لگایا جاسکتا تھا۔ جیسے جیسے میں اس مفروضے پر غور کر رہا تھا میرا شک پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ منشی جی رامن کے ساتھ مل کر اپنا ہی کھیل کھیل رہے تھے اور بڑا کنور اس سے بے خبر تھا اگر یہ بات درست تھی تو رامن قید نہیں تھا۔

اب اگر راج کنور ہم سمیت زندہ ان کے ہاتھ آ جاتا تب بھی امکان یہی تھا کہ وہ اسے مار دیتے اور پھر بڑے کنور کے سامنے اس کا الزام ہم پر یا راج کنور پر رکھ دیتے کہ اس نے مزاحمت کی اور مارا گیا۔ بڑا کنور ان کی بات ماننے پر مجبور ہوتا۔ مگر ساتھ ہی اس کا بھی امکان تھا کہ یہ سب بڑے کنور کے اشارے پر ہو رہا تھا۔ لڑائی کا مقصد راج کنور کو ختم کرنا تھا اور اتفاق کی بات ہے ہم سب میں سے نشاندہ بھی بس وہی بناور نہ فائزنگ تو اندھا دھند کی گئی تھی۔ اپنے بارے میں مجھے یقین تھا کہ بڑے کنور نے ہر صورت میری حفاظت کرنے کو کہا ہوگا لیکن منشی جی اور رامن کو اس سے اتفاق نہیں ہو گا وہ راج کنور کے ساتھ میرا پتا بھی صاف کرنا چاہتے ہوں گے۔ اس سے بڑے کنور کی صحت یابی کا امکان بھی ختم ہو جاتا اور بیمار بڑا کنور ان کے رحم و کرم پر آ جاتا اور ان لوگوں کو کھل کر اپنی من مانی کرنے کا موقع ملتا۔ ورنہ وہ صحت مند ہو کر راج کنور کی طرح سب پر حاوی ہو جاتا۔ اپنے شبہ کی تصدیق

کے لیے میں نے فٹشی جی کو آواز دی۔

”فٹشی جی آپ موجود ہیں؟“

”جی جناب میں یہیں ہوں۔“

”میں بڑے کنور سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”اس کے لیے آپ کو بڑے کنور کے پاس جانا ہوگا۔“ اس نے سادہ مکاری سے کہا یعنی ہمیں اس کمرے سے نکلنا ہوگا۔

”اتنی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے اسی کے انداز میں مکاری سے جواب دیا۔ ”جیسے آپ نے پانی اور دوسری چیزیں بھیجی تھیں اسی طرح ملازمہ کے ہاتھ ایک واکی ٹاکی بھیج دیں میں اس پر بڑے کنور سے بات کر لوں گا۔“

فٹشی جی گڑبڑا گئے تھے۔ ”جی میں دیکھتا ہوں۔“

”اس میں دیکھنے کی کیا بات ہے؟“ میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ”یہ کوئی بڑا مطالبہ تو نہیں ہے میں نے یہاں گارڈز کے پاس بھی واکی ٹاکی دیکھا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اس کے لیے بڑے کنور سے اجازت لینا ہوگا۔“

میں ہنسا۔ ”فٹشی جی آپ مذاق کر رہے ہیں۔ رامن کو مجھے اور میرے ساتھیوں کو مارنے کے لیے بڑے کنور کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی لیکن اسے سزا دینے کے لیے بڑے کنور کی اجازت کی ضرورت ضرور ہے۔ کیا آپ نے پانی اور دوسری چیزیں بھیجتے ہوئے بھی بڑے کنور سے اجازت لی تھی۔“

”وہ دوسری بات تھی۔“ فٹشی جی کا لہجہ ساٹ ہو گیا۔ ”اس معاملے میں بڑے کنور سے اجازت لینا ہو گی۔“

میں دروازہ بند کر کے راج کنور کے پاس آیا جو مسلسل تالے پر نئے کبی نیشن آزما رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”تم نے سنا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ بھی رہا ہوں، یہ بڑے کنور کو استعمال کر رہے ہیں انہیں خوف ہے کہ میں واپس آ گیا تو انہیں نہیں چھوڑوں گا۔ بڑا کنور میرا دشمن بھی ہو جائے تب بھی وہ مجھے قتل نہیں کرائے گا۔ یہ فٹشی جی اور رامن کی خواہش ہوگی۔“

”اسی لیے وہ واکی ٹاکی دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“

”ان کا بس چلنا تو یہ ہیں ہمارے خلاف کارروائی کرتے لیکن وہاں انٹر کام سے رابطے کی سہولت تھی۔ یہاں ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔“ راج کنور نے مایوسی سے کہا۔

”جہیں یقین ہے کہ بڑا کنور تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتا ہے؟“ بانو نے پوچھا وہ کچھ دور دیوار سے ٹک لگائے بیٹھی تھی۔

”وہ میرا بھائی ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“ راج کنور نے یقین سے کہا۔ ”ہم بھائیوں میں وہ بہت بہتر انسان ہے۔ بعض اوقات وہ دوسروں کو بھی معاف کر دیتا تھا۔“

”لیکن یہ اقتدار اور اس کی زندگی کا معاملہ ہے۔“

”اس کے لیے مجھے قتل کرنا ضروری نہیں ہے اپنی زندگی کی حد تک وہ مجھے یہاں سے بے دخل رکھے گا لیکن اس کے بعد یہ جاگیر اور دولت مجھے اور میری اولاد کو ہی ملے گی۔ یہ پریوار کا معاملہ ہے انسان اپنی ذات پر اپنے پریوار کو ترجیح دیتا ہے۔ مجھے موقع ملتا تو میں بھی اسے نہیں مارتا بس بے بس بنا کر اپنے قبضے میں رکھتا۔“

”تمہارے قبضے میں تو وہ پہلے بھی قائم ہی سب دیکھتے تھے اور عیش کی زندگی بسر کرتے تھے۔“

”ہاں لیکن بڑے کنور کے کان بھرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔“ اس نے نفرت سے کہا۔ ”سب سے آگے تو یہ نشی جی ہے۔“

”لیکن اسی نشی جی کو تم نے بڑے کنور کے خلاف اپنے ساتھ ملا لیا۔“

”یہ بھی اس کی چالاکی تھی اس نے محسوس کیا کہ اگر میں جاگیر پر قابض ہو گیا تو سب سے پہلے اس کی چھٹی کروں گا اس لیے وہ میرا وفادار بن گیا۔“

”اور جیسے ہی تم قید ہوئے وہ دوبارہ بڑے کنور کی طرف لوٹ گیا۔“

”مجھے شبہ ہے کہ وہ کبھی میرا وفادار تھا۔ وہ ایک منصوبے کے تحت آیا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بڑے کنور کی رضامندی سے آیا ہو۔“

”یہ تو طے ہے کہ وہ بڑے کنور کا بھی پورا وفادار نہیں ہے وہ اسے بھی لاعلم رکھ رہا ہے۔“

”شہباز۔“ راج کنور نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر تم نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا تو میری درخواست ہے مجھے اپنے ہاتھ سے گولی مار دینا میں ان نکوٹ کے ہاتھ سے مرنا نہیں چاہتا۔“

”اگرچہ انسان موت و زندگی کے بارے میں بے بس ہے لیکن ایسا موقع آیا تو میں تمہاری درخواست کو مدنظر رکھوں گا۔“

راج کنور لاک نمبر ملانے میں لگ گیا۔ یہ بہترین قسم کا کمپی نیشن لاک تھا جس میں اپنی مرضی کا اور کسی بھی عدد کا نمبر یہ طور لاک لگایا جاسکتا تھا یہ بھی ممکن تھا کہ اصل نمبر صرف چار ہندسوں پر مشتمل ہو یا یہ دس نمبروں پر بھی مشتمل ہو سکتا تھا۔ درست نمبر معلوم کرنا تقریباً بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنے کے برابر تھا۔ فی الحال آرام کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا اس لیے میں بھی ایک طرف دیوار سے ٹک لگا کر بیٹھ گیا۔ بالو میرے قریب کھٹک آئی اور مجھے معلوم تھا کہ اب سوالات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ میں تیار ہو گیا۔ اس نے پہلا سوال کیا۔ ”اگر یہ کمپی نیشن لاک نہ کھول سکا تو.....؟“

”تب ہم یہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔“ میں نے سادہ جواب دیا۔ ”ہاں توئی معجزہ ہو جائے تو الگ بات ہوگی۔“

”نشی جی اور راسن اگر بڑے کنور کی مرضی کے خلاف کام کر رہے ہیں تب وہ ہمیں زندہ نہیں پکڑیں گے۔“

”اس کا امکان ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”لیکن وہ کھل کر یہ کام نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ انہیں بڑے کنور کو جواب دینا ہے اس لیے نشی جی کی کوشش ہے کہ ہم آسانی سے ان کے ہاتھ آجائیں اور وہ اپنی مرضی سے ہمارا کام

تمام کر سکیں۔۔۔

بانو نے جھرجھری لی۔ ”آپ اتنی خوفناک باتیں کتنے آرام سے کر رہے ہیں۔“
 ”یہ سب میرے لیے نیا نہیں ہے بلکہ اب تو تمہیں بھی عادی ہو جانا چاہیے۔“
 بانو کچھ سوچ رہی تھی پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”آپ جانتے ہیں راج کنور کے ساتھ رامن بھی میرے
 پیچھے پڑا ہے۔ اگر ہم ان کے ہاتھ آگئے تو۔۔۔“

”اتنی دور کا مت سوچو۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”ابھی ہم پوری طرح بے بس نہیں ہوئے ہیں۔“
 ”میرے لیے یہ دور کی بات نہیں ہے۔“ بانو رو ہانسی ہو گئی۔ ”میں آپ کو بتا دوں اگر ایسا کوئی وقت آیا تو
 میں زندہ ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آؤں، ایک دو کو مار کر مروں گی۔“
 ”یہ اچھی اسپرٹ ہے لیکن اسے آخر کے لیے بچا کر رکھو۔ جب انسان عزت سے جی نہ سکے تو عزت
 سے مر جائے۔“

اوشا سامنے دیوار سے کمر کا کر سیدھی بیٹھی ہوئی تھی اس نے وہی ملازماؤں والا مختصر سالباں پہن رکھا تھا
 اور اسے احساس نہیں تھا کہ اس پوز میں وہ کوئی تراشا ہوا مجسمہ لگ رہی تھی۔ وہ ہماری باتیں سن رہی تھی اور اس
 نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور آنکھیں ساکت تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ناگن سکتے کی
 کیفیت میں ہو۔ بانو نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے سیاہ رنگ کی لڑکیوں میں اس سے زیادہ حسین اور پُرکشش
 لڑکی نہیں دیکھی۔“

”میں نے بھی۔“ میں نے اعتراف کیا۔
 ”اس کے جسم میں جو زہر ہے کیا اسے کسی طریقے سے ختم نہیں کیا جاسکتا تاکہ یہ بھی نارمل زندگی گزار
 سکے۔“

”مہر خیال ہے میڈیکل سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی علاج تو ہوگا۔“ میں نے
 جواب دیا اور ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ وہ نارمل ہو گئی تو سیدھا میرا رخ کرے گی۔ اوشا ہماری باتیں سن رہی تھی وہ
 اٹھ کر ہمارے پاس چلی آئی۔

”تم لوگ میرے بارے میں بات کر رہے ہو نا؟“
 ”ہاں میں کہہ رہی ہوں کہ اگر کسی طریقے سے تمہارے جسم سے زہر خارج کر دیا جائے تو تم نارمل زندگی
 کی طرف آسکتی ہو۔“

”چاہتے تو ہم بھی یہی ہیں رے۔“ اس نے حسرت سے مجھے دیکھا۔ ”پر باپو کا کہنا تھا کہ ہم ساری عمر دوش
 کے ساتھ رہیں گے۔ اس کا کوئی اپنا نہیں ہے۔“

”تمہارا باپو جدید میڈیکل سائنس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اس لیے ایسا کہہ رہا تھا۔ اب دنیا میں ہر
 مرض اور ہر چیز کا علاج ممکن ہے۔ آخر ان کا بھی تو علاج ہوتا ہے جن کو زہر لیے سانپ کاٹ لیتے ہیں یا وہ کسی اور
 طریقے سے زہر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ علاج کر کے ان کے جسم سے زہر کے اثرات ختم کر دیئے جاتے ہیں۔“
 میں نے کہا۔

”میں اس بارے میں معلوم کرا چکا ہوں۔“ تالے پر جھکے راج کنور نے اچانک کہا۔ ”میں نے انڈیا کے ماہر ترین ڈاکٹروں سے بات کی جو ہر کے اثرات ختم کرنے کے ماہر ہیں لیکن ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ اوشا کے بدن سے زہر ختم نہیں ہوگا۔ یہ اس کے سٹم کا ایک حصہ بن گیا ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا جو چیز انسانی سٹم کا حصہ بن جائے اسے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا ایسا کرنے سے انسان مر بھی سکتا ہے۔ اس کی بات سن کر مجھے تعجب ہوا تھا۔ ”تم نے کیوں یہ زحمت کی اور وہ بھی ایک معمولی ملازمہ کے لیے۔“

راج کنور نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے کبھی نیشن ملاتا رہا پھر میں نے اوشا کی طرف دیکھا تو جواب سمجھ میں آ گیا۔ راج کنور بھی اس کے حسن سے متاثر تھا لیکن زہر کی وجہ سے وہ بس دور سے دیکھنے پر مجبور تھا اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے اس نے اوشا کا زہر ختم کرنے کے لیے ڈاکٹروں سے بات کی تھی اور اسے ایسوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اوشا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”شہباز ہم کم نصیب ہیں رے کوئی ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتا ہے۔“

”یہ تمہاری سوچ ہے میری سوچ اس سے الگ ہے۔ اس زہر نے تمہاری عزت محفوظ رکھی۔“

”تو جانتا ہے میں ایک سپرے کی بیٹی ہوں۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔ ”ہم جانتے ہی نہیں کہ مجھ کیا ہے رے؟“

”ایسا نہیں ہے ہر انسان صاحب عزت ہے اگر اس کی اپنی نظر میں عزت ہو تو۔“

”بھلا آدمی کی دوسرے مجھ نہ کریں تو کھد کیسے اپنی جھٹ کرے؟“ اس نے ذرا تعجب سے کہا۔ میں اس نادان ناری کے ساتھ وقت ضائع کر رہا تھا۔ جب کہ مجھے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اس مشکل سے کیسے نکلوں۔ میں نے بانو کی طرف دیکھا تو وہ اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے بی بی؟“

”کچھ نہیں شہباز صاحب۔“ وہ ذرا شوخی سے بولی۔ ”بس ایک خیال آ رہا تھا کہ جب آدمی ذحول لگے میں ڈال لیتا ہے تو اسے بجاتا ہی پڑتا ہے۔“

اوشا نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تو ہمیں ذحول کہہ رہی ہے؟“

”بالکل نہیں تم کہاں سے ذحول ہو گئیں۔ وہ تو بہت موٹے اور بھدے انسان کو کہتے ہیں۔“ بانو نے جلدی سے تردید کی۔ ”تم تو اسارٹ ہو۔“

یہ سن کر اوشا دھکی ہو گئی۔ ”گلتا ہے ٹو اب انگریجی میں برا کہہ رہی ہے۔“

میں ہنسا۔ ”اسارٹ کا مطلب ہے چست اور دلی جیسی کہ تم ہو۔“

”تو سچ کہہ رہا ہے؟“ اس نے شک سے پوچھا تو بانو ہنسی تھی۔ اوشا خفا ہو گئی اور اسے باقاعدہ منانا ہوا تھا۔ اس چھوٹی سی کامیڈی نے ہم سب کے نئے اعصاب ذرا ڈھیلے کر دیئے تھے۔ راج کنور ذرا تعجب سے ہمیں دیکھ رہا تھا لیکن اس نے درمیان میں دخل دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے کام میں لگا ہوا تھا جب تھک جاتا تو کچھ دیر کو سوتانے کے لیے رک جاتا اور پھر بہت آتے ہی دوبارہ کام میں لگ جاتا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اپنی صحت

سے بڑھ کر کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس کے جسم میں گولی موجود تھی اور زخم تازہ تھا۔ بے شک پین کلرز نے عارضی طور پر زخم دبا دیا تھا لیکن پھر گولی کا زخم کم تکلیف دہ نہیں ہوتا ہے خاص طور سے جب گولی جسم میں موجود ہو۔ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اس کا زہر پھیلتا ہے تو یہ زیادہ تکلیف دینے لگتا ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ انسان کا بچہ بن کر ہم سے تعاون کے جذبے سے سرشار اس کام میں جتا ہوا تھا۔ یہ برادر کلاں اور اس سے زیادہ اپنے سابق نمک خواروں کا خوف تھا جو راج کنور خفیہ راستے کا تالا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے تو مجھے اتنا کھلا ہوا ”خفیہ راستہ“ دیکھ کر تعجب ہوا تھا۔ بس ایک قالین ہٹاؤ اور دروازہ سامنے آ جاتا۔ یہ تالا ہمارے لیے مسئلہ بنا ہوا تھا ورنہ کوئی اور دشمن ہوتا تو ہم مار کر یا بہت سارے لوگوں کی مدد سے اس دروازے کو توڑ کر راستہ بنا چکا ہوتا۔ جب کہ میرے خیال میں خفیہ راستہ ایسا ہو گا کہ کوئی دیکھ کر شک نہ کرے کہ یہاں خفیہ راستہ ہو سکتا ہے۔ جیسے کسی آتش دان کے پیچھے یا کسی الماری کے پٹ کے عقب میں۔ جسے خاص طریقے سے کھولا جا سکے جیسے کوئی کل دبا کر یا فرش کی ٹانگوں میں سے کسی مخصوص ٹائل کو دبا کر لیکن لگتا تھا کنور خاندان کو گلشن سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دولت مند ضرور تھے لیکن ذرا اجڈ قسم کے۔ مجھے راجا عمر دراز کے محل کے خفیہ راستے کا خیال آیا جس سے میں نے بھی سفر کیا تھا۔ وہ بالکل روایتی جاسوس کہانیوں والے خفیہ راستے کی طرح تھا۔

میں اٹھ کر فولادی دروازے کے پاس آیا۔ اس کی چادر پوری طرح طرح کنکریٹ سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے شاٹ گن کے فولادی دستے سے کنکریٹ بجا کر دیکھا۔ یہ ہر جگہ سے ٹھوس تھا۔ میں نے راج کنور سے پوچھا۔ ”اس خفیہ راستے کی تعمیر کب ہوئی؟“

”آج سے کوئی پندرہ سال پہلے۔“

”کس کی نگرانی میں ہوئی تھی؟“

”ظاہر ہے میری نگرانی میں۔“

”اس فولادی دروازے کے قبضے کہاں ہیں۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا کیونکہ آدمی جو چیز استعمال کرتا ہے اس کی ساخت پر زیادہ توجہ نہیں دیتا ہے خاص طور سے جو ساخت چھپی ہوئی ہو۔ چند لمبے بعد اس نے کہا۔ ”دیکھو یہ اس طرح سے اوپر اٹھتا ہے اس لیے اس کے قبضے اس طرف ہوں گے۔ مگر مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے کہ قبضے کہاں کہاں لگے ہیں۔“

”ان کی تعداد یاد ہے اور یہ کہ قبضے کنکریٹ میں ہیں یا اس دروازے کا چوکھٹ سمیت فولادی ڈھانچہ ہے۔“

”نہیں اس کے قبضے کنکریٹ میں پیوست ہیں۔“ اس نے تردید کی تو مجھے دلچسپی محسوس ہوئی۔ ”قبضوں کی تعداد یاد نہیں لیکن کم سے کم دو ہوں گے۔“

”اگر یہ کنکریٹ میں پیوست ہے تو اسے توڑا جا سکتا ہے۔“

”لیکن کیسے اول تو ہمارے پاس اوزار نہیں ہیں اور دوسرے اسے توڑنے کے لیے بہت طاقت درکار ہو گی۔“ راج کنور نے مایوسی سے کہا۔

”انسان کو شش کرے تو سب کر سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم اپنا کام کرتے رہو۔“ وہ دوبارہ تالے پر جھکتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تو یہ کھلتا نظر نہیں آ رہا ہے لگتا ہے کم سے کم میرا آخری سے آگیا ہے۔“

میں اس کے پاس سے ہٹا تو بانو نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ کے ذہن میں کوئی خیال آیا ہے۔“ اس مختصر سے کمرے میں دوسروں سے چمپا کر گفتگو کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے بانو کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں بس ایسے ہی خیال آیا تھا۔“

ہمیں اس کمرے میں محصور ہوئے دو گھنٹے ہونے والے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ صبح کے دس بج رہے تھے۔ اوشا نے دروازے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی اور وقفہ وقفہ سے دروازہ کھول کر باہر جھانکتی تھی۔ کبھی کبھی تھوڑا سا باہر نکل کر بھی دیکھ لیتی۔ میں نے اسے منع کیا کہ باہر نہ نکلے۔ باہر والے شرارت پر آمادہ تھے اور کوئی گولی بھی چلا سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

”ہم کب تک ایسے بیٹھے رہیں گے۔“

”جب تک حالات اجازت نہیں دیتے۔“

راج کنوری کی حالت بگڑ رہی تھی تکلیف بڑھنے سے اس کے ماتھے پر بار بار پسینہ آ رہا تھا حالانکہ اس کمرے میں خنکی تھی۔ وہ ایک بار نمبر ملاتا اور ناکامی کے بعد ٹھٹھا ہو کر پیچھے بیٹھ جاتا تھا۔ جب امت آتی تو دوبارہ کوشش کرتا۔ ہر بار اسے پہلے سے زیادہ دیر لگتی تھی۔ میں نے اسے روکا اور پھر زخم سے پٹی ہٹا کر اس کا معائنہ کیا۔ زخم کے آس پاس سوجن نمودار ہو رہی تھی اور رنگ بھی بدل گیا تھا۔ زخم واضح طور پر خراب ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ذرا حوصلہ کرو میں انگلی سے زخم ٹٹولنے جا رہا ہوں مجھے لگ رہا ہے گولی اوپر ہی موجود ہے اگر اسے نکال دیا تو تمہیں سکون ملے گا۔“

اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو اب یہاں ایسی تکلیف ہے جیسے اندرا نکلا رہا ہو۔“

”کاش کوئی چاقو ہوتا تو کام آسان ہو جاتا۔“

”چاقو ہے۔“ بانو نے چاقو پیش کر کے مجھے حیران کر دیا یہ جھوٹی نوک والی چھری تھی جس سے پھل کاٹا جاتا تھا بانو راج کنوری کے عشرت کدے سے آتے ہوئے اسے اٹھالائی تھی۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”یہ کیا تم نے کام۔“

میں نے لپٹی جانے والی پٹی کا گولہ بنا کر راج کنوری کی طرف بڑھا دیا۔ ”اسے اپنے منہ میں ٹھونس لو ایک تو آواز نہ نکلے دوسرے کہیں زبان دانٹوں تلے آ کر نہ کٹ جائے۔“

وہ خوفزدہ تھا لیکن اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے منہ دبایا تھا۔ میں نے پہلے جراثیم کش محلول روٹی پر لگا کر اس سے اس کا زخم صاف کیا۔ اس محلول نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔ منہ بند تھا لیکن اس نے ناک سے اتنا دوا دیا چھپایا کہ مجھے خدشہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں اس کی آوازیں باہر نکل نہ پہنچ جائیں۔ بہر حال اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں نے زخم صاف کر چاقو بھی اسی محلول سے صاف کیا

اور پھر اپنا پاؤں راج کنور کے سینے پر رکھا تاکہ وہ مل نہ سکے اور چاقو اس کے زخم میں داخل کیا۔ وہ اتنی زور سے تڑپا کہ چاقو ہلا اور زخم خود بڑا ہو گیا۔ فوراً ہی خون بہنے لگا تھا۔ میں نے اس کی پروا کیے بغیر انگلی زخم میں داخل کی اور گولی تلاش کرنے لگا۔

راج کنور تڑپ رہا تھا مگر میرے بوجھ تلے زیادہ نہیں مل پارہا تھا۔ انگلی کھماتے ہوئے بالآخر میں نے گولی تلاش کر لی۔ اس کے جائے وقوع کا اچھی طرح اندازہ کر کے میں نے چاقو کی نوک اندر داخل کی اس بار بھی راج کنور نے ناک سے شور کیا تھا مگر میں نے پروا کیے بغیر چاقو کی نوک سے گولی نکال ہی لی۔ وہ آخری بار تڑپا اور بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اس افسوس سے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ شخص اتنا کم ہمت ہو گا۔“

خون بہہ رہا تھا میں نے پرانی پٹی کو استعمال کیا اور اس سے زخم دبا کر خون روکتا رہا جب خون رک گیا تو جراثیم کش محلول سے اسے صاف کیا۔ اس پر خشک کرنے والا پاؤڈر چھڑک کر اوپر سے چکنی پٹی رکھ کر ٹیپ سے بند کر دیا۔ پھر روٹی سے اپنے خون آلود ہاتھ صاف کیے۔ پانی اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گولی نکلنے سے یقیناً راج کنور کی تکلیف میں کمی آئی تھی اس لیے جلد اسے ہوش آگیا میں نے پانی کے ساتھ دو چٹن کلرز اور دو اشٹی باؤنک کپسول اسے کھلا دیئے۔ وہ دیوار سے ٹک کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ دس منٹ بعد اس کی حالت خاصی بہتر نظر آنے لگی تھی۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ سوچ رہا تھا کہ میں اس جیسے دشمن کے لیے اتنی تک دود کیوں کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں لیکن شہباز میری سمجھ میں تمہارا رویہ نہیں آرہا ہے۔“

”کیسا رویہ؟“

”یہی کہ میں تمہارا بدترین دشمن ہوں اور تم میرے لیے اتنا کر رہے ہو؟“

”میں تمہارے لیے نہیں اپنے لیے کر رہا ہوں اور اس سے پہلے تم جیسے اور بھی کئی بدترین دشمن میرا رویہ سمجھ نہیں پاتے ہیں۔ اس کی بڑی سادہ سی وجہ ہے میں ایک عام انسان ہوں۔ مجھے غصہ بھی آتا ہے اور میں نے بی شمار لوگوں کو اپنے ہاتھ سے مارا ہے لیکن میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ قابو میں آئے دشمن سے برا سلوک کروں یا صرف اپنی تسکین کے لیے اسے ذلیل کروں۔ اسی طرح میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ تمہیں دشمن سمجھ کر علاج سے محروم رکھوں۔ ہاں میں یہ کر سکتا ہوں کہ اگر تم سے مجھے کوئی ناقابلِ حلانی نقصان ہوتا تو میں ایک گولی مار کر تمہیں سے دنیا سے رخصت کر دیتا۔“

”میرے بس میں ہوتا تو.....“

”راج کنور اپنا موازنہ مجھ سے مت کرو۔“ میں نے اسے نوک دیا۔ ”میں تم سے بالکل مختلف آدمی

ہوں۔“

وہ چپ ہو گیا کچھ دیر بعد سرد آہ بھر کر کہا۔ ”اگر میں بچ گیا تو اس وقت کو یاد رکھوں گا۔“

”یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر دروازے تک آیا۔ منشی جی وہاں موجود تھے

میری پکار کے جواب میں ابو۔۔۔

”حکم کریں شہباز جی؟“

”منشی جی اتنی تاخیر سے تم لوگوں کی بدینتی تو واضح ہو گئی ہے۔ اب میں انتظار کر رہا ہوں کہ تم لوگ حرکت

میں آؤ تو میں جواب دوں۔“

”آپ بے فکر رہیں یہاں کوئی آپ کے خلاف کچھ نہیں کرے گا۔“

”خوشی سے مرنہ جاتے مگر اعتبار ہوتا۔“ میں نے غمی سے کہا۔ منشی جی اینڈ پارٹی کی بدینتی تو واضح تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر اس نے کچھ کرنا ہی تھا تو اس میں اتنی تاخیر کیوں کر رہا تھا۔ اسے بہت پہلے اس کمرے پر بلہ بول دینا چاہیے تھا۔ میرے خیال میں اب ہماری طرف سے کچھ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور راج کنور کے پاس آیا۔ ”یہ بتاؤ اس دروازے کے ساتھ کوئی دھماکہ خیز ٹریپ تو نہیں ہے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسا کوئی ٹریپ نہیں ہے تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”میں اس دروازے کو توڑنے جا رہا ہوں۔“

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”اے تو کوئی ہاتھی بھی نہیں توڑ سکتا ہے۔“

”میں ہاتھی نہیں انسان ہوں۔“ میں نے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کمرے کے دوسرے

کونے میں لایا۔ ”یہاں بیٹھو۔“

”شہباز صاحب آپ کیا کرنے جا رہے ہیں۔“ بانو نے پوچھا۔

”بانو تم دروازے کے پاس رہو گی اور اگر کوئی اندر آنے کی کوشش کرے تو اسے بے دریغ شوٹ کر دینا۔“

میں نے اس کا سوال نظر انداز کر کے حکم دیا۔ ”تو وہ دروازے کے پاس چلی گئی میں نے اوشا کو بھی کونے میں جانے کا حکم دیا۔ میں نے رانفلز ایک طرف رکھ دی اور شاٹ گن سنبھالی۔ اس میں ایک وقت میں سات کارتوس آتے تھے اور جو پانچ میرے پاس تھا اس میں سو کے قریب کارتوس مزید تھے۔ یہ سب نہایت مہلک ہلٹ تھے جو میں گز کی دوری تک کسی کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کافی ہوتے۔ بازوؤں اور ٹانگوں کے علاوہ یہ کہیں بھی گلتے تو آدمی کا بچتا مشکل تھا۔ میں نے ایک مخصوص زاویے سے کھڑے ہو کر دروازے کے گرد کنکریٹ کی چوکنٹ کا جائزہ لیا۔ پھر اس کے قبضے والے حصے کا معائنہ کیا اور اوشا کو پاس بلایا۔ وہ لپک کر آئی۔

”کیا ہے رے؟“

”اوشا روٹی سب کو دو اور اپنے کانوں میں بھی ٹھونس لو۔ اس بند کمرے میں دھماکے بہت زیادہ گونجیں

گئے۔“

اوشا نے ایک پیکٹ پھاڑ کر روٹی نکالی اور سب کو دینے لگی۔ مجھے بھی دی جو میں نے گول مول کر کے کانوں میں ٹھونس لی۔ اب میں اور دوسرے دھماکوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ میں ایسے زاویے سے کھڑا تھا کہ گولی پلٹ کر میری طرف نہ آئے اور پھر یہ کنکریٹ تھا اس میں گولی ویسے بھی پلٹی نہیں ہے۔ ہاں دھماکے کی کوئی چیز ہو اور بہت مضبوط ہو تو گولی ان سے اچٹ کر واپس آ سکتی ہے۔ کانوں میں روٹی ٹھونسنے کے باوجود پہلا دھماکا ایسا تھا کہ سیدھا کان کے پردے سے جا ٹکرایا تھا۔ میں بھی اچھل پڑا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ

گولی نے فولادی تختے کے ساتھ کنکریٹ ادھیڑ دیا تھا۔ میں نے دل کڑا کر کے اسی جگہ دوسرا فائر کیا اور اس بار بھی اچھا خاصا کنکریٹ ادھیڑ اٹھا۔ صرف روئی دھماکوں کی آواز روکنے میں ناکام رہی تھی۔ ان تینوں نے کانوں پر ہاتھ بھی رکھ لیے تھے۔ میں نے ایک بار کام شروع کر دیا تھا۔

باہر والوں کو یقیناً اطلاع مل چکی تھی اور اس سے پہلے کہ ان کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی ہوتی میں جلد از جلد کنکریٹ میں سوراخ کر لینا چاہتا تھا۔ ہر فائر کے ساتھ کنکریٹ کے ذرے اڑتے تھے اور کمرے میں بارود کا دھواں پھیل رہا تھا۔ ہر فائر کے ساتھ میں آنکھیں بند کر لیتا تھا کیونکہ ذرے اڑ کر منہ تک بھی آرہے تھے۔ کوئی ایک درجن فائر کے بعد میں نے اپنی کارگزاری کا جائزہ لیا۔ شاٹ گن کے بلبس نے کنکریٹ میں سوراخ کر دیئے تھے اور اس کی اوپری سطح غائب ہو چکی تھی۔ میں نے بٹ سے کنکریٹ صاف کیا اور اندازہ کرتا چاہا کہ اس کے قبضے کہاں تھے ایک بار قبضے نظر میں آ جاتے تو میں خاص طور سے ان کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ بلبس کی کمی نہیں تھی۔ فائرنگ میں وقفہ آیا تو پتا چلا کہ باہر کوئی چلا رہا تھا۔ میں نے کانوں سے روئی نکالی۔ آواز فشی جی کی تھی۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ میں فائرنگ کیوں کر رہا تھا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے دوبارہ کانوں میں روئی ٹھنسی اور ان جگہوں کو نشانہ بنانے لگا جہاں میرے خیال میں دروازے کے قبضے موجود تھے اب تک کنکریٹ میں ان کا نشان نہیں آیا تھا۔

مزید نصف درجن فائر کے بعد مجھے رک جانا پڑا کیونکہ اب کمرے میں بارود کا زہریلا دھواں اتنا زیادہ بھر گیا تھا کہ اس میں سانس لینے سے حلق میں جلن ہو رہی تھی۔ شاٹ گن کے بلب میں جس طرح گولی بڑی ہوتی ہے اس طرح اس میں بارود بھی اچھا خاصا بھرا ہوتا ہے۔ میں نے دروازہ کھولا اور پہلے ذرا سا کھول کر باہر بھاگنا وہاں کوئی نہیں تھا۔ دروازہ کھلتے ہی دھواں کم ہونے لگا تھا۔ اس کمرے میں دھنی لیشن سسٹم نہیں تھا لیکن اس سے باہر تو موجود تھا اس لیے دھواں تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ فشی جی سخت تشویش زدہ تھے کہ میں کیوں فائر کر رہا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اسے جواب دے لوں۔ ”فشی جی فائر نہ کریں ایسے فارغ بیٹھا تھا سو چا نشانہ بہتر کر لوں۔“

”شہباز جی آپ فائرنگ بند کریں۔“

”اگر میں ایسا نہ کروں تو.....؟“

”تو آپ کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔“ فشی جی نے دھمکی دی۔ ”آپ کس پر فائر کر رہے ہیں؟“

”تمہارے سابق آقا پر نہیں کر رہا ہوں وہ ویسے بھی کچھ دیر کا مہمان ہے۔“

اس دوران میں دھواں تقریباً نکل گیا تھا اس لیے میں نے بانو کی ڈیوٹی دروازے پر لگائی۔ فشی جی پریشان ہو رہے تھے اور کوئی بعید نہیں تھا کہ اپنے کمانڈر روانہ کر دیتے۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”کوئی بھی نظر آئے اس پر فائر کرنا۔ کسی کو کمرے کے قریب مت آنے دینا۔“

”میں سمجھ گئی لیکن اگر وہ دوسری طرف سے آیا تو؟“

”اوشا بھی مستعد رہے گی۔“ میں نے اوشا کی طرف دیکھا وہ بھی دروازے کے پاس آگئی اور میں دوبارہ

فائرنگ کی مشق کے لیے تیار ہوا۔ اس بار مجھے ایک قبضہ نظر آ گیا تھا اور یہ تقریباً نصف انچ موٹی اور تین انچ چوڑی فولادی پلیٹ پر مشتمل تھا جو نہ جانے کنکریٹ میں کتنا گھسا ہوا تھا۔ میں تاک کر اس کے آس پاس فائر کرنے لگا۔

اب کیونکہ دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے اب دھواں بھی جمع نہیں ہو رہا تھا۔ تین درجن شائش مکمل کرنے کے بعد مجھے ہاتھوں سے جمع ہو جانے والا ملے ہٹانا پڑا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ دونوں قبضے نمایاں ہو گئے تھے۔ ان پر سے کئی انچ تک کنکریٹ صاف ہو گیا تھا اور مزید فائر کے بعد ان کے نکل آنے کا امکان تھا۔ میں وقت ضائع کیے بغیر پھر فائر کرنے لگا۔ مزید ایک درجن فائر کے بعد ایک قبضہ نکل گیا تھا میں نے اسے ہلا کر دیکھا۔ دوسرا ابھی تک اٹکا ہوا تھا۔ میں اس پر فائر کرنے جا رہا تھا کہ بانو نے فائر کیا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی اس طرف آیا تھا میں نے فائر کیا تو وہاں بھاگ گیا۔“

”گڈ اسی طرح محتاط رہو میں کامیابی کے قریب ہوں۔“ میں نے کہا اور دوسرے قبضے پر فائر کرنے لگا۔ اسی اثنا میں باہر سے کسی نے ہلکا سا برسٹ مارا گولیاں دروازے کے سامنے سے گزر گئی تھیں۔ میں نے بانو کو دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ ”سب کونوں میں چلے جائیں۔“

”آپ دروازے کے سامنے ہیں۔“ بانو نے فکر مندی سے کہا وہ اور اوشا ایک کونے میں چلے گئے تھے۔ ”اللہ مالک ہے۔“ میں نے کہا اور اس بار قریب سے قبضے پر لگا تار کئی فائر کیے۔ یہ بہت اچھی والی شاٹ گن تھی ورنہ کوئی عام شاٹ گن ہوتی تو اتنی دیر میں اس کی نال جواب دے جاتی۔ اس کی نال بھی دھک رہی تھی اور اسے ہاتھ سے پکڑنا ممکن نہیں تھا۔ مگر یہ اب بھی فائر کر رہی تھی۔ جلد دوسرا قبضہ بھی جواب دے گیا۔ میں نے شاٹ گن نیچے رکھی اور زور لگا کر فولادی تختہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کسی قدر وقت کے ساتھ یہ چوکھٹ سے نکل گیا تھا۔ نیچے جانے کے لیے بیڑھیاں نمودار ہوئی تھیں۔ راج کنور جلدی سے اٹھ کر پاس آیا وہ بے خیالی میں یا جان بوجھ کر راکفل اور شاٹ گن کے پاس آ گیا تھا اس لیے میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ اس کی پروا کیے بغیر پُر جوش انداز میں بولا۔

”شہباز تم نے نامکن کو ممکن کر دیا ہے اب نکل چلو اس سے پہلے کہ وہ آجائیں۔“

میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اس دوران میں منشی جی کے آدمی دروازے کے پاس آ گئے تھے اور کسی نے ترچھا برسٹ مارا اگر وہ سامنے فائر کرتا تو ہم سامنے ہی کھڑے تھے میں نے جلدی سے راکفل اٹھاتے ہوئے جوابی برسٹ مارا پھر بانو اور اوشا کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے پاس آئیں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”نیچے اتر جاؤ لیکن پوری طرح محتاط رہنا ہو سکتا ہے نیچے کوئی ہو۔“

پہلے بانو گئی تھی پھر اوشا اتری میں نے اسے پانی کی بوتل پکڑائی۔ راج کنور نے دو انیاں اور دوسرا سامان اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ بانو زہریلی گیس والا بیگ یہیں چھوڑ گئی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے مجھے ایک خیال آیا۔ وہاں راج کنور کی شرٹ کی استعمال شدہ آستینیں پڑی تھیں میں نے جلدی سے انہیں اٹھا کر پٹیوں کے صورت میں بچاڑا۔ اور پھر اسے ایک ڈوری کی صورت دے کر اسے بیک کی زپ سے منسلک کر دیا۔ بیک کی غللی زپ کھول کر اس میں کنکریٹ کا ملے بھر دیا اب یہ بھاری ہو گیا تھا اگر میں زپ کھینچتا تو بیک نہ کھینچا آتا۔ راج کنور بھی نیچے جا چکا تھا۔ اس کے اترتے ہی میں بھی اتر گیا لیکن بیڑھیوں پر رہا۔ نیچے تاریکی تھی۔ میں نے کمرے میں موجود واحد پینٹل لائٹ پر فائر کیا اور وہ بجھ گئی۔ اب مکمل تاریکی تھی۔ نیچے سے بانو نے کہا۔

”یہ کیا ہے؟“

”آگے جا کر لائٹر روشن کر لو راج کنور بھی نیچے آگیا ہے۔“ میں نے اسے خبردار کیا۔ وہاں تاریکی تھی اور ہم نہیں جانتے تھے کہ وہاں کیا ٹریپ تھے اور ممکن ہے کوئی ہتھیار بھی ہو۔ راج کنور اچھی طرح جانتا تھا وہ تاریکی میں بھی اپنا کام کر سکتا تھا۔ بانو سمجھ گئی۔ اس نے جلدی سے لائٹر آن کر لیا اور راج کنور کو اپنی نظروں میں کر لیا۔ پھر اس نے دہلی آواز میں کہا۔ ”آپ کیوں نہیں آرہے ہیں؟“

”میں کچھ کر رہا ہوں۔ تم لوگ دس پندرہ گز آگے نکل جاؤ۔“ میں نے جواب دیا میرے کان آہٹ پر مرکوز تھے۔ باہر سے گارڈز کی آوازیں آرہی تھیں اور پس منظر میں کہیں ٹنٹی جی کی آواز بھی شامل تھی۔ وہ یقیناً ہمیں روکنے کا حکم دے رہے تھے۔ میں چوکت سے کوئی دو فٹ نیچے تھا اس لیے امکان نہیں تھا کہ کوئی آتے ہی مجھے دیکھ لے گا۔ بانو اور اوشا راج کنور کو لے کر دور چلی گئیں تھیں اور نیچے تقریباً تاریکی تھی۔ ایک منٹ بعد دروازے پر ایک برسٹ مارا گیا اور پھر کسی نے لات مار کر دروازہ کھولا۔ میں نے سانس روکتے ہوئے تیزی سے ڈوری کھینچی۔ بیک کی زپ کھلی تھی اور اس کے ساتھ ہی میں نیچے اتر گیا۔ اوپر سے گارڈز کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں وہ شاید بتا رہے تھے کہ خفیہ راستہ کھلا ہے اور ہم غائب ہو چکے ہیں۔ نیچے آنے پر میں نے خود کو ایک ایسی سرنگ میں پایا جو تقریباً چھ فٹ قطر کی اور تقریباً گول تھی۔ یہ صاف ستھری اور سیمنٹ سے بنی تھی۔ یہاں بویا گند کی نہیں تھی۔ وہ تینوں آگے تھے اچانک تیز روشنی لہرائی اور بانو کی آواز آئی۔

”شہباز صاحب جلدی کریں۔“

مجھے خود جلدی تھی کیونکہ میں بیک میں بھری گیس کی اثر انگیزی اور حد سے ناواقف تھا۔ ممکن تھا وہ بہت تیزی سے پھیلنے والی گیس ہو اور اس کا اثر یہاں تک پہنچ جائے۔ میں جلدی سے ان کے پاس پہنچا۔ بانو کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا برقی لیپ تھا۔ لائٹن کی صورت کے اس لیپ میں تیز روشنی والے ایل ای ڈی بلب لگے تھے۔ ایسا ہی ایک لیپ اوشا کے ہاتھ میں تھا اور راج کنور خالی ہاتھ تھا۔ میں نے یہاں آکر سانس لیا اور پھر انہیں دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”جلدی..... چلو..... میں نے بیک کی گیس کھول دی ہے۔“

یہ سن کر راج کنور سب سے زیادہ دہشت زدہ ہوا تھا اس نے کہا۔ ”وہ سوف دور تک بھی اثر کرتی ہے۔“ یہ سنتے ہی سب کی رفتار میں تیزی آگئی تھی اور شاید سب نے ہی سانس روک لی تھی۔ سرنگ سیدھی جارہی تھی۔ میں نے اوشا سے لے کر لیپ آن کیا۔ اب یہاں زیادہ روشنی تھی۔ ایک بار میں نے مڑ کر دیکھا تو آخری سرے تک کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ گیس نے اثر کیا تھا اور کمرے میں گھسنے والے یقیناً اس کا شکار ہو گئے تھے ورنہ کوئی تو تعاقب میں آتا۔ پیچھے کی طرف سے اطمینان کے بعد میں نے راج کنور سے پوچھا۔ ”سرنگ کتنی لمبی ہے؟“ وہ اپنے زخم کی وجہ سے کسی قدر جھک کر چل رہا تھا اس نے جواب دیا۔ ”تقریباً ایک کلومیٹر لمبی ہے۔“

میں حیران ہوا تھا۔ ان لوگوں نے خاصی طویل سرنگ بنوائی تھی لیکن وہ بنوا سکتے تھے ان کے پاس دولت اور طاقت تھی۔ ”اتنی طویل سرنگ بنوانے کے لیے درجنوں مزدور استعمال کیے ہوں گے پھر اسے خفیہ کیسے رکھا؟“ راج کنور نے اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا لیکن جواب واضح تھا۔ جن سے سرنگ کھدوائی تھی۔ ان کو مروادیا گیا تھا اس لیے سرنگ کا راز راز رہا۔ ایک لمحے کو اشتعال کی لہر ابھی اور میرا دل چاہا کہ راج کنور کی گردن

مردوں۔ یہ سفاک لوگ اپنے معمولی سے کاموں پر بھی انسانوں کو اس طرح قربان کر دیتے تھے۔ مگر اس سے پہلے میں اس اپنے خیال پر عمل درآمد کرتا اشتعال کی لہر گزر چکی تھی۔ اب سرگ بار بار گھوم رہی تھی۔ یہ علاقہ شاید ریت مٹی والا تھا ورنہ پتھروں اور چٹانوں میں اتنی طویل سرگ کھودنا بہت مشکل کام ہے جب کہ اسے چھپانا بھی تھا۔ راستے میں ہر سو قدم کے بعد ویسی ہی برقی لائٹیں لٹکانی ہوئی تھیں۔ جیسی ہمارے پاس تھیں یہاں بجلی کا سسٹم نہیں تھا اس کے متبادل کے طور پر یہ لائٹیں رکھی ہوئی تھی۔ ان میں شاید طویل عرصے تک چلنے والی بیٹریاں تھیں۔

پانی کی بوتل اوشانے اٹھائی ہوئی تھی اور اسلحہ بانو کے پاس تھا۔ میرا اسلحہ میرے ساتھ تھا۔ شاٹ گن کی نال اب بھی گرم تھی اس لیے اسے اتھ میں رکھنا پڑ رہا تھا۔ جب ہمیں سفر کرتے ہوئے تقریباً دس منٹ گزر گئے اور میرے خیال میں وہ جگہ قریب آگئی جہاں یہ سرگ نکلتی تھی تو میں نے رکنے کا حکم دیا۔ ”راج کنور سرگ کا دہانہ کتنی دور ہے؟“

”بس کچھ دور ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا اسے باہر سے کھولا جاسکتا ہے؟“

”نہیں اسے صرف اندر سے کھولا جاسکتا ہے۔“ اس نے انکار کیا۔

”راج کنور بے شک سرگ تم نے بنوائی ہے لیکن بڑا کنور بھی اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔

کیا وہ باہر اپنے آدمی نہیں بھیج سکتا ہے؟“

یہ سن کر راج کنور کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ وہ بھولا ہوا تھا کہ بڑا کنور باہر کے راستے کی نگرانی بھی کروا سکتا ہے اور ادھر ہم نکلنے اور ادھر پکڑے جاتے یا مارے جاتے۔ راج کنور شاید یہ سوچے ہوئے تھا کہ اب وہ بڑے کنور کی پہنچ سے دور نکل گیا ہے۔ ”ایسا ہو سکتا ہے بلکہ ایسا ہی ہوگا۔“

”تم سمجھا سکتے ہو کہ باہر یہ راستہ کہاں نکلتا ہے؟“

”راستہ ایک چٹان میں واقع چھوٹے سے غار سے نکلتا ہے۔ غار بلندی ہے اور اس کے پیچھے ایک بلند ہوتا ہوا پہاڑ ہے۔“ راج کنور وضاحت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس معاملے میں اتنا ڈی تھا لیکن میں نے سمجھ لیا اور راپوس ہوا تھا کیونکہ جو صورت بن رہی تھی اس میں غار کا محاصرہ آسانی سے کیا جاسکتا تھا۔ اگر ہم نکلنے کی کوشش کرتے تو مارے جاتے۔ بانو اور اوشان ایک طرف تک کر بیٹھ گئی تھیں۔ یہاں کسی قدر گھٹن تھی لیکن اتنی بھی نہیں تھی کہ سانس لینا محال ہو جاتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہوا کی آمد و رفت کا انتظام تھا۔ راج کنور سے باہر کی چوہن سمجھ کر میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”تم دونوں یہیں ٹھہرو اور پیچھے سے ہوشیار رہنا۔“

”کیا اب بھی خطرہ ہے؟“

”بالکل کیس کا اثر ختم ہوتے ہی وہ دوبارہ پیچھے آئیں گے۔“ میں نے کہا۔ ہم جس جگہ رکے تھے یہاں سرگ میں موڑ تھا۔ بانو اور اوشان اس طرف چلی گئیں۔ میں نے راج کنور کو اشارہ کیا۔ ”آگے چلو اور راستہ کھولو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں وہ باہر ہوں گے مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دی اور پھر سمجھایا۔ ”ہم ساری عمر یہاں تو نہیں رہ

سکتے۔ بلکہ دو تین دن بھی نہیں گزار سکتے۔“

اس نے سوچا اور سر آہ بھر کر بولا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

راج کنور آگے بڑھا، کوئی پچاس فٹ بعد سرنگ کا آخری حصہ آگیا۔ یہاں بھی سرنگ لوہے کی سیرھیوں کے ذریعے اوپر جا رہی تھی۔ میں نے روشنی اوپر کی یہاں بھی ایسا ہی ایک فولادی دروازہ نظر آیا۔ جیسا اس سرنگ کے آغاز پر تھا۔ البتہ اس کے نیچے صرف ایک ہینڈل لگا ہوا تھا جسے گھما کر کھولا جاسکتا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہاں تالا نہیں تھا ورنہ اس جگہ تو اسے توڑنا بھی ممکن نہیں تھا۔ صرف ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا جاسکتا تھا اور ہم باہر نکل جاتے لیکن یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ باہر کون سے آفتیں ہماری منتظر ہوں گی۔ میں نے اوشا کو آواز دی وہ آئی تو اسے راج کنور کی نگرانی پر لگا کر میں خود اوپر چڑھا۔ دروازے کا ہینڈل بڑے آرام سے گھوم گیا۔ میں نے راقط کی اوپر کی اور دروازے پر دباؤ ڈالا۔ یہ اوپر کی طرف کھلتا تھا۔ یہ زیادہ وزنی بھی نہیں تھا کیونکہ کسی قدر دقت کے ساتھ اوپر اٹھ گیا۔ لائین میں نے دانت سے پکڑ لی تھی لیکن دروازہ کھلتے ہی باہر سے تیز روشنی اندر آئی۔ ایک لمحے کو میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں تھیں۔

میں نے دروازہ ذرا نیچے کیا اور جب آنکھیں روشنی کے قابل ہوئیں تو میں نے دوبارہ دروازہ اوپر کیا۔ میرا اندازہ تھا کہ بارہ بجے تھے تو سورج سر پر ہونا چاہیے تھا پھر اس کی روشنی اس غار میں کیسے آرہی تھی۔ اب تک اس طرف سے نہ تو کسی نے مداخلت کی تھی اور نہ ہی کوئی آہٹ سنائی دی تھی۔ میں آنکھوں کے بجائے کانوں پر زیادہ زور دے رہا تھا۔ کچھ پرندوں کی آوازیں ضرور سنائی دے رہی تھیں لیکن وہ دور تھیں۔ اتنی دیر گئے ہوئی سرنگ میں رہنے کے بعد باہر کی تازہ ہوا بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس میں تازگی کے ساتھ پھولوں اور نباتات کی مخصوص مہک بھی تھی۔ میں سن گرن لیتا رہا اور جب کوئی مشکوک آواز سنائی نہ دی تو میں نے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا اور راج کنور سے کہا۔ ”اوپر آؤ۔“

”نہیں۔“ وہ لرزتی آواز میں بولا تو میں نے اوشا سے کہا۔

”اوشا اگر یہ میرے باہر نکلنے تک اوپر نہ آئے تو اسے گولی مار دینا۔“

اوشا نے غالباً پستول سیدھا کیا تھا کہ راج کنور کا انکار اقرار میں بدل گیا۔ ”میں آ رہا ہوں۔“

میں نے دروازہ پورا کھول دیا اور وہ پیچھے کسی چیز سے جٹکا۔ اب وہ واپس نہیں گر سکتا تھا۔ میں ذرا اوپر ہوا تو سورج کی روشنی براہ راست اندر آنے کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ اس غار کا دہانہ اوپر کے رخ پر تھا۔ یہ اصل میں ایک پوری چٹان تھی جو شاید بارشوں سے کھوکھلی ہو گئی تھی۔ اس میں جا بجا چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ اوپر والے سوراخ کو ان لوگوں نے بڑا اور گول کر کے ہموار کر لیا تھا جب کہ نیچے کے چھوٹے سوراخ برقرار رہنے دیئے تھے۔ یہ حشرات الارض جیسے چھپکلیوں اور گرگٹوں کی پناہ گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ بارش کے پانی کی نکاسی کا کام بھی کرتے تھے۔ ورنہ بارش کا پانی سرنگ کے دروازے کے اوپر جمع ہو جاتا۔ دروازے کا اوپر ہی حصہ نہایت مہارت سے چٹان کی صورت میں تراشا گیا تھا اور اسے بند کرنے پر شہ نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی الگ سے دروازہ ہے۔

میں نے جن حشرات الارض کا ذکر کیا وہ خاصی تعداد میں یہاں موجود تھے اور میرے باہر آتے ہی وہ

افراقی میں ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ میرے ساتھ خواتین نہیں تھیں ورنہ کم سے کم بانو نے جینیں ماری تھیں۔ ایک بار اس نے واش روم میں چھپکی دیکھ کر چیخ ماری تو میں پریشان ہو گیا تھا۔ یہاں تو چیخ مارنے کے بہت سے اسباب تھے اور فی الحال آواز نکالنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے ان سے بچ کر اوپر جاتے ہوئے راج کنور کو باہر آنے کو کہا۔ یہاں سیڑھیوں جیسے اسٹیپ بنا دیئے تھے۔ اس لیے کوئی مشکل نہیں ہو رہی تھی۔ ورنہ سیدھی ڈھلان پتھر آدی پھسل کر واپس آ جاتا۔ ہانپتا کھانپتا راج کنور اوپر آ گیا۔ میں نے آس پاس دیکھا اور ایک تقریباً انسانی سر کے سائز کا پتھر اٹھا کر اسے دہانے سے ذرا اوپر کیا اور فوراً نیچے کر لیا۔ اگر کوئی دور سے مگرانی کر رہا ہوا تو اسے گلے گا جیسے کسی نے باہر سر کیا اور پھر اندر کر لیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”دیکھ رہا ہوں باہر کوئی مگرانی کر رہا ہے یا نہیں۔“

”وہ ہوں گے۔“ راج کنور نے یقین سے کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا کہ بڑا کنور اس جگہ کو خالی چھوڑ دے۔“
دو تین بار پتھر نکالنے کے بعد میں نے اپنے ذاتی سر کا خطرہ مول لیا اور اسی طرح ایک ایک لمحے کے لیے سر اٹھا کر باہر کا جائزہ لیتا رہا۔ چند بار کی جھلک سے ایک تصویر سامنے آئی۔ چٹان کے سامنے ڈھلان کا مشرقی حصہ تھا۔ اس کے پیچھے شمال میں پہاڑ بلند ہو رہا تھا۔ دہانے سے مشرق اور جنوب کا صاف دکھائی دے رہا تھا اور یہاں چھوٹے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ بڑے درخت کسی زمانے میں ہوتے تھے لیکن اب کاٹ دیئے گئے تھے اور ان کے بڑے سائز کے تنے بچے ہوئے تھے جن میں سے بعض سے دوبارہ شاخیں پھوٹ آئی تھیں۔ جا بجا بڑے سائز کے پتھر پڑے تھے اور جہاں مٹی تھی وہاں لازمی سبزہ تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی نقل و حرکت محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن اس سے یہ سمجھ لینا بے وقوفی تھی کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے راج کنور سے کہا۔ ”ان لوگوں کو اوپر بلاؤ۔“

وہ واپس گیا اور اس نے اوشانک میرا پیغام پہنچایا۔ پہلے اوشا اوپر آئی اور اس نے واجبی سی ڈری ڈری آواز نکالی لیکن بانو کی اوپر آتے ہی گھگی بندھ گئی تھی۔ یہی غنیمت تھا کہ اس نے آسمان سر پر نہیں اٹھا لیا۔ البتہ وہ تقریباً دہانے تک چلی آئی اگر میں اسے نہ روکتا تو وہ شاید باہر بھی نکل جاتی۔ ”اتنی جلدی کیا ہے بی بی ابھی کوئی گولی مار دے گا۔“

”پلیز چلیں یہاں سے۔“ اس نے دہشت زدہ نظروں سے چھپکیوں اور گرگٹوں کو دیکھا۔ ”یہاں میرا دم نکل جائے گا۔“

”میرا خیال ہے اور راج کنور کو یقین ہے کہ باہر بڑے کنور کے آدی ہیں اب بتاؤ وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔“

اس سوال پر بانو ذرا سکون میں آئی تھی۔ چھپکیاں اور گرگٹ بہر حال جان لیوا نہیں تھے لیکن باہر جو دشمن تھے وہ جان لے لیتے۔ میں نے راج کنور کو حکم دیا کہ وہ سرنگ کا دروازہ بند کر کے اس پر بیٹھ جائے تاکہ کوئی نیچے سے کھولنے کی کوشش کرے تو کامیاب نہ ہو۔ بانو نے کہا۔ ”ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔“
مجھے تعجب ہونے لگا۔ مٹی جی اینڈ کمپنی کی طرف سے اتنی خاموشی تعجب انگیز تھی۔ میں نے ذرا خطرہ مول

لے کر دہانے سے تھوڑا نکل کر باہر کا جائزہ لیا اور اس بار بھی کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ یہ چکر سمجھ سے بالاتر تھا۔ مٹی جی اینڈ کمپنی کہاں تو ہماری جان کی دشمن تھی اور کہاں انہوں نے ہمیں آزادی سے نکلنے کا پروانہ عطا کر دیا تھا۔ بانو نے ایک نسبتاً محفوظ گوشہ دریافت کر لیا تھا اور وہاں دبی ہوئی تھی اس کی ساری بہادری ہوا ہو گئی تھی۔ البتہ اوشا نے اپنے ابتدائی خوف پر قابو پایا اور دلچسپی سے ان آس پاس دیکھ رہی تھی۔ ایک گرگٹ نے ذرا بے تکلفی دکھائی اور اس کے ہاتھ کے پاس آیا تو اوشا نے اسے اٹھا کر باہر اچھال دیا تھا۔ اس پر بھی بانو نے ہلکی سی ڈری آواز نکالی۔

”تمہیں کیا ہے؟“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”یہ تمہیں کھانسیں جائیں گے۔“

”مجھے بچپن سے ان سے ڈر لگتا ہے۔“ بانو رو ہنسی ہو گئی۔

”اب تم بچی نہیں ہو بڑی ہو گئی ہو۔ دل مضبوط کرو۔“ اس بار میں نے لہجہ نرم رکھا تھا۔

بانو خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے کہا۔ ”آپ نے کیا سوچا ہے ہم زیادہ دیر یہاں نہیں بیٹھ سکتے ہیں۔“

”میں نے سوچ لیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پہلے میں باہر جاؤں گا۔ کسی جگہ پوزیشن لے کر جائزہ لوں گا اور

اس کے بعد تم لوگوں کو بلاؤں گا۔ جیسے میں کہوں ویسا ہی کرنا۔“

بانو نے سر ہلایا۔ ”راج کنور کا کیا کرنا ہے؟“

”اس کا ابھی سوچا نہیں ہے۔“ میں نے اسے ٹال دیا۔ ”یہاں ہوشیار رہنا۔“

میں نے شاٹ گن اب شانے پر ٹانگ لی اس کی نال ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ رائفل کا بیٹ بغل میں دبا کر میں دہانے سے نکلا اور چٹان سے نیچے اترتے ہوئے نزدیک ایک درخت کے کٹے تنے کے ساتھ دبک گیا۔ میں شمالی ڈھلان اور مغرب کا بھی جائزہ لیتا چاہتا تھا۔ سورج سر پر ہونے سے یہ فائدہ تھا کہ یہ پوری جگہ بالکل واضح دکھائی دے رہی تھی اور حیران کن طور پر جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تو کیا مٹی جی نے اس طرف کسی کو بھیجا ہی نہیں تھا؟ پوزیشن بدل کر میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ چند منٹ بعد مجھے یقین آ گیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا میں نے بانو کو آواز دی۔ ”اوشا کو یہاں بھیج دو۔“

”میں آ جاؤں؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نے کیا کہا ہے۔“ میرا لہجہ سخت ہو گیا تو بادل نا خواستہ بانو نے اوشا کو باہر بھیج دیا۔ وہ مشکل سے نیچے آئی کیونکہ اس نے پاؤں میں گرگڑا جیسی چیز پہنی ہوئی تھی۔ بانو کے پاؤں میں کینوس شوز تھے اور اس لحاظ سے وہ بہتر پوزیشن میں تھی۔ اوشا کو ان پہاڑوں پر چلنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں نے اوشا کو ایک طرف جانے کا اشارہ کیا اور کہا۔ ”نیچے دیکھتی رہو جیسے ہی کوئی حرکت محسوس ہو یا کوئی نظر آئے تو مجھے خبردار کرنا۔“

اوشا ایک جھاڑی کے ساتھ دبک گئی۔ میں نے راج کنور کو آواز دی۔ ”تم چٹان پر چڑھو اور آس پاس دیکھو۔“

”میں زخمی ہوں۔“ اس نے عذر پیش کیا۔ ”اوپر نہیں چڑھ سکتا۔“

میری طرف سے کسی ردِ عمل سے پہلے بانو نے اسے سبق سکھایا۔ اس کے چلانے کی آواز آئی تھی۔ بانو نے

کہا۔ ”اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ جو کہا جائے اس پر فوراً عمل کرو تاخیر تمہاری صحت کے لیے نقصان دہ ہے تم جاتے ہو یا.....“

راج کنور کراہتا ہوا نمودار ہوا اور اوپر چڑھنے لگا۔ وہ نیچے پاؤں تھا اسے کچھ پہننے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی اور ہمیں بھی خیال نہیں آیا تھا کہ راج کنور کو جوتے یا کوئی چپل پہننے کو کہہ دیتے۔ وہ ڈر کے مارے دیوار سے چمنا ہوا تھا۔ مشکل سے سر اٹھا کر اس پاس دیکھ رہا تھا میں نے دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہا لیکن یہ اس کی فطرت تھی وہ بزدل تھا اور زندہ رہنا چاہتا تھا اس لیے موت سے ڈر رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ چٹان پر چڑھ گیا اور اس نے لیٹ کر اس پاس دیکھنا شروع کیا۔ اوشا نیچے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہلکی سی آواز میں کہا۔ ”شہباز..... ادھر دیکھ رہے۔“

اوشا ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے نیچے دیکھا دور چند افراد حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ وہ اتنی دور تھے کہ ان کی ساخت بھی واضح نہیں ہو رہی تھی بس ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کنور پیلس کے گارڈز کی مخصوص خاک کی رنگ کی وردی پہنی ہو۔ اب وقت نہیں تھا میں نے بانو کو آواز دی اور راج کنور کو بھی نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ نیچے اتر آیا۔ بانو بھی دہانے سے نکل کر آگئی تھی اور کسی قدر خفا نظر آرہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی جان سب سے زیادہ نکل رہی تھی اور میں نے اسے آخر تک غار میں روکے رکھا۔ راج کنور کی حالت بری تھی زخم درد کر رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ میں نے نیچے کی طرف اشارہ کیا۔ ”شاید یہ پیلس کے گارڈز ہیں ان کے آنے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

راج کنور نے غور سے نیچے کی طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ ”یہ پیلس کے گارڈز ہی ہیں۔ ان کی شرٹ پر چمک دار دھاتی ٹن ہوتے ہیں دیکھو دھوپ پڑنے سے یہ ٹن چمک رہے ہیں۔“

وہ درست کہہ رہا تھا واقعی آنے والے افراد کے لباس سے وہ رہ چمک اٹھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”سب اوپر کی طرف چلیں۔ بانو تم آگے ہو گی اور اوشا تم سے پیچھے ہو گی۔ راج کنور میرے آگے چلو گے۔“

ہم اسی ترتیب سے اوپر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر میں ہم چٹان سے آگے نکل گئے تھے۔ میں اب تک حیران تھا کہ منشی جی نے اپنے آدمی یہاں کیوں نہیں بھیجے تھے۔ اس کی اب تک ایک ہی وجہ میرے ذہن میں آئی تھی کہ یہ بڑے کنور کا کام نہیں تھا۔ وہ شاید اپنے کمرے میں تھا ویسے بھی اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے کمرے سے باہر زیادہ دیر نہ سکے۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنی آرام کرسی پر بیٹھے ہی دیکھا تھا۔ منشی جی اپنی مرضی چلا رہے تھے اور اسی وجہ سے اس نے معاملے میں بس اپنے چند اعتماد یافتہ افراد کو شامل کیا ہو گا اور وہ پیلس کے بانی گارڈز سے کام نہیں لے سکا ہو گا۔ شاید اس لیے اس کے پاس اتنے لوگ نہیں تھے کہ وہ یہاں کا محاصرہ بھی کروا سکتا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس حوالے سے جھوٹ بول رہا تھا۔ یقیناً کنور پیلس میں شدید قسم کی کھجڑی پک رہی تھی اور میں اس سے بالکل بے خبر تھا۔ راج کنور یقیناً مجھ سے زیادہ جانتا تھا لیکن اس حالت میں بھی میں اس سے توقع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھے پیلس کے اندرونی معاملات کے بارے میں بتائے گا۔

بہر حال جو بھی تھا اس وقت میرے حق میں رہا تھا۔ اگر بڑا کنور ٹیک اور نہ کرتا یا دوسرے لفظوں میں منشی جی اور رامن اس کے حق میں نہ ہو جاتے تو مجھے راج کنور کی مدد سے وہاں سے نکلنا پڑتا اور یہ آسان نہیں تھا۔

پیس کے تمام گاڑز سے نمٹنا ناممکن تھا اور ہمارے پیس سے نکلنے ہی معاملہ قانون کے ہاتھ میں جاسکتا تھا۔ جس کے بعد میرے اٹریا میں ایک مصیبت اور کھڑی ہو جاتی۔ مگر ملازموں کی سازشوں کی وجہ سے وہ لوگ پوری طرح حرکت میں نہیں آسکتے تھے۔ ممکن ہے بعد میں بڑے کنور کو پتا چلا ہو کہ میں راج کنور کو لے کر نکل گیا ہوں اور پھر اس نے آدی بیجے ہوں۔ نیچے آنے والے بڑے کنور کے بیجے لوگ تھے۔ سرگم والے راستے سے ابھی تک کوئی نہیں نکلا تھا۔ شاید چند افراد کے مرنے کے بعد وہ خوفزدہ ہو گئے تھے اور ابھی تک اس طرف سے نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سب برے لیے قدرت کی طرف سے آسانیاں تھیں۔

جب ہم پیس والوں کی پہنچ سے دور نکل جاتے تو اس کے بعد سوچا جاتا کہ اب پاکستان کی طرف کیسے نکلا جائے۔ میرے اور بانو کے لیے پہاڑی راستوں پر چلنے آسان ہو رہا تھا کیونکہ ہم دونوں نے کریپ سول والے کیفوس شوز پہن رکھے تھے۔ اگرچہ یہ بھی پہاڑوں پر چلنے کے لحاظ سے مثالی نہیں تھے جیسے جو گرز ہوتے ہیں لیکن برے بھی نہیں تھے۔ اوشا مشکل سے چل رہی تھی۔ اس کی نازک گرگابی پیس کے ٹھنڈے قالینوں اور چکنے فرشوں پر چلنے کے لیے تھی اس کھردرے پتھر لیے راستے پر یہ بے کار تھی۔ سب سے زیادہ مشکل میں راج کنور تھا۔ ننگے پاؤں اور پسلیوں کے زخم کے ساتھ اس کے یہاں چلنا بہت دشوار ہو رہا تھا۔ پھر اس کے پیروں میں لگ رہے تھے اور وہ یقیناً ایسی مشکوں کا عادی نہیں تھا اس لیے جب کوئی پتھر چبھتا تو بے ساختہ کراہ اٹھتا تھا۔ ہم تقریباً ایک کلومیٹر دور آئے ہوں گے کہ وہ ایک پتھر پر ٹک کر تھکے ہوئے گدھے کی طرح ہاپنے لگا۔ میں نے اسے گھورا۔

”رک کیوں گئے ہو چلنے ہو ہم زیادہ دور نہیں آئے ہیں۔“

”مجھ سے نہیں چلا جا رہا ہے یہ دیکھو میرے پیروں کا حال۔“ اس نے پاؤں اوپر کیے اس کے نکلوں پر جگہ جگہ کٹ لگے ہوئے تھے اور خون کی سرخی جھلک رہی تھی۔ واقعی حالت بری تھی۔

”ٹھیک ہے لیکن ہم رک نہیں سکتے ہیں تم جانے ہو موت کے ہر کارے پیچھے ہیں اگر انہوں نے آیا تو ہم شاید بچ سکیں لیکن تم مارے جاؤ گے اس لیے ہمت کرو اور چلتے رہو۔“

مجبوراً وہ پھر چلنے کے لیے آمادہ ہوا تھا۔ ہمہ وقت نفیس لباس اور بہترین چلیے میں رہنے والے راج کنور کا حلیہ ابتر تھا۔ اس نے سلک جیسے کپڑے کی شرٹ پہنی تھی جس کی دونوں آستینیں غائب ہو چکی تھیں اور نیچے نرم سوتی پاجامہ تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور جسم گرد آلود ہو رہا تھا۔ نیلگوں رنگ کی شرٹ پر خون کی سرخی بھی لگی ہوئی تھی۔ اوشا بھی ایسی مشقت کی عادی نہیں تھی۔ وہ ہانپ رہی تھی مگر پوری استقامت سے ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے اس دوران میں ایک بار بھی رکنے کے لیے نہیں کہا اور نہ راستے کی شکایت کی۔ وہ بھی سمجھتی تھی کہ ہمارا جلد از جلد دور نکل جانا بہتر تھا۔ میں اور بانو بہتر پوزیشن میں تھے صرف لباس اور جوتوں کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ ہم کہیں زیادہ فٹ بھی تھے۔ اسی لیے اس دشوار ترین راستے پر ایک کلومیٹر کی تیز واک کے بعد بھی ہمارے سانس ہموار تھے۔ دوسرے کلومیٹر کے بعد راج کنور پھر بیٹھ گیا۔ وہ ہانپتے ہوئے رک رک کر بولا۔

”اب..... مجھ سے..... نہیں چلا جا..... رہا۔“

یہاں پانی کی بوتل میں نے لے لی تھی کیونکہ اوشا اس کے وزن کے ساتھ اور مشکل میں پڑ جاتی۔ شاٹ گن بانو کو دے دی تھی۔ میں نے پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ ”پانی پو اور کچھ دیر آرام کرو۔“

پانی پی کر اس نے اپنے ہر دیکھے جن کے زخم مزید بڑھ گئے تھے اور کچھ سے تو باقاعدہ خون رس رہا تھا اس نے مایوسی سے کہا۔ ”میں مزید نہیں چل سکوں گا۔“

میں اس کی بات پر دھیان دیئے بغیر ایک بلند چٹان پر چڑھا اور نیچے دیکھا۔ یہاں بلند اور کٹی فٹ قطر تنوں والے درخت تھے جو منظر کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ نیچے لینڈ اسکیپ کھل رہی تھی اور اس میں کسی چھوٹی حرکت کرتی چیز کو تلاش کرنا دشوار کام تھا۔ میں نظر جما کر دیکھتا رہا اور کچھ دیر بعد مجھے دائیں طرف ڈھلان پر جہاں سرگرم والی چٹان تھی کچھ حرکت کا احساس ہوا۔ یہاں کچھ لوگ حرکت کر رہے تھے لیکن وہ پہلے سے زیادہ دور تھے اس لیے یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ کس طرف جا رہے تھے۔ یہ بات حوصلہ افزا تھی کہ ہم ان سے خاصی دور نکل آئے تھے لیکن ابھی خطرے سے دور بھی نہیں تھے۔ ان کو یہ اندازہ کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی کہ ہم کس طرف گئے تھے اور پھر وہ اسی طرف کا رخ کرتے۔ یہ بہت بلند پہاڑ تھا اور اس پر آخری حصے میں برف بھی دکھائی دے رہی تھی۔ حالانکہ یہ مٹی کا وسط تھا شاید سولہ یا سترہ تاریخ تھی۔ میں نیچے آیا۔

”بس اب چلو وہ لوگ سرگرم والی چٹان تک آگئے ہیں اور اب یقیناً اس طرف آئیں گے۔“

”میں نہیں چل سکتا۔“ راج کنور نے نفی میں سر ہلایا۔

”اس صورت میں، ہمیں تمہاری لاش چھوڑ کر جانا پسند کروں گا۔“ میں نے رائفل کا رخ اس کی طرف کر

دیا۔

”تم مجھے گولی مارو گے۔“ راج کنور مسکرانے لگا۔ ”فائر کی آواز ان تک جائے گی اور انہیں پتا چل جائے گا کہ تم کہاں ہو؟“

”ان کا باپ بھی پتا نہیں چلا سکتا تم پہاڑوں کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتے ہو یہاں آواز اس طرح گونجتی ہے کہ سمت کا پتا نہیں چلتا اور دوسرے میں تمہاری گردن بھی توڑ سکتا ہوں اس میں بس اتنی آواز آئے گی کہ تمہارے کان ہی سن سکیں گے۔ بولو اب کیا کہتے ہو؟“

”تم میرے زخم دیکھ رہے ہو۔“ وہ دوبارہ عاجزی پر اتر آیا۔ ”ان کے ساتھ میں زیادہ دور تک نہیں چل سکتا ہوں۔“

”ان زخموں کے ساتھ زندہ رہنا یقیناً بہتر ہے بہ نسبت اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھ مارے جانے میں۔ تمہارے پاس ایک منٹ ہے فیصلہ کرنے کے لیے۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں دشمنی کرنے کے لیے زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔“

”تب تم مجھے بعد میں بھی نہیں چھوڑو گے۔“

”اگر میں اس جگہ سے بحفاظت نکل گیا اور پاکستان پہنچنے کی راہ نظر آئی تو میں تمہیں رہا کر دوں گا۔ اس وقت چھوڑوں گا تو تم میری راہ میں ہر ممکن رکاوٹ کھڑی کرو گے۔“

”میں وعدہ کرتا.....“ اس نے جلدی سے کہنا چاہا۔

”وقت پورا ہو گیا ہے۔“ میں نے رائفل اوشاکو پکڑا دی اور اس کی طرف بڑھا۔ میرے عزائم میری صورت پر نظر آرہے تھے اس لیے وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے میں چل رہا ہوں۔“

”جسہیں اگر گھٹ کر چلنا پڑے تب بھی تم چلو گے اور اب اسی وقت انکار کرنا جب تم مرنے کا فیصلہ کر چکے ہو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”شاید تم میرے نرم رویے سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو۔ تم صرف میری مجبوری ہو۔“

راج کنور آگے بڑھا تو میں نے اوشا سے رائل لے لی وہ سہی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ”باپ رے..... ٹو اس طرح بھی بات کر سکتا ہے رے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”میرے ساتھ رہو گی تو اور بھی بہت کچھ جان لو گی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”تیرے ساتھ ہی تو رہنا چاہتے ہیں۔“ وہ بولی اور آگے بڑھ گئی۔ بانو زادہ تھی لیکن سن رہی تھی۔ اوشا کے آگے جانے پر وہ میرے پاس آئی۔

”یہ آپ سے کچھ زیادہ ہی فری نہیں ہو رہی ہے۔“ اس نے احتیاطاً انگریزی میں کہا۔

”ہو تو رہی ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”بعد میں آپ کے لیے مشکل نہ بن جائے۔“

”بی بی آسان حالات اور انسان تو عرصہ ہوا مجھے نہیں ملے ہیں اسے بھی بھگت لوں گا۔“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ بانو سمجھ گئی کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا اس لیے اس نے موضوع بدل دیا۔

”شہباز صاحب، ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔ آپ نے محسوس کیا ہے کہ اس بلندی پر دن کے وقت تیز دھوپ میں بھی سردی لگ رہی ہے۔ رات کو یہاں درجہ حرارت بہت کم ہو جائے گا اور ہم میں سے کوئی سردی سے بچاؤ کا سامان نہیں رکھتا ہے۔“

”یہ تو ہے۔“

”دوسرے ہمیں بالآخر نیچے کا رخ کرنا ہو گا اس لیے جتنا بلندی کی طرف جائیں گے اتنا دور ہوتے جائیں گے۔“

”تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”میرا تو خیال ہے ڈھلان کے متوازی سفر کرنا چاہیے۔“ اس نے مشورہ دیا جو معقول بھی تھا اس لیے میں نے قبول کرتے ہوئے فوری رخ بدل لیا۔ بانو خوش ہو گئی اس نے اوشا کو آواز دی اور اسے بتایا کہ اب ہم نے مغرب کی طرف سفر کرنا تھا۔ راج کنور سن رہا تھا اور شاید اس نے بی سب سے بڑا سکون کا سانس لیا تھا کیونکہ گولی کے زخم اور زخمی پیروں کے ساتھ اوپر چڑھنا اس کے لیے عذاب تھا۔ اب متوازی سفر کی صورت میں مشکل اتنی زیادہ نہیں تھی۔ سورج بلندی سے ہو کر کسی قدر مغرب کی طرف جھک گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا ڈیڑھ سے دو بجے تک کا وقت تھا۔ ہم سب نے صبح ناشتے میں پھل کھائے تھے اور وہ کب کے ختم ہو چکے تھے۔ پھر اس پہاڑی سفر نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ جب میرے پیٹ میں چوہا ریس جاری تھی تو یقیناً باقی سب کا بھی یہی حال تھا۔ مگر ان پہاڑوں میں ہمارے کھانے کا کوئی سامان نظر نہیں آ رہا تھا۔ بعض مقامات پر اسٹریپری کے پودے دکھائی دیے تھے لیکن ان پر پھول تھے اور ابھی اسٹریپری نہیں آئی تھی۔ بلندی پر پھل ہمیشہ دیر سے پکتا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم رک گئے۔ اب پیچھے کوئی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لوگ بہت پیچھے رہ گئے تھے اور شاید وہ ہمارے فرار کی سمت کا تعین بھی نہیں کر سکے تھے۔ ابتدائی مشکلات کے بعد ہم جتنی آسانی سے نکل آئے تھے اس سے مجھے ایک دوبار شبہ بھی ہوا کہ کہیں اس میں کوئی چکر تو نہیں ہے۔ مگر ہم آزاد تھے اور راج کنور ہمارا قیدی تھا اس لیے میں نے اس شبہ کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ راج کنور کی حالت مزید ابتر ہو گئی تھی۔ اس کے ہیروں تلے چھالے بن کر پھوٹ رہے تھے۔ وہ زمین پر پاؤں رکھتا تو کراہتا تھا اگر اسے جان کا خوف نہ ہوتا تو شاید ساری دنیا کی دولت کے بدلے بھی وہ اس وقت سفر پر آمادہ نہ ہوتا۔ میں نے افسوس سے کہا۔ ”اگر تم نے خود پر ڈر ابھی سختی کی ہوتی تو تمہیں اتنی مشکل نہ ہوتی۔“

اس نے ہنسا کر کہا۔ ”مجھے کیا معلوم تھا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا۔“

یہاں نزدیک ہی جھاڑی لگی تھی جس کے پتے بڑے اور دبیز تھے۔ راج کنور نے پتے توڑے اور ان کو ہیروں پر لیٹا۔ پھر اس نے درختوں سے لٹکتے بال لے کر ان کو دھاکے کی جگہ استعمال کیا اور کسی قدر کوشش کے بعد اپنے لیے خود ساختہ جوتے بنانے میں کامیاب رہا۔ میں نے اسے مشورہ دیا۔ ”یہ جوتے زیادہ دیر نہیں چلیں گے اس لیے ان کا مزید سامان ساتھ لے لو۔“

اس نے ایسا ہی کیا۔ دس منٹ آرام کے بعد ہم دوبارہ چل پڑے۔ میں نے راج کنور سے پوچھا۔ ”تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہم کس سمت جا رہے ہیں اور آگے کیا طے گا؟“

”پیچھے تو کچھ نہیں ہے کسی زمانے میں قبائلیوں کی بستیاں ہوتی تھیں لیکن اب کچھ نہیں ہے۔ ہم نے یہاں جانور چرانے والوں پر بھی پابندی لگا دی۔“

”ہیروں کی کان کی وجہ سے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ابھی وہاں کام شروع نہیں ہوا ہے سال کے چار مہینے کام ہوتا ہے اس دوران میں موسم بہتر رہتا ہے اس کے بعد کام روک دیا جاتا ہے۔“

مجھے ہیروں سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے اسے ٹوک دیا۔ ”میں نے پوچھا ہے آگے کیا طے گا؟“

راج کنور نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے کچھ دیر بعد ہمیں ایک سڑک ملے گی۔ یہ شمال سے آتی ہے اور اسٹیٹ کے پاس یہی سڑک ہے ہمیں جب شہروں کی طرف جانا ہوتا ہے تو اسی سے سفر کرتے ہیں۔“

”اس علاقے میں یہ ایک ہی سڑک ہے؟“

”نہیں سڑکیں تو اور بھی ہیں لیکن وہ پورے سال سفر کے قابل نہیں رہتی ہیں اور ان کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے ہائی وے کلاس کی یہ واحد سڑک ہے۔“

”اس کا مطلب ہے اس پر ٹریفک رہتا ہے۔“

”صرف بہت زیادہ برف باری کی صورت میں ٹریفک بند ہوتا ہے اور یہاں بہت زیادہ برف سال میں ایک دو بار ہی گرتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہاں ٹریفک چل رہا ہوگا۔“

”بالکل۔“

”تب چلو، رات سے پہلے ہم سڑک تک پہنچ گئے تو وہاں سے لفٹ مل سکتی ہے۔“

”اس اسٹے کے ساتھ کوئی لفٹ نہیں دے گا۔“ راج کنور نے ہمارے ہتھیاروں کی طرف اشارہ کیا۔

”فکرمات کرو ہمیں لفٹ لینا آتی ہے۔“ میں نے کہا اور ہم آگے روانہ ہو گئے۔ اوشاب بانو کے ساتھ

چل رہی تھی اور راج کنور میرے ساتھ تھا۔ بعض مقامات پر بانو اوشا کو اور مجھے راج کنور کو سہارا دینا پڑتا تھا اگرچہ یہ مجھے ناگوار گزرتا تھا۔ راج کنور ان چند افراد میں سے ایک تھا جن سے میں شدید نفرت کرتا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اس کے چنگل سے نکلنے کا موقع ملا اور وہ میرے قابو میں ہوا تو اسے قتل کر دوں گا۔ وہ ایسا زہریلا ناگ تھا جس کا پھن پہلی فرصت میں کچل دینا ہی مناسب تھا ورنہ وہ آزاد ہوتے ہی آپ کو دوبارہ ڈسنے کی سعی کرے گا۔ ایسے فرد کو قیدی کی حیثیت سے بھی ساتھ رکھنا میرے لیے مبر آتا تھا میں اپنی فطرت کے مطابق اس سے برا سلوک نہیں کر سکتا اور ایک ہی وار میں اسے ختم کرنے کی شدید خواہش پر عمل بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ جب تک اس کا وقت نہیں آ جاتا اسے میں یا کوئی بھی ختم نہیں کر سکتا تھا۔

بلندی پر دھوپ تیز تھی اگرچہ موسم خشک تھا مگر ساتھ ہی خشک بھی تھا اور چلنے سے جسم کا پانی پسینے کی صورت میں خارج ہو رہا تھا اس لیے سب کو بار بار پیاس لگ رہی تھی۔ آنے والے ایک گھنٹے میں پانچ لیٹرز پانی کی بوتل میں مشکل سے ایک لیٹر پانی بچا تھا۔ اب تک ہمیں پانی کا کوئی چشمہ یا ندی دکھائی نہیں دی تھی جہاں سے پانی لے سکتے اور کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مبر کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ابھی تک وہ سڑک نہیں آئی تھی جس کا راج کنور نے ذکر کیا تھا اور نہ ہی اس کے آثار دکھائی دیے تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اب ہم بلندی سے شیب کی طرف جا رہے تھے حالانکہ ہم نے نیچے کا رخ نہیں کیا تھا مگر یہاں پہاڑ کی بلندی کم ہو رہی تھی۔ میں نے ایک دو بار راج کنور سے سڑک کے بارے میں پوچھا تو وہ خود کنفیوز ہو گیا۔ ظاہر ہے اس نے کبھی ان راستوں پر سفر کر کے سڑک تک رسائی حاصل نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ مجھ سے متا نہیں سکتا تھا۔ البتہ اسے یقین تھا کہ سڑک اسی سمت تھی۔

مزید ایک گھنٹے بعد جب سورج واضح طور پر مغرب کی طرف جھک چکا تھا اور اس کی روشنی آنکھوں میں کھس رہی تھی۔ اس لیے ابھی شاید سڑک اس وقت نظر آئی جب ہم اس کے پاس پہنچ گئے تھے بلکہ سڑک نہیں اس پر سے گزرنے والا ایک ٹرک دکھائی دیا تھا جس پر خشک بھوسہ بھرا ہوا تھا لیکن وہ شمال کی طرف جا رہا تھا۔ بانو اور اوشا خوش ہو گئی تھیں کیونکہ بھوک کافی الحال کوئی مدد انہیں تھا لیکن چل چل کر بھی برا حال ہو گیا تھا اور اس سے نجات ملنے کی امید نظر آئی تو وہ خوش ہو رہی تھیں۔ راج کنور دوسرے تپاچے ”جوتے“ تبدیل کر چکا تھا اور دونوں بار جوتے پھٹ چکے تھے دوسرے جوتے بھی سڑک تک پہنچنے پہنچتے جواب دے گئے۔ اس لیے وہ بھی خوش تھا کہ اب چلنے کے لیے کم سے کم ہموار سڑک تو ملے گی۔ سڑک کے پاس پہنچ کر سب ایک جگہ نرم سبز گھاس پر ڈھیر ہو گئے۔ میں اور بانو بھی تھک گئے تھے مگر اوشا اور راج کنور بے حال تھے وہ لیٹے تو جیسے نیم بے ہوش ہو گئے تھے۔ میں بیٹھا تھا اور بانو نیم دراز تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا حال ہیں؟“

”بھوک لگی ہے اور دل چاہ رہا ہے اچھا سا کھانا ملے اور اس کے بعد نرم بستری مل جائے۔“

”دونوں کا امکان کم ہے۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اگر تم جاگتے رہنے کا وعدہ کرو تو میں ذرا پھر لگاؤں۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”اسی سڑک پر ذرا آگے تک جاؤں گا ممکن ہے کوئی گاڑی مل جائے یا پھر کوئی گھر نظر آجائے۔ شام قریب ہے اور رات سے پہلے سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ مل جائے تو بہتر ہوگا۔“

”ہاں کوئی آبادی یا گھر مل جائے تو وہاں سے کھانا بھی مل جائے گا۔ ہمارے پاس رقم بھی ہے۔“ بانو خوش ہوئی۔

”رقم تو اتنی ہے کہ ہم فائدہ اٹھا کر کھانا بھی افرڈ کر سکتے ہیں لیکن فی الحال کھانے کے لائق کچھ مناسب مل جائے تو یہ بھی غنیمت ہوگا۔“ میں نے روانہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہوشیار رہنا اور بہتر ہو گا کنارے سے ذرا ہٹ جاؤ تا کہ کوئی اچانک آجائے تو پکڑے نہ جاؤ۔ اگر کوئی مسئلہ ہوتا تو چھوٹے پستول سے فائر کرنا اس کی آواز زیادہ دور تک نہیں جاتی ہے لیکن میں سن لوں گا ہاں پتیل کے لوگ آجائیں تو کوئی رعایت مت کرنا۔“

”ٹھیک ہے۔“

میں جنوب کی طرف بڑھا تھا۔ یہاں مل کھاتی سڑک ایک ٹیلے کے پیچھے غائب ہو رہی تھی۔ میں موڑ تک پہنچا تو سامنے دو رنگ پھاڑوں کے درمیان خشیب کی طرف جاتی سڑک دکھائی دی۔ یہاں ڈھلان تھی اور کہیں بھی آبادی کے آثار نظر نہیں آ رہی تھے۔ سڑک بھی خالی تھی یعنی دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں شخصی سانس لے کر رہ گیا اس کا مطلب تھا کہ ہمیں مزید مارچ کرنا تھا اور فی الحال مارچ کی ہمت مجھ سمیت کسی میں نہیں تھا۔ آگے جاتا رہے گا رہا میں تین چار کلومیٹر زچل کر جاتا اور کچھ نہ ملتا تو اتنا ہی واپس آتا پڑتا اس لیے ہجرت بھی تھا کہ واپس چلا جائے اور سڑک کے کنارے کسی گاڑی کا انتظار کیا جائے اگر قسمت میں ہو تو گاڑی مل جائے گی ورنہ رات شاید اسی ویرانے میں بھوکے پیاسے بسر کرنی پڑے گی۔ پیاسے یوں کہ اب پانی بھی ختم ہونے والا تھا اور ان پھاڑوں میں اب تک پانی کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا تھا حالانکہ ہم شاید دس بارہ کلومیٹر ڈھلے تھے کئی خشک ندی نالوں سے گزرے۔ ابھی اوپر کہیں بارش نہیں ہوئی تھی اس لیے پانی نایاب تھا۔

میں واپس آ رہا تھا کہ شمال کی طرف سے ایک بڑی گاڑی نمودار ہوئی۔ پہلے میں اسے درمیانے سائز کا ٹرک سمجھا تھا۔ اس وقت ہمارے لیے کوئی چھٹڑا بھی آجاتا تو غنیمت تھا یہ تو پھر بھی مشینی سواری تھی۔ وہ خاصی دور تھی اور بہت سست روی سے آ رہی تھی۔ اس لیے مجھے تیز چلنے کی وجہ سے اس کی آمد سے پہلے واپس ہٹنے کا موقع مل گیا۔ بانو نے اس دور میں راج کھور اور اوشا کو سڑک کے کنارے سے ذرا دور ہٹا لیا تھا۔ اس نے بھی آنے والی گاڑی کو دیکھ لیا تھا اور انکھوں کے سامنے چھبایا کر غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اسلحا ایسی جگہ چھپا دیا جہاں سے وہ خود فوری حاصل کر سکتی تھی لیکن راج کھور سے دور تھا ویسے بھی اوشا اس کی نگرانی کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔ ”شبیاز صاحب ذرا دیکھئے گا یہ انوکھی گاڑی نہیں ہے عام گاڑیوں سے ہٹ کر۔“

گاڑی کا انوکھا پن اس کے نزدیک آنے پر واضح ہوا تھا۔ یہ اصل میں سفری گھر تھا۔ طاقتور ڈائجٹک آپ کے پیچھے تقریباً بارہ فٹ لمبا اور کوئی آٹھ فٹ چوڑا سفری گھر تھا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے گاڑی خاصی لمبی اور

وزنی ہو گئی تھی اس لیے وہ اس پہاڑی سڑک پر بہت سست روی سے سفر کر رہی تھی۔ یہاں تیز رفتاری کی وجہ سے یہ بے قابو ہو سکتی تھی۔ بانو اور میں نے اپنے ہتھیار چھپا دیئے اور صرف پستول پاس رکھے تھے اوشا کا اعشاریہ اڑتیس کا پستول اب میرے پاس تھا۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”ویسے تو امکان نہیں ہے کہ اس گاڑی میں دشمن ہوں گے لیکن پھر بھی پوری طرح ہوشیار رہنا خطرہ محسوس کرتے ہی راکفل اور شاٹ گن اٹھانے کی کوشش کرتا۔“

گاڑی کے نزدیک آنے سے پہلے ہم سڑک پر آگئے تھے اگر ہم اچانک سڑک پر نمودار ہوتے تو شاید گاڑی والوں کے نزدیک مشکوک ہو جاتے اس لیے ہم ٹپکنے کے انداز میں سڑک پر موجود رہے تھے۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”کہانی یہ ہو گی کہ ہماری گاڑی بے قابو ہو کر کھائی میں گر گئی لیکن خوش قسمتی سے ہم جان بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ میں اور تم مسٹرائیڈ سڑکار ہیں۔“

بانو سرخ ہوئی تھی پھر اس نے ان دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان کے بارے میں کیا کہیں گے؟“

”راج کنور کا اصل نام ٹھیک رہے گا اور وہ ہمارا ایک واقف کار ہے۔ دشمن بھی تو واقف کار ہی ہوتا ہے اور اوشا کے لیے ملازمہ کا رول مناسب رہے گا۔“

”وہ مان جائے گی؟“ بانو نے دبے لہجے میں کہا۔

”کیوں نہیں مانے گی؟“

”آپ کے حوالے سے اسے اب بات بات پر اختلاف ہونے لگا ہے۔ میرے ساتھ ہوتی ہے اس لیے ہینڈل کر لیتی ہوں آپ کو نہیں بتاتی۔“

”تم فکر مت کرو اس نے اعتراض کیا تو میں اسے ہینڈل کر لوں گا۔“

میں نے نزدیک آئی تو ڈانچ پک آپ کے کہیں میں مجھے ایک جوڑا نظر آیا۔ مرد ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور عورت اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں اور بانو ان کو دیکھتے ہی ہاتھ بلانے لگے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر انہوں نے رکنے کا عندیہ نہیں دیا تو نزدیک آنے پر میں پستول نکال لوں گا۔ مگر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی ہمیں دیکھتے ہی پک آپ کی رفتار کم ہونے لگی۔ نزدیک آ کر وہ رکی اور مرد نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔ ”ہیلو..... کوئی مسئلہ ہے؟“

میں اس کی طرف آیا۔ ”مسئلہ سا مسئلہ، ہم دہلی سے یہاں تفریح اور شکار کے لیے آئے تھے واپسی میں گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی اس کے بریک فیل ہو گئے تھے اور ہم بڑی مشکل سے اس سے چھلانگ لگا کر بچ سکے تھے۔“

”اوہ افسوس ہوا۔“ مرد نے کہا۔ ”سوری میں نے تعارف نہیں کرایا۔ میں شام کپور ہوں اور یہ میری بھتیجی رہتا ہے۔ ہم آگرے میں رہتے ہیں۔“

میں نے ہندوؤں کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑے اور اپنا طے شدہ تعارف کرایا۔ شام اور ریتا لہجے سے پڑھے لکھے اور مہذب لگ رہے تھے۔ شکل صورت کے بھی اچھے تھے۔ کپور لوگ اصل میں شمال سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے خدو خال اور رنگ و روپ پٹھانوں جیسا ہوتا ہے۔ جیسے راج کپور فیملی کا تعلق پشاور سے تھا۔ شام

سرخ و سفید تھا لیکن رینا کی رنگت کی ملاحظت بتا رہی تھی کہ اس کا تعلق وسط یا جنوبی ایشیا سے تھا۔ رینا نے نیچے اتر آئی۔ اس پر شیام نے اسے گھورا لیکن کچھ کہا نہیں اور مجھ سے پوچھا۔ ”مسٹر وجے کمار میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”ہمیں آگے کسی معقول جگہ تک لفٹ درکار ہے جہاں ہم کچھ سامان خرید سکیں اور آگے کے لیے ٹرانسپورٹ حاصل کریں۔ حادثے میں سارا سامان بھی برباد ہو گیا۔“

شیام اور رینا نے ہماری کہانی تسلیم کر لی تھی اور شیام مدد پر بھی آمادہ ہو گیا تھا لیکن جب ہماری کہانی میں راج کنور اور اوشا کا اضافہ ہوا تو اچانک ہی شیام کے تاثرات بدل گئے تھے اس نے جلدی سے کہا۔ ”ایک منٹ مسٹر کمار، میں سواری کر رہا ہوں۔ میں سمجھا آپ دو افراد ہیں لیکن آپ چار ہیں اس لیے آپ کسی اور سے لفٹ حاصل کر لیں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”آپ کی پک آپ خاصی بڑی ہے۔ اور پیچھے گلے گھر میں تو پورا قبیلہ آ سکتا ہے۔“

اس نے نفی میں سر ہلانا جاری رکھا۔ ”میں ایک بار پھر سواری کرتا ہوں۔“

میں نے خوش غلطی سے کہا۔ ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہم آپ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔“

”تم بد معاشی کر رہے ہو۔“ شیام کا لہجہ بدل گیا۔ ”ہمیں نہتا اور عام فرد سمجھ رہے ہو۔“ شیام نے کہتے ہوئے پستول نکال لیا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا لیکن اسی لمحے بانو کی آواز آئی۔

”شیام جی کوئی حماقت مت کرنا ورنہ دودھوا ہو جاؤ گے۔“

بانو کے ہاتھ میں شاٹ گن اور اس کا رخ اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر شیام دنگ رہ گیا تھا اور جب میں نے اس کے ہاتھ سے پستول لیا تو اس نے قطعی مزاحمت نہیں کی تھی۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”دودھوا عورت ہوتی ہے اگر شیام جی کوئی حماقت کرتے تو رینا دودھوا ہو جاتی۔“

بانو نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور پوچھا۔ ”اگر عورت مر جائے تو ہندی میں اس کے شوہر کو کیا کہتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے اصل میں مرد کو خوش قسمت ہی کہتے ہیں۔“ میں نے شیام کی تلاش لی۔ شیام اور رینا اب پریشان تھے۔

”آپ لوگ کون ہیں؟“ رینا نے ہمت کر کے پوچھا۔

”ہم وہی ہیں جو آپ کو بتایا تھا۔“ میں نے شائستگی سے کہا۔ ”لیکن خاتون آپ کے شوہر وہ نظر نہیں آ رہے ہیں جو دکھائی دیتے ہیں۔“

”ہلیز میں ان کی طرف سے معافی مانگتی ہوں۔“ رینا نے کہا۔ ”یہ جلد غصے میں آ جاتے ہیں۔“

”آپ کو معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے معافی ہم مانگیں گے جب آپ سے رخصت ہوں گے۔“

شیام عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا وہ چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ہم تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔“

”زبردستی۔“

میں نے شانے ہلائے۔ ”جو تم چاہے سمجھ لو۔ اگر تم نے سمجھداری سے کام لیا تو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا

اور اگر تم چاہو تو ہم اس رائڈ کا معاوضہ بھی ادا کریں گے۔“

بانو نے دیکھا کہ صورت حال میرے قابو میں ہے تو وہ اوشا اور راج کنور کو لینے چلی گئی۔ بانو نے رائفل اور شاٹ گن مجھے تھمائی اور پھر وہ تینوں براہ راست سفری ٹریلر میں چلے گئے۔ میں نے ریٹا سے کہا۔ ”دیوی جی آپ ٹریلر میں جائیں میں آپ کے بچے کے ساتھ بیٹھوں گا۔“

”ان کے ساتھ کیوں؟“

”ان کا غصہ بے قابو ہے اسے قابو میں رکھنے کے لیے۔“ میں نے شیم کی طرف دیکھا تو وہ ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ یقیناً اسے خود پر قابو پانے میں خامی و دشواری پیش آرہی تھی۔ ریٹا نے اسے دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں صبر کی تلقین اور خاموشی سے ٹریلر کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی شیم نے کہا۔

”تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔“

”مجھے تسلیم ہے لیکن مجبوری ہے۔“

”اگر تمہاری گاڑی کسی کھائی میں گر گئی ہے تو تم زبردستی دوسروں سے لفٹ لیتے پھر اس میں مجبوری کہاں سے آگئی؟“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

”مجبوری یہ ہے کہ رات قریب ہے۔ ہمارے پاس نہ کھانے کو ہے اور نہ پیئ کو۔ ہمارا واقعہ کار خفی ہے اور مدد کے مستحق ہیں۔ تم نے خود انکار کیا اور پھر پستول نکال لیا۔ تم نے خود ہمیں مجبور کیا کہ تمہارے ساتھ زبردستی والا سلوک کریں۔ اب اندر بیٹھو۔“

میں اس سے پہلے پک اپ میں سوار ہو گیا اور ڈیش بورڈ کی تلاشی لی۔ اس کے خانے میں کوئی اور ہتھیار موجود نہیں تھا۔ میں نے شیم کپور سے لیا پستول اپنے پاس رکھ لیا۔ شاٹ گن اور رائفل بھی تھی اور میں یہ سارے ہتھیار اٹھانے پر مجبور تھا۔ میں کچھ زیادہ ہی مسلح تھا۔ بانو کے پاس بریٹا تھا اور وہی کافی تھا۔ وہاں راج کنور موجود تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اتفاق سے ہتھیار حاصل کرنے کا موقع ملے وہ بانو سے آسانی سے پستول نہیں چھین سکتا تھا تھا۔ شیم نے پک اپ اسٹارٹ کی اور آگے بڑھائی۔ اس نے کہا۔ ”یہاں سے تیس کلومیٹر ز نیچے ایک چھوٹا قصبہ ہے تم چاہو تو وہاں اتر سکتے ہو۔“

”اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب کیا تم اس سے آگے بھی ہمارے ساتھ جانا چاہتے

ہو؟“

”میں نے کہا تھا اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ چپ ہو گیا۔ کچھ دیر

بعد اس نے کہا۔

”سچ بتاؤ تم لوگ کون ہو؟“

”میرا خیال ہے ہم نے بتایا تو ہے۔“

”نہیں تم لوگوں نے غلط کہا تھا۔“

”تم اس جگہ میں مت پڑو کہ ہم کون ہیں اپنی توجہ اس پر مرکوز رکھو کہ تم نے اپنی پیاری سی چینی سمیت زندہ

رہنا ہے اور اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ تم ہم سے تعاون کرتے رہو۔ میں صرف اتنا اطمینان دلا سکتا ہوں کہ ہم سے تمہاری جان، مال اور عزت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

اچانک ڈیش بورڈ کے سامنے والے حصے میں نصب ریڈیو کھڑکھڑایا اور اس سے بانو کی آواز آئی۔ ”یہ میں ہوں، یہاں کھانے پینے کو سب کچھ ہے میں بہت مزے کا دال چاول کھا رہی ہوں آپ کیا کھائیں گے؟“

شیام نے ریڈیو کا ایک بٹن دبایا اور بولا۔ ”تم بات کر سکتے ہو۔“

”جو بھی کھانے کو ہو۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس وقت پورا کچن کھا سکتا ہوں برتنوں سمیت۔“

بانو ہنسی۔ ”تو دس منٹ رکھیں میں کھالوں تو آپ پیچھے آجائے گا۔“

”یہ شیام جی کچھ فرنٹ ہو رہے ہیں اور ممکن ہے تنہائی پا کر ہبک جائیں۔ ان کا کیا کرتا ہے؟“

”ان کی تنہائی میں دور کر دوں گی۔“ بانو نے روانی سے کہا اور پھر اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے تو

اس نے جلدی سے تھجج کی۔ ”میرا مطلب ہے اسے میں دیکھ لوں گی۔“

میں نے بٹن آف کر کے کہا۔ ”تم نے اچھا سسٹم نصب کیا ہوا ہے کیا یہ صرف اسی گاڑی کی حد تک کام کرتا

ہے؟“

”میں الیکٹریکل انجینئر ہوں۔“ شیام نے انکشاف کیا۔ ”میں نے ایف ایم ریڈیو کے ساتھ ایک مائیک

نصب کر دیا ہے ایسا ہی ایک ریڈیو ٹریلر میں لگا ہوا ہے۔ اکثر ریٹائرڈ میں ہوتی ہے اور اسے رابطہ کرنا ہوتا اس

سے بات کر لیتی ہے۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”اکثر.....؟ کیا تم لوگ سفر میں رہتے ہو؟“

”نہیں۔“ وہ دھیان سے ایک موڑ کا نٹے ہوئے بولا۔ اس پہاڑی علاقے میں وہ رفتار کو بیس کلومیٹر زنی

گھنٹہ سے اوپر نہیں لے جا رہا تھا۔ ”گرمیوں کے چند مہینے ہم اس علاقے میں گزارتے ہیں۔ یہاں دولت

مندوں نے گھر بنا رکھے ہیں۔ میرا کئی افراد سے کانٹریکٹ ہے۔ میں گرمیوں میں آکر ان کے گھروں میں

الیکٹریکس کی چیزوں اور سیکورٹی کی مٹھی نینس کرتا ہوں۔ ہماری تفریح بھی ہو جاتی ہے اور کچھ آمدنی بھی مل جاتی

ہے۔“

”شہر میں تم جاب کرتے ہو؟“

”نہیں وہاں بھی میرا اپنا بزنس ہے ایک چھوٹی سی فرم ہے۔ اسی لیے تو دو تین مہینے کے لیے یہاں آ سکتا

ہوں ورنہ جاب کرنے والا کیسے نکل سکتا ہے۔“

اس نے اچھا سسٹم کیا ہوا تھا یہ ایسے علاقے میں زیادہ کام آتا جہاں موبائل سگنل نہ ہوں۔ بس منٹ بعد

بانو نے ریڈیو پر گاڑی روک کر کہا۔ شیام نے گاڑی روکی۔ بانو اتر کر آئی اور اس نے میری سیٹ سنبھال لی۔

میں نے روانہ ہونے سے پہلے شیام کو خبردار کیا۔ ”کوئی التاسید حا خیال دل میں مت لانا ورنہ یہ تمہیں سیدھا کر

دے گی۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“ بانو نے اپنا بریٹا نکال کر اس کا معائنہ کیا اور پھر اسے ہاتھ میں رکھا۔ میں ٹریلر میں

آیا۔ یہ اچھا خاصا بڑا اور پُر نقش قسم کا ٹریلر تھا۔ ایک طرف بیڈروم تھا جو عقی حصے میں تھا۔ درمیان میں کچن اور مختصر

ساداش روم تھا اور دوسری طرف لاؤنچ تھا۔ یہاں چھوٹے صوفے اور ایک عدد ایل سی ٹی وی بھی لگا ہوا تھا۔ راج کنور اور اوشالا لاؤنچ والے حصے میں تھے۔ رینا کچن میں مصروف تھی۔ اس نے دال چاول بنائے تھے اور ساتھ میں آلو کی بھجیا اور اچار بھی تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ وہ ہندو تھے اور اگر کوئی ایسی چیز ہوئی جس میں گوشت ہوا اور میں نے کھانے سے انکار کیا تو وہ سمجھ جاتے۔ جب کہ میں اپنا مذہب اور قومیت فی الحال راز میں رکھنا چاہتا تھا۔ سفر میں دال چاول ہی سب سے آسان اور بہترین خوراک ہوتے ہیں۔ اس نے ایک بڑی ٹرے میں سب سجا کر لا کر میرے سامنے رکھ دیا اور خوفزدہ نظروں سے اسلحہ کی طرف دیکھا۔

میں نے کھانے کا آغاز کیا اور راج کنور کی طرف دیکھا۔ ”اب تم آرام سے ہو۔“

”ہاں لیکن ابھی ہم خطرے میں ہیں۔“ اس نے دھمے لہجے میں کہا۔

”وہ کیسے؟“

”اس علاقے سے باہر جانے والی یہ واحد سڑک ہے اور اس پر وہ لوگ موجود ہوں گے؟“

”تمہارا مطلب ہے بڑے کنور کے گھر گئے؟“

اس نے سپاٹ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے وہ منشی جی اور راجن کے آدمی ہیں۔ تمہاری طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ بڑا کنور بے بس ہو گیا ہے۔ یہ لوگ اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔“

”میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔ منشی جی محرم راز اور تم لوگوں کے بہت نزدیک کسی لیکن ہے تو ایک ملازم۔ وہ اس طرح سے سازش کیسے کر سکتا ہے؟“

”وہ کر سکتا ہے۔“ راج کنور نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس نے اپنے زخموں کی دوبارہ مرہم پٹی کر لی تھی اور اس کے پیروں پر بھی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ شرٹ کا خون بھی ٹمکنہ حد تک صاف کر لیا تھا یعنی وہ خاصی بہتر حالت میں تھا۔ ”تم نہیں جانتے منشی دل جی صرف ہمارا ملازم نہیں ہے وہ کنور خاندان کا ایک حصہ ہے۔“

میں حیران ہوا تھا۔ ”وہ بھی کنور ہے؟“

راج کنور نے سر ہلایا۔ ”رشتے میں وہ ہمارا چچا لگتا ہے۔“

میں اس کی بات پر غور کر رہا تھا۔ یہ نیا انکشاف تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ جاگیر کا مالک بھی بن سکتا تھا جب میں نے راج کنور سے پوچھا تو اس نے تصدیق کی۔ ”اگر میں اور بڑے کنور نہ رہیں تو وہ اس جاگیر کا مالک بن سکتا ہے۔“

”اس صورت میں بھی جب کہ تمہاری ایک بہن موجود ہے؟“

”ہاں۔“ راج کنور نے پھر پہلو بدلا۔ ”وہ جاگیر سے پہلے ہی دستبردار ہو چکی ہے۔“

اگرچہ مجھے اس سے کوئی فرق پڑتا تھا کہ یہ جاگیر کس کے پاس جاتی ہے اور کون اس کا مالک بنتا ہے لیکن فی الحال اس سیاست کا مجھ پر سنگین اثر پڑ رہا تھا۔ اگر یہ بات درست تھی تو دونوں کنوروں کے ساتھ میں بھی منشی جی اور اس کا نمبر ون نشانہ تھا اور وہ مجھے مارنے کی بھی ہر ممکن کوشش کرتے۔ مجھے بھی خطرے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے کھانے سے فارغ ہوتے ہی رینا سے ریڈیو طلب کیا۔ اس نے مجھے پرانے موبائل کے سائز کارڈیو

لا کر دیا اور اس کے فنکشن سمجھائے۔ میں نے کال کی اور شیام سے کہا۔ ”اگر آگے کہیں ناکا نظر آئے تو تم فوراً گاڑی روک لو گے ناکے کے پاس نہیں جاؤ گے۔“

”تم پولیس ناکے کی بات کر رہے ہو؟“ وہ تشویش زدہ ہو گیا۔

”میں ہر قسم کے ناکے کی بات کر رہا ہوں جہاں گاڑیوں کو روک کر چیک کیا جا رہا ہو۔ بانو تم نظر رکھنا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ شام کے چھ بج رہے تھے اور سورج پہاڑوں کی طرف جھک چکا تھا شام کے سائے تیزی سے طویل ہو رہے تھے۔ کچھ دیر میں اندھیرا ہو جاتا اور اس میں سفر تو کیا جاسکتا تھا لیکن ناکوں پر نظر نہ رکھی جاسکتی تھی۔ ریتانے چائے بنائی تھی۔ ہمارے شریفانہ رویے سے اسے حوصلہ ہوا تھا اور اب وہ اتنی خوفزدہ نہیں تھی۔ اس نے اوشا کو ایک شال دے دی تھی کیونکہ رات ہوتے ہی سردی میں اضافہ ہوا تھا۔ اوشا خاموشی تھی اور اس نے خود کو میرے سہارے پر چھوڑ دیا تھا اب تک وہ اپنی ہمت سے بڑھ کر میرا اور بانو کا ساتھ دیتی آئی تھی مگر اب اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ وہ جھکی ہوئی تھی میں نے اس سے کہا۔ ”اوشا تم لیٹ جاؤ۔“

”نہیں رہے ہم ٹھیک ہیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”ہم تیرے لیے پریشان ہیں۔ نشتی جی اچھا آدمی نہیں ہے وہ ان دونوں کنوروں سے زیادہ خطرناک ہے۔“

”تم فکر مت کرو میں اس سے پہلے بھی ایسے لوگوں سے نمٹا رہا ہوں اور آگے بھی نمٹ لوں گا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم بیڈروم میں چلی جاؤ۔“

اوشا جانا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے اصرار پر چلی گئی۔ میں خود بھی چائے نوشی کرتے ہوئے ریلیکس کر رہا تھا۔ ٹریڈر میں جہاں جہاں کھڑکیاں تھیں وہاں پردے بھی لگے تھے اس لیے اندر کا منظر باہر سے نظر آتا تھا اور باہر دیکھنے کے لیے بھی پردہ سرکنا پڑتا تھا۔ میں نے لاؤنج کا سامنے والا پردہ سرکا دیا تو پک آپ کے اوپر سے آگے کا منظر دکھائی دینے لگا تھا۔ ٹریڈر میں ہم باندی پر تھے۔ اس لیے زیادہ بہتر دیکھ سکتے تھے۔ شاید اسی لیے مجھے وہ منظر پہلے نظر آ گیا جو شیام اور بانو کچھ دیر بعد دیکھتے۔ کچھ آگے ایک جیب ترچھی کھڑی تھی اور اس نے سڑک بلاک کر دی تھی۔ میں نے جمیٹ کر ریڈیو اٹھایا اور مٹن دبا کر کہا۔ ”بانو شیام سے گاڑی روکو آگے سڑک بلاک ہے ایک جیب کھڑی ہے۔ بانو تم میری بات سن رہی ہو؟“

لیکن دوسری طرف سے خاموشی تھی۔ میرے بار بار پکارنے پر بھی دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا اور ہم سڑک پر کھڑی جیب کے پاس ہوتے جا رہے تھے۔ میرا دل خدشے سے دھڑکنے لگا تھا۔ بانو یا شیام جواب کیوں نہیں دے رہے تھے جب کہ وہ دونوں گاڑی میں دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک پک آپ نے بریک لگائی اور میں سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے لڑھک گیا تھا۔ راج کنور میرے پاس گرا تھا۔ میں سنبھل کر اٹھا تو میں نے دو افراد کو پک آپ کی طرف آتے دیکھا۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی دونوں صاف دکھائی دے رہے تھے اور ان میں سے ایک راسن تھا۔ اسی لمحے میری نظر راج کنور پر گئی جو شیام کا گر جانے والا ہسپتال اٹھارہا تھا۔



میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر لات ماری وہ ہسپتال کا رخ معری طرف کر رہا تھا۔ ہسپتال اس کے

ہاتھ سے نکل کر ریٹا کے پاس جا کر تھا لیکن وہ خوفزدہ سی کھڑی تھی۔ اس نے پستول اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ راج کنور کے ہاتھ پر چوٹ آئی تھی وہ ہاتھ تھامے کراہ رہا تھا میں نے اٹھتے ہوئے کہنی سے اس کے سر پر وار کیا تو وہ گر کر بے سدھ ہو گیا۔ اسی لمحے باہر پے در پے فائر ہوئے۔ یہ آواز ریٹا کے فائر کی تھی فوراً ہی خود کار رائل گرجی ٹریلر کا سامنے والا شیشہ ٹوٹا اور ریٹا جھج کر نیچے گری تھی۔ میں سمجھا کہ اسے گولی لگ گئی ہے لیکن وہ ڈر کر نیچے گری تھی۔ میں رینگتا ہوا آگے گیا اور اس کے جسم کے نیچے دبا پستول نکال لیا۔ وہ ٹھیک تھی مگر کانپ رہی تھی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”لیٹی رہنا اٹھنا مت۔“

اوشا اٹھ گئی تھی اور بیڈ روم کی دیوار کے ساتھ دبی ہوئی تھی اس نے مجھے آواز دی۔ ”شہباز یہ کیا ہے رے؟“

ریٹا نے چونک کر مجھے دیکھا وہ مجھے ہندو سمجھ رہی تھی لیکن اوشا نے بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ بہر حال اس وقت مجھے اپنے راز سے زیادہ باہر آنے والوں کی فکر تھی۔ خود کار رائل سے فائر یقیناً رامن یا اس کے ساتھی نے کیا تھا کیونکہ بانو کے پاس صرف بریٹا تھا۔ میں نے اٹھ کر ایک لمحے کے لیے باہر جھانکا اور فوراً سر نیچے کر لیا اس کا امکان تھا کہ باہر کوئی تاک میں ہو۔ اس ایک جھلک میں مجھے اب سامنے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فائرنگ بھی ختم گئی تھی۔ میں نے چلا کر کہا۔ ”بانو تم ٹھیک ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں لیکن شام جی.....“

ریٹا تڑپ کر اٹھی۔ ”کیا ہوا شام کو؟“

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”لیٹی رہو باہر دشمن ہیں وہ پھر فائرنگ کریں گے۔“

”میں شام کے پاس جاؤں گی۔“ وہ رونے لگی۔

میں نے چلا کر پوچھا۔ ”بانو شام کو کیا ہوا ہے؟“

”گولی لگی ہے لیکن زندہ ہے۔“

”حملہ کرنے والے کہاں ہیں؟“

”رامن کے ساتھ آنے والا میری فائرنگ سے مارا گیا ہے یا زخمی ہے اور رامن بھاگ گیا۔ رائل سے فائرنگ اسی نے کی تھی۔“

”تم اندر رہو۔“ میں نے کہا اور ریٹا سے بولا۔ ”تم اندر رہو میں جا کر دیکھتا ہوں کسی بھی صورت میں نیچے مت اترنا اور اوشا تم اس کی نگرانی کرو۔ اگر یہ کوئی حرکت کرے تو اسے کاٹ لینا۔“ میں نے راج کنور کی طرف اشارہ کیا اور خود نیچے اتر گیا۔ نیچے اترتے ہی میں ٹریلر کے عقبی حصے میں آیا جس طرف سے اتر تھا اس طرف کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا دوسری طرف بھی کوئی نہیں تھا۔ پھر میں نے نیچے سے جھانک کر دیکھا ٹریلر اور پک آپ کے نیچے بھی کوئی نہیں تھا۔ بلکہ دور تک سڑک صاف تھی۔ میں محتاط قدموں سے پک آپ کی طرف بڑھا اور پاس پہنچ کر میں نے آہستہ سے بانو کو پکارا۔ ”بانو.....“

”میں یہاں ہوں۔“ بانو نے جواب دیا۔ وہ سیٹ کے نیچے دبی ہوئی تھی اور شام ڈرائیونگ سیٹ پر بے سدھ بیٹھا ہوا تھا۔ آگے سو گز تک سڑک صاف تھی۔ اس کے بعد موڑ تھا جہاں رامن اینڈ کمپنی نے ناکا لگایا تھا۔

بانو نے جسے نشانہ بنایا تھا وہ بھی غائب تھا۔ جہاں سڑک مڑ رہی تھی اس سے ذرا آگے ہی دشمنوں کی گاڑی موجود تھی مگر وہ یہاں سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر شام کا معائنہ کیا۔ گولی اس کے دائیں شانے سے ذرا نیچے لگی تھی اور خون بہہ رہا تھا وہ نیم بے ہوش تھا۔ میں نے چابی نکال کر ہینڈ بریک کھینچنے اور اسے کھینچ کر نیچے اتارا اور پک آپ کے عقبی حصے میں ڈال دیا۔ یہاں کچھ سامان پڑا تھا۔ بانو بھی نیچے اتر آئی تھی میں نے اسے خود کار رائل دی۔ اس نے کہا۔ ”جیسے ہی نظر آئے میں نے رامن اور اس کے ساتھی پر فائر کیا۔ دوسرا گرا اور پھر رامن نے برسٹ مارا۔ میں نیچے ہو گئی لیکن شام بیٹھا رہا اسے گولی لگی۔ کچھ دیر بعد میں نے سراٹھا کر دیکھا تو وہ بھاگ گئے تھے۔ دوسرا شاید اتنا زخمی نہیں تھا ورنہ وہ اس طرح بھاگ نہیں سکتا تھا۔“

”تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ اب اوپر چڑھ جاؤ اور گرائی کرتی رہو جیسے ہی کوئی نمودار ہو برسٹ مارنا۔“ میں نے بانو کو دوسری رائل دی اور وہ مستعدی سے اوپر چڑھ گئی اور اس نے عقبی حصے میں کھڑے ہو کر پک آپ کی چھت سے رائل نکالی تھی۔ میں واپس ٹریلر کی طرف آیا۔ رینا دروازے سے لگی کھڑی تھی میں نے پوچھا۔ ”فرسٹ ایڈ کا سامان ہے؟“

”ہاں..... شام ٹھیک ہے؟“

”اسے گولی لگی ہے خون روکنا ہے۔ وہ سامان لے کر پک آپ میں آجاؤ۔“

رینا اندر لپکی تھی میں بھی اندر آیا۔ اسلحہ وہیں تھا وہ سینا اور پھر راج کنور کو ہوش میں لانے کے لیے اس کے منہ پر پانی ڈالا۔ وہ جھرجھری لے کر ہوش میں آگیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے گھبرا کر کہا۔ ”میں پستول تمہارے لیے نہیں اٹھا رہا تھا۔“

”تاویل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”چلو..... تمہارے سابق نمک خوار آگئے ہیں۔“

”رامن۔“ راج کنور کا چہرہ ست گیا۔ ”وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔“

”ظاہر ہے تم سے زیادہ بہتر کون جانتا ہوگا۔“ میں نے طنز کیا۔ رینا فرسٹ ایڈ کٹ اٹھالائی تھی میں نے اس سے کہا۔ ”مجھے ایک بیگ چاہیے۔“

”وہ بہت خطرناک آدمی پہلے بھارتی اسپیشل فورس میں تھا۔“ راج کنور بدستور گھبرایا ہوا تھا۔ ”بلیک کیٹ کمانڈوز میں تھا پھر کچھ عرصے رامن کام کیا لیکن کسی چکر میں نکال دیا گیا۔“

”پھر وہ تمہارے پاس آگیا۔“ میں نے رینا کے دیئے بیگ میں اسلحہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”اب اٹھو ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“

رینا پہلے ہی جا چکی تھی اور پک آپ میں پڑے شام کا ذمہ دیکھ کر روتے ہوئے اس کی مرہم پٹی کر رہی تھی۔ ٹریلر ایک ہک کی مدد سے پک آپ سے منسلک تھا۔ اسے کھول کر فولا دی پٹی کو ذرا اوپر اٹھا کر دونوں کو الگ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے راج کنور سے کہا۔ ”میں یہ راڈ اٹھاؤں گا تم ہینڈ بریک ریلیز کرو گے جیسے ہی میں کہوں فوراً دوبارہ بریک لگا دو گے۔“

رامن اینڈ کمپنی نے دوبارہ مداخلت نہیں کی تھی۔ بانو کی کارروائی نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا

لیکن سوال یہ تھا کہ انہوں نے دوبارہ حملہ کیوں نہیں کیا تھا۔ راج کنور نے میری ہدایت پر عمل کیا اور پک اپ ٹریلر سے الگ ہو گئی۔ راڈ اگ کرنے سے پہلے میں نے ٹریلر کے اگلے دونوں ٹائرز کے آگے پتھر رکھ دیئے تھے ورنہ آزاد ہوتے ہی وہ بھی چل پڑتا۔ پک اپ کے آزاد ہوتے میں نے اوشا اور راج کنور کو عقبی حصے میں سوار ہونے کو کہا۔ ”راج کنور تم پیچھے ہو گے لیکن فرار کا خیال مت لانا۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ہمارے ساتھ رہو ورنہ بڑے کنور سمیت اب یہاں صرف تمہارے خون کے پیا سے ہیں۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اچک کر پک اپ میں سوار ہو گیا۔ اوشا سردی سے بچنے کے لیے شال اوڑھے ہوئے تھے۔ اس سے اس کی ستر پوشی بھی ہو رہی تھی ورنہ اپنے نہ ہونے کے برابر لباس میں وہ جا سے باہر ہو رہی تھی۔ میں اور بانو پک اپ میں آئے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی تھی۔ بانو برابر میں آئی۔ میں نے اسے خبردار کیا۔

”بانو ہم اب تک کی جدوجہد کے سب سے خطرناک مرحلے میں داخل ہونے والے ہیں۔ موڑ کے بعد رامن اینڈ کمپنی گھات لگائے بیٹھی ہوگی اور وہ ہمیں مارنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ یوں سمجھ لو ہمیں آگ کے دریائے گزر کر پار جانا ہے۔“

”تب ہمارا اس طرف جانا ضروری نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ دشمن سامنے گھات لگائے بیٹھا تھا تو ضروری نہیں تھا ہم اسی طرف سے جاتے، ہم واپس جا کر کوئی اور راستہ بھی تلاش کر سکتے تھے۔ رامن کے ساتھ ایک آدمی تھا لیکن اس کا امکان تھا کہ اس کے ساتھ پورا نو لہ ہوگا اور نصف درجن افراد بھی اگر اس پک اپ پر خود کار ہتھیاروں سے فائرنگ کرتے تو کسی ایک فرد کا بچنا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔ اگر نائز برسٹ ہو جاتے تو تیز رفتاری کی کوشش میں پک اپ قابو سے باہر ہو جاتی اور سڑک کے ایک طرف نہایت گہری کھائی تھی اس میں گر کر کسی کا سلامت رہنا بھی معجزے سے کم نہ ہوتا۔ آگے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ موڑ تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا دشمن یقیناً ہماری مگرانی کر رہا تھا اور اگر ہم اس طرف جاتے تو وہ ہمارے استقبال کو تیار ہوتا۔ ذرا غور و فکر کے بعد میں نے تسلیم کیا کہ ان حالات میں بانو کا مشورہ بہترین تھا ایک بار ہم دشمن کی پہنچ سے نکل جاتے تو فیصلہ کر سکتے تھے کہ اب کہاں کارخ کریں اور یہاں سے کیسے نکلیں۔ میں نے عقب والوں سے کہا۔

”ہوشیار رہو اور نیچے سر کر لو ہم یہاں سے نکلنے والے ہیں۔“

میں نے اللہ کا نام لے کر انجن اسٹارٹ کیا اور پک اپ کارخ بدلا۔ فوراً ہی موڑ کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ میں اور بانو بھی بے ساختہ جھک گئے تھے۔ بانو کی طرف کا شیشہ ٹوٹ گیا اور باڈی پر گولیاں نشان کر کے لگیں لیکن غنیمت رہا کہ کوئی نائر نشانہ نہیں بنا۔ اب میں نے احتیاط بالائے طاق رکھ کر پک اپ موڑنے کی کوشش شروع کی۔ یہاں سڑک خاصی تنگ تھی اور پک اپ خاصی بڑی تھی اسے موڑنا آسان نہیں تھا۔ میں چند فٹ آگے لے جاتا اور پھر چند فٹ پیچھے لاتا۔ اس عمل کے دوران دیوانہ وار اسٹیرنگ کاٹنے میں مصروف تھا۔ بانو نے ہمت کی اور رائفل اوپر کر کے موڑ کی طرف ایک برسٹ مارا۔ اسے تجربہ نہیں تھا اس لیے برسٹ میں پورا میگزین ہی خالی ہو گیا لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ دشمن جو آگے آگئے تھے وہ پلٹ کر واپس بھاگے۔ میں نے اسٹیرنگ سے لڑتے ہوئے اسے شاباش دی۔

”لیکن میگزین کا خیال رکھو ہر بار ایک میگزین خالی کرتی رہیں تو جلد ہمارے پاس ایسٹیشن ختم ہو جائے

گا۔“

”سوری مجھے اس کا تجربہ نہیں ہے۔“ اس نے خفت سے کہا۔

میں تین بار میں پک آپ کو تقریباً موڑنے کی پوزیشن میں لے آیا تھا اب میں اسے ایک بار اور آگے پیچھے کرتا تو میں پک آپ آگے کرنے جا رہا تھا کہ میری نظر موڑ کی طرف گئی اور اس اتفاق نے ہمیں بچالیا۔ موڑ کی طرف سے ایک شعلہ نمودار ہوا اور ہماری طرف لپکا۔ میرے ذہن نے لمحے کے سویں حصے میں اس خطرے کو بھانپ لیا اور میں نے بے ساختہ ایکسی لیٹر دیا۔ پک آپ جھٹکے سے آگے گئی اور دوسرے لمحے میں بریک لگا چکا تھا لیکن یہاں چند فٹ کی جگہ تھی۔ اسی لمحے شعلہ پک آپ کے عقبی حصے کے اوپر سے گزر اور ٹریلر سے ٹکرایا۔ ایک دھماکہ ہوا اور ٹریلر کے پرچے اڑ گئے تھے۔ یہ گرینڈ تھا جسے لانچر سے فائر کیا گیا تھا۔ ہم بال بال بچے تھے اس کا نشانہ پک آپ تھی لیکن میں نے بروقت آگے کر کے اسے بچالیا تھا۔

میں نے بریک لگائی تھی لیکن جب پک آپ نہیں رکی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا کیونکہ آگے بس کھائی تھی۔ بریک لگانے کے ساتھ میرے ہاتھ خود کار انداز میں حرکت میں تھے۔ میں نے ریورس گیزر لگایا اور ایکسی لیٹر دیا۔ ٹائروں کے چیخنے کی آواز گرینڈ کے دھماکے میں دب گئی تھی۔ پک آپ آگے گئی۔ اس کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ ایک لمحے کو ایسا لگا کہ پک آپ سیدھی کھائی میں جائے گی۔ میں نے بے ساختہ کلمہ پڑھا مگر اسی لمحے جیسے پک آپ کو کسی نے پیچھے سے پکڑ کر واپس کھینچ لیا۔ مجھے یقین ہے اس کے اگلے ٹائر کھائی کے خلا میں جا چکے تھے اور صرف پچھلے ٹائر انجن کی طاقت سے اسے واپس نہیں کھینچ سکتے تھے یہ کوئی غیبی ہاتھ تھا جس نے پک آپ کو واپس کیا۔ یہ اصل میں ہاتھ تقدیر کا ہاتھ تھا جسے ابھی ہماری موت قبول نہیں تھی۔ پک آپ اتنی قوت سے پیچھے گئی کہ پہاڑی ڈھلان پر چڑھ گئی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اب مجھے جگہ مل گئی اور میں نے اسٹیرنگ کا نٹے ہوئے پک آپ کو ایک ہی بار میں موڑ لیا اور یہ جلتے ٹریلر کو تقریباً چھوٹی ہوئی آگے گئی تھی۔

اس جدوجہد کے دوران میری حس سماعت نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور میرے ساری جان میرے ہاتھوں اور آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ جب ہم ٹریلر کے پاس سے گزرے تب مجھے بانو اور پیچھے موجود خواتین کی ہشیرانی جھین سنائی دیں۔ مگر ان پر توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ رامن اینڈ کمپنی پیچھے موجود تھی اور اس بار وہ خطرناک جنگی ہتھیاروں سے حملہ کر رہے تھے۔ اب سمجھ میں آیا کہ وہ آگے کیوں نہیں آئے تھے جیسے ہی تصدیق ہوئی کہ پک آپ اور ٹریلر میں ہم ہیں وہ واپس گئے اور گھات لگا کر بیٹھ گئے اور جیسے ہی ہم حرکت میں آئے انہوں نے حملہ کر دیا۔ مگر رامن نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم پک آپ لے کر فرار کی کوشش کریں گے اور اس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ ایک ساتھ ہی ہم سب کو اڑا دے گا۔ مگر اس کا منصوبہ دو دو جہات کی بنا پر ناکام ہوا۔ ایک تو ہم نے آگے جانے کے بجائے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا دوسرے یہ سراسر تائید خداوندی تھی جس نے ابھی ہماری موت کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور یہی اصل وجہ تھی باقی سب اسباب تھے۔

جیسے ہی پک آپ ٹریلر سے آگے نکلی دوسرا گرینڈ فائر ہوا۔ میں عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا شعلہ نظر آتے ہی میں نے پک آپ ٹریلر کی آڑ میں کر لی اور شعلہ ہمارے برابر سے ہوتا ہوا کھائی کی طرف چلا گیا اور چند لمحے بعد

ایک زوردار دھماکہ سنائی دیا تھا۔ میں نے ایکسی لیٹر دیا یا اور پک آپ اچھل کر آ گئے تھی۔ چودہ سو سی قاتور ڈیزل انجن بہترین حالت میں تھا۔ چند سیکنڈ میں رفتار دس سے بڑھ کر تیس میل فی گھنٹہ پہنچ گئی تھی۔ رات کے وقت اور اس سڑک پر یہ رفتار زیادہ تھی لیکن میں پک آپ کنٹرول کر سکتا تھا خطرہ عقب سے آنے والے تیسرے گرینڈ سے تھا یہاں پہنچنے کی گنجائش کم تھی۔ بانو نے خود پر قابو پالیا تھا اور اب پیچھے دیکھ رہی تھی۔ تیسرے گرینڈ سے اس نے خبردار کیا۔ وہ چلائی۔“

”شہباز بچیں۔“

میں نے پک آپ لہرائی اور ہم نہ جانے کیسے بچ گئے تھے کیونکہ گرینڈ بہت پاس سے گزرا اور سو گز آگے سڑک پر پھنسا تھا۔ میں نے رفتار کم کی اور سڑک پر نمودار ہونے والے گڑھے سے بچتے ہوئے بمشکل پک آپ آگے نکالی۔ بانو بدستور ٹھہرائی کر رہی تھی اسی نے خبردار کیا۔ ”ایک گاڑی پیچھے آ رہی ہے۔“ اس مار دھاڑ میں کسی اور گاڑی کے اس طرف آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی اس طرف آ رہا ہوتا تو یقیناً پلٹ کر واپس بھاگتا۔ یہ یقیناً رامن اور اس کے ساتھی تھے جو ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ میں نے رفتار بڑھائی۔ بانو نے عقب میں بنی کھڑکی کا شیشہ ہٹا کر رائفل باہر نکالی تھی۔ رینا اپنے شوہر کے اوپر ڈھال بنی پڑی تھی جب کہ اوشا اور راج کنور بھی دیکے ہوئے تھے لیکن وہ سب خیریت سے تھے۔ بانو نے رائفل کا میگزین تبدیل کیا اور ان سے کہا۔ ”سب لیٹے رہیں کوئی سر نہ اٹھائے وہ پیچھے آ رہے ہیں۔“

رات پوری طرح مسلط ہو چکی تھی اور فورا ہی سردی نے مزاج پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ کھڑکی کے ٹوٹ جانے والے شیشے سے نہایت سرد ہوا اندر آ رہی تھی۔ باہر والوں کا یقیناً زیادہ برا حال تھا۔ رینا نے سراٹھا کر کہا۔ ”پلیز کسی ہاسٹل چلو، شام کو طبی امداد کی ضرورت ہے۔“

”فی الحال تو ہمیں پیچھے آنے والوں سے بچنا ہے۔“ بانو نے جواب دیا۔ ”تم خون روکنے کی کوشش کرو۔“ میں ان سب باتوں سے بے نیاز اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر دے رہا تھا ہم دشمن سے جتنا دور نکل جاتے اتنا ہی محفوظ رہتے۔ اس وقت میں اور پک آپ دو جسم ایک قالب بن گئے تھے۔ اس لیے میں اس سے بہترین کام لے رہا تھا۔ بانو نے مجھ سے کہا۔ ”وہ ڈرائیو پیچھے رہ گئے ہیں لیکن ان کی گاڑی کی روشنی نظر آ رہی ہے۔“

”وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑیں گے بھی نہیں۔“

”کچھ کرنا ہوگا؟“

”لازمی بات ہے۔ مگر فی الحال دور نکلنا ہے یہ ان کا علاقہ ہے اور وہ آسانی سے مدد لے سکتے ہیں دوسرے یہاں چھپنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمیں ایسی جگہ تک جانا ہوگا جہاں چھپنے کی گنجائش ہو اور کئی راستے ہوں تب ہم کر ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

میں نے اسلحہ والا بیگ آگے رکھا تھا۔ ہمارے پاس دو خود کار رائفلیں تھیں۔ دو شاٹ گنز میں سے ایک میں نے راستے میں چھوڑ دی تھی۔ البتہ شام کے پستول سمیت ہمارے پاس تین پستول آگے تھے۔ سوائے شاٹ گن کے تمام ہتھیاروں کا ایمونیشن تسلی بخش مقدار میں تھا۔ شاٹ گن کے مشکل سے تیس پینتیس کارتوس رہ گئے تھے۔ پیٹ بھرنے کے بعد میں پوری طرح فارم میں تھا اور کسی بھی مشکل کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہی

حال بانو کا تھا۔ اسے زیادہ بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے وہ زیادہ خوش تھی۔ اس نے خلوص سے کہا۔ ”اللہ کا شکر ہے جس نے اس دیرانے میں کھانا، پانی اور یہ گاڑی دی۔“

میں ہنسا۔ ”جن کا یہ سب ہے ان بے چاروں کا برا حال ہے۔ وہ ہمارے برعکس اپنے بھگوان سے شکوہ کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟“

بانو نے پیچھے دیکھا۔ ”شیام ہوش میں آ گیا ہے۔“

یہ اچھی بات تھی اس کا مطلب تھا گولی نے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن پیچھے جو موت کے ہر کارے آ رہے تھے یہ اچھی بات نہیں تھی۔ اس لیے میں نے اطلاع پر تھرہ کیے بغیر ڈرائیونگ جاری رکھی۔ آج شاید صبحے بعد مجھے آزادی سے کچھ کرنے کا موقع ملا تھا اور میں کسی صورت اس موقع کو گنوا نہیں چاہتا تھا۔ بانو وقفے وقفے سے پیچھے آنے والوں کے بارے میں خبردار کر رہی تھی۔ وہ نزدیک آرہے تھے۔ مگر ابھی اتنے قریب نہیں آئے تھے کہ ہم پر اپنے ہتھیار استعمال کرتے۔ کچھ دیر بعد ہم اس جگہ سے گزرے جہاں ہم سڑک تک پہنچے تھے اور یہیں سے ہم نے رینا اور شیام سے لفٹ لی تھی۔ اب رینا اور شیام خود ہمارے ساتھ جا رہے تھے۔ مگر اس حالت میں کہ شیام زخمی تھا اور ان کا سفری گھر تباہ ہو چکا تھا۔ یہ ہماری وجہ سے ہوا تھا مجھے اس کا افسوس تھا لیکن میں اتنا جذباتی نہیں تھا کہ دشمن کو نظر انداز کر کے ان سے معافی طلبی کرنے لگ جاتا۔ میں شیام کے زخم کا مداوا بھی نہیں کر سکتا تھا مگر ان کے نقصان کی طلبی کر سکتا تھا بشرطیکہ ہمیں یہاں سے بچ کر نکلنے کا موقع مل جاتا۔

میری خواہش تھی کہ جلد از جلد کسی ایسی جگہ پہنچ جائیں جہاں راستہ کہیں اور بھی نکلتا ہو اور ہم دشمن سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”ایسا کر تو تم کسی طرح اس کھڑکی سے پیچھے نکل جاؤ اور ڈرا بلندی سے دیکھ کر مجھے بتاؤ اگر کوئی راستہ کسی اور طرف نکل رہا ہو۔“

”میں کوشش کرتی ہوں۔“ اس نے کہا اور رائفل رکھ کر مڑی۔ پہلے اس نے سر نکالا اور پھر جسم نکالنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک طرف ہو کر اسے موقع دیا۔ بانو کا جسم بھر گیا تھا اور مضبوط بھی ہوا تھا اس لیے مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ اس مختصر سی کھڑکی میں پھنس نہ جائے لیکن اس کی قدرتی جسمانی لچک اور نرمی برقرار تھی اس لیے وہ کسی نہ کسی طرح گڑ کھا کر پیچھے جانے میں کامیاب رہی۔ اس نے باہر نکل کر اندر سے رائفل لی اور کھڑکی ہو کر آگے دیکھنے لگی۔ اس کا سر میرے سر سے تقریباً پانچ فٹ زیادہ بلند تھا اور اسی لیے اسے میری نسبت زیادہ دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے میں نے رامن اینڈ کھنی کا نا کا پہلے دیکھ لیا تھا کیونکہ میں ٹریلر میں زیادہ بلندی پر تھا۔ بانو آگے کے ساتھ پیچھے بھی دیکھ رہی تھی پھر اوشانے یہ ذمے داری لے لی وہ پیچھے دیکھ رہی تھی اور بانو آگے۔ کچھ دیر بعد دونوں نے بیک وقت مجھے اطلاع دی۔

”وہ پیچھے ہیں رے۔“ اوشا بولی۔

”آگے ایک کچا راستہ سڑک سے ہٹ کر نکل رہا ہے دائیں طرف۔“ بانو بولی۔

”کتنی دور ہے؟“ میں نے بانو سے پوچھا۔

”شاید ادا کلو میٹر ہو گا روشنی ہوتی تو پہلے نظر آ جاتا۔ ایک منٹ میں دوبارہ دیکھتی ہوں۔“ بانو نے سیدھے

ہو کر معائنہ کیا اور بولی۔ ”ڈرا سا سڑک مڑتے ہی ہے۔ اسی لیے نظر آ گیا اور نہ سیدھی سڑک پر بتا بھی نہ چلتا۔“

میں نے عقب میں دیکھا اور پک آپ کی تمام لائنس آف کر دیں۔ آسمان پر ستارے موجود تھے اور کسی قدر نظر آ رہا تھا۔ مگر اس طرح سے ڈرائیونگ کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بڑے خطرے سے بچنے کے لیے مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا تھا۔ میں نے رفتار کم کر دی تھی اور آنکھوں پر پورا زور دے رہا تھا۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”سب خود کو سنبھالیں شاید جھکے لگ سکتے ہیں۔“

بانو اور اوشا نیچے بیٹھ گئیں۔ ایک منٹ بعد راستہ آگیا یہ کچا راستہ اوپر کی طرف جا رہا تھا اور پک آپ جیسی بڑی گاڑی کے لیے موزوں نہیں تھا لیکن میں نے فور ڈھیل گیر لگاتے ہوئے بلا تکلف پک آپ اس پر چڑھادی۔ زبردست جھکے لگے اور ایسا لگا کہ پک آپ واپس سڑک پر آجائے گی کیونکہ ڈھلان توقع سے زیادہ ترچھی تھی لیکن پک آپ کے طاقتور انجن نے یہ معرکہ سر کر لیا اور وہ اوپر چڑھنے لگی۔ یہ جگہ درختوں کے درمیان تھی اس لیے دیکھنے میں زیادہ دشواری پیش آرہی تھی۔ میں شاید ہی زندگی میں کبھی پیدائی پر اتنا زور دیا تھا جتنا کہ اس وقت دے رہا تھا۔ رفتار خود بہ خود کم ہو گئی تھی۔ اس لیے تصادم یا راستے سے اترنے کا خطرہ کم تھا لیکن مجھے پیچھے آنے والوں کی فکر تھی وہ پاس آتے تو پک آپ کے انجن کا شور سن سکتے تھے اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ ہم کہاں تھے؟ یہ گھومتا ہوا کچا راستہ تھا جو پہاڑ کے اوپر جا رہا تھا اور آگے مزید تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ تقریباً پچاس ساٹھ گز اوپر آنے کے بعد آگے جانے کی محاش باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے پک آپ روک کر ہینڈ بریک کھینچا اور انجن بند کر دیا۔ اچانک خاموشی ہوئی تو پتا چلا کہ اس دشوار راستے پر انجن کتنا شور مچا رہا تھا۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اب پک آپ واپس نہیں جائے گی میں نیچے اتر آیا۔ بانو بھی اتر آئی تھی۔

”وہ بھی آنے والے ہیں۔“ اس نے اشارہ کیا۔

”ہوشیار ہو..... ہو سکتا ہے وہ جان گئے ہوں اور اب سیدھا سی طرف آئیں گے۔ اس صورت میں ان کو حملے میں پہل کا موقع نہیں دیتا ہے۔“

”میں نیچے جاؤں؟“

”نہیں کوئی رسک مت لو۔ یہیں رک کر ان کے رد عمل کا انتظار کرنا ہے۔“ میں نے کہا اور جھک کر شام کو دیکھا۔ ”تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”تکلیف ہے۔“ اس نے دھمے لہجے میں کہا۔ ”لیکن بہتر ہوں۔“

”میں ریڈیو پر رابطہ کر رہا تھا لیکن تمہاری طرف سے جواب نہیں دیا جا رہا تھا۔“

”میں نے ریڈیو آف کر دیا تھا۔“ اس نے شرمندگی سے کہا۔ ”اسی کا نتیجہ بھگتا ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس نے خیالہ بھگت لیا تھا مزید کچھ کہنا بے کار تھا۔ رینا نے پٹنی سے کہا۔ ”یہ سب تم لوگوں کی وجہ سے ہوا؟“

”مجھے تسلیم ہے خاتون۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”لیکن ہماری بھی مجبوری تھی۔ بہر حال اس مصیبت سے نکلیں تو تمہارے لیے کچھ کرتے ہیں اور تم فکر مت کرو تمہارے نقصان کی تلافی بھی کر دی جائے گی بشرطیکہ زندہ رہے۔“

وہ دونوں ڈر گئے تھے۔ شام بولا۔ ”تم ہمیں مار دو گے؟“

”ہم نہیں ہمارے دشمن..... تم بے ہوش تھے لیکن رینا نے دیکھا کہ انہوں نے گرینڈ مارے وہ تو قسمت

اچھی تھی کہ ہم جگہ سے البتہ تمہاری گاڑی تباہ ہوگئی۔“

”کیا؟“ شیام نے انٹنے کی کوشش کی۔ ”ٹرلر تباہ ہو گیا؟“

”ہاں۔“ میں نے اسے واپس لٹا دیا۔ ”پہلا گرینڈ اسی پر لگا تھا۔“

”تم نے مجھے بتایا نہیں۔“ شیام نے ریٹا سے کہا تو اس کے لہجے میں تنہی تھی۔

”تمہاری حالت ٹھیک نہیں تھی اس لیے نہیں بتایا۔“ وہ سبے انداز میں بولی۔ ”قائدہ بھی نہیں تھا اس میں

کچھ بچا کہاں ہوگا؟“

میں ان کی گفتگو سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسی اثنا میں سڑک کی طرف سے مشینی انجن کی گونج سنائی دی۔ ڈشٹن آگئے تھے یقیناً ہماری گاڑی کی لائٹس غائب ہونے سے وہ کنفیوز ہوئے تھے اور اب ذرا سست رفتار سے چلتے ہوئے ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ یہ بڑے سائز کی جیپ تھی۔ چند لمحوں بعد وہ اس کے راستے کے پاس پہنچی، ایک لمحوں کو اس کی رفتار سست ہوئی اور مجھے لگا کہ وہ رک جائے گی یا پھر اس راستے پر چڑھ آئے گی لیکن پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ بانو میرے ساتھ ہی سانس روکے کھڑی تھی۔ ان کے آگے جانے پر اس نے سانس لی اور بولی۔ ”شکر ہے دفع ہو گئے۔“

میں ہنسا۔ ”تم مردود اور منحوس مارے وغیرہ لگانا بھول گئیں۔“

وہ جھپٹی۔ ”کیا کروں عورتوں والی فطرت تو نہیں جاتی۔“

راج کنور اتنی دیر سے خاموش تھا وہ پہلی بار بولا۔ ”اس طرح چھپنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا وہ جلد جان جائیں گے کہ تم کہیں چھپ گئے ہو اور وہ واپس آئیں گے۔“

”جب تک وہ آئیں گے ہم یہاں سے جا چکے ہوں گے۔“ میں نے کہا اور شیام سے پوچھا۔ ”تم یہاں

اکثر آتے جاتے رہتے ہو، اگر ہم جنوب کی طرف جائیں تو کہاں ہمیں متبادل سڑک ملے گی۔“

”کیمن میں ایک نقشہ ہے وہ دکالو۔“ اس نے کہا تو میں ڈیش بورڈ کے خانے سے پلاسٹک پر بنا ہوا نقشہ

نکال لایا۔ اسے دیکھنے کے لیے نارج بھی وہیں سے ملی۔ شیام نے نقشہ پھیلا دیا۔ میں نے نارج کی روشنی ڈالی۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے ایک مقام پر انگلی رکھی۔ ”ہم یہاں ہیں اور اگر جنوب کی طرف جاتے ہیں تو تقریباً بارہ

کلومیٹر کے بعد ہمیں متبادل سڑک ملے گی یہاں.....“ اس نے دوسری جگہ انگلی رکھی تب تک ہمیں اسی سڑک پر

سفر کرنا ہے۔“

میں نے نقشے کا معائنہ کیا۔ میں کلومیٹر کے بعد متبادل سڑکوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ میں نے ایک جگہ انگلی

رکھی۔ ”میرا خیال ہے یہاں انہوں نے ناکا لگایا تھا۔“

راج کنور بھی نقشہ دیکھ رہا تھا اس نے تصدیق کی۔ ”یہ جگہ اسٹیٹ سے آنے والی سڑک سے کچھ پہلے ہے۔“

”میرا خیال ہے ناکا ہوگا۔“ بانو بولی۔ ”وہ اس جگہ کو خالی نہیں چھوڑیں گے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ہمیں نکلنا ہے مجھے یقین ہے اس جانے والی گاڑی میں

راهن ہوگا اور وہی ہمارے لیے خطرناک ترین آدمی ہے۔ آگے دوسرے لوگ ہوں گے تو ان سے نمٹا جا سکتا

ہے۔ اس پہلے راهن آئے ہمیں واپس جانا ہے۔“

سردی کی شدت بڑھ رہی تھی اور اب واضح محسوس ہونے لگی تھی ریٹا اور بانو تو کانپ بھی رہی تھیں۔ ہمارا حال بھی اچھا نہیں تھا لیکن اوشا صرف شال میں آرام سے تھی۔ ریٹا نے اس سے پوچھا۔ ”تمہیں سردی نہیں لگ رہی ہے؟“

”نہیں رہے ہمیں سردی نہیں لگتی ہے۔“ وہ بولی۔ ”یہ بھی ایسے ہی لی ہے۔“

اس کے جسم میں بھرے زہری گرمی اسے سردی سے بچا رہی تھی۔ میں نے مداخلت کی۔ ”ہاتوں کے بجائے چلنے کی فکر کرو۔“ میں نے پہلے ایک پانے کی مدد سے پک آپ کی اگلی بچھلی بریک لائٹس توڑ دیں کیونکہ ان کو بند کرنا ممکن نہیں تھا۔ صرف ہیڈ لائٹس اور انڈی کیٹنگ لائٹس قابو میں تھیں۔ ریٹا اور شام خاموشی سے ٹریلر کے بعد اپنی جیب کا حشر ہوتے دیکھ رہے تھے اور غالباً اپنی خیر متا رہے تھے کہ ان چیزوں کے بعد کہیں ان کی باری نہ آجائے۔ یہ کام کر کے میں نے پک آپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور بانو نیچے رہ کر گائیڈ کرنے لگی کہ پک آپ کس طرح اتاری جائے۔ رپورس میں جانا اور چڑھنے کی نسبت کہیں مشکل کام ثابت ہوا تھا۔ اگر بانو مدد نہ کر رہی ہوتی تو شاید میں پک آپ کہیں ٹکرا دیتا یا حادثے کا شکار ہو جاتی۔ بڑی مشکل سے میں اسے سڑک پر لانے میں کامیاب رہا۔ نیچے آتے ہوئے میں نے اسے رپورس کر لیا اور اب ہمارا رخ جنوب کی طرف تھا۔ بانو اور اوشا بچھلے حصے میں سوار ہو گئیں۔ پک آپ کی لائٹس بند کر کے اس کا رخ جنوب کی طرف کر دیا۔

اس بار تاریکی کے باوجود میں نے رفتار تیز رکھی تھی تاکہ جلد از جلد اس جگہ سے نکل جائیں۔ میرے ذہن میں اس جگہ کی کچھ نشانیاں تھیں جہاں رامن اینڈ کمپنی نے ناکا لگا دیا تھا۔ بانو عقب میں نظر رکھے ہوئے تھے اور فی الحال پیچھے کوئی گاڑی یا اس کی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں جیب کی واپسی سے پہلے ناکے سے گزر جاؤں۔ بالآخر ہم ایک جگہ پہنچے جہاں سڑک گھوم رہی تھی اور اس سے ذرا آگے ٹریلر چل رہا تھا۔ میں نے پک آپ روکی اور نیچے اتر آیا۔ بانو بولی۔ ”یہاں کیوں رکے ہیں؟“

”یہاں سے میں پیدل آگے جاؤں گا۔“

”اکیلے؟“ وہ فکر مند ہو گئی۔

”ہاں تم لوگ یہاں ہوشیار رہنا۔ راج کنور ڈرائیونگ سیٹ پر رہے گا اور تم اس کی نگرانی کرو گی۔ اگر وہ لوگ واپس آئے تو تم لوگ پک آپ لے کر آگے آؤ گے۔ میں راستے میں مل جاؤں گا۔ میں وہاں پہنچ کر ناکا دیکھوں گا اور اگر راستہ صاف ہوا تو میں سیٹی بجاؤں گا۔“

”سیٹی یہاں تک سنائی دے گی؟“

”اگر دوسروں کے سن لینے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ابھی بجا کر دکھاتا۔ مجھے یاد ہے گاؤں میں جب نہر پر نہانے جاتا تھا تو وہاں کے وقت سیٹی بجا کر حویلی میں اطلاع کرتا تھا اور میرے لیے گرم گرم روٹی ڈالی جاتی تھی۔ نہر حویلی سے نصف میل دور تھی اور یہ تو اس سے کم فاصلہ ہے۔“

بانو ہنسی تو میں جینپٹ گیا قصہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا۔ ”ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گی۔“

”اگر میری سیٹی کے جواب میں تم لوگ نہ آئے تو میں پستول سے ایک ایک سینڈ کے دقتے سے تین فائر

کروں گا۔ اسی طرح اگر کوئی خطرہ ہوا تو تم دو فائر کرو گی۔“

میں سڑک کے ساتھ ڈھلان کے ساتھ روانہ ہوا۔ یہاں تاریکی زیادہ تھی اور اگر کوئی موٹر پر نگرانی کر رہا تھا تو میرے نظر آنے کا امکان کم تھا۔ جب میں ناکے والے موٹر کے پاس پہنچا تو سڑک سے ڈھلان پر چڑھ گیا اور اب مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑ رہا تھا۔ کیونکہ ذرا پاؤں غلط رکھتا تو گرنے کا امکان تھا اسی طرح اگر میرے پاؤں تلے آکر پتھر لڑھک جاتے تو دشمن باخبر ہو جاتا۔ دونوں موٹر کے درمیان دوسو گز کا فاصلہ تھا۔ قریب آکر میں مزید بلندی کی طرف گیا تاکہ ذرا دور تک دیکھ سکوں اگرچہ وہاں دیکھنے کی مجالش کم تھی۔ ایک چٹان کی اوٹ سے میں نے سڑک کا معائنہ کیا۔ جہاں پہلے جیب کھڑی تھی وہاں اب کوئی نہیں تھا لیکن مجھے یقین کی حد تک شک تھا کہ رامن وہاں کسی نہ کسی کو چھوڑ کر گیا ہوگا اور اب وہ یہاں گھات لگائے بیٹھا ہوگا۔ کئی منٹ تک میں نظریں جمائے بیٹھا رہا لیکن نہ تو کوئی نظر آیا اور نہ ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ جو بھی تھا یا تھے بہت خاموشی سے میری طرح ڈھلان پر یا نیچے کھائی والی سمت میں چپے ہوئے تھے۔ جب کوئی سامنے نہیں آیا تو میں نے ایک آزمودہ نسخہ آزمایا۔ ایک پتھر اٹھا کر سڑک سے آگے کھائی میں اچھال دیا۔ پتھر خاصی آواز کے ساتھ گر اور پھر اس کے لڑھکنے کی آواز بھی آئی تھی۔ فوراً ہی کوئی بولا۔

”یہ کیا تھا؟“

جواب میں کسی دوسرے نے اس کی والدہ کے حوالے سے ایک ناقابل بیان بات کی۔ ”کتے کے بچے چپ نہیں رہ سکتا۔“

”اور تو خود جو بھونک رہا ہے۔“ کتے کے بچے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ دونوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ خاموش ہو گئے لیکن میرا مقصد پورا ہو گیا تھا مجھے ان دونوں کی لوکیشن کا پتا چل گیا۔ وہ مجھ سے کوئی بیس گز آگے اسی ڈھلان پر موجود تھے۔ میں بہت آہستہ سے اپنی کمین گاہ سے نکلا موسم کو نظر انداز کر کے اپنے جوتے اتار دیے ورنہ یہ سلسلہ کرتے یا کوئی پتھر ان کے نیچے آکر لڑھک جاتا تو دشمن قبل از وقت میری آمد سے باخبر ہو جاتے۔ نیچے پاؤں میں زیادہ بہتر چل سکتا تھا۔ اچانچ اچانچ کرتے ہوئے میں اپنے اندازے کے مطابق عین ان کی پشت پر پہنچا۔ مزید تعقیق کے لیے میں وہی تکنیک آزمائی اور ایک پتھر سڑک کی طرف اچھال دیا لیکن اتفاق سے درمیان میں موجود ایک درخت سے ٹکرایا اور وہیں گر گیا۔ بلکہ شاید ان پر ہی گر اٹھا کیونکہ وہ اچھل پڑے تھے۔

”کوئی ہے۔“ پہلے والا چلایا۔

”پاس ہے۔“ دوسرے نے تعدیق کی تو میرا کام آسان ہو گیا۔ میں نے ایک درخت کی آڑ سے راقفل کا رخ ان کی طرف کر کے ٹریگر دیا۔ فائرنگ کے بے پناہ شور میں ان کی جھپٹیں دب گئی تھیں۔ ایک بار دس بارہ گولیوں کا برسٹ مار کر میں رک گیا۔ مگر پہاڑوں میں فائرنگ کی گونج جاری تھی۔ اسے سمجھنے میں ذرا وقت لگا۔ میں نے دوبارہ اندازے سے اسی طرف ہلکا برسٹ مارا۔ اس بار دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔ پستول سے فائر ہوئے۔ نشانہ میں تھا لیکن تمام گولیاں درخت کے تنے میں لگیں۔ میں نے شعلوں سے جگہ کا تعین کیا اور اگلا برسٹ اسی طرف مارا۔ اس بار چیخ نے بتایا کہ میں کامیاب رہا تھا۔ وہ گولیاں کھا کر نیچے لڑھک گیا تھا۔ دوسرا پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ میں نے تاریخ روشن کی لیکن خود سامنے نہیں آیا جب کوئی رد عمل ہوا تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ ایک دیہی سامنے پڑا تھا اس کا نصف سرا ڈھکیا تھا اور دوسرا ڈھلان پر سڑک سے ذرا اوپر پڑا ہوا تھا۔ وہ بھی ساکت تھا۔

میں جوتے پہن کر نیچے آیا۔ دوسرا زندہ تھا لیکن اکھڑی اکھڑی سانس لے رہا تھا شکل صورت سے دونوں مقامی لگ رہے تھے۔ میں نے ان کا اسٹمپ اور ایڈمنسٹریشن سمیٹا اور سڑک پر آیا۔ سیٹی بجائی جو کچھ دیر پہاڑوں میں گونجتی رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ سیٹی سن کر روانہ ہوئے تو ایک منٹ سے بھی پہلے یہاں پہنچ سکتے تھے۔ مگر جب دوسرا منٹ ہونے پر بھی وہ نہیں آئے تو میں فکر مند ہو کر خود روانہ ہو گیا۔ اب کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لیے میں نے کھلی سڑک پر دوڑ لگائی اور ایک منٹ سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ پک آپ کو اپنی جگہ موجود پاکر میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ میرے ذہن میں کئی خدشات سرسرا رہے تھے۔ مگر قریب جاتے ہی گڑ بڑ کا احساس ہوا اور سکون ہوا ہو گیا۔ وہاں بانو اور راج کنور دونوں ہی نہیں تھے۔ پچھلے حصے میں اوشا، رینا اور شام تھے۔ اوشا مجھے دیکھتے ہی بولی۔

”راج کنور نے حرامی پن کیا ہے وہ بھاگ گیا ہے۔ بانو اس کے پیچھے گئی ہے۔“

یہ ایک نئی پریشانی تھی۔ راج کنور نے بڑے غلط موقع پر حرکت کی تھی اور بانو نے بھی جذباتی ہو کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی تھی۔ میں نے اسے آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے اوشا سے پوچھا۔ ”وہ کس طرف گئے ہیں؟“

”اس طرف۔“ اوشا نے ڈھلان کے اوپری حصے کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہم اسے آواز دیتی رہ گئے پر وہ رکی نہیں۔“

مجھے راسن کا خیال بھی تھا وہ کسی وقت بھی واپس آ سکتا تھا اور میں ان لوگوں کو چھوڑ کر جاتا تو یہ اس کا آسان شکار بن جاتے۔ میں نے رینا اور شام سے کہا۔ ”تم لوگ اتر کر درختوں میں آ جاؤ۔“

”میں نہیں اتر سکتا۔“ شام نے عذر کیا۔ ”میں زخمی ہوں۔“

”ٹھیک ہے تب بیٹھے رہو جب وہ واپس آ کر گریڈ ماریں تب بھی بیٹھے رہنا۔“ میں نے کہتے ہوئے پک آپ کا ہینٹ کھول کر اس کا ڈسٹری بیوٹر کا کیپ اتار لیا۔ اب پک آپ کسی صورت اشارت نہیں ہو سکتی تھی۔ مقصد رینا اور شام کو فرار سے روکنا تھا۔ میں نے اوشا کو ساتھ لیا اور اوپر کی طرف بڑھا۔ مجبوراً رینا اور شام بھی نیچے اتر آئے اور رینا شوہر کو سہارا دے کر اوپر لانے لگی۔ اوشا بتا رہی تھی کہ راج کنور نے چالاکی سے کام لیا اس نے بانو سے کہا کہ اسے شمال کی طرف روشنی دکھائی دی ہے وہ پک آپ پر چڑھ کر اس طرف دیکھ رہی تھی کہ راج کنور خاموشی سے سرک گیا۔ جب تک بانو کو احساس ہوتا وہ درختوں میں جا چکا تھا اور پھر بانو اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ میں نے اوشا سے کہا۔ ”تم ذرا آگے چلو اور بانو کو آوازیں دو۔ اگر راج کنور کہیں آس پاس ہوا تو تمہیں اکیلا سمجھ کر سامنے آ جائے گا۔“

اوشا سمجھ گئی اور اس نے اعتراض نہیں کیا کہ میں اسے قربانی کا بکرا کیوں بتا رہا ہوں ممکن تھا کہ راج کنور اس پر حملہ کر کے اسے مارنے کی کوشش کرتا۔ وہ پوری بے لوثی سے میرا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور میں اس سے کچھ پیچھے رہ گیا۔ اوشا بانو کو آواز دینے لگی۔ اس کی آواز خاصی تیز تھی اور دور تک جا رہی تھی پہاڑوں کی گونج اسے بڑھا رہی تھی مگر بانو کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ میرا دل دھڑک اٹھا اگر بانو جواب نہیں دے رہی تھی اس کا ایک ہی مطلب تھا وہ فریپ ہو گئی تھی اور جواب دینے کے قابل نہیں تھی۔ جب اوشا خاموش ہوتی تو میں اپنی سماعت استعمال کرتا تھا۔ یہاں تاریکی زیادہ تھی اور ایسے میں آنکھوں سے زیادہ کان کام آتے۔

ایک بار جیسے ہی اوشا خاموشی ہوئی اور کہیں آواز آئی جیسے پتھر گرے ہوں۔ میں نے اس طرف رخ کر کے نارچ روشن کی تو ایک سفید پوش ہیولہ بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ راج کنور نے بھی سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ لمحوں میں وہ گئے درختوں میں غائب ہو گیا۔

”راج کنور“ میں نے چلا کر کہا۔ ”تم بھاگ نہیں سکتے۔“

مگر وہ غائب تھا میں نارچ کی روشنی میں آگے بڑھا تو اوشا بھی میری طرف آئی تھی۔ ”کیا ہوا رہے؟“

”راج کنور کی جھلک دکھائی دی تھی وہ اوپر درختوں میں ہے۔“

”اسے زکھ میں ڈالو بانو کو تلاش کرو۔“

”بانو اسی کے ساتھ تھی۔ ہمیں اوپر دیکھنا ہوگا۔“

اس روز اگر میں یہ فیصلہ نہ کرتا تو شاید ساری عمر بچھتا تار ہتا۔ جیسے ہی میں اس مقام پر پہنچا جہاں راج کنور نظر آیا تھا۔ ایک درخت کے پیچھے کسی کے پاؤں دکھائی دیے۔ پاؤں جوتوں سے عاری تھے۔ مگر نسوانی تھے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس طرف آیا تو بانو اوندھے منہ پڑی تھی۔ میں بے تاب رہنے لگا۔ اس کی طرف لپکا نارچ اوشا کو تھا کر بانو کو سیدھا کیا۔ اس کا سر ایک طرف سے لہولہاں تھا اور خون بہہ کر نصف چہرے پر آ گیا تھا۔ میں نے گردن پر اس کی نبض دیکھی اور اسے چلتا پا کر سکون کا سانس لیا۔ مگر جب اس کے سر کا زخم دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ یہ خاصا گہرا زخم تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی سخت چیز بہت زور سے اس کے سر پر ماری گئی تھی اور ضرب نے شاید کو پڑی چٹخادی تھی۔ خون بہہ رہا تھا اور بانو مکمل طور پر بے ہوش تھی۔

”اسے کیا ہوا؟“ اوشا نے سب سے انداز میں پوچھا۔

”راج کنور نے بے خبری میں حملہ کیا۔ ہم بروقت آگئے ورنہ وہ شاید اسے مار کر جاتا۔ ابھی اسے صرف جوتے اتارنے کا موقع ملا۔“

اوشا نے نارچ سے چاروں طرف روشنی ڈالی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے بانو کو اٹھا کر شانے پر ڈالا اور اوشا سے کہا۔ ”نارچ سے راستہ دکھاؤ ورنہ میں گمراہ تو پھر مجھے بھی اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔“

اوشا روشنی دکھانے لگی اور میں بانو کے وزن کے ساتھ سنبھل کر اترتا رہا۔ اس وقت میں پہلی بار پچھتا یا کہ بانو کو وزن بڑھانے کا مشورہ کیوں دیا تھا۔ تقریباً چوتھہ پینسٹھ کلو گرام وزنی بانو کو اٹھا کر اس ڈھلان سے تاریکی میں اتارنا کس قدر مشکل کام ثابت ہوا تھا یہ میں لفظوں میں نہیں بتا سکتا۔ نہ جانے کیسے میں اسے لے کر صحیح سلامت نیچے پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا لیکن میرا سانس پھول گیا تھا اور آخر میں گھٹنے لرزنے لگے تھے۔ پک آپ سامنے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور بانو کو اس کے پچھلے حصے میں لٹا دیا۔ خوش قسمتی سے ریٹا آتے ہوئے پانی کی ایک بوتل لٹی آئی تھی۔ میں نے پانی بانو کے چہرے پر چھڑکا اور منہ میں پٹکا یا لیکن اس کی طرف سے کوئی رد عمل نہیں آیا تھا پانی بھی اس کے حلق میں جانے کے بجائے بانو کے منہ سے بہہ نکلا تھا اور یہ خطرناک علامت تھی۔ ریٹا اور شیاہ ہمیں دیکھ کر نیچے اتر آئے تھے۔ میں نے ریٹا اور اوشا سے کہا۔

”اس کے زخم کی مرہم بنی کرو۔“

بانو کی رائفل اور پستول مع اضافی میگزین کے غائب تھا اور وہ یقیناً راج کنور کے ہاتھ لگا تھا لیکن وہ

بزدل تھا اس لئے حملے کے بجائے اس نے فرار کو ترجیح دی تھی۔ ورنہ وہ آسانی سے مجھے اور اوشا کو بھی ٹھکانے لگا دیتا۔ بہر حال اس وقت اسلحے یا راج کنور کے بجائے مجھے بانو کی فکر لاحق ہو گئی تھی اسے جلد از جلد کسی اسپتال پہنچانا ضروری تھا ورنہ اس کے سر کی چوٹ جان لیوا بھی ہو سکتی تھی۔ اسلحے والا بیگ پک اپ کے کین میں تھا اور چابی میرے پاس تھی لیکن اس کی کھڑکی کا شیشہ غائب تھا اگر ریٹا یا شام کو اس کا خیال آتا تو وہ اسلحہ حاصل کر سکتے تھے۔ بانو کے پاس موجود رقم موجود تھی راج کنور کو رقم نکالنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ میں نے اپنے پاس رکھ لی اور رامن کے آدمیوں سے حاصل کیا ہوا اسلحہ بیگ میں ڈال دیا۔ ڈسٹری بیوٹر کا کیپ لگا کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اسے آگے بڑھایا۔ عقب سے اوشا نے کہا۔

"زخم صاف کیا ہے پر بہت گہرا ہے کھون نہیں رک رہا۔"

"خون روکنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے کہا۔ "زخم کسی چیز سے ڈھک دو اور اس کا خیال رکھو۔"

"اوشا بے چاری نے اس حد تک خیال کیا کہ اپنی مثال اسے اوڑھادی حالانکہ سب سے کم کپڑے اسی

نے پہنے ہوئے تھے۔ ریٹا نے مجھ سے پوچھا۔ "فائرنگ کس نے کی تھی؟"

"میں نے تاکہ اگر دشمن کہیں چھپا ہو تو سامنے آجائے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔" میں نے غلط بیانی سے

کام لیا اسے یا شام کو بتانا غیر ضروری تھا کہ میں دود دشمنوں کو ٹھکانے لگا کر آ رہا ہوں۔ ہم اس جگہ سے گزرے تو میں نے جان بوجھ کر پک اپ ذرا کنارے کی طرف کر لی تھی کہ ڈھلان کی ساتھ پڑی لاش اتفاق سے بھی نظر میں نہ آئے۔ اس بار میں نے رفتار تیز رکھی اور ہیڈ لائٹس بھی آن کر لی تھیں۔ نقشے کے مطابق پہلا قصبہ یا آبادی یہاں سے کوئی پندرہ کلومیٹر دور تھی۔ جب بارہ کلومیٹر ز بعد دور ہوا آیا تو میں نے نقشہ دیکھ کر سڑک کا تعین کیا۔ اس وقت میں راستہ بھٹکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ روانگی کے نصف گھنٹے بعد ہم اس پہاڑی قصبے میں داخل ہوئے۔ یہاں بجلی تھی اور شاید ایک ہزار گھر تھے۔ سڑک کے ساتھ ہوٹل اور دکانیں تھیں۔



اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
چودھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

کاشفِ زہر کے قلم سے ایک تیز رفتار ایگیشن سے بھرپور ناول



PDFBOOKSFREE.PK

ایک ایک ایڈورٹائزنگ اور تھریس آئیٹم سلسلہ

- ❖ کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا کون سا واقعہ مستقبل میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔
- ❖ انسانی عقل و فہم محدود ہے۔ وہ صرف محدود دائرے میں مخصوص محاذ پر ادراک نظر رکھتی ہے۔
- ❖ خیر و شر کی اس ازلی جنگ کا قصہ اس کے بغیر فلسفہ حیات کے اسرار و رموز سے آگاہی ممکن نہیں۔
- ❖ اس نوجوان کی کہانی جس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو قتل و غارت گری، بے جا بی ویریاوی اس کی منتظر تھی۔
- ❖ اس کی زندگی کے لیے بھی کوئی جائے پناہ نہ تھی لیکن قدرت کو شاید اس سے کوئی اہم کام لینا مسطور تھا۔
- ❖ چنانچہ وہ زندہ رہا اور اپنے دشمنوں کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوا۔

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور
 فون: 37247414
 علی میاں پبلیکیشنز